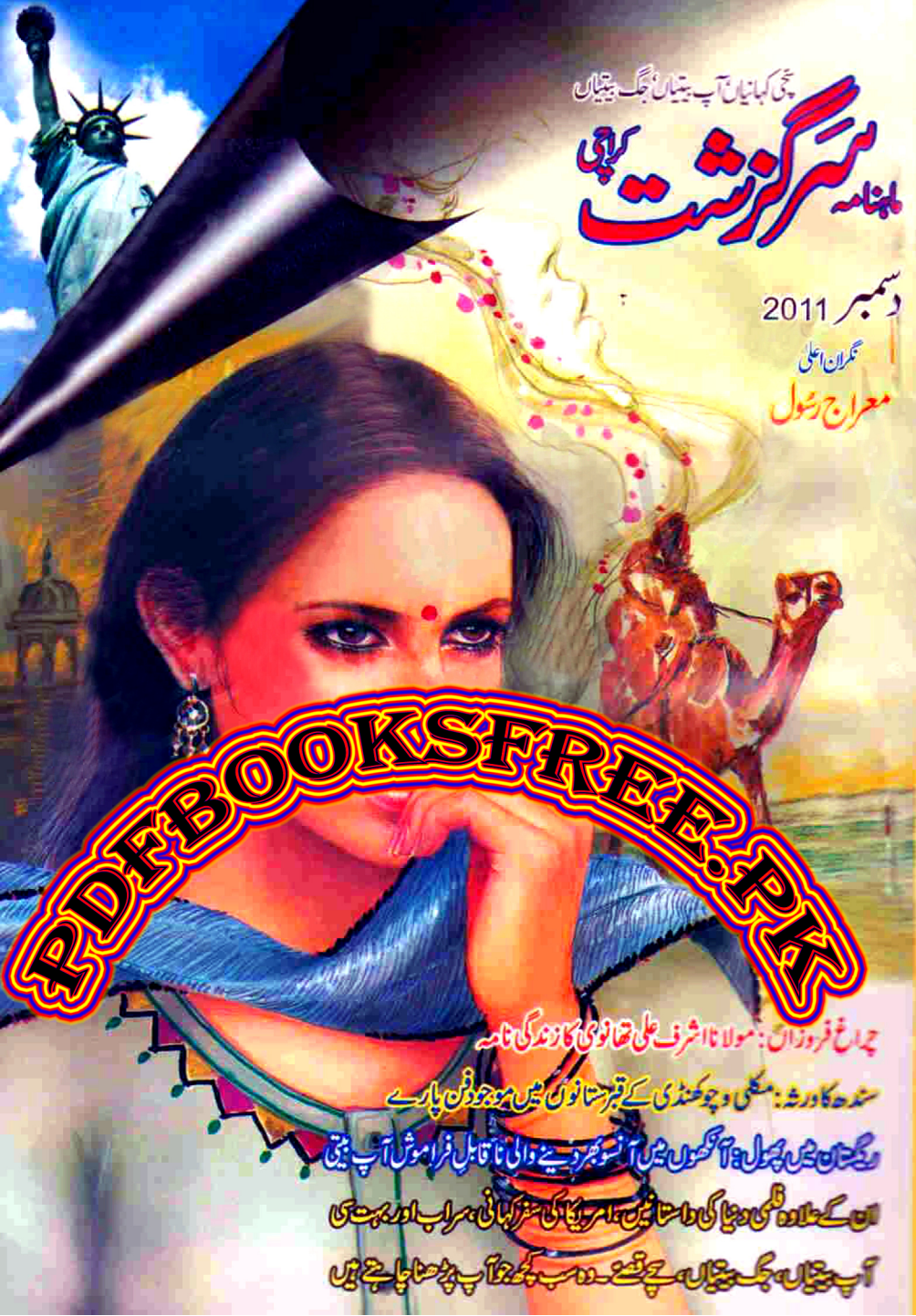

سچی کہانیاں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
دسمبر 2011
نگران اعلیٰ
معراج رسول
PDFBOOKSFREE.PK
چراغ فروزاں: مولانا اشرف علی تھانوی کا زندگی نامہ
سندھ کا ورثہ: مکلی و چوکنڈی کے قبرستانوں میں موجود فن پارے
ریگستان میں پھول: آنکھوں میں آنسو بھر دینے والی ناقابلِ فراموش آپ بیتی
ان کے علاوہ فلمی دنیا کی داستانیں، امریکا کی سفر کہانی، سراب اور بہت سی
آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، سچے قصے۔ وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

سرگزشت 15
بینا نابینا
ادارہ
ایک صفحے میں مکمل ایک نادر روزگار کا تعارف خاص

گفت وشنید 16
شہرِ خیال
مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت 24
چراغِ فروزاں
ڈاکٹر ساجد امجد
اس نابغۂ روزگار شخصیت کا زندگی نامہ جس نے برصغیر کی اسلامی دنیا میں ہلچل مچا دی تھی

جنگ وجدل 47
باغی کمانڈر
محمد عفان
ایک بربر پیگار قبیلے کے حالات، وہ حقوق کی خاطر لڑ رہے ہیں

حادثات 61
شوقِ پرواز
طارق عزیز خان
ان کی زندگی داؤ پر لگ گئی تھی مگر حالات نے موت کو پیچھے دھکیل دیا

خراج عقیدت 71
خواجہ پرویز
انور فرہاد
پاکستانی فلمی دنیا کے ایک لیجنڈ شخصیت کو خراج عقیدت

فلم وصحافت 77
فلمی الف لیلہ
علی سفیان آفاقی
فلم وصحافت کی کہی ان کہی کہانیاں فلم نگری کی باتیں، یادیں

معلومات 97
کولمبس ہی کیوں
مریم کے خان
کیا یہ جھوٹ ہے کہ کولمبس نے امریکا دریافت کیا تھا؟ ذہین قارئین کے لیے تحفہ

مہم جوئی 115
مددِ پرخطر
ظفر سعید یوسفی
ایک درندے کی زندگی بچانا تھی کیونکہ اس کے ساتھ ننھے بچے بھی تھے

سفر کہانی 127
امریکا او امریکا
الطاف شیخ
ایک الگ انداز کی سفر کہانی مختلف انداز سے امریکا درشن

سیر پاکستان 143
سندھ کا ورثہ
مختار آزاد
مکلی، چوکھنڈی اور دیگر قبرستانوں میں کیسے کیسے فن پارے موجود ہیں

معاشرت 156
سراب
کاشف زبیر
بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان، ایک دلچسپ تحریر

شعر و ادب 195
بیت بازی
قارئین
شعروادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

انعامی مقابلہ 198
علمی آزمائش
ادارہ
ذہین قارئین کے ذوق جستجو کی تسکین کے لیے منفرد انعامی سلسلہ

پہلی سچ بیانی 200
ریگستان میں پھول
اشرف حسن
اس نے ایک ہندو لڑکی کو جیون ساتھی بنایا مگر......

دوسری سچ بیانی 213
آخری مقدمہ
نصیرالدین نیاز
اسے مقدمہ بازی کا شوق تھا کہ ایک دن اس کی بازی اسی پر الٹ گئی

تیسری سچ بیانی 217
تلافی
ثمرہ حمید
اس نے اپنے باپ کو زہر پلا دیا لیکن جب راز کھلا

چوتھی سچ بیانی 237
جوڑ بے جوڑ
اعزاز حسن سید
اس دنیا کے اسٹیج پر کیسے کیسے کھیل کھیلے جارہے ہیں

پانچویں سچ بیانی 247
خون کا اثر
نوران
وہ بچے کے لیے ترستی تھی لیکن جب بچہ کوکھ میں آیا تو وہ نفرت سے بھر اٹھی

چھٹی سچ بیانی 261
بیٹا برائے فروخت
مختار حسین
اس نے بیٹے کی شادی کے لیے ایک انوکھی تجویز رکھی تھی

ساتویں سچ بیانی 267
تحریر شناس
آصفہ ضیا احمد
اسے غیب دانی پر فخر تھا اور اسی تحریر شناسی نے اس کی زندگی غموں سے بھر دی

آٹھویں سچ بیانی 275
مکافاتِ عمل
عظیم خان
وہ چن چن کر پاکستانیوں کے خلاف افسران بالا کے کان بھرتا سازشیں کرتا تھا

نویں سچ بیانی 279
شکستِ شبِ تار
شہریار
کبھی کبھی اپنا خون بھی گردن پر چھری چلانے لگتا ہے

سوغات 000
پارچے
قارئین/ ادارہ
دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات انکشافاتی پارچے

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع ونقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بےحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جلد 22 ❖ شمارہ 02 ❖ دسمبر 2011ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

مصور : شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا محمد زاہد 0323-2895528

نمائندہ لاہور افراز علی نازش 0300-4214400

❖❖❖

قیمت فی پرچہ 50 روپے ❖ زرِ سالانہ 600 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ○ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551

E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

برصغیر کی بدقسمتی رہی ہے کہ یہاں مسلمانوں میں کبھی اتحاد و اتفاق نہ رہا ورنہ صدیوں کی حکمرانی کے بعد بھی بیس فیصد نہ رہتے۔ دراوڑ وآریہ پہلے بھی اکثریت میں تھے اور اب بھی ہیں اور ان میں پہلے بھی اتحاد و اتفاق تھا، اب بھی ہے جبکہ ہم اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی آپس میں ٹکراتے، دست وگریباں ہوتے رہے اور آج بھی ہو رہے ہیں۔ آپسی نفاق کا ہی تو شاخسانہ تھا کہ نواب سراج الدولہ کو پاپیادہ عقبی دروازے سے بھاگنا پڑا۔ ٹیپو سلطان کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ بہادر شاہ ظفر کو قید ہونا پڑا۔ جنرل بخت خاں کو اپنے توپ خانے کے ساتھ پیچھے ہٹنا پڑا۔ یہاں تک کہ لاکھوں لاکھ جانوں کی قربانیوں کے بعد حاصل شدہ تحفۂ خداوندی جو ہمیں عین شب قدر کو خدا نے عطا کیا تھا، اس کے ایک حصے کو کھونا پڑا۔ بقول صہبا اختر ؎

شکار گاہ کی خواہش تھی ملک گیروں کو
بطور خاص میرا ملک انتخاب ہوا

یہ زخم دسمبر کے منحوس مہینے میں ہمارے دل پہ لگا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دسمبر آتے ہی اس کی ٹیس بے چین کرنے لگتی ہے اور میں سوچتا رہ جاتا ہوں کہ آخر ہم مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کب پیدا ہوگا؟ کب تک ہم دشمنوں کے بہکاوے میں آکر اپنوں کے خون سے ہولی کھیل کر اپنا ہی گھر جلاتے رہیں گے، آخر کب تک؟

معراج رسول

نابینا بینا

سرگزشت

ابھی عمر ہی کیا تھی۔ چار سال ہی کا تو تھا۔ چیچک نکلی اور ایک آنکھ بصارت سے محروم ہوگئی۔ اسے تو اس کمی کا احساس بھی نہیں تھا لیکن والدین پر قیامت گزر گئی لیکن پھر بھی یہ تسلی تھی کہ دیکھنے کے لیے ایک آنکھ تو موجود ہے۔ ذرا بڑا ہوا تو دوسری آنکھ بھی جاتی رہی۔ اب وہ اتنا بڑا ہوگیا تھا کہ اپنے اندھے پن کو سمجھ سکتا تھا۔ یہ اندھیرے اس کے دل تک اتر گئے۔ وہ اداس رہنے لگا۔ اس کے والدین بھی اس کے مستقبل سے پریشان ہوگئے لیکن جلد ہی ان پر انکشاف ہوا کہ قدرت نے ایک نعمت چھین کر اسے دوسرا انعام عطا کر دیا ہے۔ اس پر حافظے کے دروازے کھل گئے ہیں۔ جو سنتا ہے ہمیشہ کے لیے یاد کر لیتا ہے۔ اسے پوری کتاب سنائی گئی اور اس نے لفظ بہ لفظ دُہرا دی۔ بس پھر کیا تھا۔ اس کی کمزوری طاقت میں بدلنے لگی۔ دس سال کا تھا کہ دینی اور نصابی علوم کی تکمیل کر لی۔ پھر وہ حلب چلا گیا۔ بہترین اساتذہ سے لسانیات اور حدیث کا درس لیا۔ اس کی عمر چودہ سال کی تھی کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کی زبان سے مرثیے کے اشعار خود بہ خود جاری ہوگئے۔ اس پر انکشاف ہوا کہ وہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے۔ وہ باقاعدگی سے شاعری کرنے لگا لیکن روح کی تسکین کے لیے اسے کچھ اور درکار تھا۔ وہ تحقیق کی جانب متوجہ ہوا۔ بیس سال کی عمر میں جب وہ وطن لوٹا تو فارغ التحصیل ہو چکا تھا۔ 1008ء میں اس نے بغداد کا سفر کیا۔ یہاں پہنچتے ہی وہ ایک مسجد میں گوشہ نشیں ہوگیا۔ صرف اس وقت مسجد سے نکلتا تھا جب اسے عبدالسلام مصری کے درس میں شریک ہونا ہوتا تھا۔ بغداد میں رہتے ہوئے ایک سال ہوگیا تھا کہ ناداری سے تنگ آکر بغداد چھوڑ دیا اور ایک مرتبہ پھر وطن کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ راستے میں تھا کہ اسے والدہ کی وفات کی خبر ملی۔ دنیا کی بے ثباتی کا ایسا اثر دل پر ہوا کہ گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ گوشت، انڈے اور دودھ کا استعمال چھوڑ دیا۔ اب اس کا گزارہ جو کی ایک روٹی پر تھا۔ اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی لیکن وہ مرجع خلائق بنا ہوا تھا۔ علم و حکمت کی شائق عالمِ اسلام کے کونے کونے سے اس کے پاس کھنچے چلے آرہے تھے۔

سیاسی اعتبار سے یہ دور نہایت پُرآشوب تھا۔ فاطمیوں کے حملوں نے حکومت کی شان و وقار کو داغ لگا دیا تھا۔ صالح بن مردان نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ حلب کو تاراج کیا اور معرۃ النعمان کا محاصرہ کر لیا۔ وہ یہیں گوشہ نشینی اختیار کیے بیٹھا تھا۔ اہلِ شہر اس کے پاس فریادی بن کر آئے اور خوشامد کی کہ وہ صالح کے پاس جائے اور اس سے محاصرہ اُٹھانے کی سفارش کرے۔ اس نابینا عالم نے ایک آدمی ساتھ لیا اور صالح کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اس انداز سے دنیا کی ناپائیداری پر تقریر کی کہ صالح تھر تھر کانپنے لگا۔ نہ صرف محاصرہ اُٹھا لیا بلکہ شہر کا نظم و نسق اس کے حوالے کر دیا۔ وہ شہر کا مالک ہوگیا تھا۔ بہت سی نعمتوں اور نوکر چاکروں کا آقا لیکن اس نے اپنی روش کو ترک نہیں کیا۔ فقیروں کا لباس بدن پر، جو کی روٹی غذا۔ اپنے نائب مقرر کر دیے تھے جو نظم و نسق سنبھال رہے تھے۔ اس کے صرف مشورے تھے۔ زندگی کی تلخیوں نے اس کے خیالات کچھ عجیب سے کر دیے تھے جو نہ تو عام لوگوں کی سمجھ میں آسکتے تھے نہ ہر ایک کے لیے قابلِ عمل تھے لیکن وہ ان خیالات کو دوسروں پر تھوپنے کا قائل نہیں تھا۔ اس نے زندگی بھر شادی نہیں کی۔ اولاد پیدا کرنے کو گناہ سمجھتا تھا۔ ہر قسم کے پرندے کے شکار کو حرام کہتا تھا۔ عورتوں کا بدترین مخالف تھا۔ موت سے قطعی خائف نہیں تھا بلکہ اسے [illegible] کہہ کر قہقہہ لگاتا تھا۔

اس کی یہ باتیں اتنی عجیب تھیں کہ بعض لوگ اسے کافر، زندیق کہنے لگے تھے جبکہ کچھ لوگ ولی اللہ کہتے تھے اور اس کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کو عین سعادت سمجھتے تھے۔ تصوف کی دنیا میں اس کے پرستار اب بھی موجود ہیں۔ حضرت علامہ اقبال نے [illegible] نظم لکھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے بے شمار کتابیں لکھیں۔ ان تصانیف میں سے بہتر کتابوں کی نشاندہی [illegible] نایاب ہیں۔

اس عرب شاعر اور عالم کا نام ابوالعلا المعری تھا جو 362ھ میں معرۃ النعمان میں پیدا ہوا اور 1057ء کو وفات پائی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہرِ خیال

☒ **رانا محمد سجاد** نے نواں شہر، مظفر گڑھ سے لکھا ہے ''اس بار بھی انکل معراج صاحب آزادی کی اہمیت کا احساس دلاتے نظر آئے۔ بلاشبہ وطنِ عزیز کے حصول کے لیے اس قوم نے بے شمار قربانیاں پیش کی ہیں۔ کتنے شہیدوں کا لہو اس ارضِ پاک کی بنیادوں میں جذب ہے۔ لیکن پھر وہی بات کہ اربابِ اقتدار نے اس کو اپنی چراگاہ سمجھا ہے جو اس ملک کے لوگوں میں تبدیلی لانے کی بجائے اپنے حالات میں تبدیلی لانے میں کوشاں ہیں اور جو اس کو سنوارنے، نکھارنے اور اس کو آگے بڑھانے کا عزم لے کر آگے بڑھے، ان کے ساتھ ایسا بُرا سلوک کیا گیا جو کہ قابلِ مذمت ہے۔ وہ مسائل جن کو کافی عرصہ پہلے حل کر لینا چاہیے تھا ہم ان کو حل کرنے کا کوئی قابلِ عمل حل ہی تلاش نہ کر سکے ابھی تک۔ بجلی کے مسئلے کو دیکھ لیجیے، اعلیٰ عدلیہ نے کرائے کے بجلی گھر کے بارے میں سماعت کرتے ہوئے کہا کہ 67 ارب روپے خرچ کرنے کے باوجود 100 میگاواٹ بجلی حاصل ہوئی ہے، باقی کا پتا نہیں اور گیس کے بارے میں ایک وزیر نے قوم کو ''خوشخبری'' سناتے ہوئے کہا کہ سردیوں میں شدید لوڈشیڈنگ ہوگی اور انکل نے جس خطرناک مسئلے کی طرف اداریہ میں توجہ مبذول کروائی، واقعی ایک انتہائی خطرناک اور شرمناک صورتِ حال ہے۔ جب محافظ ہی لٹیروں کی شکل اختیار کر لیں تو کس سے گلہ کرے کوئی۔ کہا جاتا تھا پہلے کہ تنخواہیں اتنی قلیل ہیں کہ ان کا گزارا نہیں ہوتا لیکن اب تو تنخواہیں بھی بڑھ چکی ہیں پھر بھی یہ صورتِ حال ہے، کیا کہیں اب...... اور اس کے ساتھ ساتھ قومی کھلاڑیوں نے کس طرح ملکی عزت و وقار کو داؤ پر لگایا۔ یقین جانیے کہ جب اخبارات میں اس کی تفصیل پڑھ رہے تھے تو خون کھول رہا تھا۔ ایٹم شناس میں سائنس دان دمقراط کا احوال پہلی بار پڑھا، حیرت ہوئی کہ اس دور میں یہ نظریات پیش کیے گئے؟ اس کے ساتھ ہی شہرِ خیال میں دستک دی، سب سے پہلے ایم اے خالق بھٹی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ تبصرہ پر آپ کے خیالات کا شکریہ۔ شہرِ خیال میں ایک اور ساتھی اپنی خوشی میں ہمیں شامل کر رہے تھے، جناب رانا شاہد صاحب، رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئے، اللہ آپ کو اور آپ کی شریکِ حیات کو اس نئے رشتے سے وابستہ تمام خوشیاں عطا فرمائے، آمین۔ افتخار احمد گھمن، سعید احمد چاند، خالد کبیر آپ کے تبصرے پر پسندیدگی پر ازحد مشکور ہوں۔ آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے شہرِ خیال میں شرکت کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ عبدالرشید صاحب، وعلیکم السلام۔ جی اے مغل روایت شکن تبصرے کے ساتھ آئے۔ سلطان مسعود احمد کا خط کافی سنسنی لیے ہوئے تھا۔ اُڑن طشتری ہمارا پسندیدہ موضوع ہے۔ ادارے سے پہلے بھی درخواست کی تھی، مکرر عرض ہے کہ اس پر تفصیلی لکھوایا جائے۔ شہرِ خیال میں نئے ساتھی الف۔ جیم صدیقی کی آمد ہوئی، جناب خوش آمدید۔ احمد خان توحیدی کا تبصرہ پسند آیا۔ طاہر الدین بیگ، اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ اعجاز حسین سنہار کا تفصیلی تبصرہ پڑھا، آپ کی شہرِ خیال سے محبت قابلِ تحسین ہے جو اتنا طویل تبصرہ کرتے ہیں۔ ملک جاوید خان، آپ کا تبصرہ مختصر تھا، تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضری دیجیے گا آئندہ۔ سدرہ بانو ناگوری صاحبہ، نثر میں شاعری کر رہی تھیں۔ ہم آپ کے خیالات سے سو فیصد متفق ہیں۔ محمد فیضان غنی، جناب شہرِ خیال میں خوش آمدید۔ ہمیں خوشی ہے کہ طالب علم بھی اس معیاری ڈائجسٹ کا حصہ ہیں۔ آپ باقی ساتھیوں کو بھی اس طرف مائل کریں۔ محترم انور اعجاز خان صاحب کا کیا حال ہے، اس حوالے سے کوئی اطلاع ہو تو ضرور دیجیے گا۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔ روبینہ نفیس ثاقب، آپ کہاں چلی گئیں، کافی عرصے سے خیر خبر ہی نہیں، آپ کا بھائی آپ کو یاد کر رہا ہے جلد از جلد اپنی خیریت سے مطلع فرما کر شکریے کا موقع دیں۔ قرۃ العین زینب ایڈووکیٹ، آپ کب حاضری دے رہی ہیں؟ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے سراب کی طرف بڑھے۔ ہمیشہ کی طرح خوبصورت اور سنسنی خیز فلمی الف لیلہ آفاقی صاحب نے شمی کپور، بے بی حسنہ، تسلیم فاضلی، ڈاکٹر عبدالسلام، سہیل ظفر، نذیر صاحب کا تذکرہ کیا۔ کپور خاندان میں سے رشی کپور اور ان کے بیٹے رنبیر کپور کے بارے میں آفاقی صاحب تحریر کریں، یہ ٹھیک ہے کہ ماضی کو فراموش نہیں کرنا چاہیے لیکن حال کو بھی نظر انداز کرنا ٹھیک نہیں۔ حال ہی میں شعیب منصور صاحب کی فلم ''بول'' منظرِ عام پر آئی، ابھی تک دیکھی تو نہیں لیکن تعریف بہت سنی ہے، اس کے بارے میں بھی کچھ تحریر کریں۔ گل تازہ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی خوبصورت تحریر لیکن جلدی جلدی واقعات کو سمیٹا گیا۔ ترقی پسند تحریک کے حوالے سے ایک اور نام حمید اختر ہم سے بچھڑ گئے۔ راکھ کا آسیب ابن کبیر کی اچھی تحریر تھی، یہ حضرت انسان کے لیے ایک سبق ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس کا غلام سمجھے۔ زلفی شاہ کی سملی ڈیم نے کوئی خاص مزہ نہیں دیا۔ ''سُر کا بادشاہ'' زین مہدی کی ایک خوبصورت تحریر۔ جگجیت سنگھ غزل کی دنیا کی بادشاہ، ویسے اتفاق ہے کہ ان کے بارے میں کوئی خاص علم نہیں تھا۔ تفصیلی تعارف ہوا۔ ان کی تصاویر نے تحریر کو اور دلکش بنا دیا۔ عزم محکم، عبدالرب بھٹی صاحب غالباً دو یا تین ماہ بعد حاضر ہوئے ہیں۔ واقعی فرینک کے پختہ ارادے نے اس کو زندہ رکھا۔ نشان، سید احتشام کی تحریر تھی۔ رسل نے درندگی کا

مظاہرہ کرتے ہوئے ایک چراغِ حیات گل کر دیا اور ساتھ ساتھ مغربی پولیس کی کارکردگی بھی مثالی رہی۔ شمارے کی ایک اور دلچسپ تحریر مریم کے خان کی انکار تھی۔ غالباً خواتین کی ایڈونچر سے بھرپور مہم جوئی کی یہ پہلی تحریر تھی، بہت پسند آئی۔ سفرنامہ امریکا او امریکا دلچسپ جا رہا ہے۔ سچ بیانیوں کے حوالے سے اور بعد میں پہلے بیت بازی، قاری سطوت جاہ کا شعر پسند آیا۔ جہاں آرا بیگم والی علمی آزمائش میں میرا جواب ٹھیک تھا لیکن نام نہیں تھا۔ اب کی بار سچ بیانیاں کوئی خاص نہیں تھیں۔ ڈائری ایک فضول تحریر تھی، خواہ مخواہ مزاح پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ میک اے وش میں ارشد نے ایک خوبصورت طریقے سے نواز شاہ میں احساس پیدا کیا۔ نازو والے فیاض الحسن ناموں کے الٹ پھیر میں واقعی ایک غلطی کر بیٹھا لیکن نہیں، یہ غلطی نہیں بلکہ اسے ایک نیک اور ہمدرد شریکِ حیات مل گئی۔ چاہت کے رنگ، بلو نے کتنی آسانی سے اپنے مالک کو بے وقوف بنا لیا۔ سونے کے کنگن ایک اداس کر دینے والی تحریر تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس درندے پر لعنت کہ جس نے اس معصوم بچے کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔''

☒ **ریما اور کشف** کا ای میل ''میرا نام ریما اور بہن کا کشف ہے۔ ہم نے ابھی کچھ ہی دنوں پہلے سرگزشت پڑھنا شروع کیا اور اب پرانے شمارے بھی پُرانی کتابوں والوں سے خرید کر پڑھ رہے ہیں۔ کئی دن قبل مارچ 2008ء کا ایک شمارہ ہاتھ لگا۔ اس میں ایک سچ بیانی تھی ''وحشت'' اس کی راوی ہیں سعدیہ رحیم، انہوں نے سچ بیانی کے آخر میں اپنے ساتھی عارف کے بارے میں رائے مانگی تھی۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان کا کیا ہوا؟ اگر اس معاملے میں آپ ہماری رہنمائی کریں تو ہم شکر گزار ہوں گے۔'' (وحشت ڈاک سے موصول ہوئی تھی۔ راوی نے بعد میں ہم سے رابطہ نہیں کیا)

☒ **ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری** کا بھکر سے ای میل ''پُراسراریت نمبر کے لیے ایک سچ بیانی ارسال کر رہی ہوں۔ اگر نمبر کے معیار کی ہو تو اسے ضرور شامل کریں۔ ان دنوں میں علیل ہوں، صحت یابی اور رحمت باری تعالیٰ کے لیے دعا کریں۔ شہرِ خیال میں سب کے تبصرے اچھے لگے، اس بار تو مجھے سب نے بھلا دیا۔ کم از کم آپ سب سے یہ امید نہ تھی۔ سعید چاند، کچھ زیادہ ہی خوش نظر آئے۔ راجا ثاقب دوسروں کی باتیں چھوڑیں، آپ اپنی بتائیں کہ آپ کا ارادہ کتنی شادیاں کرنے کا ہے؟ اعجاز حسین، انسان بعض دفعہ بہت کوشش کے باوجود بھٹک جاتا ہے۔ پر اللہ پاک بہت مہربان ہے، وہ تو ہمارے ہر قدم پر ہوئے گناہوں کو بھی معاف کرتا ہے ورنہ تو ہمارے اعمال ایسے نہیں۔ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے آج اتنا ہی۔ ایک ڈائجسٹ میں پڑھا کہ پرویز بلگرامی صاحب کے بیٹے علیل ہیں، اللہ پاک ان کو صحت یاب کرے۔''

☒ **عروج شاہد** نے کراچی سے لکھا ہے ''ہمارے گھر ماہ نامہ سرگزشت باقاعدگی سے اور بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ جناب علی سفیان آفاقی کی تحریر کردہ فلمی الف لیلہ خاص طور پر میرے والد صاحب کی دلچسپی کا سامان ہوتی ہے۔ میرے والد صاحب کہتے ہیں کہ آفاقی صاحب کی تحریر انہیں Down the Memory Lane لے جاتی ہے، ان کا کہنا ہے کہ آفاقی صاحب نے اب تک پاکستان میں دلیپ کمار کے ہم شکل اداکار حنیف کے بارے میں کچھ نہیں لکھا لہٰذا منتظر ہیں کہ آفاقی صاحب اس بات کو نوٹ کر کے اداکار حنیف کے بارے میں جلد ہی ضرور تحریر فرمائیں گے۔ اس بات سے بھی خوشی ہوگی اگر کوئی اور باذوق قاری اداکار حنیف کے بارے میں اپ ڈیٹ کر سکے۔''

☒ **بشیر احمد بھٹی**، فوجی بستی بہاولپور سے رقم طراز ہیں ''اکتوبر کے سرگزشت میں ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی کامیڈین نے تصوراتی پردے پر اچھا تاثر چھوڑا۔ وہ اِک لمحہ ایک بہترین کہانی ہے۔ جمیل اختر صاحب کی کہانی حیران کرنے والا نے ورطۂ حیرت میں غوطہ زن کر دیا۔ بہزاد علی کی فرشتہ بہترین کاوش ہے۔ علی سفیان آفاقی کا فلمی الف لیلہ ایک دلربا سلسلہ ہے۔ ویسے اس سلسلے میں بڑے بڑے رازوں سے پردہ اُٹھ رہا ہے۔ فلم اسٹار فردوس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اوڈنی ہے۔ اوڈ برادری سے تعلق ہے۔ کراچی میں وہ اینٹیں سر پر رکھ کے ایک بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی کہ فلم اسٹار اکمل کی نگاہ پڑی اور وہ اسے فلموں میں لے آیا۔ جولائی 2010ء کے سرگزشت میں فلمی الف لیلہ پڑھ کر پتا چلا کہ فردوس کا تعلق لاہور کے بازارِ حسن سے تھا۔ شباب کیرانوی صاحب نے انہیں فلموں میں متعارف کرایا۔ سرگزشت کے فلمی الف لیلہ نے حقائق پر مبنی رپورٹس سے عوامی خام خیالیاں دور کر دی ہیں۔ فلم اسٹاروں کے من گھڑت قصے جو عوام میں پھیلے ہوئے ہیں، فلمی الف لیلہ حقائق کو سامنے لا کر ان فرضی کہانیوں کا خاتمہ کر رہا ہے۔ جہاں شمع ہوتی ہے وہاں پروانے تو ہوتے ہیں، فردوس کو قدرت نے بلا کا حسن عطا کیا تھا۔ اگر یہ اداکارہ مقابلۂ حسن میں حصہ لیتی تو حسینۂ اوّل کہلاتی۔ سرگزشت کی آخری کہانی برق رفتار بھی اچھی رہی۔ آپ کو ایک کہانی بھیجی تھی، عنوان تھا چارہ، اس کہانی کا کیا ہوا؟ ردی کی ٹوکری نے ہڑپ کر لی یا اپنے نمبر کی منتظر ہے؟'' (افسوس صد افسوس، وہ کہانی سرگزشت کے مزاج کی نہیں تھی)

☒ **انجینئر محمد شاہد عالم** کا مکتوبِ خاص، وہاڑی سے ''جب میں کلاس 8 میں تھا تب سے سرگزشت میرے مطالعے میں ہے۔ (یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی) مجھے ڈاکٹر ساجد امجد کے وہ مضامین جو انہوں نے صوفیوں پر لکھے تھے بہت پسند آتے تھے۔ میں نے گزارش بھی کی تھی کہ ایسے مضامین [illegible] رہیں۔ اس بار خط لکھنے کا مقصد ایک کہانی ہے جو ایک انگلش فلم پر مبنی ہے۔ اس فلم کی سی ڈی بھیج رہا ہوں۔'' (آپ کی بھیجی ہوئی CD دیکھی، وہ کہانی [illegible] مذکور مصنف سے بھی جواب طلب کیا۔ انہوں نے بھی انٹرنیٹ کے تراشے اور دیگر مواد بھیجے۔ سب کو ملا کر پورے بورڈ نے غور کیا۔ اس کہانی میں [illegible] ضرور ہیں جو فلم سے ملتے جلتے ہیں اور بقول مصنف کے یہ سچ ہے پھر بھی مصنف کو وارننگ دے دی گئی ہے۔ آپ کا بھی بہت شکریہ کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ نے توجہ دلائی۔ ہم اپنے قارئین سے یہی امید رکھتے ہیں کہ جہاں کوئی قابلِ گرفت بات نظر آئے، ہمیں ضرور مطلع کریں)

☒ **حسنین عباس بلوچ**، سرگودھا سے رقم طراز ہیں ''اس ماہ کا سرگزشت 20 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل بہت ہی عمدہ و اعلیٰ تھا۔ کرسیٔ صدارت سے لے کر تمام خطوط دوستوں کے قابلِ دید تھے۔ میری طرف سے تمام حاضرینِ محفل کو سلام دعا، قبول ہو۔ سب سے پہلے سراب کے لطف سے سیراب ہوئے۔ بڑی پرفیکٹ اسٹوری ہے۔ عرصہ پانچ برس سے بس اس ایک ہی اسٹوری کی بدولت ڈائجسٹ منگواتے ہیں اور اپنے پیسے پورے کرتے ہیں۔ دیگر کہانیاں بھی تمام معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں۔ بیت بازی میں بھی بڑا مزہ آتا ہے۔ میرے کچھ ساتھی جو کہ اس وقت دوسری جیلوں میں اسیر ہیں، جدا ہو گئے۔ شہباز احمد منا، ظفر اقبال، جاوید ملک، رمضان جٹ، علی اصغر یہ تمام ساتھی بڑی محبت سے ڈائجسٹ منگواتے اور پڑھتے ہیں۔ ان کی خدمت میں سلام۔ آپ سب حاضرینِ محفل سے گزارش ہے کہ ہمارے ساتھی بھائی مناظر علی گوندل کا کیس ہائی کورٹ میں سماعت ہو رہا ہے، ان کے ماں باپ بھی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ سب نیک تمناؤں، دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔ اللہ کرے کہ اس کی اسیری آزادی میں تبدیل ہو، آمین۔''

☒ **افتخار احمد گھمن** کا خلوص نامہ، لاہور سے ''ایٹم شناس میں یونانی فلسفی مفکر دمقراط کا مختصر تعارف ہوا۔ شہرِ خیال میں ایم اے خالق بھٹی اپنے تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ رانا محمد شاہد، سعید احمد چاند، راجا ثاقب نواز ثاقب اور سرگزشت کے تجزیہ کار خالد کبیر بھی غیر حاضری کے بعد موجود تھے، تبصرہ خوب لکھا۔ ان کے سالانہ تجزیے کا انتظار ہے گزشتہ برس سالانہ رپورٹ خوب لکھی تھی۔ پہلے یہ کام ہمایوں دین پوری کیا کرتے تھے۔ ان کی کچھ خیر خبر نہیں، کہاں ہیں؟ رانا محمد سجاد، سلطان مسعود، اکبر بیگ، طاہر الدین بیگ اور اعجاز حسین سٹھار طویل تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ پروفیسر احمد علی کے حالاتِ زندگی پڑھنے کو ملے۔ افسوس کہ ہم نے ان کی قدر نہ کی۔ ابن کبیر کا راکھ کا آسیب میں ایک قدرتی آفت کا ذکر ہوا جس کے آگے جدید ٹیکنالوجی والے بھی بے بس نظر آئے۔ سملی ڈیم پر معلوماتی مضمون تھا۔ مشہور بھارتی گلوکار جگ جیت سنگھ کی مختصر داستان بھی پڑھی۔ خوفناک بھینسا میں بھینسے کے شکار پر کہانی پڑھی، یہ بھینسے تو شیر اور چیتے سے بھی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ بڑا اڑیل ضدی قسم کا جانور ہے۔ عزم محکم میں ایک شخص کی داستان جسے قدم قدم پر موت کا سامنا کرنا پڑا مگر اپنے عزم سے بالآخر مشکلات سے گزرا۔ پراسراریت نمبر 2 آیندہ سال کا پہلا شمارہ ہوگا، یہ پڑھ کر بہت خوشی ہے کہ زیادہ انتظار کرنا نہیں پڑا۔ امید ہے اس کے مضامین بھی دلچسپ اور معیاری ہوں گے۔''

☒ **راجا ثاقب نواز ثاقب** کا اظہارِ خیال، ساہیوال سے ''نومبر کے سرگزشت کی آمد کے ساتھ ہی وطنِ عزیز کی ہر گلی، محلّے اور کوچے میں جیسے الیکشن میں ہر طرف آوے ہی آوے کی صدائیں گونجتی ہیں، بالکل ایسے ہی ''میں...... میں، بھیں...... بھیں بھاں...... بھاں'' کی آوازیں بچوں اور بڑوں کے شور و غل میں سنائی دیں گی۔ دیکھا جائے تو بکرے اور لیڈر دونوں ''میں...... میں'' کی گردان کرتے رہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بکرے قربان ہو جاتے ہیں اور لیڈر عوامی امیدیں قربان کرتے ہیں۔ رہی عوام تو وہ سدا کی ٹھہری اللہ میاں کی گائے، جہاں چاہے ہانک دو۔ معراج رسول جی کو داد اور دعا دیتے ہوئے اور ایٹم شناس سے ملاقات کرتے ہوئے شہرِ خیال میں وارد ہوئے۔ افتخار احمد گھمن، سعید احمد چاند، عبدالرشید خاں، خالد کبیر، رانا محمد سجاد اور اکبر بیگ، جرمنی نے میری حوصلہ افزائی کی ہے اور شاید وہ یہ نہیں جانتے کہ اگر آج میں باقاعدہ طور پر سرگزشت فین کلب کا ممبر ہوں تو اس میں سارا کمال سرگزشت کی اعلیٰ ٹیم کا ہے۔ گلِ تازہ میں جہاں پروفیسر احمد علی نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار سے متاثر کیا، وہیں پر خیر سے پی ٹی وی نے اپنی روایات بھی قائم رکھیں۔ راکھ کا آسیب میں تو جیسے انسانی زندگی کو مفلوج ہی کر ڈالا۔ سملی ڈیم میں یقیناً اہالیانِ پاکستان کے لیے ڈیم کا لفظ نیا ہوگا۔ خوفناک بھینسا کو اگر ماجو قصائی کے حوالے کر دیا جاتا تو اتنے خوفناک حالات پیدا ہی نہ ہوتے۔ سُر کا بادشاہ ہندوستان کے شہنشاہ غزل جگجیت سنگھ کے حالاتِ زندگی کا احاطہ کرتی ہوئی مختصر مگر جامع ثابت ہوئی۔ فلمی الف لیلہ میں اب کی بار آفاقی صاحب نے زیادہ تر پاکستانی فلموں اور ڈاکٹروں کی روداد سنائی، البتہ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کپور خاندان بھی موجود تھا۔ عزم محکم میں فرینک کی بہادری اور جرأت کو داد دینا ہوگی۔ نشان میں درندہ صفت رسل کے لیے تو پھانسی کی سزا بھی کم تھی۔ انتظار میں تو جیسے چارلی انجلز ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ انکل کولمبس کی تاریخی غلطی، امریکا کی سیر امریکا او امریکا میں ہنوز جاری و ساری ہے۔ سراب میں شہباز روزینہ کے ہاتھوں قربانی کا بکرا بننے سے بال بال بچ گیا۔ ڈائری میں منظر امام نے ایک بہت پیچیدہ روداد کو ہلکے پھلکے انداز میں پیش کر دیا۔ گردابِ زندگی میں شمسہ نے جب تک اپنے محسن عدنان کی ایک جذباتی غلطی کو معاف کیا، اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ میک اے وش میں تو ارشد فرشتہ ثابت ہوا۔ ناز والے میں صائمہ ناز کے لیے میری خدمات حاضر ہیں۔ (بغیر مٹھائی کے ڈبے کے؟) چاہت کے رنگ کے بارے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ اس بچ بچی کو دل پھینک مردوں کی پہنچ سے دور رکھیں۔ پَل کی خبر نہیں کے اختتام نے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ سونے کے کنگن کو بلاشبہ اسٹوری آف دی منتھ کہا جا سکتا ہے۔ محسنہ میں سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو ذبح کرنے کی کوشش مہنگی پڑ گئی۔ جہدِ مسلسل میں بانو لڑکی تھی کہ چھلاوہ؟ لڑکوں والے کھیل، کھیل رہی ہے، درختوں پر چڑھ رہی ہے، یتیم ہو رہی ہے، چودھری سے ٹکر لے رہی ہے، تہ خانے میں قید سے رہا ہو رہی ہے، تیر رہی ہے، ساجد کو زخمی کر کے عزت بچا کر گھر سے بھاگ رہی ہے اور پھر خیر سے ڈاکٹر بھی بن گئی۔ آخری کہانی صدمہ کی حد تک غیر یقینی اور غیر متاثر کن رہی۔ میری طرف سے آپ کو خصوصی طور پر اور سرگزشت کی پوری ٹیم کو مجموعی طور پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے عیدِ قرباں کی مبارک باد۔''

☒ نامعلوم مقام سے **نامعلوم** قاری کا خط جو اپنا نام پتا بھی لکھنا بھول گئے، لکھتے ہیں ''خطوط بھی تحریر کیے، اظہار بھی کیا لیکن خط پوسٹ ہونے سے رہ گئے۔ پُراسراریت نمبر پڑھا لیکن سچ بیانیوں کی تشنگی برقرار رہی۔ پُراسراریت نمبر اپنی جگہ لیکن ایسے قصے، واقعے ہم سنتے ہیں اور سچ بیانیوں میں ہمارے لیے ہر ہر لفظ میں ایک سبق چھپا ہوتا ہے۔ اور پھر سرگزشت کی سچ بیانیاں، اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ رمضان المبارک، عید مبارک بادیاں، جشنِ آزادی کی مبارک بادیاں، سب دیں آپ سب کو لیکن وہی کہ خط پوسٹ ہی نہیں ہوا۔ (بھئی یہ کیا کہ رسالے پر تبصرہ لکھنے کے بعد پوسٹ نہیں کیا اور ہمیں آپ نے اپنی قیمتی رائے سے محروم رکھا۔ چلیں اس مرتبہ محفل کے اراکین آپ کو معاف کرتے ہیں لیکن اس شرط پر کہ آپ باقاعدگی سے محفل میں شریک ہوتے رہیں گے) اللہ کرے کہ اس دفعہ آپ کو وقت پر ملے تو ضرور شائع کیجیے گا۔ مصیبت یہ ہے کہ بنوں میں سرگزشت 2 یا 3 تاریخ سے پہلے نہیں ملتا، خط لکھنا اس لیے رہ جاتا ہے۔ بہرحال آپ ضرور خط شامل کیا کریں جب بھی ملے۔ کیونکہ ہم ہر لفظ غور سے پڑھتے ہیں اور اس سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ (آپ اسی طرح خط لکھیں کہ 10، 11 تک ہمیں مل جائے) ستمبر کی سچ بیانیوں، ہونی انہونی، پستی بلندی، توبہ، محبت زندہ باد بہت زبردست رہیں اور نامہرباں دھوپ میں سارہ کے وجود سے نفرت ہوئی۔ کتنی خود غرض عورت، ہر قدم پر خود غرضی۔ ٹونی مرد تھا، یہ خود کم عقل تو نہ تھی۔ نسرین کے ساتھ زیادتی اور پھر مراد۔ ٹونی ماں باپ کی اکلوتی اولاد اس نے چھین لی۔ کیوں سارہ جی، آپ جب اتنی مغرور تھیں تو عقل کہاں تھی آپ کی۔ جو لوگوں کو برباد کیا، یہ سزا آپ کی بے حد کم ہے۔ سراب تو اپنی مثال آپ ہے۔ شہباز صاحب نے زرین کے ساتھ وفا کی۔ یاد رکھا۔ زرین کی خواہش پوری کی لیکن زرین کے آنے سے کہانی میں نئے نئے واقعات سامنے آتے رہے خاص کر ڈاکٹر توفیق والی اقساط بے حد زبردست رہیں۔ زرین کی تشنگی بے حد محسوس ہوئی۔ شہباز صاحب التجا ہے کہ مرد ساتھی ڈھونڈا کریں۔ عورتیں ساتھی آپ کو کیوں ملتی ہیں؟ اور سویرا کو دکھ نہ دیا کریں۔ پُرانے دوستوں کی واپسی سے مزہ آیا۔ سفیر، مونا، وسیم، سعدیہ وغیرہ سے بیٹو کا دوست بننا اچھا لگا۔ مونا، سعدیہ کی بے جا ضد کہ ہم بھی یہاں وہاں جائیں گے، یہ غلط ہے۔ اگر زرین بھی اس دن ضد نہ کرتی تو یہ انجام نہ ہوتا۔ اب مونا اور سعدیہ کو بھی سوچنا چاہیے کیونکہ عورت جتنی بھی بہادر ہو مرد کا مقابلہ یا موازنہ نہیں کر سکتی۔ فلمی الف لیلہ میں پُرانے اسٹارز کی تصویریں یاد دیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ ناظم صاحب کے بارے میں پڑھ کر بہت دُکھ ہوا۔ واقعی، کچھ لوگوں کو محنت کا صلہ تقدیر کی وجہ سے نہیں ملتا۔ امریکا او امریکا کو طول نہ دیں۔ امریکا او امریکا کا جواب ہم تحریر مکمل ہونے کے بعد دیں گے۔ ماہ اکتوبر کی سچ بیانیوں برق رفتار اور وہ ایک لمحہ بہت زبردست رہیں۔ ہوانا سے فرار میں مس جولیا کا کردار دلچسپ رہا۔ ڈائجسٹ دکھی لوگ پڑھتے ہیں۔ جو زندگی سے اُکتا جائیں تو ڈائجسٹ ایسے اکیلے لوگوں کا بہترین دوست ہے۔ مزید ہم اس ادارے کے لیے دعائیں ہی دیتے رہیں گے۔ اللہ ہمارے ملک کے ساتھ ساتھ اس ادارے کو بھی دن دوگنی رات چوگنی ترقی دے۔ پاکستانی عوام کو چاہیے کہ تھوڑا صبر کیا کریں، ہمارا ملک بھی انشاءاللہ ترقی کرے گا لیکن اگر اس بے حیائی کی روک تھام ہو جائے۔''

☒ **سعید احمد چاند** کا اظہاریہ، کراچی سے ''اداریہ حالاتِ حاضرہ کے مطابق برمحل تھا۔ دمقراط کے بارے میں پڑھا۔ اس سے پہلے ہمیں اس کے بارے میں کوئی جانکاری نہ تھی۔ پھر شہرِ خیال میں آئے۔ ہر جگہ ہم موجود تھے یعنی تبصرہ نگاروں میں، بیت بازی میں اور علمی آزمائش میں۔ یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ چلو پیسے وصول ہو گئے۔ دیکھو علمی آزمائش میں کب قرعہ اندازی میں ہمارا نام آتا ہے۔ ایم اے خالق بھٹی، پریس کلب کے تو صدر ہیں ہی اب وہ شہرِ خیال کے بھی صدر بنتے جا رہے ہیں، مبارک ہو۔ خالق بھائی، یہ بات نہیں کہ انہیں قلم سے چڑ ہو گئی ہے، ہو سکتا ہے ان کی مصروفیت آڑے آ رہی ہو جو انہیں شہرِ خیال میں آنے سے روک رہی ہو۔ ورنہ ہماری روبی اتنی جلدی ہمت ہارنے والوں سے میں نہیں ہیں۔ ہم تو بس ان کے لیے اتنا ہی کہیں گے، بے وفا ہم نہ بھولے تجھے ساری دنیا نے ہم سے کہا بھول جا۔ ویسے بھائی کچھ بھی ہے، ان کے دم سے شہرِ خیال میں رونق تھی۔ ہم نے انہیں شہرِ خیال کی بیوٹی کوئن کا خطاب ایسے ہی تو نہیں دیا تھا۔ اب سدرہ بانو ناگوری سے امیدیں وابستہ ہیں، دیکھو وہ کب تک شہرِ خیال میں ہمارا ساتھ دیتی ہیں؟ اس دفعہ جویریہ قاضی اور شمع خانم بھی غیر حاضر ہیں۔ عبدالرشید خان صاحب، شکریہ تو جب ہم آپ کا قبول کریں گے جب آپ باقاعدہ شہرِ خیال میں حاضری دیں گے۔ اکبر بیگ، رانا محمد سجاد، جی اے مغل، خالد کبیر، الف جیم صدیقی، احمد خان توحیدی، طاہر الدین بیگ، محمد فیضان غنی، سدرہ بانو ناگوری، ملک جاوید محمد خان سرکانی ورانی، افتخار احمد گھمن، رانا محمد شاہد، راجا ثاقب نواز ثاقب اور جناب ایم اے خالق بھٹی اور اعجاز حسین سٹھار کے تبصرے شہرِ خیال کی جان تھے۔ فلمی الف لیلہ میں آفاقی صاحب نے کھلی پلک میں جھوٹا غصہ کو فلم ''پرنس'' کا لکھا ہے، یہ گانا فلم پروفیسر کا ہے اور ہیروئن وجنتی مالا لکھا جبکہ اس فلم میں ہیروئن کلپنا تھیں۔ ویسے اس دفعہ انہوں نے پرتھوی راج کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے مگر تشنہ ہے، ان کی فلموں وغیرہ کے ناموں کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ کاشف زبیر کی سراب بھی اچھی جا رہی ہے۔ بس اس میں رومانس کا تڑکا لگتا تو اور اچھی رہتی۔ اس دفعہ جو کہانی اچھی لگی، وہ ڈاکٹر ساجد امجد کی گلِ تازہ، ابن کبیر کا راکھ کا آسیب، مزین مہدی کا سُر کا بادشاہ، مریم کے خان کا انتظار، الطاف شیخ کا امریکا او امریکا۔ سچ بیانیوں میں منظر امام کی ڈائری، شمسہ فرخ کی گردابِ زندگی، فیاض الحسن کی ناز والے، اجالا سعید کی جہدِ مسلسل، غزالہ شاہین عبدالقیوم کی سونے کے کنگن اچھی لگیں۔ ویسے سب کہانیاں اچھی ہیں، انتخاب مشکل ہے۔''

☒ **سدرہ بانو ناگوری** کا کراچی سے تبصرہ ''ایم اے خالق بھٹی، آپ کیوں چاہتے ہیں کہ سرورق پر ماڈلز کی تصاویر لگائی جائیں جبکہ آج پاکستان کے ہر دوسرے ڈائجسٹ پر ماڈلز کی تصویر لگائی جاتی ہے لیکن سرگزشت اپنے سرورق کی وجہ سے ان میں سب سے منفرد ہے۔ جس طرح بیرونی دروازے کو دیکھ کر گھر کی اندرونی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اسی طرح سرگزشت کے دلکش اور مصور کی بے انتہا محنت اور لگن سے سجائے گئے سرورق کو دیکھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر سرگزشت کی اندرونی خوبصورتی کا اندازہ بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ اس دفعہ فلمی الف لیلہ مسیحاؤں کے حوالے سے دلچسپ رہی، دکھی لوگوں کی خدمت کرنے والے مسیحا کتنی آسانی سے قیدِ زندگی سے آزاد ہوئے۔ موت تو برحق ہے، ہر شخص کو آنی ہے لیکن کس شان سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے کے مصداق تینوں مسیحا بغیر کسی تکلیف کے رخصت ہوگئے۔ آفاقی انکل نے کتنی بیماریاں پال رکھی ہیں کہ طب یونانی، ایلوپیتھک اور ہومیو پیتھک پر اتھارٹی ہوگئے ہیں۔ اللہ انہیں صحت یابی عطا فرمائے، آمین۔ کبیل ظفر کی طرف سے بعد مرگ آنے والے گڈ مارننگ کے میسج نے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اقبال کا مصرعہ یاد آیا "محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی" سراب پر تبصرہ اس بار نہیں کیا جاسکتا، سوری انکل! کاشف زبیر ہاتھ ہلکا رکھیں۔ گل تازہ پر تبصرہ کیا کروں کہ ادب سے اتنی ہی واقفیت ہے کہ بزرگوں کا ادب کرنا چاہیے۔ امریکا او امریکا میں الطاف شیخ نے کھانوں کے ذکر سے تحریر کا لطف دوبالا کر دیا۔ تحریر کیا پڑھ رہے تھے گویا دسترخوان پر بیٹھے تھے۔ امریکا کے بارے میں سنہرے خواب دیکھنے والوں کے لیے تلخ حقائق بڑھتے ہی جارہے ہیں۔ ہماری نظر میں تو وہ جنت میں رہتے ہیں لیکن انکل بتارہے ہیں کہ وہ پھولوں کی سیج پر نہیں سوتے بلکہ مسلسل جدوجہد میں دن رات ایک کررہے ہیں۔ امریکا میں رہنے والے پردیسی لوگو، تمہاری ہمت کو سلام کہ تمہاری وجہ سے پاکستان کو خطیر زرِمبادلہ حاصل ہورہا ہے اور معیشت کی گاڑی چل رہی ہے۔ مریم کے خان کی انتظار اور عبدالرب بھٹی کی عزم محکم پڑھتے ہوئے سرد لہریں سی محسوس ہوئیں اور بحر منجمد شمالی اور جنوبی کا مطلب اب سمجھ میں آیا، دونوں ہی سرد تحریریں تھیں اور دونوں نے ہی لطف دیا۔ ابن کبیر نے راکھ کا آسیب لکھا، یہ اس لیے منفرد لگی کہ حال ہی کا واقعہ تھا اور اخبار الیکٹرونک میڈیا میں کافی پڑھا تھا لیکن تفصیلات اور وجوہات ایک ہی جگہ اکٹھی کرنا ابنِ کبیر کا کام تھا کہ کہانی کا سا لطف بھی آگیا۔ سچ بیانیوں میں اپنے پسندیدہ رائٹر کی تحریر ڈائری ایک منفرد اور دلچسپ تحریر لگی، پڑھ کر مزہ آیا لیکن اس بات کا بھی بہت افسوس ہے کہ گل نواز کے کرتوتوں کی سزا اس کے جوان بیٹے کو بھگتنا پڑی۔ میک اے وش ایک پڑھے لکھے اور مہذب نوجوان کی موت نے بہت دکھ دیا بقول انکل جب قانون کے محافظ ہی قانون شکنی کرنے لگیں تو اس محکمے کا مصرف کیا رہ جائے گا۔ نواز شاہ جیسے قانون کے رکھوالے اگر اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیں تو بھی ایک پُرسکون زندگی کبھی بھی نہیں گزار سکتے اور آخری سانس تک ان کا ضمیر انہیں ملامت کرتا رہے۔ سونے کے کنگن ایک دل دہلانے والی تحریر تھی کہ مدیحہ کے سونے کے کنگن کی خواہش اسے اس حد تک لے گئی کہ اس کا معصوم اور چھوٹا سا بچہ اس کی اس اندھی خواہش کی بھینٹ چڑھ گیا۔ جہدِ مسلسل اُجالا سعید کی ایک بہترین تحریر ہے کہ اگر اپنی دوست نیلم کی طرح ہمت اور بہادری کا مظاہرہ نہ کرتیں تو شاید ڈاکٹر جیسے عظیم رتبے پر کبھی بھی فائز نہ ہو پاتیں، پَل کی خبر نہیں اور محسنہ بھی اچھی تحریریں تھیں۔"

✉ **ملک جاوید محمد سرکانی درانی** کا خط، براہ زئی، بھچھ سے "نومبر کا سرگزشت پُراسراریت نمبر کے اعلان کے ساتھ ملا۔ ایک مخصوص موضوع کے حوالے سے اس کو خاص نمبر کہنا درست ہوسکتا ہے ورنہ تو سرگزشت کا ہر شمارہ ہی خاص ہوتا ہے۔ ایسے خصوصی شماروں کے لیے میرے خیال میں خاص الخاص کا لفظ ہی استعمال کرسکتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ امید بھی رکھتے ہیں کہ نقشِ اوّل سے نقش ثانی بہرحال بہتر ہی ہوگا۔ شہر خیال میں صدر محفل بننے پر عبدالخالق بھٹی صاحب کو مبارک باد۔ تاہم باقی ساتھیوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ افتخار احمد کھمن، سعید احمد چاند، راجا ثاقب نواز، اکبر بیگ اور محمد عبدالخالق بھٹی، خط کی پسندیدگی پر شکریہ۔ ملک ثاقب نواز اور ناصر حسین رند کی غیر حاضری گراں محسوس ہوئی۔ اس ماہ ڈاکٹر ساجد امجد ہماری خواہش کے عین مطابق ایک اہلِ قلم کی داستان لے کر آئے۔ دعا ہے کہ ان کا قلم اسی روش پر چلتا رہے۔ ابنِ کبیر، ذلفی شاہ، انجم فاروق، بلی سفیان آفاقی، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی، سید احتشام، مریم کے خان، الطاف شیخ اور زین مہدی کے مضامین کی تعریف نہ کرنا بے انصافی ہوگی ورنہ کہی ہوئی بات دہرانے والی بات ہے۔ جگجیت سنگھ عظیم گلوکار تھے، ان کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ جگجیت یعنی فاتح عالم تو نہ بن سکے مگر کئی دلوں کو فتح کرنے والے یعنی دلجیت ضرور تھے اور دلوں کو فتح کرنا دنیا کو فتح کرنے کے مقابلے میں آسان مگر اس سے نہایت افضل اور بامقصد کام ہے۔ اب کچھ بات سرورق کے بارے میں 77-78ء میں ہم نے پہلی دفعہ لوڈشیڈنگ کا نام سنا تھا اور کہا گیا تھا کہ دو سال میں بجلی کا بحران ختم کردیا جائے گا تو ہم نے سوچا تھا کہ یہ دو سال کیسے ختم ہوں گے۔ کیا معلوم تھا کہ زندگی کا ایک بڑا حصہ اسی جبرِ مسلسل میں کٹے گا۔ شاید یہی خیالات مصور شاہد حسین کے بھی تھے جن کا اظہار انہوں نے مٹی کے دیے اور حسینہ کے بالوں میں جھلکتی سفیدی اور جھریوں زدہ چہرہ بنا کر کیا لیکن حسینہ کی آنکھوں میں مایوسی کے بڑھتے سائے نہیں بلکہ امیدوں کی چمک اور لبوں پر ہلکی سی مسکان ہے، چراغ کے گرد پھیلی، گلاب کی پتیاں نوید بہار کا اور بند کواڑوں پر دستک دیتے دو دل ایک خوش آیند مستقبل کا تصور پیدا کرتے ہیں۔ آخر میں دو شکایتیں، بیت بازی کے صفحات پر میرا بھیجا گیا شعر نہیں شائع کیا گیا اور علمی آزمائش میں بھیجے گئے درست جواب کے باوجود نام شامل نہ کرکے ایک امکانی جیت کا موقع ضائع کرنے پر آپ کا شکریہ۔ خط پہنچنے کی آخری تاریخ کون سی ہے؟ (بارہ تاریخ تک پہنچنے والے تبصرے ضرور شامل ہوتے ہیں) پُراسراریت نمبر کے لیے ایک تحریر حکیم کی روح تو آپ نے قبول فرمالی۔ (ابھی حکیم کی روح پڑھی بھی نہیں ہے۔ پڑھنے کے بعد فیصلہ ہوگا کہ وہ سرگزشت کے مزاج کی ہے یا نہیں) اور ہاں، اظہر جمیل صدیقی کے اقتباس بھی خاص طور پر پسند آئے۔"

✉ **طاہر الدین بیگ**، میرپور خاص سے لکھتے ہیں "عید مبارک، آپ سب کو بھی اور اہلِ وطن کو بھی۔ اللہ تعالیٰ سے دلی دعا ہے کہ پاکستان کو صدا قائم اور سلامت رکھے، آمین۔ دمقراط صاحب کو پڑھا، خوبصورت اور معلوماتی تحریر تھی۔ شہر خیال میں کافی دلچسپ اور معلوماتی تبصرے ملے۔ بھٹی صاحب سرفہرست رہے۔ اکبر بیگ جرمنی سے، سخار صاحب تھل سے اور کراچی سے الف، جیم صدیقی صاحب کے تبصرے اچھے رہے۔ الف، جیم اور س لکھ دیتے تو مزہ اور بھی دوبالا ہو جاتا۔ سدرہ بانو ناگوری صاحبہ نے بھی اچھا لکھا۔ سرگزشت سے صنفِ نازک کی دوری کچھ سمجھ میں نہیں آرہی حالانکہ اس میں بہت کچھ ہے جوان کو پسند ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی گل تازہ زبردست اور معلوماتی تحریر، لکھی بھی خوب گئی، ہمارے اور بہت سے پڑھنے والوں کے لیے زبردست معلوماتی تحریر تھی۔ اس ہی کے پڑوس میں ابن کبیر کا راکھ کا ڈھیر ایک خوبصورت اور معلوماتی تحریر کہ اس کرۂ ارض پر کیسی کیسی قیامتیں گزری ہیں اور کس طرح گزری ہیں، زبردست خراجِ عقیدت سرگزشت والوں کو کہ کہاں کہاں سے تلاش کرکے تحریریں اپنے پڑھنے والوں کے لیے حاصل کرتے ہیں، زندہ باد۔ سملی ڈیم اور سر کا بادشاہ اپنی جگہ دونوں اچھی تحریریں تھیں۔ خاص طور پر سملی ڈیم ذلفی شاہ کا وطن پرستوں کے لیے وطن کا تحفہ خوب تھا تو دوسری طرف کالا بھینسا جو ساحلی صاحب نے خوفناک بھینسا لکھا ہے شکاریات کے موضوع پر خوفناک کہانی پڑھنے کو ملی، مزہ آگیا۔ ابھی خوفناک بھینسے کے اثر سے نہیں نکلے تھے کہ بھٹی صاحب ایک اور زبردست تحریر عزم محکم کے ساتھ آئے اور خوب آئے۔ ایک لرزہ خیز تحریر جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے، انسانی عزم واستقلال سے لبریز ایک لرزہ خیز تحریر، جواں ہمت لوگوں کے لیے ایک ولولہ انگیز تحریر۔ اب مریم کے خان کسی سے کم کیوں رہیں، وہ بھی لے آئیں مہم جوئی پر ایک زبردست تحریر، اپنی زندگی کو داؤ پر لگانے والے مہم جو کی کہانی، تہلکہ خیز تحریر ہے۔ محترم آفاقی صاحب تشریف لائے اور ایک بار پھر جانِ بہار اور حسنہ کا ذکر لے کر آئے، ان دونوں کا ذکر ہو اور شوکت رضوی کا نہ ہو، یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔ محترم آفاقی صاحب، رضوی صاحب کی حمایت میں لکھتے ہوئے یہ بھول گئے کہ خود انہوں نے بھی اسی پاکستان کے اسٹوڈیوز میں کئی ایسی فلمیں بنائیں، آخری نشان، باغی، عشق لیلیٰ، انتظار، گھونگھٹ آدمی، سات لاکھ، یہ سب شاہکار فلمیں انہی لوگوں کے ساتھ بنائی گئیں جو شوکت رضوی صاحب کے معیار پر پورے نہیں اُترتے تھے۔ حالانکہ امتیاز علی تاج، خادم محی الدین اور سب سے بڑھ کر نور جہاں یہیں تھیں۔ فلمیں اسٹوڈیو سے نہیں بلکہ عقل اور ہنرمندی سے بنتی ہیں۔ اگر گستاخی نا سمجھی جائے تو عرض کروں کہ یہ سب چیزیں رضوی صاحب بھارت چھوڑ کر آگئے تھے، یہی حال محترم ضیا سرحدی صاحب کا بھی تھا اور وعدہ جیسی سدابہار فلموں کے خالق اپنی شاہانہ طبیعت کی وجہ سے اعلانات سے آگے نہیں بڑھ سکے، یہ ہماری فلمی صنعت کے لیے انتہائی دکھ اور درد کی بات تھی۔"

✉ **میاں محمد زاہد آرائیں** کی کریانوالہ، پنجاب سے تشریف آوری، لکھتے ہیں "سرگزشت کافی عرصے سے زیرِ مطالعہ ہے۔ ہر ماہ اس کی آمد کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ اگرچہ موجودہ ٹی وی، انٹرنیٹ، کیبل کے دور میں مطالعہ کی عادت لوگوں میں کافی کم ہوگئی ہے لیکن پھر بھی سرگزشت کو قارئین کا ایک وسیع حلقہ دستیاب ہے جس کی وجہ سے آپ اور دیگر اسٹاف کی محنت، لگن اور جدوجہد ہے جس کی وجہ سے قارئین تک پسندیدہ اور صاف ستھرا مواد پہنچتا ہے۔ اس پر آپ سب مبارک باد اور ستائش کے لائق ہیں۔ پُراسراریت نمبر اچھا لگا تھا، نئے سال میں بھی آپ نے اس کی نوید دی ہے، جس کا انتظار رہے گا۔ اس بار ایک تحریر نے موڈ آف کردیا۔ براہِ مہربانی ہمارے پیارے سرگزشت کی انفرادیت قائم رکھیں۔ ابنِ کبیر صاحب کی پہلے بھی کئی تحاریر ہماری نظروں سے گزری ہیں، وہ سب اچھی تھیں۔ سفرنامہ امریکا او امریکا بھی اچھا جارہا ہے۔ اس میں کئی چیزیں ہمارے لیے نئی ہیں۔"

✉ پاکستان فلم انڈسٹری کے حوالے سے ایک مستند نام **عزیز میرٹھی** کا سندیسہ، لاہور سے "آپ کا اداریہ ہمیشہ ہی حالاتِ حاضرہ کا بےلاگ تبصرہ اور بے باک تجزیہ ہوتا ہے۔ یہ چشم کشا اور فکر انگیز اداریے، دکھ اور دردمندی سے پُر ہوتے ہیں جن سے ایک محبِ وطن کا جگر جلنے کی بو آتی ہے۔ کمال تحریر یہ ہے کہ بڑے سے بڑے اہم موضوع کو جو کئی صفحات کا متقاضی ہوتا ہے، آپ اس اختصار سے بیان فرماتے ہیں، گویا سمندر کو سیپ میں سماتے ہیں۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ قبلہ! دورِ حاضر کے سلطان سے کوئی بھول نہیں ہوئی، بلکہ جان بوجھ کر ہوسِ اقتدار اور دانستہ طلبِ زر اور ذاتی مفاد کی خاطر لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کررکھا ہے۔ لوگ بھوکے مررہے ہیں اور اربابِ اختیار عوام کے خون سے گلچھرے اڑا رہے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ لوٹے ہوئے سرمائے کو عوامی فلاح و بہبود اور ملکی ترقی پر خرچ کرنے کے بجائے دشمنوں کی حفاظت میں دے کر قوم کو غیروں کا دست نگر بنا رکھا ہے۔ قول صادق ہے کہ بےضمیر اور لٹیرا حاکم کسی باغ سے ایک انار بلاقیمت اپنالے تو لشکر سارا باغ اُجاڑ ڈالتا ہے۔ اللہ عزوجل مملکتِ خداداد پاکستان پر رحم فرمائے، آمین۔ برادر عزیز علی سفیان آفاقی کی فلمی الف لیلہ تو پڑھتا ہی رہتا ہوں مگر اس بار جناب نے قلم سے قطع نظر جو تین ڈاکٹروں کا ذکرِ خیر کیا ہے، خصوصاً ہومیو ڈاکٹر عبدالسلام شیخ کا انتہائی دلچسپ انداز میں تذکرہ کرکے قلم کا جادو جگایا ہے۔ وہ سر چڑھ کر بولا ہے۔ خاکہ نگاری اس تحریر کے لیے بہت ہلکا عنوان ہوگا۔ زبان کی سادگی، بیان کی پُرکاری اور سلاست و روانی تو ان کے گھر کی لونڈی ہے مگر ڈاکٹر صاحب کی جو چلتی پھرتی تصویر کشی اور کردار نگاری کی ہے، اس میں موصوف نے اپنے صحافیانہ اسلوب و انداز کے بجائے ایک ماہر اسکرین پلے رائٹر ہونے کا پورا پورا فائدہ اُٹھایا ہے۔ فصاحت و بلاغت اور صراحت و سلاست کا یہ عالم ہے کہ بیان کا ایک ایک لفظ کاغذ پر حق و صداقت کی مہر بن کر ثبت ہوگیا ہے۔ تصنع اور رنگ آمیزی، مبالغہ اور زیبِ داستان کا کہیں شائبہ تک نہیں۔ آفاقی نے اپنا مضمون قاری کو پڑھایا ہی نہیں، کرداروں کو چشم تصور سے دکھایا بھی ہے۔ دل خوش ہوگیا۔ اللہ اس نازک اندام دوست کو تندرست و توانا اور تادیر سلامت رکھے، تاکہ وہ اپنی نوکِ قلم سے گلستان سرگزشت میں ایسے ہی بوقلموں اور رنگارنگ پھول کھلاتے رہیں۔ پورا پرچہ ابھی دیکھا ہی نہیں۔ صرف یہ دو چیزیں پڑھ کر ہی دامنِ صبر ہاتھ سے چھوٹ گیا اور بے ساختہ قلم تھام کر جو جی میں آیا لکھ مارا۔ گر قبول افتد زہے عزوشرف۔"

✉ **انجم فاروق ساحلی** کا نامہ، لاہور سے "نومبر کا شمارہ ایک خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔ یک مشتی سرگزشت خوب تھی۔ راکھ کا آسیب، عزم محکم، نشان، انتظار اچھی اور دلچسپ تحریریں ہیں۔ باقی پرچہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ فلمی الف لیلہ بھی اچھی جارہی ہے۔ خوفناک بھینسا شائع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے اور فوری معاوضہ بھیجنے کا بے حد شکریہ۔ پُراسراریت نمبر 2 کے لیے انگریزی سے ایک دلچسپ اور حیرت انگیز تحریر کا ترجمہ آپ کی خدمت میں پیش کررہا ہوں۔ امید ہے توجہ فرمائیں گے اور شائع فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں گے۔'' (آپ بھول رہے ہیں کہ فرضی کہانیاں سرگزشت میں شامل نہیں ہوتیں اس لیے معذرت)

☒ **اعجاز حسین سٹھار** کی آمد، نور پور تھل سے ''ملک جاوید سرکانی درانی کا اعتراض ہے کہ تبصرے میں کوئی نئی بات نہیں ہے تو عرض ہے کہ میں گاؤں کا رہنے والا جٹ ہوں۔ تاریخ پڑھنے اور فلمیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا اس لیے اس صنف پر لکھی میری باتیں بے سروپا ہوں گی۔ اپنے پسندیدہ سلسلوں پر میں ہر ماہ تبصرہ لکھتا ہوں، شاید یہی وجہ ہے کہ آپ کی توجہ حاصل نہیں کرسکا جس پر افسوس کا اظہار ہی کیا جاسکتا ہے۔ جن دوستوں نے سراہا ہے اپنی پسند کا اظہار کیا، میں سب کا شکر گزار ہوں۔ سملی ڈیم میں زلفی شاہ رنگ نہیں جما سکے۔ مختصر ہونے کے باوجود بھی مضمون مزہ نہیں دے سکا۔ خوفناک بھینسا منہ کا ذائقہ بدلنے کی اچھی کوشش ہے۔ شکار کے سارے لوازمات موجود ہیں لیکن یہ تصویر بیل کی ہے، بھینسا ہرگز دکھائی نہیں دیتا (ایک بار پھر غور سے دیکھیں، مزید تفصیل کے لیے انٹرنیٹ پر جائیں۔ اسے نیپال کی ترائی میں پاڑاں کہتے ہیں جو بھینسے کی نسل ہے اور سیاہ ہی ہوتا ہے۔ بھینس بھی اسی نسل سے ہے جو پالتو ہوتی ہے) سُر کا بادشاہ کے جگجیت سنگھ کی وفات کا پی ٹی وی پر کافی چرچا رہا۔ ان کے گیت اور غزلیں بھی سنائی گئیں لیکن سچی بات ہے کہ غلام علی کی آواز میں کہیں زیادہ مٹھاس ہے اور انداز بھی دل کو موہ لینے والا ہے۔ اب لگے ہاتھوں ان کا بھی تفصیلاً تذکرہ ہوجانا چاہیے، یہ میری فرمائش ہے۔ 1956ء میں علی سفیان آفاقی نے صحافت میں قدم رکھ دیا تھا بلکہ ''آفاق'' کے اسٹاف ممبر بن گئے تھے اس حوالے سے میں ان کی عمر کا اندازہ لگا تا رہا۔ وہ فلمی دنیا کے عروج وزوال کے عینی شاہد ہیں۔ گزرے پچاس سالوں میں ان کی آنکھوں نے کیا کیا نظارے دیکھے ہوں گے۔ کون کس حلیے میں آیا اور کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ کس نے کامیابیاں، دولت اور شہرت سمیٹی اور کتنے ایسے ہوں گے جو جیسے آئے، اسی حال میں چلے گئے۔ زمانے کی بے ثباتی نے انہیں نگل لیا۔ بس ماضی کی طرف دیکھتے ہیں تو آہ نکل جاتی ہے۔ جب آفاقی بھائی نے اپنے بچپن، لڑکپن اور نوجوانی کے دنوں کا قصہ چھیڑا اور حالات لکھنے شروع کیے تھے تو کتنے شوق سے اور لطف لے کر پڑھتے رہے لیکن نہ معلوم کیوں وہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ نشان، سنسنی خیز، پرتجسس اور دلچسپ کہانی ہے۔ سچی بات ہے، یہ سچ بیانیوں کے برابر کی ہے۔ ایسی کہانیاں ہر ماہ شائع ہوتی رہنی چاہئیں۔ سراب میں وسیم اور سعدیہ کی شادی کی وجہ سے حالات سے یاسیت، مارکٹائی اور گولہ بارود کا پردہ ہٹا تو زندگی پُررونق، شوخ اور نکھری نکھری لگنے لگی۔ کتنے خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں جو اپنے بچوں اور پیاروں کے ساتھ ہنسی خوشی اور تفکرات سے پاک دن گزارتے ہیں۔ اندیشے اور خوف چہروں کی رونقیں چاٹ لیتے ہیں۔ سچ بیانیوں پر کسی بھی رسالے کی بنیاد رکھی جاتی ہے، یہ اکثر قارئین کا پسندیدہ سلسلہ ہوتا ہے۔ معاشرے کے یہ تلخ حقائق ہمیں سوچنے، سمجھنے اور غور کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں اور ہم آسانی سے اپنا محاسبہ کرسکتے ہیں۔ ڈائری میں ندیم اور فریحہ بُرے پھنسے تھے، صاف بچ نکلنے میں ان کی ذہانت کا دخل نہیں ہے بلکہ اسے خوش قسمتی کہا جاسکتا ہے ورنہ حادثات تو تاک میں رہتے ہیں۔ اگر وہ کسی حادثے کا شکار ہوتے تو سب نے یہی کہنا تھا کہ انہیں پرائی آگ میں کودنے کی کیا پڑی تھی؟ مقدر نے انہیں صاف بچالیا جس کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ منظر امام صاحب ٹی وی اور میگزینز کے سینئر لکھاری ہیں، مجھے ان کا یہ انداز نہیں بھایا۔ گرداب زندگی بھی حالات کے تغیرات سے زندگی میں پیش آنے والی پیچیدگیوں کا بیان ہے۔ میک اے وش میں حالات اس ترتیب سے پیش کیے گئے ہیں کہ جوں جوں آگے بڑھتے گئے، دل دھڑکنے کی رفتار بڑھتی گئی۔ ارشد کی بے بسی کا اندازہ لگائیے، وہ اپنی موت کا انتظار کررہا تھا اور بھائی کے قاتل کو سامنے دیکھ کر بھی اسے نقصان نہ پہنچا سکا لیکن خود اس کا ضمیر جاگ اُٹھا تو خود کو قانون کے حوالے کرکے بری الذمہ ہوگیا ہے اور عملی اقدام کرکے عاقبت سنوار لی ہے۔ ناز والے میں دراصل والدین کی مجبوریوں کو موضوع بنایا گیا ہے، کبھی وہ بھی پریشانیوں کے دباؤ سے نکلنے کے لیے چھوٹی موٹی دھاندلی کے مرتکب ٹھہرتے ہیں، ایسے میں انہیں قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ چاہت کے رنگ کی بلوکم عمری میں کتنی چالاک اور منصوبہ ساز ہے، وہ کس بہادری اور مضبوطی سے تن کر کھڑی ہوگئی۔ کل کی خبر نہیں میں مصنف نے اونچی سوسائٹی کو موضوع بنایا ہے۔ میرے بھائی یہاں چھابڑی فروش، ریڑھی والے اور رکشا چلانے والا بھی کئی ایسے منصوبے ذہن میں لیے بیٹھے ہیں، کون ہے جو ترقی کے راستے پر گامزن ہوکر آگے نہیں بڑھنا چاہتا؟ سونے کے کنگن میں لٹیرے صاف بچ گئے اور آزاد ہیں لیکن مدیحہ اور واجد مظلوم ہوتے ہوئے خون کے آنسو رونے پر مجبور ہیں۔ کیسی اُلٹی گنگا چل رہی ہے۔ محسنہ میں ہر کردار اپنی غرض تک محدود ہے۔ سونم کو مدہوشی کے لمحات پر پردہ ڈالنا تھا، بچے کو باپ کا نام مل گیا ہے لیکن اس نے مرغی ذبح کرکے سارے انڈے ایک ہی بار ہتھیانے چاہے اور بددیانتی وخباثت کے بدلے میں ساری عمر کی ذلت حصے میں آئی۔ نیت کا پھل اسی دنیا میں مل جاتا ہے۔ جہدِ مسلسل میں بانو اپنی جواں حوصلگی اور عزم سے معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کرچکی ہیں لیکن دیہاتی زندگی میں اب بھی جہالت کا دور دورہ ہے، ایک لڑکی غلط حرکت کر بیٹھے تو سب پڑھی لکھی لڑکیوں پر الزام آجاتا ہے۔ خدارا، تعلیم ضرور حاصل کرو لیکن اپنی اور خاندان کی عزت پر حرف نہ آنے دو۔''

☒ **سید محمد عظیم شاہ بخاری** کا خلوص نامہ، خان پور کٹورہ سے ''نومبر 2011ء کا شمارہ ختم ہونے کے قریب ہے۔ مصروفیت کی وجہ سے اس بار شمارہ کافی آہستہ آہستہ پڑھ رہا ہوں۔ بہرحال اس بار سرگزشت کی سچ بیانیاں انتہائی لاجواب تھیں۔ منظر امام کی ڈائری بہت لاجواب تھی۔ میں یہ کہانی پڑھ کر حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ گرداب زندگی تو واقعی کسی فلمی کہانی سے کم نہ تھی، بہرحال تھی مزے دار۔ میک اے وش ایک انتہائی جذباتی اور رُلا دینے والی کتھا تھی۔ مجھے سب سے زیادہ متاثر جہدِ مسلسل نے کیا۔ آفرین ہے ایسی باہمت لڑکیوں پر۔ سچ ہے کہ جو خود اپنی حالت بدلنا چاہتا ہو، پھر خدا بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ کاش کہ پاکستان کی ہر عورت بانو کی طرح نڈر اور بہادر ہوجائے۔ سُر کا بادشاہ بہت لاجواب تھی اور جگجیت سنگھ کی اصول

[...]ادیب نے شمارے کے رنگ اور زیادہ نکھار دیے۔ آفاقی انکل سے گزارش ہے کہ جگجیت سنگھ کے بارے میں وہ اپنے تاثرات بھی قلم بند کریں۔ فلمی الف لیلہ بھی اچھی رہی۔ اب میں ذکر کروں گا اپنی سب سے پسندیدہ تحریر کا جو ہے سملی ڈیم۔ سیر پاکستان کا مجھے جنون کی حد تک شوق ہے۔ زلفی انکل کی تحریریں [...] ہاٹ کیک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انکل، آپ اسی طرح محنت کرتے رہیں کیونکہ ابھی آپ کو بہت محنت کرنی ہے۔ ابھی تو پاکستان کے کئی مقامات کو [...] کرکے آپ کو سرگزشت میں سجانا ہے۔ سملی ڈیم کا بس نام سنا تھا، اب اس کے بارے میں کافی معلومات ہوگئی ہیں۔ زلفی انکل، پلیز بلوچستان کے پہاڑی دروں، سرنگوں اور وادیوں کی اہمیت اور جغرافیائی ہیئت کے بارے میں بھی ضرور لکھیں۔ تمام قارئین کو نیا سال 2012ء مبارک ہو۔ رانا محمد شاہد صاحب کو میری طرف سے شادی کی ڈھیروں مبارک باد۔''

☒ **غزالہ شاہین عبدالقیوم** کی حیدرآباد سے حاضری ''نومبر 2011ء کا سرگزشت اپنی آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ نئے سال کا پہلا شمارہ پُراسراریت نمبر 2 ہوگا، یہ نمبر میرا پسندیدہ نمبر ہوتا ہے۔ شہرِ خیال میں بہن بھائیوں کے خطوط سے آراستہ محفل نے دل شاد کیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے سید احمد علی کے بارے میں خوبصورت تحقیقات کے ساتھ سحر افروز بیان تحریر کیا جس نے ہماری معلومات کو ایک نئی روشنی فراہم کی۔ زلفی شاہ کی سملی ڈیم ایک معلوماتی تحریر تھی۔ شکاریات کے رسیا لوگوں کے لیے خوفناک بھینسا انجم فاروق ساحلی کی دلچسپ، سنسنی خیز تحریر تھی۔ فلمی الف لیلہ میں حسنہ اور تسلیم فاضلی کا تذکرہ خوب رہا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی عزم محکم دل دہلا دینے والی تحریر تھی جو منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی رہی۔ کاشف زبیر کی سراب ایک بے مثال انفرادی تحریر ہے جو سرگزشت میں کامیابی سے سفر طے کررہی ہے۔ سچ بیتیوں میں کہانی کا معیار بلند نظر آیا۔ خاص طور پر منظر امام نے ڈائری میں ایک پیچیدہ مسئلے کو شگفتہ انداز میں لکھا۔ میری کہانی شائع کرنے پر آپ کی بہت مشکور ہوں۔ اللہ آپ کے رسالے کو دن دوگنی، رات چوگنی کامیابی سے ہمکنار کرے، آمین۔''

☒ **نزہت ناز** کی سیالکوٹ سے تشریف آوری ''خطوط کی محفل میں بھائی ایم اے خالق بھٹی صدر نشین ہوئے تو لگے ان دوستوں کو آوازیں دینے جو محفل سے غیر حاضر ہیں۔ ایسے لوگوں کی کمی ہم جیسے کبھی کبھی خط لکھنے والے بھی محسوس کرتے ہیں۔ رانا محمد شاہد، راجا ثاقب نواز ثاقب، افتخار کمسن، سعید احمد چاند اور سلطان مسعود احمد، اکبر بیگ کے خطوط خصوصیت کے حامل ہیں۔ سُر کا بادشاہ پُرانی یادیں تازہ کرگیا۔ جب میں کلاس سیون میں تھی، اس دور میں جگجیت کی گائی یہ غزل ''دیواروں سے مل کر رونا اچھا لگتا ہے'' ہر وقت سنا کرتی تھی۔ راکھ کا آسیب بھی پسند آئی۔ سونے کے کنگن از غزالہ شاہین عبدالقیوم اور محسنہ از محمد سلیم اختر بہت پسند آئیں۔''

☒ **افتخار اکبر رندھاوا** کا مکتوب، جہلم سے ''ہر شمارے کی طرح شمارہ نومبر بھی خاص نمبر لگا۔ اس میں شامل تمام کی تمام تحاریر اہم ہیں، کس کس کی تعریف کروں۔ گلِ تازہ ایک پُرانے مصنف کی یادیں تازہ کررہا تھا تو راکھ کا آسیب قدرتی آفات سے دہلا رہا تھا۔ سملی ڈیم ہماری نااہلی پر نوحہ کناں تھا تو خوفناک بھینسا ڈرا رہا تھا۔ سُر کا بادشاہ جگجیت کی آواز اور گیتوں سے بہلا رہا تھا۔ فلمی الف لیلہ ماضی کی سیر کرا رہا تھا۔ کل ملا کر ہر مضمون اپنی جگہ اہم تھا۔ سچ بیانیوں میں سونے کے کنگن اور کل کی خبر نہیں، بہت پسند آئیں۔''

☒ **ایم اے خالق بھٹی** صدر پریس کلب، اللہ آباد ضلع رحیم یار خان کا خط ''اس دفعہ اداریہ میں اپنے حکمرانوں کی نااہلی عیاں تھی۔ مختصر بیتی میں ایٹم کے نظریہ کے بانی دمقراط کا ذکر پہلی مرتبہ پڑھنے کو ملا ہے۔ اس مرتبہ معلوماتی اور زندگی میں حرارت پیدا کرنے والے مضامین کی کہکشاں وافر نظر آئیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی ''گلِ تازہ'' ابن کبیر کی ''راکھ کا آسیب'' زلفی شاہ کی ''سملی ڈیم'' زین مہدی کی ''سُر کا بادشاہ'' علی سفیان آفاقی کی فلمی الف لیلہ۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ''عزمِ محکم'' مریم کے خان کی ''انتظار'' اور خاص کر الطاف شیخ کا سفرنامہ امریکا او امریکا پڑھ کر دل کو سکون، آنکھوں کو ٹھنڈک اور ذہن کو آسودگی ملی ہے۔ گزشتہ دو تین برسوں سے سرگزشت کا جو معیار بنا ہے، اس نے ہمیں دیگر ڈائجسٹوں سے بیگانہ کردیا ہے۔ رانا شاہد کو نکاح مبارک۔ شادی کی دعوت کب کھلا رہے ہیں؟ راجا ثاقب نواز ثاقب، چار بیویوں کے ذکر پر آپ کے منہ میں پانی کیوں بھر آیا ہے۔ خط کی پہلی تین لائنیں متاثر کن تھیں۔ محمد [...] علی کی آمد پر سلام پیش کرتا ہوں۔ ملک جاوید محمد سرکانی، اعجاز سٹھار، سعید چاند، الف۔جیم صدیقی، طاہر الدین بیگ، اکبر بیگ، جرمنی کا اتنی باریک بینی [...] مطالعہ اور تبصرہ متاثر کن ہے۔''

تاخیر سے موصول خطوط: ابرار احمد، سعید امتیاز، نصرت جاوید، شہباز عثمان، نادر افروز، انجم بانو (کراچی) فرحت اللہ بابر، نصیر الدین، کبیر الحسن، [...] (لاہور) فہیم اختر (مظفر گڑھ) شاہد حسن (کوٹ ادو) خاقان خان (ہنگو) ارشد خان (واہ کینٹ) نعمان بٹ (سیالکوٹ) مہوش [...] (بہاولپور) شگفتہ اسحاق (لیہ) زرینہ بزنجو (روہڑی) کلیم اللہ وٹو (العین، یو اے ای) ارتضیٰ حسین (مسقط، اومان)

☆☆☆

نومبر 2011ء کے شمارے میں سُر کا بادشاہ نامی تحریر میں جگجیت سنگھ کے پہلی بار ریڈیو سے آفر آنے کا سال 1940ء چھپ گیا۔ جبکہ اصل میں 1960ء ہے۔ اس سہو پر ہم معذرت خواہ ہیں اور ان تمام قارئین بالخصوص اشفاق مخدومی، راولپنڈی کے شکر گزار ہیں جنہوں نے اس غلطی کی نشاندہی کی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

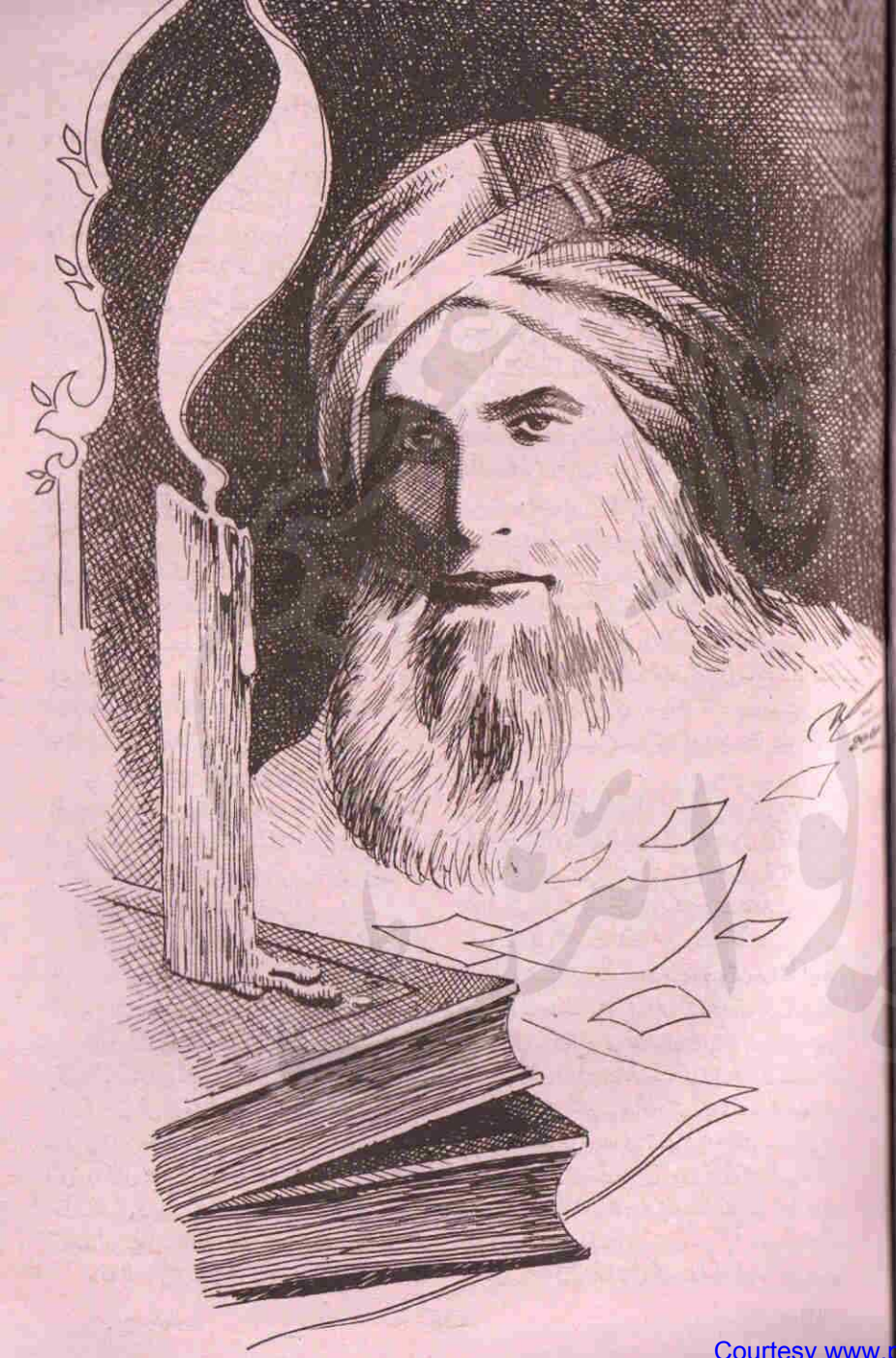

چراغِ فروزاں

ڈاکٹر ساجد امجد

برصغیر صدیوں سے پرورش علم میں کوشاں رہا ہے۔ یہاں بڑے بڑے مشاہیر نے جنم لیا۔ ایسے ایسے اہلِ علم جن کی شہرت سرحدوں کو پار کرکے دور دور تک پھیلی۔ ان کا شمار بھی ایک ایسے اہلِ علم میں ہوتا ہے۔ انہوں نے عوام کے ذہنوں میں انقلاب برپا کردیا تھا۔ بگڑتے معاشرے کی مہار تھام لی تھی، اپنے حلقے میں مصلح کے نام سے پہچانے گئے، آج بھی ان کی کتابیں ہر گھر کی ضرورت کہلاتی ہیں۔

برصغیر کی ایک نابغہ روزگار شخصیت کا زندگی نامہ

وہ خدا سے طلب کرنے کے سوا کسی سے مانگنے کی قائل نہیں تھیں۔ توکل کی اس قدر قائل کہ مانگنا تو بڑی بات، شکایت تک زبان پر نہ لاتی تھیں لیکن ایک روز بھائی کے سامنے دستِ سوال دراز کر ہی بیٹھیں۔ اپنے وقت کے صاحبِ حال و قال بزرگ پیر جی امداد علی ان کے بھائی تھے۔ بہت دن بعد تشریف لائے تو بہن کو ملول دیکھا۔ گھر میں خدا کا دیا اتنا تھا کہ دوسروں کو بانٹ کر بھی کم نہ پڑتا تھا۔ بہنوئی عبدالحق ایک مقتدر رئیس، صاحبِ نقد و جائداد اور کشادہ دست انسان تھے۔ میرٹھ کی ایک بڑی ریاست کے مختار عام تھے۔ ٹھیکے بھی لیا کرتے تھے۔ گھر میں نوکر چاکر سب تھے۔ پھر یہ اداسی؟ بہن سے استفسار کیا۔ انہوں نے حسبِ عادت ٹالنا چاہا لیکن پیر جی بضد ہو گئے۔

''خدا کو ناشکری سخت ناپسند ہے۔'' پیر جی نے فرمایا

''آپ کو کس چیز کی کمی ہے جو آپ یوں ملول رہتی ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے، میں نے کب شکایت کی ہے۔''

''پھر خیریت تو ہے۔ بھائی صاحب سے کوئی بات ہوئی ہے؟''

''وہ تو فرشتہ ہیں، ان سے کیا بات ہوگی؟''

''پھر کیا ہے، آپ نے تو مجھے پریشان کردیا۔''

''ہر ماں باپ کو اولاد کی تمنا ہوتی ہے۔ کیا مجھے نہیں ہوگی؟ تمہارے بھائی صاحب مرد ہیں۔ ان کا وقت باہر بھی گزر جاتا ہے، میں سونے گھر میں سوی پڑی رہتی ہوں۔''

''اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہوگی۔''

''میں یہ کہہ رہی تھی۔'' وہ بھائی کے قریب کھسک آئیں ''آپ میرے لیے دعا کیجیے۔''

''ارے میری دعاؤں میں کہاں اثر۔ تم دل سے دعا مانگو۔ وہ ضرور سننے والا ہے۔''

وہ سن کر چپ ہو گئیں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں چھڑ گئیں۔ بھائی سے دوبارہ کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پیر جی اُٹھ کر جانے لگے تو بہن کی آنکھوں میں ایسا حسرت زدہ سوال دیکھا کہ تڑپ کر رہ گئے۔

''میں اپنے مرشد حافظ غلام مرتضیٰ صاحب کی خدمت میں عرض کروں گا اور دعا کے لیے کہوں گا۔''

پیر جی کی بہن اپنے میکے آئی ہوئی تھیں کہ ایک روز حافظ غلام مرتضیٰ تشریف لے آئے۔ اس مرتبہ پیر جی نے نہیں ان کی والدہ نے عرض کیا۔

''میری لڑکی کے لڑکے زندہ نہیں رہتے۔ دعا فرمایئے کہ میں بھی اپنے نواسوں کو دیکھ سکوں۔''

حافظ صاحب نے مخصوص دبانہ انداز میں فرمایا ''اب کی باری علی کے سپرد کر دینا۔''

آپ کا یہ ارشاد ایسا معمّا تھا جسے حل کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وضاحت طلب کرنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی، آخر پیر جی کی ہمشیرہ ہی نے اس عقدے کو حل کیا۔

وہ کہہ اٹھیں ''حافظ صاحب کا یہ مطلب ہے کہ لڑکوں کا ددھیال ہے فاروقی اور ننھیال ہے علوی۔ اور اب تک جو نام رکھے گئے وہ ددھیالی طرز پر تھے۔ اب کی بار جب لڑکا ہو تو ننھیالی وزن پر نام رکھا جائے جس کے آخر میں علی ہو۔''

حافظ صاحب یہ سن کر ہنس پڑے اور فرمایا ''لڑکی بڑی ہشیار ہے۔ میرا منشا یہی تھا۔'' پھر آپ کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے۔ سر اُٹھایا تو فرمایا ''انشاءاللہ اس کے دو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لڑکے ہوں گے اور زندہ رہیں گے۔ ایک کا نام اشرف علی رکھنا اور دوسرے کا اکبر علی۔ ایک میرا ہوگا اور وہ مولوی ہوگا۔ دوسرا دنیادار ہوگا۔"

بزرگوں کی دعائیں رائگاں نہیں جاتیں۔ 5 ربیع الثانی 1280ھ کو چہار شنبہ کے دن صبح صادق کے ساتھ مجذوب کامل کی دعا پیکر اشرف بن کر جلوہ نما ہوئی۔

ابھی اس دعا کا دوسرا حصہ باقی تھا۔ اشرف علی کی ولادت کے چودہ مہینے بعد حضرت حافظؒ کی دعا کا دوسرا حصہ بھی پیدا ہوا۔ دوسرے بچے کا نام حافظ صاحب کی ہدایت کے مطابق اکبر علی رکھا گیا۔

☆☆☆

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکمرانی سے قبل راجا بھیم نے ضلع مظفر نگر میں ایک قصبہ اپنے نام سے تھانہ بھیم بسایا تھا۔ مسلمانوں نے تھانہ بھیم کو "محمد پور" سے بدل دیا مگر یہ نام مشہور نہ ہوا۔ زمانے کی گردش نے تھانہ بھیم کو تھانہ بھون بنا دیا۔ اس نام کی ایسی برکت ہوئی کہ بڑے بڑے صاحبِ فضل و کمال یہاں پیدا ہوئے۔

اسی مردم خیز قصبے میں دو معزز خاندان آباد تھے۔ ایک خاندان تھانیسر ضلع کرنال سے نقل سکونت کر کے یہاں آیا تھا اور نسباً فاروقی تھا۔ دوسرا خاندان جھنجھانہ سے تھانہ بھون منتقل ہوا تھا اور نسباً علوی تھا۔

یہ دونوں خاندان صدیوں سے یہاں رہتے چلے آرہے تھے۔ دونوں خاندانوں کا یک جا ہونا شاید مقدر ہو چکا تھا۔ فاروقی خاندان کے عبدالحق کے لیے جب لڑکی کی تلاش ہوئی تو مختلف گھروں میں تاک جھانک شروع ہوگئی۔ ایک لڑکی پسند کر لی گی۔ یہ وہی علوی خاندان تھا۔

دونوں خاندان دنیاوی اعتبار سے بھی معزز تھے اور دینی اعتبار سے بھی معتبر۔ دولت و حشمت اور زہد و تقویٰ دونوں بغل گیر ہو رہے تھے۔

شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی عبدالحق کو خارش کا مرض لاحق ہوگیا۔ کچھ دن حکیموں کا علاج ہوتا رہا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ کبھی اس میں کمی آجاتی، کبھی اضافہ ہو جاتا۔ بہت تنگ آکر کسی ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس کے مشورے سے انہوں نے کوئی ایسی دوا کھالی جو دافع خارش تو تھی مگر قاطع نسل بھی ثابت ہوئی۔ خارش تو جاتی رہی لیکن یہ امکانات جاتے رہے کہ آئندہ نسل چلے گی۔ جو اولاد ہوتی تھی، زندہ نہ رہتی تھی۔

حافظ غلام مرتضٰی پانی پتی کی توجہ اور دعا سے دو لڑکے اشرف علی اور اکبر علی پیدا ہوئے اور ماشاء اللہ زندہ بھی رہے۔

دونوں بچوں کی پیدائش کے درمیان وقفہ اتنا کم تھا کہ دو بچوں کے لیے ماں کا دودھ کم پڑنے لگا۔ اشرف علی چونکہ بڑا بیٹا تھا اس لیے اس کے لیے دودھ پلانے والی ایک عورت کو ملازم رکھ لیا گیا۔

اشرف علی کی عمر بہ مشکل پانچ برس کی ہوئی تھی کہ والدہ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اب اس کی تعلیم و تربیت کا بار والد کے کندھوں پر آگیا۔ عبدالحق پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ان معنیٰ میں پڑھے لکھے کہ فارسی میں اعلیٰ استعداد رکھتے تھے۔ حافظ قرآن نہیں تھے لیکن ناظرہ بہت قوی تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ تلاوت کثرت سے کرتے ہیں۔ کسی اچھے استاد سے پڑھا تھا کہ تجوید کا خاص خیال رکھتے تھے۔

جب بچوں کی تعلیم کا وقت آیا تو انہیں حافظ غلام مرتضٰی کی بات یاد آئی۔ انہوں نے فرمایا تھا "ایک میرا ہوگا اور وہ مولوی ہوگا۔"

یہ ماجرا یاد کر کے انہوں نے ان میں سے ایک کا انتخاب کرنے کے لیے دونوں بچوں کی افتادِ طبع کا مشاہدہ کرنا شروع کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اشرف علی دینی تعلیم کے لیے موزوں رہے گا اور اکبر علی کو دنیاوی تعلیم دلانی چاہیے۔ یہ اعزاز اشرف علی کے نصیب میں تھا۔ قدرت نے ان کا انتخاب کر لیا۔

انہوں نے چھوٹے بیٹے اکبر علی کو انگریزی پڑھنے کے لیے اسکول بھیج دیا۔ میرٹھ میں ایسے اسکولوں کی کمی نہیں تھی۔ اشرف علی کو مدرسے بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے فارسی کی ابتدائی کتب ختم کیں اور یہیں رہ کر کلام پاک حفظ کر لیا۔

کہتے ہیں تعلیم کے ساتھ اگر تربیت نہ ہو تو حال اس کشتی کا سا ہو جاتا ہے جس پر ضرورت سے زیادہ بوجھ لاد دیا گیا ہو اور وہ ڈوب جائے۔ عبدالحق اس نکتے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ ان بچوں کی ماں نہیں ہے۔ تعلیم بھی انہیں دلانی ہے، تربیت بھی انہی کو کرنی ہے۔ گھر میں نوکر ضرور ہیں لیکن یہ بار خود انہیں اُٹھانا ہے۔ تجربے نے انہیں سکھا دیا تھا کہ غیرت اور عزتِ نفس دو جواہر ایسے ہیں کہ اگر انسان سے چھین لیے جائیں تو وہ ہر بُرائی کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اس جوہر کو چمکانے کے لیے غیر معمولی احتیاط سے کام لیا۔ ایک مرتبہ تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر مٹھائی تقسیم ہوئی تو اشرف علی بھی لے کر گھر آیا۔ انہوں نے

اپنے فرزند کے ہاتھ سے یہ مٹھائی لے لی۔

"لذت اس چیز میں ہوتی ہے جو اپنے ہاتھ سے اپنے پیسوں سے خریدی جاتی ہے۔ یہ پیسے لو اور ابھی نوکر کے ساتھ جا کر اپنی پسند کی مٹھائی خرید کر لاؤ۔"

جب وہ مٹھائی لے کر آئے تو مسجد سے ملنے والی مٹھائی سے زیادہ بھی تھی اور اپنی پسند کی بھی تھی۔ اپنے سامنے بٹھا کر، جی بھر کے کھلائی۔

ایسا لاڈ پیار بھی تھا اور بوقتِ ضرورت سختی اور نگرانی بھی کہ کہیں ہر وقت کے پیار سے بچے میں گستاخی اور بے ادبی پیدا نہ ہو جائے۔

خود اشرف علی کی طبیعت کا حال یہ تھا کہ بازاری لڑکوں کے ساتھ کھیل کود اور میل جول سے کبھی مناسبت ہی نہیں ہوئی۔

بچپن تو بچپن ہوتا ہے، کھیل کود کو دل چاہتا ضرور تھا لیکن کھیل بھی نرالے تھے۔ اپنے ایسے چند بھولے بھالے لڑکوں کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔ ان کے ساتھ مل کر نماز باجماعت کی نقل اُتارتے۔ خود امام بنتے اور باقی لڑکے مقتدی۔ خوب لمبے لمبے سجدے ہوتے اور رقت انگیز دعائیں مانگی جاتیں۔ جن میں ایک دعا یہ بھی ہوتی کہ اے اللہ! ہمیں اچھی اچھی مٹھائیاں روز کھلا۔

ایک روز تو حد ہی ہوگئی۔ وہ ایک راستے سے گزر رہا تھا کہ ایک مسجد پر نظر پڑی۔ وہ اندر گیا اور منبر پر چڑھ کر جو قرآنی آیتیں اس وقت تک یاد کی تھیں، انہیں خوش الحانی سے پڑھا اور منبر سے اُتر کر مسجد سے باہر نکل آیا۔ اپنے دوستوں کے پاس گیا اور یہ قصہ بیان کیا۔ دوستوں نے کہا، کل جاؤ تو ہمیں بھی لے چلنا۔ ہم دیکھیں گے تم منبر پر بیٹھے کیسے لگتے ہو؟

وہ تو خود بھی چاہتا تھا کہ جو کارنامہ وہ کر آیا ہے اس کے دوست بھی اسے دیکھیں۔ دوسرے دن جب نماز کا وقت نہیں تھا۔ مسجد خالی پڑی تھی، وہ دوستوں کو لے کر پہنچ گیا۔ پھر یہ کھیل اکثر کھیلا جانے لگا۔

کھیل اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ مستقبل میں اس بچے کو کس عظیم مرتبے پر فائز ہونا ہے۔

طبیعت میں تمام تر سنجیدگی کے باوجود شوخی بھی تھی اور اس کا مظاہرہ بھی کبھی کبھی سرزد ہو جاتا تھا۔ محلے میں ایک نابینا حافظ قرآن رہا کرتے تھے۔ نابینا تھے، کلام مجید خوب یاد تھا اور اس پر ان کو ناز بھی تھا۔ اشرف علی نے نیا نیا قرآن حفظ کیا تھا۔ نابالغ ہونے کی وجہ سے نوافل میں سنایا کرتے تھے۔ ایک دن نابینا حافظ جی سے سرِ راہ ملاقات ہوگئی۔

"کہیے برخوردار، کلام اللہ حفظ کر لیا یا ابھی کچھ باقی ہے؟" حافظ جی نے اشرف علی سے پوچھا۔

"اللہ کے فضل سے حفظ مکمل ہوگیا۔"

"میاں اسے مکمل کبھی نہ کہنا۔ ہم نے بہت دیکھے ہیں یاد کر کے بھول جانے والے۔"

"حافظ حسین علی فرماتے ہیں میرا حافظہ بہت اچھا ہے۔"

"حافظے کی تم نے خوب کہی۔ عمر گزر جاتی ہے تب یہ جمتا ہے۔ اب ہمیں دیکھ لو، اس عمر میں یہ ہوا ہے کہ مجال ہے کوئی دھوکا دے جائے۔"

اشرف علی کو شرارت سوجھی۔ بچپن تو تھا ہی، سوچا حافظ جی کو ذرا تنگ کیا جائے۔

"حافظ جی، سنا ہے آپ کا قرآن بہت پکا ہے۔"

"میاں، ایسا ویسا۔"

"اگر میں آپ کو دھوکا دے جاؤں؟"

عمارت

محمود غزنوی نے اپنی نوجوانی میں ایک سرسبز و شاداب باغ لگوایا اور اس باغ میں ایک شاندار اور خوب صورت عمارت تعمیر کروائی۔ جب باغ اور عمارت کی تکمیل ہوگئی تو اس نے ایک عام جشن منعقد کیا اور اپنے باپ ناصر الدین سبکتگین اور سلطنت کے دوسرے ارکان کو باغ میں مدعو کیا۔

سبکتگین نے باغ اور عمارت کو دیکھ کر کہا "محمود! اگرچہ باغ اور عمارت، بہت شاندار اور خوبصورت ہیں لیکن ایسی چیزیں تو تمہارے ملازم بھی بنا سکتے ہیں بادشاہوں کی شان اور شوکت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ایسی عمارت کی بنیاد ڈالیں جس کی مثال پیدا نہ کی جا سکے۔"

محمود نے ادب سے پوچھا "آپ کون سی عمارت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔"

سبکتگین نے جواب دیا "وہ عمارت اہلِ علم کے دل ہیں۔" "اگر تم ان کے دلوں کی سرزمین میں اپنی محبت اور احسان کے بیج بو دو گے تو وہ بارآور ہوں گے۔ ان کے پھل ایسے ہوں گے جن کو چکھنے سے تمہیں سعادت کی لذت ملے گی اور تمہارا نام حشر تک زندہ رہے گا۔"

مرسلہ: نعمان، کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''رہنے دو۔ ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ تم مجھے کیا دھوکا دو گے۔ بڑے بڑے حافظ نہ دے سکے۔''

''پھر ہو جائے۔ آج آپ کو دھوکا دوں گا اور یہ بھی بتا دوں کہ کس آیت میں دھوکا دوں گا۔'' انہوں نے وہ آیت بھی بتلا دی۔

اشرف علی، نابالغ ہونے کی وجہ سے نوافل میں قرآن سنایا کرتا تھا۔ جب وہ قرآن سنانے کھڑا ہوا اور اس آیت پر پہنچا جو وہ پہلے ہی بتا چکا تھا تو ایک لفظ کو بہت ترتیل کے ساتھ پڑھا جیسا کہ رکوع کرنے کے قریب پڑھتے ہیں اور گویا ''اللہ اکبر'' کہنے والے ہیں۔ بس حافظ جی اسی تصور سے فوراً رکوع میں چلے گئے۔ ادھر اس نے قرأت شروع کر دی۔ حافظ جی بے چارے پھر کھڑے ہو گئے۔

اس شوخی کے ساتھ طبیعت سنجیدگی کی طرف ایسی مائل تھی کہ بارہ سال عمر ہوگی کہ فغان صبح گاہی کی لذت سے آشنا ہونے لگے۔ پچھلی رات میں اُٹھ بیٹھنا، تہجد اور وظائف میں محو ہو جانا۔ گھر والے سمجھاتے کہ اس عمر میں ان مشقوں کی کیا حاجت ہے مگر وہ اپنی دھن کا پکا تھا۔ یہ کیفیتیں کوئی اس واسطے ہوتی ہیں کہ ان پر عمل بھی کیا جائے۔

لطافت طبع کا عالم یہ تھا کہ کسی کا برہنہ پیٹ دیکھ لیتا تو فوراً قے ہو جاتی۔ اس کے ہم عمروں کو تو جیسے ایک کھیل ہاتھ آ گیا۔ جان بوجھ کر اپنا پیٹ برہنہ کر دیتے۔ وہ یا تو بھاگ کھڑا ہوتا یا قے کرنے بیٹھ جاتا۔ یہی حال جھوٹا کھانے یا پینے میں بھی تھا۔ باوجود انتہائی عقیدت و محبت کے عمر بھر بھی اپنے بزرگوں کا جھوٹا نہیں کھایا۔

ان کے والد انہیں میرٹھ سے تھانہ بھون لے آئے۔ یہاں آ کر مولانا فتح محمد سے عربی کی ابتدائی اور فارسی کی متوسط کتابیں پڑھیں اور پھر اپنے ماموں واجد علی سے جو فارسی کے استاد کامل تھے، فارسی کی انتہائی کتابیں پڑھیں۔

جب نصاب یہاں تک پہنچ گیا اور جب یہ دیکھ بھی لیا گیا کہ صاحب زادے ان علوم میں نہ صرف دلچسپی لے رہے ہیں بلکہ ذہن رسا خوب چل رہا ہے تو ان کے لیے کسی بڑی درس گاہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔

دارالعلوم دیوبند ایک عرصے سے ہندوستان کے مسلمانوں کے علم و فضل کی شناخت بن کر دینی علوم کے موتی بکھیر رہا تھا۔

دارالعلوم کے مسلک میں سلاسل علمیہ اور سلاسل فقہیہ کے ساتھ سلاسل صوفیہ کو بھی جمع کر دیا گیا تھا لہٰذا اس طرح یہ مدرسہ بھی تھا اور خانقاہ بھی۔

یہ مدرسہ دو تین باتوں میں دوسری درس گاہوں سے ممتاز تھا۔ اس مدرسے کے بانیوں نے انگریزی علوم کی مخالفت کی نہ تائید بلکہ غیر جانبدارانہ موقف اختیار کیے رکھا۔

عبدالحق کو انہی چیدہ چیدہ خصوصیات نے متاثر کیا اور اپنے بیٹے کو اس روحانی تربیت گاہ کے حوالے کر دیا۔ اب اشرف علی کو گھر سے دور دیوبند کے ہاسٹل میں رہنا تھا۔ یہ بھی کسی طالب علم کے لیے امتحان ہوتا ہے کہ وہ گھر والوں کی نگرانی سے دور رہ کر اپنے لیے کن دوستوں اور کس راستے کا انتخاب کرتا ہے۔

عبدالحق اشرف علی کو دیوبند چھوڑ کر تھانہ بھون آئے تو بیٹے کی جدائی سے ملول بھی تھے اور دل ہی دل میں خوش بھی ہو رہے تھے کہ انہوں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔

ان کی بھاوج ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں ''بھائی، تم نے چھوٹے کو تو انگریزی پڑھائی ہے، وہ خیر کما کھائے گا۔ بڑا عربی پڑھ رہا ہے، وہ کہاں سے کھائے گا اور اس کا گزارہ کیسے ہوگا؟''

عبدالحق اس وقت یونہی ملول تھے، بھاوج کے طنز سے جوش میں آ گئے ''خدا کی قسم! جس کو آپ کمانے والا سمجھتی ہیں اس جیسے اس کی جوتیوں سے لگے پھریں گے جسے آپ عربی پڑھنے والا کہہ رہی ہیں۔ اور یہ مردِ خدا ان کی طرف رُخ بھی نہیں کرے گا۔''

اشرف علی دیوبند پہنچے تو حصولِ علم میں ایسے منہمک ہوئے کہ عام طلبہ سے کنارہ کش ہو کر کتابوں میں گم رہنے لگے۔ کتابوں سے فرصت ملتی تو عام طلبہ کی طرح گھومنے نہیں نکل جاتے بلکہ اپنے استادِ خاص مولانا محمد یعقوب کی خدمت میں جا بیٹھتے۔ یہ بزرگ چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ حضرت حاجی اور امداد اللہ مہاجر مکی کے خلفا خاص میں تھے۔ گویا آپ کی صحت خزانہ علمی بھی تھی اور طہارت نفس بھی۔ آپ کے پاس بیٹھ کر کتابوں سے بھی آگاہی ہوتی تھی اور زہد و تقویٰ میں بھی اضافہ ہوتا تھا۔

دیوبند میں ان کے کچھ رشتے دار بھی تھے۔ وہ ان کے پاس ....آئے اور اصرار کیا کہ بے شک رہائش ہاسٹل میں رکھو لیکن کھانا ہمارے ساتھ کھایا کرو۔ یہ کیا بات ہوئی کہ جب ہم موجود ہیں تو تم ہاسٹل کا کھانا کیوں کھاؤ۔ اشرف علی نے کہا میں کوئی کام والد کی مرضی کے بغیر نہیں کرتا۔ میں خط لکھ کر ان سے اجازت طلب کر لیتا ہوں۔ انہوں نے اجازت دے دی تو

پھر ٹھیک ہے۔ انہوں نے والد کو خط لکھ دیا۔ والد کا ڈانٹ بھرا خط آیا۔

''تم وہاں رشتے داریاں جتانے گئے ہو یا طالب علمی کرنے۔ خبردار جو رشتہ داروں کے پاس آنا جانا رکھا۔ خود پر اور اللہ پر بھروسا رکھنا سیکھو۔ یہی رشتے دار جو آج تمہیں کھانا کھلائیں گے، کل بڑے فخر سے جتائیں گے کہ اشرف کی تعلیم میں ان کا بھی حصہ ہے۔ زندگی بھر تمہیں ان کا احسان مند رہنا پڑے گا۔ میں چاہتا ہوں تم عزتِ نفس کی حفاظت کرو اور سر اُٹھا کر جی سکو۔''

اس نصیحت نے ایسا اثر کیا کہ کھانا تو بڑی بات کسی عزیز کی طرف رُخ بھی نہیں کیا۔ رشتے داروں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ بڑے باپ کے بیٹے ہیں، مغرور نہ ہوں گے، تو کیا ہوگا۔

باپ کی دوربین نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ صاحب زادے کا ستارۂ اقبال بلندی پر ہے۔ اگر یہ ہر قسم کے رشتہ داروں میں گھر گیا تو اس کا دل تعلیم سے اچاٹ ہو جائے گا۔ ابتدا کھانے سے ہوگی اور پھر ہر قسم کی تقریبات میں شرکت لازمی ہو جائے گی۔ وقت ضائع ہوتا رہے گا۔

ان کا یہ اندازہ بالکل درست تھا۔ اشرف علی نے رشتہ داروں سے منہ موڑا تو کتابیں ہی اس کی پناہ گاہ تھیں یا پاکیزہ صحبتوں میں دل لگتا تھا۔ وہ جلد ہی اپنے اساتذہ کی نظروں میں آ گئے اور ان پر خصوصی توجہ دی جانے لگی۔ مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی محدث جو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے پیر بھائی اور اپنے شیخ کے خلیفہ ارشد تھے۔ انہوں نے آپ کا ذوقِ علمی دیکھ کر عجیب تاریخی جملہ کہا۔

''میرے بعد یہ لڑکا میری جگہ ہوگا۔''

یہ کوئی کم اعزاز نہیں تھا۔

تعلیمی مراحل تیزی سے طے کر رہے تھے۔ عام طالب علم کی طرح نہیں بلکہ حال میں مستقبل کی روشنی صاف نظر آتی تھی۔ بزرگ اساتذہ دیکھ رہے تھے کہ اس درسگاہ کو ایک عظیم الشان عالم دین میسر آنے والا ہے۔

علوم عقلیہ سے خاص مناسبت تھی۔ فطرت نے ذہانت و فطانت، حاضر جوابی اور طلاقت لسانی کے جواہر سے پوری طرح آراستہ کیا تھا۔ بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرتے کرتے علم منطق میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ ابھی سبزۂ خط کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ مناظروں میں اپنی اہمیت منوانے لگے تھے۔ اب کوئی غیر مذہبی شخص اسلام کے خلاف مناظرے کے لیے دیوبند آتا تو اشرف علی ہی کو تلاش کیا جاتا۔ مناظرہ کرنے والا دل میں ہنسنے لگتا کہ یہ طالب علم اس کے سوالوں کے کیا جواب دے گا لیکن خلوت سے نکلتے ہی مخالف کے ہر دعوے کو باطل ثابت کر دکھاتے۔

آپ کی اسی طاقت لسانی کو دیکھ کر اس وقت کے مناظروں کے سرتاج مولانا مرتضیٰ حسن نے ایک مرتبہ فرمایا کہ بڑے سے بڑا مناظرہ بھی آپ کے آگے ٹھہر نہیں سکتا۔

ابھی آپ طالب علمی کے دور سے گزر رہے تھے کہ ایک مرتبہ قطب ارشاد حضرت رشید احمد گنگوہی کسی کام سے دیوبند تشریف لائے۔ اعلیٰ مدارج کے طلبہ کو ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ جب ان کے سامنے پیش ہوئے تو نہ جانے کیا ہوا۔ نظر پڑتے ہی ایک تیر تھا کہ دل میں پیوست ہو گیا۔ مصافحہ کے لیے آگے بڑھے۔ قدم قابو میں کب رہے تھے۔

ایک بار ایک وزیر پر لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ دیکھو اس نے وزیر ہوتے ہی اپنے بیٹوں، بھتیجوں، رشتے داروں اور عزیزوں کو نوکریاں دینا شروع کر دیا ہے۔ لوگوں کی طبیعتوں میں حسد اور کم ظرفی تو ہوتی ہے۔ بعضوں نے سرعام اعتراض کرنے شروع کر دیے۔ آخر وزیر موصوف کو وضاحت کرنی پڑی کہ بے روزگاروں کو روزی مہیا کرنا ہمارا فرض ہے۔ اگر روزی پانے والے بے روزگار میرے عزیز ہیں تو اس سے اصولی پوزیشن میں فرق نہیں پڑتا۔ وزیر موصوف نے خیرات کے فضائل بھی بیان کیے اور کہا کہ دیکھیے ہر اچھی چیز ہمیشہ گھر سے شروع ہوتی ہے۔ بقرعید پر بھی لوگ اچھی اچھی بوٹیاں اور رانیں اسی لیے سب سے پہلے عزیزوں اور کنبے والوں کو بھیجتے ہیں۔ اب میں اپنے عزیزوں کو نوکریاں دوں گا تو میرے افسران اور دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے عزیزوں کو نوکریاں دیں گے اور یوں رفتہ رفتہ سبھی لوگ باروزگار ہو جائیں گے اس لیے کہ ہر کوئی کسی نہ کسی کا رشتے دار ہے۔ اگر نہیں ہے تو یہ اس کا اپنا مقدر ہے۔ کیوں نہیں وہ سوچ سمجھ کر اچھی جگہ پیدا ہوا۔ کسی وزیر کے کنبے میں کسی افسر بااختیار کے خاندان میں۔

ابن انشا کے کالم سے انتخاب

مرسلہ: زرینہ شمسی، کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے اختیار پاؤں پھسل گیا۔ حضرت گنگوہی نے آگے بڑھ کر تھام لیا۔ گرنے اور سنبھلنے میں ہی وہ راز و نیاز تھے کہ زبان پر آ گئے۔

''حضرت اب آپ ہی مجھے سنبھالیں گے، مجھے بیعت فرما لیجئے۔ اپنی غلامی میں لے لیجئے۔''

''ابھی تم طالب علم ہو۔ تعلیم سے فراغت پالو۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔''

''حضور تاب انتظار نہیں ہے۔''

''کندن بننے کے لیے جلنا ضروری ہے۔''

''میری تعلیم کا آخری درجہ ہے۔''

''پھر تو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔''

''میں تعلیم کو خیر باد کہہ کر آپ کے قدموں میں آ جاتا ہوں۔ اس کے بعد تو دوران طالب علمی کا عذر باقی نہیں رہے گا۔''

''پہلے شریعت پھر طریقت۔ جاؤ انتظار کرو۔''

مایوسی کے بادل چھا گئے۔ سوچا تو یہ سوچا کہ مجھ میں کوئی کمی ہے۔ اسی لیے تو مرشد کے ہونٹوں پر انکار ہے یا پھر میرے اصرار کی شدت میں کمی ہے۔ آپ ایک مرتبہ پھر ان کی خلوت میں مخل ہوئے۔ اصرار کے پھول پھر برسائے۔ انکار کی ہوا نے پھولوں کو پھر مرجھا دیا۔

جب تک حضرت گنگوہی مقیم رہے، وہ ان کے روبرو جبین نیاز جھکاتے رہے۔ پھر انہیں معلوم ہوا کہ حضرت گنگوہی عازمِ حج ہونے والے ہیں۔ اشرف علی کو ایک ہستی یاد آ گئی۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی عرصہ دراز سے مکہ معظمہ میں مقیم تھے۔ درس و تدریس میں مشغول تھے۔ شیخ العرب و عجم کہلاتے تھے۔ اشرف علی نے ایک خط ان کے نام لکھا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ آپ مولانا سے فرمادیں کہ مجھ کو بیعت کر لیں۔ یہ عریضہ انہوں نے حضرت گنگوہی کو دیا اور درخواست کی کہ وہ اسے شیخ العرب تک پہنچا دیں۔ حضرت گنگوہی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس خط میں کیا تحریر ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ نے جس وقت ہندوستان چھوڑا ہے، اشرف علی کی ولادت بھی نہیں ہوئی تھی لہٰذا دونوں میں تعارف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اشرف علی تو حاجی صاحب کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے لیکن اشرف علی تو ان کے لیے اجنبی تھے۔ ایک عام سا طالب علم جو دیوبند میں پڑھتا تھا لیکن جیسے ہی یہ عریضہ ان تک پہنچا، زمان و مکان کے حجابات اُٹھ گئے۔ اشرف علی کی اہمیت ان پر واضح ہو گئی۔ یہ عاشق جانباز تو ان کے پاس اچھا لگے گا۔ انہوں نے اشرف علی کے والد کو لکھا ''تم حج کو آؤ اور جب آؤ تو اپنے لڑکے کو لیتے آؤ۔''

عبدالحق تو اس دعوت کو پڑھ کر شاد و فرحاں ہو گئے فوراً دیوبند آئے اور بیٹے کو گلے سے لگالیا۔

''تم تو بڑی قسمت والے ہو گئے۔ شیخ العرب تمہیں طلب کر رہے ہیں اور تمہارے طفیل ہمیں بھی۔ میں تو یہ حیران ہو رہا ہوں کہ ان سے تمہارا تعارف کیوں کر ہوا؟''

اشرف علی نے والد کو یہ نہیں بتایا کہ یہ خط ان کے عریضے کے جواب میں آیا ہے لیکن خود اس اشارے کو سمجھ گئے۔ حضرت شیخ مجھے اپنی مریدی میں لینا چاہتے ہیں۔ اب یہ عقدہ بھی حل ہو گیا کہ مولانا گنگوہی بیعت کے لیے انکار کیوں کر رہے تھے۔ مجھے کہیں اور جانا تھا۔

اب انتظار تھا تو اس کا کہ حج کا موسم کب آتا ہے؟

انیسویں برس میں پہنچے تھے کہ دستار بندی کا مرحلہ آ گیا۔ خبر ملی کہ دستار بندی و تقسیم اسناد کا جلسہ بڑے پیمانے پر ہونے والا ہے اور یہ رسم مولانا گنگوہی کے ہاتھوں انجام پانے والی ہے۔ طبیعت میں عالمانہ انکسار اتنا تھا کہ خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ بہت کچھ حاصل کر لیا تھا لیکن لگتا تھا اس سمندر سے ایک قطرہ بھی نہیں لیا...... یہ گمان ہوا کہ رشید احمد گنگوہی کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ آپ نے چند ہم سبقوں کو اپنے ساتھ لیا اور استادِ خاص مولانا محمد یعقوب کی خدمت میں پہنچ گئے۔

''حضرت، ہم نے سنا ہے کہ ہم لوگوں کی دستار بندی ہوگی اور سند دی جائے گی۔ ہم خود کو ہرگز اس کا اہل نہیں پاتے۔ یہ تجویز منسوخ فرما دیجئے یا پھر حضرت گنگوہی کے علاوہ کسی اور کو مہمان خصوصی بنائیے ورنہ مدرسے کی بڑی بدنامی ہوگی کہ ایسے نالائقوں کو سند دی گئی۔''

''تمہارا خیال بالکل غلط ہے۔'' مولانا نے فرمایا ''یہاں چونکہ تمہارے اساتذہ موجود ہیں اس لیے ان کے سامنے تمہیں اپنی ہستی کچھ نظر نہیں آتی۔ باہر جاؤ گے تب تمہیں اپنی قدر معلوم ہوگی۔ جہاں جاؤ گے، بس تم ہی تم نظر آؤ گے، باقی سارا میدان صاف ہے۔''

خدا خدا کر کے وہ دن آ گیا جب حضرت گنگوہی تشریف لائے۔ طلبہ کا امتحان لینا اور انہیں دستارِ فضیلت سے سرفراز فرمانا آپ کے منصب کا حصہ تھا چنانچہ مولانا محمود الحسن نے

اشرف علی کو نہایت فخر کے ساتھ پیش کیا اور ان کی ذہانت کی بڑی تعریف فرمائی۔ مولانا گنگوہی نے بھی جانچنے کے لیے نہایت مشکل سوالات کیے۔ یہاں کیا دیر تھی۔ ایسے برجستہ اور مدلل جوابات دیے کہ حضرت گنگوہی ان کے درخشاں مستقبل کی نوید سنائے بغیر نہ رہ سکے۔

اب اشرف علی، مولانا اشرف علی تھانوی تھے۔ دیوبند میں پانچ سال گزارنے کے بعد انہوں نے سند حاصل کر لی تھی۔ تھانہ بھون آئے تو والد کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ جی بھر کے شیرینی تقسیم کی گئی۔

پہلا جمعہ آیا تو آپ کے ماموں واجد علی صاحب انہیں جامع مسجد تھانہ بھون لے گئے اور اعلان کر دیا کہ نماز کے بعد مولانا اشرف علی وعظ فرمائیں گے۔ زندگی میں پہلا موقع تھا۔ گھبراہٹ لازمی تھی۔ باوجود علم و فضل کے ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ماموں صاحب سے عرض کیا، آپ نے اعلان کیا، آپ ہی وعظ فرمائیں۔ مجھ سے تو کچھ نہیں بولا جائے گا۔

''ہمت کرو، پہلے پہل کی بات ہے۔ پھر رواں ہو جاؤ گے۔'' ماموں نے کہا اور دور ہٹ کے بیٹھ گئے تاکہ وہ کچھ کہہ نہ سکیں۔

اشرف علی نے دل ہی دل میں تقریر کے لیے ایک موضوع چن لیا۔ نماز ختم ہوئی تو ان کے نام کا اعلان ہو گیا۔ انہیں مجبوراً اپنی جگہ سے اُٹھنا پڑا۔ منبر تک گئے تو عاجزی میں منبر پر نہیں بیٹھے بلکہ نیچے کے حصے میں بیٹھ گئے اور سر جھکا کر چند آیات پڑھیں۔ ترجمہ کیا اور تھوڑی دیر اس کا مطلب بیان کر کے وعظ ختم کر دیا۔

وعظ کے بعد مسجد سے باہر نکلے تو ماموں نے آگے چلنے کے لیے فرمایا۔ یہ ادب کے منافی تھا کہ ماموں پیچھے چلیں اور آپ آگے۔

''ماموں جان! مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ آپ آگے چلیں، میں آپ کے پیچھے ہی اچھا لگتا ہوں۔''

''اب تم اشرف علی نہیں ہو۔ تم منبر رسولؐ پر بیٹھ چکے ہو۔ اگر ہم گھر کے آدمی احترام نہیں کریں گے تو دوسرے لوگ کیوں کر احترام کریں گے۔''

یہ سفر جیسے تیسے طے کیا اور پسینے میں نہائے ہوئے گھر پہنچ گئے۔

اسی رات اپنے استاد مولانا شیخ محمد تھانوی کو خواب میں دیکھا۔ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ عرض کیا کہ مجھے آپ کے انتقال کا بہت رنج ہے۔ فرمایا میں تو اب بھی تمہاری طرف اسی طرح متوجہ ہوں جیسا کہ زندگی میں تھا۔''

آنکھ کھلی تو یوں لگا جیسے زبان کی گرہیں کھل گئی ہوں۔ اس کا ثبوت بہت جلد مل گیا۔ شہر شہر اور قریہ قریہ میں وعظ کے لیے آپ کو بلایا جانے لگا۔ واعظوں کے بازار سرد ہو گئے۔ مسجدیں آباد ہو گئیں۔ اللہ نے زبان میں ایسی تاثیر دے دی کہ راہِ راست سے پھرے ہوئے قلوب اتباع سنت سے معمور ہو گئے۔ جس شہر میں چلے جاتے، آپ کو دیکھنے کے لیے عوام کے ٹھٹ لگ جاتے۔

بہت جلد آپ ''سراج الواعظین'' کہلائے جانے لگے۔

آپ نے ایک خواب دیکھا کہ ایک بڑے مکان میں ایک پنجرہ رکھا ہوا ہے۔ اس میں دو خوبصورت کبوتر ہیں۔ جب شام ہوئی اور اندھیرا ہو گیا تو ان کبوتروں نے کہا، ہمارے پنجرے میں روشنی کر دو۔ آپ نے جواب دیا ''خود ہی کر لو، چنانچہ انہوں نے اپنی چونچیں رگڑیں جس سے تیز روشنی ہوئی اور سارا پنجرہ منور ہو گیا۔

آپ نے یہ خواب اپنے ماموں واجد علی سے بیان کیا تو انہوں نے تعبیر دی۔

''وہ دو کبوتر روح اور نفس تھے۔ انہوں نے تم سے درخواست کی کہ مجاہدہ کر کے ہم کو نورانی کر دو مگر تم نے جو یہ کہہ دیا کہ تم خود ہی روشنی کر لو اور انہوں نے اپنی چونچ رگڑ کر روشنی کر لی۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ انشاء اللہ بلا ریاضت ہی حق تعالیٰ تمہاری روح اور نفس کو نورِ عرفاں سے منور فرما دیں گے۔''

بھینس

بھینس بہت مفید جانور ہے، پنجاب کے بیشتر علاقوں میں اسے ''مج'' کے نام سے پکارا جاتا ہے، قد میں عقل سے تھوڑی بڑی ہوتی ہے، چوپایوں میں واحد جانور ہے جو موسیقی کا ذوق رکھتا ہے۔ اس لیے لوگ اس کے آگے بین بجاتے ہیں۔ بھینس دودھ دیتی ہے لیکن یہ کافی نہیں ہوتا، لہٰذا باقی دودھ گوالا دیتا ہے اور ان دونوں کے باہمی تعاون سے ہم شہریوں کا کام چلتا ہے۔

ابن انشا، کی اردو کی آخری کتاب سے انتخاب
مرسلہ: طیب شاہین، کٹھیالہ شیخاں (منڈی بہاءالدین)

اللہ تعالیٰ اس خواب اور اس جیسے دوسرے خوابوں کے ذریعے یہ بتارہا تھا کہ آپ آیندہ کس مرتبے پر فائز ہونے والے ہیں۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنا برگزیدہ بندہ بنالیتا ہے۔

ان خوابوں کے اشارے ملنے شروع ہوگئے تھے۔ مقبولیت واحترام میں مسلسل اضافہ ہورہا تھا۔ جمالِ ظاہری وباطنی سے آراستہ اس نوجوان مبلغ نے سب کے دل جیت لیے۔ کیا خاص کیا عام سب اس کے کمالات کے قائل ہونے لگے۔ بزرگوں کی پیش گوئیاں پوری ہونے کا وقت آ گیا تھا۔

ایک روز کانپور کے کچھ معزز افراد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ کوئی ایسی نئی بات نہیں تھی۔ مسٹر وملا سب ہی ملنے آتے تھے۔ کوئی فتویٰ لکھوانے آرہا ہے، کسی کو مشورہ درکار ہے۔ کوئی یونہی چہرۂ جمال آفریں کے دیدار کے لیے چلا آرہا ہے۔ اس میں دوسرے شہروں کے لوگ بھی ہوتے تھے۔ کانپور سے آئے ہوئے لوگوں نے تمہیداً آپ کے علم وفضل کی تعریف کرنی شروع کی اور پھر اصل مطلب پر آ گئے۔

''ہم لوگ اس درخواست کے ساتھ آئے ہیں کہ آپ تھانہ بھون چھوڑ کر ہمارے شہر کو رونق بخشیں۔''

''بھائی، میں کچھ سمجھا نہیں۔ میں تو ہر شہر کو بقول آپ کے رونق بخشتا ہوں۔ کانپور بھی گیا ہوں لیکن تھانہ بھون چھوڑنے کا سوال درمیان میں کیسے آ گیا۔ بھلا وطن بھی کسی وجہ کے بغیر کسی سے چھوٹتا ہے؟''

''سرکار، اگر آپ اجازت مرحمت فرمائیں تو وجہ ہم بیان کیے دیتے ہیں۔ وجہ دین اور اشاعت دین سے تعلق رکھتی ہے اس لیے ہمیں یقین ہے، آپ انکار نہیں کریں گے۔''

''آپ نے درست فرمایا، جہاں اشاعتِ دین کا معاملہ درپیش ہو وہاں انکار کی گنجائش کہاں۔''

''بات یہ ہے کہ کانپور میں ایک مدرسہ قدیم سے چلا آرہا ہے ''مدرسۂ فیض عام۔''

''جی ہاں، نام میں نے بھی سنا ہے۔''

''اس کے صدر مدرس مولانا احمد حسن صاحب ایک جامع اور خصوصاً ماہر معقولات عالم تھے۔ کسی وجہ سے ناراض ہوکر انہوں نے الگ مدرسہ قائم کرلیا ہے۔''

''تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کی جگہ فیض عام میں مسند درس وتدریس سنبھال لوں۔''

''بے شک، آپ نے درست اندازہ کیا۔''

''بھائی، وہ ناراض ہوگئے ہیں، انہیں منا کر لے آیئے۔ وہ نہایت پائے کے عالم ہیں، میں ان کی جگہ کیسے لے سکتا ہوں۔''

''آپ کی اہمیت سے تو ہم واقف ہیں۔''

''آپ کا حسنِ نظر ہے لیکن ایسے معاملات میں تنازعات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ دو چار ان کے چاہنے والے بھی ہوں گے جو کسی غیر کو کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ میرا اس بکھیڑے میں پڑنا اچھا نہیں ہوگا۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ کانپور کے کسی مقامی عالم سے رجوع فرمائیں۔''

''ہندوستان میں آپ کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ ہمارا وفد تو محض نمایندہ ہے ورنہ تمام طلبہ نے ہمیں یک آواز ہوکر آپ کے پاس بھیجا ہے۔ پھر آپ نے خود بھی فرمایا ہے کہ اشاعتِ دین کے لیے آپ انکار نہیں کریں گے۔''

آپ مسلسل ٹالتے رہے اور وہ لوگ مسلسل اصرار کرتے رہے۔ پھر آپ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ اپنے والد ماجد اور اساتذہ سے مشورہ کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کریں گے۔

آپ نے اپنے اساتذہ سے مشورہ مانگا۔ والد ماجد سے ذکر کیا۔ سب کا کہنا یہی تھا کہ انہیں کانپور چلے جانا چاہیے چنانچہ آپ پچیس روپے ماہوار پر کانپور تشریف لے گئے۔

جوان العمر تھے لیکن اپنی قابلیت اور حسنِ اخلاق سے سب کے دل جیت لیے۔

آپ اس سے پہلے کبھی مسند تدریس پر نہیں بیٹھے تھے۔ یہاں جو پہنچے تو اونچے درجے کی کتابیں آپ کے سپرد ہوئیں۔ طبیعت میں گھبراہٹ طاری ہوئی لیکن غیب سے ہمت افزائی ہونے لگی۔

آپ کو یقین تھا کہ قدرتِ الٰہی خود آپ کے ذریعے علوم کے دریا بہانا چاہتی ہے۔ دو تین مہینے ہی میں ایسا ہوا کہ اہلِ کانپور آپ کے فریفتہ ہوگئے۔ ہر طرف آپ کے علم وفضل کا چرچا ہونے لگا۔ خود سابق صدر مدرس جن کی جگہ انہوں نے سنبھالی تھی، ان سے محبت کرنے لگے۔ انہیں تو یہ خوف مانع تھا کہ کوئی تنازع کھڑا ہوگا مگر ہوا یہ کہ آپ سب کی آنکھ کا تارا بن گئے۔ اسے بزرگوں کا تصرف ہی کہا جاسکتا تھا ورنہ امتحان تو سخت تھا۔

اب شاید ایک اور اشارۂ غیبی کی تکمیل کا وقت آ گیا تھا۔

مدرسہ دیوبند کی طرف سے تجارت کی ایک کمپنی قائم کی گئی۔ اس میں مولانا تھانوی کے والد نے تین حصص پانچ پانچ سو کے خریدے۔ ایک اپنے نام سے اور دو اپنے دونوں صاحبزادوں کے نام سے لیکن کچھ ہی عرصہ بعد کسی وجہ سے ان حصص کی رقم واپس لے لی۔ مولانا تھانوی اس وقت کانپور میں تھے۔ انہوں نے بذریعہ خط والد سے پوچھا۔

''یہ پانچ سو روپے جو آپ نے میرے نام سے جمع کیے تھے اور اب واپس لیے ہیں میری ملکیت ہیں یا آپ کی؟''

جواب آیا ''ابھی تک تو یہ رقم میری ملکیت تھی لیکن اب میں اس رقم کو تمہاری ملکیت قرار دیتا ہوں۔''

حضرت تھانوی نے پھر ایک خط لکھا ''پھر اس رقم کی زکوٰۃ بھی میرے ذمے واجب ہے اور اب حج بھی مجھ پر فرض ہے۔''

والد نے حج کے متعلق لکھا ''اس سال تمہاری چھوٹی بہن کے عقد سے فراغت ہو تو آیندہ سال حج کا قصد ہے۔ اس وقت تم بھی چلے چلنا۔''

''آپ یہ ضمانت لکھ کر بھیج دیجیے کہ میں اگلے سال تک زندہ رہوں گا۔ میرے ذمے تو حج فرض ہو چکا اور زندگی کا کچھ اعتبار نہیں پھر اس میں تاخیر بلا عذر شرعی جائز نہیں، اس لیے مجھے تو اسی سال حج کرنا ضروری ہے۔''

عبدالحق صاحب سمجھ رہے تھے کہ اگر وہ نہیں گئے تو صاحب زادے اکیلے چلے جائیں گے۔ ان کی محبت یہ اجازت نہیں دے رہی تھی کہ وہ اکیلے جائیں۔ انہوں نے اپنی صاحب زادی کے عقد سے جلدی فراغت حاصل کرلی اور مولانا تھانوی کو لے کر حج پر جانے کا ارادہ کرلیا۔

دراصل مولانا تھانوی کو حضرت امداد اللہ مہاجر مکی سے ملنے کی جلدی تھی۔ ان کا خط آیا رکھا تھا جس میں بیعت کا اشارہ ملتا تھا۔ دیکھنا چاہتے تھے کہ کیا ظہور میں آتا ہے؟ عاشق جانباز کو وصالِ محبوب کا موقع مل رہا تھا۔ جوش کا یہ عالم تھا کہ سمندر کا ہیجان بھی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔

مکہ معظمہ پہنچتے ہی شیخ عالی مقام سے نیاز حاصل کیا۔ حضرت شیخ خود منتظر تھے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ عاشق کون ہے، محبوب کون ہے؟

حضرت شیخ نے کمالِ محبت سے معانقہ کیا اور اسی وقت بیعت سے سرفراز کیا۔ ایک مجذوب کی دعا سے عالم موجود میں تشریف لائے دوسرے کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ ایک منزل اور طے ہوئی۔ سفر ابھی باقی تھا۔

اب شیخ کی خواہش تھی کہ وہ کم از کم چھ مہینے ان کے پاس اور رک جائیں۔ جی ابھی بھرا نہیں۔ پیمانہ سلوک میں ابھی [illegible] باقی ہے۔ اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہوسکتی تھی۔ منزل خود پاؤں پکڑ رہی تھی۔

''میں تو زندگی بھر کے لیے یہیں رک جاؤں لیکن والد صاحب کو میری مفارقت چھ مہینے کی لیے بھی گوارہ نہیں، وہ اجازت نہیں دیتے۔''

''والد کی اطاعت مقدم ہے۔ اس وقت چلے جاؤ، پھر دیکھا جائے گا۔''

دل پر ایک بجلی سی گری۔ جی کسی طرح نہ مانتا تھا کہ یہاں سے چلیے لیکن اب تو شیخ کا حکم بھی یہی تھا کہ ابھی چلے جاؤ پھر دیکھا جائے گا۔ دل وہیں رہ گیا اور آپ مجبوراً جہاز میں بیٹھ گئے۔

عشق کی چنگاریاں جو دبی دبی سی تھیں ارضِ پاک کے قیام سے بھڑک اٹھیں لیکن ابھی یہ سوختہ سامانی بے قابو نہیں ہوئی تھی۔

حج سے واپس ہوکر کانپور میں درس وتدریس کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا۔ تحریر وتقریر کے مشاغل بھی جاری رہے۔ شیخ عالی مقام سے خط کتابت کے ذریعے سلوک کی منزلیں طے ہوتی رہیں۔

یہ حضرت شیخ ہی کا تصرف تھا کہ آپ کے وعظ وتبلیغ میں اللہ نے برکت ڈال دی۔ اس کے اثرات افغانستان وایران بلکہ انگلستان تک پہنچ گئے چنانچہ آپ ہی کے ایک معتقد حبیب احمد تھانوی یورپ گئے ہوئے تھے۔ ان کی زبانی اسلام کی خوبیاں سن سن کر کچھ انگریز عیسائی مسلمان ہوگئے۔ ان کے نام رکھنے کا مسئلہ آیا تو حبیب احمد نے مولانا سے رجوع کیا۔ مولانا نے ان کے نام تجویز کرکے تحریر کیے۔

ایک انگریز خاندان مسلمان ہوا تو مولانا کی محبت اس درجہ غالب ہوئی کہ نیاز حاصل کرنے ہندوستان آیا۔ انگلستان میں آپ کی شہرت اتنی ہوئی کہ حبیب احمد نے انگلستان آنے کی دعوت دی تاکہ تبلیغی کام پوری قوت سے ہوسکے۔ آپ نے بھی ہامی بھرلی۔

''اگر میرے طرزِ تبلیغ سے وہاں کے لوگوں کو تشفی ہوتی ہے تو میں یہ سفر ضرور کروں گا۔''

تمام تیاریاں مکمل ہوگئی تھیں کہ حبیب احمد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ آپ ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ ہمیشہ کے لیے ارادہ ترک فرمادیا۔

دعوتِ دین کے کام اسی طرح چل رہے تھے۔ آپ کی تصنیفات بھی لوگوں کے دلوں کو گرمارہی تھیں کہ جذبۂ عشق کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

داؤ چل گیا۔ حالت سکر کا ایسا غلبہ ہوا کہ دل بے قابو ہو گیا۔ شیخ سمندر پار تھے۔ ہر ایک سے حالِ دل بیان نہیں ہو سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ حال ہوا کہ باطنی شغل سے دلچسپی بڑھ گئی۔ جتنے خارجی تعلقات تھے، سب سے دل اُچاٹ ہو گیا۔ جی میں آئی کہ ملازمت ترک کر دوں۔ تارک دنیا ہو کر گھر بیٹھ جاؤں۔ مشورے کے لیے مرشد کو خط لکھا۔ مرشد نے کچھ وظائف تحریر کیے نصیحتوں کے پھول بھیجے۔

مرشد برحق کے ارشادات کو آنکھوں سے چوما دل سے لگایا۔ ضبط کیا اور درس و تدریس میں مشغول رہے۔ کچھ دن مزاج القدس نے اعتدال کی راہ دیکھی مگر پھر بے قابو ہونے لگا۔ رہ رہ کر شیخ کا اصرار یاد آتا تھا "تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ۔" کسی کا بلاوا تھا جو بار بار یاد آتا تھا۔ کسی صورت چین نہ آتا تھا۔ اس عرصے میں والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ کوئی روکنے والا نہیں تھا آخر ارادہ کر لیا۔

وہ ملاقات بھی یادگار تھی جو محبوب محب کے درمیان ہوئی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے حضرت یعقوبؑ کو یوسفؑ گم گشتہ مل گیا ہو۔ عنایات کی بارش ہونے لگی۔ الطاف و کرم کے دریا بہنے لگے۔ قرب ایسا بڑھا کہ اوروں کو حسد ہونے لگا۔ حضرت شیخ نے تمام مصروفیات ملتوی کر دیں۔ کیسے کیسے راز تھے جو شاگرد کے حوالے نہیں کیے ہوں گے۔ عرفان و معرفت کی کیسی کیسی منزلیں ہوں گی جو طے کرائی ہوں گی۔

بارش تو ہر جگہ ہوتی ہے لیکن ہر زمین نمو پذیر نہیں ہوتی۔ جذب کی صلاحیت کسی کسی زمین میں ہوتی ہے۔ استاد کے ارشادات کو ایسا قبول کیا کہ خود استاد پکار اُٹھا۔

"بس تم پورے پورے میرے طریق پر ہو۔"

مکہ کی فضاؤں میں تلاوت قرآن کی کیفیت ہی دوسری تھی۔ خیال آیا کہ اگر فنِ قرأت میں مہارت حاصل کر لی جائے تو خود بھی لطف آئے، دوسروں کو بھی۔ مشہور عالم قاری محمد عبداللہ وہاں موجود تھے، شیخ سے اجازت لی اور ان کے پاس پہنچ گئے۔ قاری صاحب وہ ذات گرامی تھے جو عرب کے قاریوں پر بھی اپنی مہارتِ فن کا سکہ جما چکے تھے۔ مولانا نے چند ہی روز میں ایسی مشق فراہم کر لی کہ شاگرد و استاد جب مشق کرتے تو پہچاننا مشکل ہو جاتا کہ استاد کون ہے اور شاگرد کون؟

مولانا تھانوی کے اسی قیامِ مکہ کے دوران آپ کی اہلیہ محترمہ اور خالہ بھی وہاں پہنچ گئیں۔ خالہ صاحبہ نے حضرت شیخ کی خدمت میں عرض کیا۔

"مولانا کے اولاد نہیں ہے، ان کے لیے صاحبِ اولاد ہونے کی دعا فرمائیے۔"

حضرت نے دعا تو فرما دی لیکن باہر آ کر مولانا سے فرمایا "تمہاری خالہ نے مجھ سے دعا کے لیے کہا کہ تمہارے اولاد ہو، سو دعا تو میں نے کر دی لیکن بھائی میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ جیسا میں ہوں ویسے تم بھی رہو۔ جو حالت میری ہے، وہی حالت تمہاری بھی رہے۔"

"جو حالت حضرت کو پسند ہے، وہی میں اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔"

اتباعِ شیخ اسی کو کہتے ہیں اور مولانا نے اس راز کو پا لیا تھا۔ اسی لیے جو شیخ نے کہا وہ ان کے لیے جزوِ ایمان ہو گیا اور اسی لیے جب کوئی حاجی صاحب سے علم و عرفاں کی کوئی بات پوچھتا تو وہ آپ کی طرف اشارہ کرتے۔

"ان سے پوچھ لو، یہ خوب سمجھ گئے ہیں۔"

اس مرتبہ کے قیامِ مکہ میں ان پر "توحید" کا انکشاف ہوا جو شریعت و طریقت کی اساس ہے اور جس کا لازمی نتیجہ "عبدیت" ہے۔

کوئی شے ہمیشہ اپنی اصلی حالت پر نہیں رہتی۔ اس قیام کی مدت بھی ختم ہوئی لیکن یہ معلوم ہوتا تھا جیسے چھ مہینے میں چھ صدیوں کا علم حاصل کر لیا۔

رخصت کی گھڑی آئی تو مرشد نے دو وصیتیں بطورِ خاص فرمائیں۔

"دیکھو میاں اشرف علی، ہندوستان پہنچ کر تم کو ایک حالت پیش آئے گی۔ عجلت نہ کرنا۔"

"کبھی کانپور کے تعلق سے دلبرداشتہ ہو جاؤ تو پھر دوسری جگہ تعلق نہ کرنا۔ توکل بہ خدا تھانہ بھون آ کر بیٹھ جانا۔"

یہ سامانِ آخرت سے لدے پھندے ہندوستان پہنچے۔

☆☆☆

آپ جب حضرت امداد اللہ مہاجر مکی کے پاس چھ مہینے کے لیے گئے تھے تو اس وقت "مدرسۂ فیض عام" سے نہیں بلکہ "جامع العلوم" سے وابستہ تھا۔

اس کا قصہ یوں ہوا کہ جب کانپور اور دیگر شہروں میں آپ کی مقبولیت بڑھنے لگی اور آپ کے ایک حکم پر لوگ سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار نظر آنے لگے تو مدرسے کی مجلس انتظامیہ کو مالی فائدہ اُٹھانے کی سوجھی۔ مولانا جس سے جو کہیں گے وہ مدرسے کی جھولی میں لا کر ڈال دے گا۔ یہ غلط بھی نہیں تھا لیکن اس قیم کے مطالبے مولانا کی غیرت کو کبھی

گوارا نہیں ہوئے تھے۔ مجلس کے اراکین نے آپ سے استدعا کی کہ عوام سے چندے کی اپیل کریں۔ مولانا نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر بعض اراکین سخت ناراض ہوئے۔

حضرت کو جب معلوم ہوا کہ ان کے خلاف باتیں کی جا رہی ہیں تو انہوں نے ازخود استعفیٰ پیش کر دیا اور باوجود اصرار کے اس مدرسے میں رہنا گوارا نہیں کیا۔

کانپور سے وطن کی طرف لوٹ رہے تھے کہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ کی کشش نے آپ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ سوچا نہ جانے پھر کب موقع ملے چنانچہ آپ ان کی خدمت میں پہنچ گئے۔

کانپور سے رخصت ہوتے ہی مقامی علما میں کھلبلی مچ گئی۔ کوششیں کی جانے لگیں کہ کسی طرح انہیں واپس بلا لیا جائے۔

جب آپ گنج مرادآباد سے گھر لوٹ رہے تھے تو آپ کو کانپور ہی میں روک لیا اور اس درجہ مجبور کیا کہ ماننا ہی پڑا۔

اب آپ جامع مسجد محلہ پنکا پور میں درس دینے لگے۔ اس طرح ایک نئے مدرسے کی بنیاد پڑی جس کا نام آپ نے خود مسجد کی مناسبت سے "جامع العلوم" رکھا۔

دن گزرتے گئے۔ آپ کی تعلیم و تلقین سے سیکڑوں کے ذہن و قلوب میں تعلیماتِ اسلامی کی عظمت و حقانیت جم گئی لیکن عین اس عالم میں آپ کو خیال گزرا کہ مدرسے سے معاوضہ لینا مناسب نہیں۔ یہ کام فی سبیل اللہ ہونا چاہیے۔ پھر ذریعہ معاش کا کیا ہو؟ کوئی اور کام تو مجھے آتا ہی نہیں۔ غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر طبابت (حکمت) سیکھ لی جائے تو اچھا ذریعۂ معاش بن سکتا ہے۔ آپ حکیم عبدالمجید خاں کے پاس پہنچے تاکہ یہ فن سیکھا جائے لیکن ابھی پندرہ دن بھی نہیں گزرے تھے کہ کانپوری حضرات آئے اور آپ کو ان کے ساتھ آنا پڑا۔

یہی وہ دن تھے جب آپ کا قلب بے قابو ہوا اور آپ چھ مہینے کے لیے حضرت شیخ کی خدمت میں مکہ معظمہ چلے گئے۔

☆☆☆

حج ثانی کے بعد آپ پھر کانپور آ گئے اور اسی "جامع العلوم" سے وابستہ ہو گئے۔ آنے کو تو آ گئے تھے لیکن "دل وہیں رہ گیا جاں بھی وہیں رہ گئی" والا معاملہ تھا۔ جلوۂ حسن نے دل میں جگہ کر لی تھی۔ اثرِ عشق اپنا کام دکھا چکا تھا۔ کسی پہلو چین نہ آتا تھا لیکن اسے بے چینی بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ تو وہ کیفیت تھی جو کسی حسین کو دیکھ لینے کے بعد ہوتی ہے۔ جب مکہ معظمہ گئے تھے تو شوقِ الٰہی کا غلبہ تھا اب "سیرِ الٰہی" سے دوچار تھے۔ جی چاہتا تھا سب کو وہ دکھا دوں جو میں دیکھ رہا ہوں۔

اکثر عالمِ جذب میں فرماتے "جی چاہتا ہے ساری دنیا کو ذاکر و شاغل اور ولی کامل بنا دوں۔"

اسی غلبہ حال کی وجہ سے شروع شروع "حلقہ توجہ" بھی منعقد فرمانے لگے۔ اثر کا یہ عالم تھا کہ توجہ لینے والے تاب نہ لا سکتے تھے۔

مدرسۂ مدرسہ ہی نہ رہا، خانقاہ بن گیا۔ جس کو دیکھو ذکر و شغل میں مست و سرشار۔

حضرت شیخ کو پل پل کی خبریں مل رہی تھیں، انہوں نے خط لکھا۔

"ماشاء اللہ آپ اور آپ کے متعلقین کے ذوق و شوق کی کیفیت سن کر طبیعت نہایت خوش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ یہ ایں ہمہ ذکر و شغل دائم مشغول رکھے۔ روز بروز اور ترقی عطا فرمائے، بمقصود اصلی تک پہنچائے۔"

مسلسل ذکر و اشغال سے مقامات میں رسوخ بڑھتا گیا۔ اب کسی ایک جگہ رُکنا محال تھا۔ بلند تر مقامات پر نظر پڑنے لگی اور فطری طور پر ان مقامات کے حصول کی تڑپ پیدا ہوئی۔ اب خوشگواری کی جگہ اضطراب کہ مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں۔

حضرت شیخ نے مکہ معظمہ سے رخصت کرتے ہوئے خبردار کیا تھا "ہندوستان پہنچ کر تم کو ایک حالت پیش آئے گی۔ عجلت نہ کرنا۔"

صبر کس کو تھا، یہاں تو یہ حال تھا۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

"نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی" کہاں کا درس اور کیسا وعظ۔ ہر شغل سے دل اُچاٹ ہو گیا۔ کوئی ملنے آتا تو چپ بیٹھے رہتے۔ جیسے کسی اور دنیا کی سیر کو نکلے ہوئے ہوں۔

انہی دنوں ایک بڑا جلسہ تھا۔ بیرونی علما بھی آئے ہوئے تھے۔ پہلے اراکینِ مدرسہ نے خود کوشش کی پھر سفارش کے لیے ان علما کو لے کر آپ کی خدمت میں آئے اور وعظ گوئی کے لیے اصرار کیا۔ حالت سے بے خبر لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ بھی کوئی ادائے عالمانہ ہے کہ انکار فرما رہے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اکابرین ان کے سامنے بیٹھے تھے۔ انکار کریں تو ادب مانع تھا' اقرار کریں تو اپنی حالت پیش نظر تھی۔ جب کچھ نہ بن پڑا تو گردن جھکالی۔ آنسوؤں کو نشیب ملا تو بہہ نکلے۔ اتنا روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ علما دم بخود تھے کہ یہ انہیں ہوا کیا ہے؟ دو چار جو واقفِ حال تھے انہوں نے مولانا تھانوی کو ان کے حال پر چھوڑا اور زیادہ اصرار مناسب نہ سمجھا۔

بات پھیلتے دیر نہیں لگتی۔ عوام الناس تک بھی یہ بات پہنچ گئی کہ حضرت مولانا وعظ گوئی سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ کچھ نے اسے جادو سے تعبیر کیا کچھ نے غرور کہا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

شاہ سلیمان پھلواری تشریف لائے ہوئے تھے۔ کانپور کے لوگ ان کے پاس تشریف لے گئے اور انہیں اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ مولانا کو لب کشائی پر آمادہ کریں تو انہوں نے عجیب جواب دیا۔

''اگر ایسی حالت میں اس شخص سے وعظ کہلوایا تو بس منبر پر بیٹھتے ہی اس کے منہ سے پہلا لفظ جو نکلے گا وہ ''انا الحق'' ہوگا۔ ایسی حالت میں اصرار ہرگز مناسب نہیں۔''

اس زمانے میں حضرت پر توحید کا ایسا غلبہ تھا کہ اس کا نتیجہ وہی نکلنا تھا جو شاہ سلیمان پھلواری نے فرمایا۔

اتفاقاً کوئی صاحب مکہ معظمہ جا رہے تھے۔ مولانا نے ان کے ذریعے اپنے پورے احوال لکھ بھیجے۔

جب یہ عریضہ شیخ کی خدمت میں پہنچا تو بے اختیار فرمایا۔

''جوان آدمی ہیں، غلبہ ہو گیا ہے۔ تحمل نہ ہو سکا مگر میں تو اتنی دور ہوں، کیا کروں؟''

آپ کو معلوم ہوا کہ جو شخص عریضہ لے کر آیا ہے بہت جلد ہندوستان جانے والا ہے۔ اب کچھ ہو سکتا ہے۔ آپ نے اطمینان کا سانس لیا اور جواب ان کے حوالے کر دیا۔

''ان سے کہنا کہ جب تک تمہارا خادم زندہ ہے کیوں کسی دوسرے کی طرف رجوع کرتے ہو؟''

ظہر کا وقت تھا جب وہ شخص حضرت شیخ کا پیغام اور جواب لے کر آیا۔ خط کا پڑھنا تھا کہ جلتے ہوئے انگاروں پر پانی کا چھڑکاؤ ہو گیا۔ مغرب ہوئی نہیں تھی کہ مطلع صاف ہو گیا۔ ''شوق'' کی بے چینی ''انس'' کے سکون میں بدل گئی۔ طبیعت اعلیٰ سے ارفع تک پہنچ کر ٹھہر گئی۔

''انس'' کی اس کیفیت نے خلق سے دوری کا سبب پیدا کر دیا۔ ایک دل میں دو محبتیں کیسے آباد رہ سکتی تھیں' چنانچہ رفتہ رفتہ آپ کو بھی تعلقات سے وحشت ہونے لگی۔ چاہا کہ مدرسہ چھوڑ کر چلا جاؤں۔ حضرت شیخ کا کہنا یاد آیا کہ اگر کبھی کانپور سے دل برداشتہ خاطر ہو جاؤں تو پھر تو کل بہ خدا تھانہ بھون میں جا کر بیٹھ جانا۔

پیروں میں کانپوری حضرات کی محبت کی زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ خاطر شکنی گوارا نہیں تھی۔ حل کوئی ایسا نکالنا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اتفاقاً ان دنوں مدرسے کی حالت کچھ خراب تھی۔ اس بہانے پہلے تو اپنی تنخواہ سے دست بردار ہوئے۔ پھر اپنی جگہ مولوی اتقی صاحب بردوانی کو مدرس اوّل بنایا اور اپنے لیے محض سرپرستی کی خدمت رکھ لی۔ اس کے بعد اہلِ کانپور سے کچھ دن آرام کرنے کا عذر کر کے تھانہ بھون چلے آئے۔

اس کی اطلاع حضرت شیخ کی خدمت میں پہنچائی۔ جواب اس کا حوصلہ افزا آیا۔

''بہتر ہو کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے آئیں۔ امید ہے کہ آپ سے خلائق کثیر کو فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا۔ آپ ہمارے مدرسے کو از سرِ نو آباد کریں۔''

تھانہ بھون آ کر بھی آپ اہلِ کانپور اور مدرسے کی خیر و عافیت دریافت فرماتے رہے کہ کہیں اہل کانپور یہ نہ سمجھ لیں کہ انہوں نے ہمیشہ کے لیے ترکِ تعلق کر لیا ہے اور جب انہوں نے دیکھا کہ مدرسہ اپنی اصلی حالت پر آ گیا ہے تو انہوں نے مدرسے والوں کو لکھ بھیجا کہ اب میری سرپرستی کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نے تھانہ بھون میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا ہے۔

یہ خبر اہلِ کانپور پر برق بن کر گری۔ ان لوگوں نے درخواست کی کہ مدرسے کا کوئی کام آپ کے ذمے نہیں ہوگا لیکن آپ ہمارے شہر کو قیام کی عزت بخشیں۔ آپ نے فرما دیا کہ جو کچھ کیا گیا ہے وہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی جو میرے پیر و مرشد ہیں ان کے حکم سے کیا گیا ہے۔ وہی اس فیصلے کو تبدیل کریں تو کریں۔

اہلِ کانپور ایسے بضد تھے کہ انہوں نے حاجی صاحب کو خط لکھا کہ آپ حضرت تھانوی کو قیام کانپور کی اجازت مرحمت فرما دیں۔ حضرت نے بھی معذرت کر لی۔

''فقیر کے نزدیک مستقل قیام آپ کا تھانہ بھون میں ضروری ہے۔ باقی تعطیل وغیرہ یا کسی فرصت میں یا جس وقت طبیعت کچھ گھبرائے تو کانپور کا دورہ بھی کریں اور ان لوگوں کی خبر گیری کریں۔ طالبِ علم کے لیے تھانہ بھون کچھ دور تو نہیں۔''

قدرت کو ان سے کچھ کام لینے تھے اور اس کے لیے تھانہ بھون سے مناسب کوئی اور مقام نہ تھا۔

☆☆☆

ایک شیخ کے ہوتے ہوئے کسی اور کی طرف نگاہ بھی اُٹھانا ''ردِ شیخ'' مرادف ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ جب ایک معالج چن لیا تو بس ہر مرض کی دوا اسی کو سمجھو۔ یہ نہیں کہ کبھی ایک طرف جھک گئے، کبھی دوسری طرف' لیکن یہ سختی مبتدی اور غیر مستحکم سالک کے لیے ہے۔ جس کا رابطہ قلبی اپنے شیخ سے کامل ہو چکا ان کے لیے اور بزرگوں سے فیضِ صحبت میں مضائقہ نہیں کیونکہ اس پر کسی اور کا رنگ چڑھنے کا شائبہ نہیں ہوتا۔

مولانا تھانوی کو بھی اجازت تھی کہ وہ ہر سلسلے کے بزرگوں سے مل سکتے ہیں۔ ان کی جو باتیں اپنے مرشد سے متصادم نہیں انہیں قبول بھی کر سکتے ہیں' چنانچہ حضرت مولانا تھانوی نے مختلف النوع بزرگانِ دین سے فیض اُٹھایا۔ مولانا رفیع الدین صاحب مجددی جو مدرسہ دیوبند کے مہتمم تھے، مولانا کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ خود مولانا ان کا حلقہ توجہ میں شریک رہے۔ اتنا قرب تھا کہ مولانا رفیع الدین کے ساتھ آپ سرہند پہنچ کر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مزار کی زیارت کی۔

نقشبندیہ سلسلے کے دو چشم و چراغ شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی اور شاہ ابو احمد بھوپالی بھی تھے۔ آپ ان بزرگوں کی زیارت سے بھی مستفید ہوئے۔

شاہ فضل الرحمٰن سے تو اتنی محبت بڑھی کہ انہوں نے آپ کو اپنے وہ احوال سنائے جو اوروں سے چھپاتے تھے۔ بعض خدائی راز ہر کسی کو بتانے کے نہیں ہوتے۔

کسی عقد میں شرکت کے لیے پیلی بھیت گئے ہوئے تھے۔ یہاں ایک بزرگ شاہ محمد شیر خاں صاحب تھے۔ آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دعا چاہی کہ دل میں اللہ کی محبت پیدا ہو جائے۔

شاہ صاحب نے فرمایا کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو رگڑو۔ اب آپ اس حکم کی تکمیل کر چکے تو پوچھا کچھ گرمی پیدا ہوئی' عرض کیا کہ ہوئی۔

''بس اسی طرح قلب کو رگڑے جاؤ۔ انشاء اللہ محبت کی گرمی پیدا ہو جائے گی۔''

مولانا رشید احمد گنگوہی مشہور صوفی بزرگ تھے۔ مولانا نے پہلے پہل آپ ہی سے بیعت کی درخواست کی تھی، اس لیے تاحیات آپ کے ساتھ شیخ ہی کا سلوک رکھا۔ آپ فرماتے تھے اور لوگوں کے ساتھ تو میری عقیدت استدلالی ہے اور مولانا کے ساتھ غیر استدلالی۔ دلائل سوچنا بھی خلافِ ادب سا لگتا ہے۔

اس کے علاوہ لاتعداد بزرگانِ عصر سے ملاقاتیں کیں اور ان سب کو اپنے علم و اخلاص سے متاثر کیا۔ ان بزرگوں نے بھی آپ کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا۔

ہوتا تو یہ ہے کہ اختلاف فروعی تک منافرت کا سبب بن جاتے ہیں لیکن آپ کے دل میں سب کے لیے محبت ہی محبت تھی۔ یہ خلوص اور یہ مقبولیت عطیہ ربانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

☆☆☆

مولانا اشرف علی تھانوی نے چودہ سال کی طویل مدت تک کانپور کے دو مدرسوں میں اپنے درس کے ذریعے بیسیوں اہلِ کمال پیدا کیے۔ اس تجربے کے دوران آپ نے وہ اصول وضع کیے جو مدرسین کے لیے مشعلِ راہ ہو سکتے ہیں۔ اس کو آپ ضبطِ تحریر میں بھی لائے۔ یہی وہ اصول تعلیمی تھے جنہوں نے سنگریزوں کو جواہر پارے بنا دیا۔ یہ اصول آج بھی نہ صرف قابلِ عمل بلکہ قابلِ ستائش ہیں۔

استاد جو بھی مضمون پڑھائے اس میں خود زیادہ مشقت اُٹھائے اور اس کو آسان ترین صورت میں شاگردوں کے آگے رکھ دے۔

پیچیدہ مقام کو پہلے بہت ہی آسان پیرائے میں سمجھایا جائے اور جب بات ذہن نشیں ہو جائے تو اس مسئلے کا اصطلاحی تعارف کرایا جائے۔

اساتذہ خواہ کوئی مضمون پڑھاتے ہوں، ان کا نفسیات سے واقف ہونا ناگزیر ہے۔ اسی واقفیت و عدم واقفیت پر ان کی ناکامی اور طلبہ کی پختگی و ناکامی کا مدار ہے۔

طلبہ کے آگے ضرورت سے زیادہ تقریر نہ کی جائے اور محض اپنی قابلیت کے اظہار کے لیے اصل مطلب کو نہ اُلجھایا جائے۔

ہفتہ واری تقاریر اور مباحثے نہ رکھے جائیں کیونکہ اس کے باعث طلبہ کی توجہ اسی ایک موضوع تقریر و بحث کی طرف لگی رہتی ہے اور اصل درس سے دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔

طالب علم میں استعدادِ علمی پیدا ہونے کے لیے تین باتوں پر ان کی توجہ دلائی جائے۔

وہ آئندہ سبق کا مطالعہ کر کے معلومات و مجہولات میں تمیز پیدا کرے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

استاد سمجھانے لگے تو بلا سمجھے آگے نہ بڑھے۔

جب سمجھ چکے تو خود بھی اسی مطلب ومفہوم کو بیان کرے۔

کسی طالب علم کو اس کی دلچسپی کے خلاف علوم سیکھنے پر مجبور نہ کیا جائے اور نہ ہی اس کو اس بناپر سند سے محروم کیا جائے مثلاً اگر کوئی معقولات نہ پڑھے اور محض دینیات پڑھے تو اس کو بھی سند ضرور دی جائے۔

☆☆☆

تھانہ بھون کی رونق مولانا شیخ محمد کی رحلت، حضرت حافظ ضامن کی شہادت اور حاجی امداداللہ مہاجر مکی کی ہجرت کی وجہ سے ماند پڑ چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی رونق بحال کرنے کے لیے کسی کو تو لانا تھا۔ مولانا تھانوی کا نام آیا نگاہِ انتخاب میں۔ اب مولانا کو بھی یقین آ گیا ہوگا کہ انہیں اتنی تربیت گاہوں سے کیوں گزارا جارہا تھا۔ سلوک کی منزلیں کیوں طے کرائی جارہی تھیں لیکن معلوم ہوا کہ یہ تربیت تو تھانہ بھون تک لانے کے لیے تھی۔ ابھی کچھ اور مراحل بھی ہیں جو یہاں مستقل قیام اور جو مہمان یہاں آنے والے ہیں ان کی میزبانی کا اہل بننے کے لیے ضروری ہیں۔ ابھی انہیں طے کرنا باقی ہے۔

ان دنوں کسی وجہ سے قیام گنگوہ میں تھا۔ پچھلی رات کو تہجد کے لیے اُٹھے۔ ابھی وضو کررہے تھے کہ یکا یک بلا کسی قصد وارادہ کے ایک ''خطرۂ منکرہ'' (یعنی ایمانی تقاضوں کے خلاف وسوسہ) وارد ہوا۔

قیام تو گنگوہ میں تھا ہی۔ صبح ہوتے ہی آپ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے پاس پہنچے اور یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا۔ حضرت گنگوہی نے تفصیل بھی نہیں پوچھی صرف اتنا کہا ''التفات نہ کیا جائے۔''

مولانا تھانوی نے بھی کوئی خاص فکر نہیں کی اور وطن لوٹ آئے۔ سمجھتے تھے کہ جان چھوٹی۔ ایک خیال جو اَب لوٹ کر نہیں آئے گا لیکن یہ وسوسہ تو ایسا تھا کہ خیال میں آ کر جم گیا تھا۔ ہر وقت پیشِ نظر رہتا۔ نماز میں، وضو کے دوران حتیٰ کہ ذکر کرنے بیٹھتا تو ساتھ ہی وہ ''خطرۂ منکرہ'' بھی عود کرتا اور اگر اس سے بچنے کی غرض سے ذکر کو منقطع کرنا چاہتا تو اس کو بھی کسی طرح دل گوارا نہ کرتا۔

ایسی سخت کش مکش تھی کہ جان بُری لگنے لگی۔ جی چاہتا تھا موت آئے اور اس عذاب سے نجات ملے۔ ایک بار ایک صاحب ملنے آئے۔ ان کے پاس بھری ہوئی بندوق تھی۔ جی چاہا ان سے کہہ دیں کہ خدا کے لیے فائر کر کے میرے ناپاک وجود سے دنیا کو پاک کردو۔

موت کی خواہش اتنی شدید ہوتی چلی گئی کہ اختلاج قلب کے شدید دورے پڑنے لگے۔ حکیم محمد صدیق گنگوہی اتفاقاً تھانہ بھون آئے ہوئے تھے، ان سے رجوع کیا۔ حکیم صاحب نے قارورہ دیکھا تو تعجب کیا کہ یہ زندہ کیسے ہیں؟ قارورہ تو صاف بتارہا ہے کہ حرارت عزیزی بالکل فنا ہوچکی ہے۔

انہوں نے اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ وہ بھی بلآخر یہ کہہ کر اُٹھ گئے کہ اس کا علاج ''خزانۂ غیب'' سے ہوسکتا ہے۔

اب عالم وحشت نے یہ راہ سجھائی کہ خانقاہ سے نکل کر سیر وتفریح میں وقت گزارا جائے۔ کسی خادم کو ساتھ لیے بغیر خالی بندوق لے کر فائر کرتے رہتے۔ دل کو قدرے سکون ملتا پھر وہی گھبراہٹ۔ گھومتے گھامتے پھر حضرت گنگوہی کی خدمت میں پہنچ گئے۔

''حضرت کوئی علاج، اب دل میرے قابو میں نہیں رہا۔''

''التفات نہ کیا جائے۔ خطرات آتے ہیں تو آنے دو۔''

اب ایک ہی دروازہ رہ گیا تھا، اسے بھی کھٹکھٹایا۔ اپنے شیخ کو اپنے حال سے مطلع کیا۔

جواب آیا ''آپ کے قلب کی حالت بہت اچھی ہے۔ یہ مقام خوورجا ہے۔ اسی کو ''ہیبت انس'' کہتے ہیں۔ کبھی ہیبت اور کبھی ''انس'' کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ دونوں کو ایک سمجھنا چاہیے۔ فقیر دعا کرتا ہے جو کچھ قلب پر وارد ہو منجانب اللہ خیال کرو۔ جو واردات مضر ہوں گے اس مراقبہ سے سب دفع ہوجائیں گے۔ اس قسم کی گھاٹیاں طالب کو پیش آیا ہی کرتی ہیں۔ انشاءاللہ سب سے پار ہوجاؤ گے۔''

اس کے بعد بھی تقریباً ایک برس تک یہ ''غلبہ ہیبت'' طاری رہا۔ آہستہ آہستہ یہ کیفیت فرو ہوئی۔ ہیبت کم ہوئی اور ''انس'' میسر آیا۔ اہلِ تصوف کہتے ہیں اس گھاٹی کو عبور کرنے کے بعد آپ کو وہ مرتبہ ملا جس کو ''عبدیت'' کہتے ہیں۔

سارے تصوف اور ساری صوفیانہ تربیت کا حاصل یہ ہے کہ بندے کو بندگی پر قائم رکھا جائے اور اس کے ذہن وفکر سے بڑائی اور بزرگی کے ہر شائبہ کو مٹا کر تواضع کے وصف اعلیٰ سے مزین کیا جائے۔

اب معلوم ہوا کہ یہ امتحان اس لیے تھا کہ عبدیت پر قائم کر کے عاجزی کا پیکر بنادیا جائے۔ غلام کی اپنی کوئی ہستی نہیں ہوتی، اس کا مالک اس سے جو کام چاہتا ہے لیتا ہے۔ غلام اپنی جانب سے نہ اس میں کمی کرسکتا ہے نہ اضافہ۔ اگر مالک نے پانی طلب کیا ہے اور غلام، مالک کی مزید خوشنودی کے لیے دودھ لے آئے تو ممکن ہے مالک کے عتاب کا نشانہ بنے۔ پانی کہا گیا ہے تو نفع نقصان کا خیال کیے بغیر پانی ہی پلایا جائے۔ یہ ہے عبدیت۔ جب نفی ذات اس طرح ہوگئی تو اپنے تمام تر کمالات کے باوجود غلام کی، حقیقت ہی کیا۔ یہ شان آپ میں پیدا ہوگئی تھی۔

حالات سازگار ہوتے ہی رُکے ہوئے کام پھر شروع ہوئے۔ حج ثانی کے بعد رشد وہدایت اور اصلاح باطنی کا کام شروع ہوچکا تھا۔ تھانہ بھون پہنچ کر جب انہوں نے خانقاہ امدادیہ کا نظم ونسق سنبھالا تو مریدوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا تھا لیکن پھر مرحلہ ہیبت کا غلبہ ہوا تو سال بھر یہ کام رُکا رہا۔ اب پھر اس دکان معرفت کی گرم بازاری کا دور دورہ تھا۔

☆☆☆

''خانقاہ'' کا نام آتے ہی لوگ اسے رہبانیت کا نعم البدل سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ حقیقت ایسی نہیں۔ یہ تو ایک تربیت گاہ ہے جہاں علوم باطنی کی عملی تعلیم دی جاتی ہے۔ تعلیم اور تربیت دو الگ الگ چیزوں کا نام ہے۔ خانقاہ میں اسی تربیت کا ماحول فراہم کیا جاتا ہے۔ محض کتاب وتقریر سے ذہنیت وعمل کو بدلا نہیں جاسکتا بلکہ اس کے لیے ایک خاص ماحول پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ خانقاہ نشینوں نے یہی کام سرانجام دیا۔

خلفائے راشدین کے دور تک چونکہ لوگ دین کی اصل اور اس کی روح سے پوری طرح باخبر تھے اس لیے یہاں کسی الگ دینی تربیت گاہ کا وجود نہیں تھا، نہ اس کی ضرورت تھی لیکن جب جامعیت کے یہ دور ختم ہوگئے تو دین اور ملک گیری دو الگ الگ چیزیں ہوگئیں تو بعض نفوس قدسیہ نے دین کی اصل کو سنبھالنا اپنا فریضہ قرار دیا۔ انہوں نے سیاست سے کنارہ کش ہوکر ایسی تربیت گاہیں قائم کیں جہاں سے دین کو سمجھنے والے پیدا ہونے لگے۔ یہی تربیت گاہیں بعد میں خانقاہیں کہلائیں۔

جب خانقاہوں کا یہ طریقہ اکناف عالم میں پھیلا تو ہندوستان میں بھی عاشقانِ رسول ﷺ نے یہ خانقاہیں قائم کیں۔

تھانہ بھون میں حاجی امداداللہ مہاجر مکی نے ''خانقاہ امدادیہ'' قائم کی۔ ان کے ہجرت کر چکنے کے بعد اور مختلف علما کے اُٹھ جانے کے بعد خانقاہ امدادیہ کا انتظام حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے ہاتھ میں آیا اور یہ خانقاہ، خانقاہ امدادیہ اشرفیہ کہلائی۔

خانقاہ کی عمارت قصبہ (تھانہ بھون) کی بالکل مغربی سرحد پر تھی۔ اس کے بعد کوئی آبادی نہیں تھی۔ کوئی دو فرلانگ پر ریلوے اسٹیشن تھا۔ قصبے کی اکثر عمارتوں کی طرح یہ عمارت بھی پرانی لکھوری اینٹ اور کھڑنجے کی تھی۔ پھاٹک کے اندر ایک وسیع صحن، کنارے کنارے پختہ برآمدہ۔ ٹین کا سائبان۔ نصف صحن کے قریب ایک پختہ حوض کا زیادہ حصہ بنا ہوا، ایک لمبا حصہ کھلا ہوا۔ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی دونوں طرف غسل خانے۔ سائبان کے نیچے بالکل متصل کنواں۔ سائبان طے کرنے کے بعد جب آدمی اندرون دروازے میں داخل ہوتا تھا تو صحن مسجد شروع ہوجاتا تھا۔ بائیں طرف مہمان خانے کا زینہ۔ مہمان خانے کے کمرے، ہر ایک میں اتنی گنجائش کہ چار مہمان بہ آسانی ٹھہر سکیں۔

زینے سے چند قدم آگے یعنی مغرب کی جانب ایک لمبا برآمدہ۔ اس برآمدے میں دو سہ دریاں، پہلی سہ دری کے عقب میں کتب خانہ کا کمرا دوسری سہ دری میں مولانا تھانوی کی نشست گاہ۔ ایک حجرہ اس کے عقب میں، دوسرا حجرہ اس کے مغربی کونے پر۔

جہاں مسجد ختم ہوتی تھی، اس کے بعد سالکین کے لیے حجرہ تھا۔ دالان میں ابتدائی تعلیم کے لیے لڑکوں کا مدرسۂ قرآنی۔ خاتمے پر زینہ اور کچھ اور حجرے جو طالب علموں کے تھے۔ برآمدے کے دوسرے حصے میں مدرسے کی اونچی جماعتیں۔

مولانا تھانوی جب تھانہ بھون منتقل ہوئے خانقاہ کا نظام سنبھالا تو کچھ ایسی شان سے کہ دور دور اس خانقاہ کی دھوم مچ گئی۔ لوگ دور دور سے کھنچے چلے آتے تھے۔ مرشد کے وصال کے بعد تو لوگ انہی کو مرشد کی جگہ گردانتے تھے۔ ذات والا میں ایسی کشش تھی کہ جس پر آپ کی نگاہ توجہ پڑجاتی بس آپ ہی کا ہوکر رہ جاتا۔ بڑے بڑے انگریزی خواں آپ کے اسیر ہوئے تو بس خانقاہ ہی کے ہوکر رہ گئے۔ بڑے بڑے اہلِ علم نے جب اپنے لیے مرشد کی تلاش کی تو آپ ہی پر نگاہ ٹھہری۔ سید سلیمان ندوی جیسے عالم آپ کے مرید ہوئے۔

(جاری ہے)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مولانا تھانوی اب تقریر سے گزر کر تحریر کی طرف راغب ہوئے تھے۔ اس کے لیے اطمینان اور وقت کی ضرورت تھی۔ یہاں یہ حال خانقاہ میں تانتا بندھا رہتا تھا۔ ذرا ذرا سے کام کے لیے لوگ آپ کے پاس دوڑے چلے آتے تھے۔ اب انہیں خانقاہ میں اپنے نظام الاوقات کی چارٹ آویزاں کرنا پڑا۔

صبح سے بارہ بجے تک مجھے متفرق ایسے کام رہتے ہیں جو تنہائی میں ہو سکتے ہیں۔ اس وقت کسی سے ملنے یا بات کرنے میں تکلف بھی ہے اور حرج بھی۔ البتہ تین شخص مستثنیٰ ہیں۔ ایک وہ شخص جو تازہ آیا ہو اور صرف ملاقات کا مصافحہ کرنا چاہتا ہو۔ دوسرا وہ جو جا رہا ہے اور صرف رخصت کا مصافحہ کرنا چاہتا ہے۔ تیسرا وہ شخص جس کو ایسی حاجت ہو کہ اس میں مہلت نہیں ہو سکتی۔

بارہ بجے سے نماز ظہر سے فارغ ہو کر اپنی مجلس میں بیٹھنے تک میرے قیلولہ و نماز کا وقت ہے۔ اس میں ملاقات اور نیز سب خدمات سے معافی چاہتا ہوں۔

جب ظہر پڑھ کر اپنی مجلس میں حاضر ہو جاؤں اس وقت سے عصر کی اذان ہونے تک عام اجازت ہے۔

عشاء کے بعد تو کلی معذوری ہے۔

اگر کسی کو کچھ پوشیدہ کہنا ہو۔ اس کے لیے قاعدہ ہے کہ اگر تحریر کو کافی سمجھیں تو میری مجلس سے ملحق سہ دری کی دیوار میں ایک بکس لگا ہے اس میں لکھ کر ڈالیں اور جس موقع پر جواب چاہتے ہوں اس کا پورا پتا لکھ دیں، مثلاً فلاں نمبر کے حجرے میں یا مسجد کے منبر پر۔ اس طریقے سے تحریر میں جواب مل جائے گا اور اگر پوشیدہ بات زبانی کہنا چاہیں تو ایسے ہی پرچے کے ذریعے تنہائی کا وقت پوچھ لیں۔

بعض مہمانوں کو میں خاص اجازت دے کر تنہائی کے وقت میں بٹھلاتا ہوں۔ دوسرے حضرات اپنے کو ان پر قیاس نہ کریں۔"

راستے میں کوئی صاحب میرے ساتھ نہ چلیں نہ گھر جا کر پکاریں۔

جو لوگ خانقاہ میں قیام کے خواہاں ہوتے تھے ان سے تعارف کے لیے آپ نے ایک فارم بنا رکھا تھا جس کی خانہ پری کر کے ضروری تعارف بہ سہولت حاصل ہو سکتا تھا۔

یہ اس لیے ضروری ہو گیا تھا کہ عوام و خواص کا رجوع سیکڑوں کی نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں تھا۔ فرداً فرداً سب کے حالات جاننے میں بہت دیر لگ سکتی تھی۔

یہ اوقات کار تو ان لوگوں کے لیے تھے جو ملاقات کے لیے آتے تھے۔ پورے ملک سے جو لوگ خطوط کے ذریعے رابطہ کرتے تھے ان کی تعداد ان سے کہیں زیادہ تھی اور پھر روز کے روز ان کا جواب بھی دیا جاتا تھا۔ پھر خط بھی مختصر اور چند سطری نہیں بڑے لمبے چوڑے اور فقہ، سلوک، کلام وغیرہ کے مسائل سے متعلق۔ اتنے خطوط کا روز جواب دینا بذاتِ خود ایک کرامت ہی لگتا تھا۔ یہ انبار ابھی ختم نہیں ہوتا تھا کہ دوسری ڈاک سہ پہر کو دہلی کی طرف سے بھی آ جاتی تھی۔ دورانِ سفر بھی خطوط کے جوابات اور تصنیف کا کام برابر جاری رہتا تھا۔

آپ کے یہ اصول خانقاہ تک محدود نہیں تھے۔ دوران سفر بھی ان کے اپنے اصول تھے جن پر وہ زندگی بھر کاربند رہے۔ کبھی نہ تو فرمائشی وعظ کہے نہ وعظ کوئی کا کوئی معاوضہ قبول کیا۔ عام دعوتوں سے بھی گریز فرماتے کہ یہ بھی معاوضے کی ہی ایک شکل تھی۔ ایسے مقام پر قیام نہ فرماتے جہاں عام مسلمانوں کو آنے اور ملنے میں دشواری ہو۔ والیان ریاست کی ملاقات سے تو عموماً گریز ہی کرتے تھے۔

یہ اصول تو کہا جا سکتا ہے کہ نمائشی ہوں لیکن آپ کی نجی زندگی بھی مثالی تھی۔ یہ نہیں کہ اپنے لیے کچھ دوسروں کے لیے کچھ۔ آپ کی دو ازواج تھیں اور دو ہی مکان تھے۔ جب آپ ـــ دونوں مکان دونوں بیویوں کی ملکیت میں دے چکے تو جواب آیا کہ ان مکانوں میں رہ کر اپنی بیویوں کا منت پذیر ہوں چنانچہ ایک مرتبہ خوش اسلوبی سے آپ نے یہ بات دونوں کے سامنے رکھ دی کہ ماہانہ کچھ کرایہ لے لیا کریں۔ دونوں بیویاں ظاہر ہے کہ کرایہ لینے والی کب تھیں۔ دونوں نے انکار کر دیا۔ آپ کہتے رہے کہ بھئی، یہ اب آپ کی ملکیت ہے۔ کچھ کم سہی لیکن کرایہ تو لینا پڑے گا۔ وہ نہ مانیں۔ آپ خاموش ہو گئے مگر یہ طریقہ رکھا کہ اظہار کیے بغیر کرائے کی نیت سے کچھ روپیا دونوں کو دے دیا کرتے۔

آپ سخت گیر نہ تھے۔ کبھی گھر والوں سے تحکم کا لہجہ اختیار نہیں کیا۔ کیسی ہی پریشانی ہو، جب گھر میں داخل ہوتے تو ہشاش بشاش نظر آتے۔ اپنی ازواج کے مہمانوں کی خوب خاطر مدارات فرماتے۔ کبھی یہ ظاہر نہ ہوتا کہ بہت بڑے عالمِ دین ہیں۔ ہزاروں مرید ہیں، سیکڑوں خدام ہیں۔

آنے والوں کے ذمے کوئی کام نہ کرتے کہ کہیں وہ آیندہ آنا ہی چھوڑ دے۔ اگر کوئی کام کسی سے لینا ہوتا تو خود اس کے پاس چل کر جاتے۔

نوکروں کے بارے میں یہ حال تھا کہ نوکر اگر دیر سے اٹھتا تو خود اپنے آپ کو عمداً کسی کام میں مشغول فرما لیتے تھے تاکہ وہ اٹھے تو اسے یہ خیال دامن گیر نہ ہو کہ آپ اس کے منتظر ہیں۔ نوکروں کو یہ بھی تاکید تھی کہ ان کے سامنے خواہ مخواہ کھڑے نہ رہیں بلکہ سلام کر کے بیٹھ جائیں۔ اس کے بعد کوئی بات کریں۔

کثرت مشاغل کے باوجود روزانہ گھر پابندی سے تشریف لے جاتے۔ سفر میں ہوتے تو روزانہ گھر خط لکھتے۔ گھر میں کوئی بیمار ہو جاتا، اس وقت تو مولانا کی گھبراہٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ فراخ دلی سے روپیا صرف فرماتے۔ ضرورت پڑتی تو دور دراز کے مقامات پر خود لے جا کر علاج کرواتے۔

اس قدر احتیاط اللہ والوں کو ہی ہو سکتی ہے۔ اپنے کپڑے خانقاہ میں رکھتے تھے۔ اس خیال سے کہ اگر ایک بیوی کے گھر میں کپڑے رکھتے تو دوسری بیوی کے دل میں خیال آتا کہ اس کے ساتھ اتنی خصوصیت نہیں جتنی دوسری کے ساتھ ہے۔

عدل و مساوات اسی کا نام ہے۔

آپ کی اسی اصول پرستی کی وجہ سے آپ کے مخالفین آپ پر بدخوئی کا الزام لگاتے تھے اور یہ پھیلا دیا تھا کہ متشدد ہیں۔ بہت جلد برہم ہو جانے والے ہیں۔ کوئی سادہ لوح بے چارہ ان کے پاس جاتا ہے اور وہ اسے ایسی ویسی سنانے لگتے ہیں۔ جو ان سے کبھی نہیں ملا ہوتا وہ اس تنقید پر یقین بھی کر لیتا تھا لیکن جو مشاہدہ کر چکے تھے وہ یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ خلافِ دین امور پر آپ برہم ہو جاتے تھے تو دوسری طرف قلبی شفقت کا یہ اثر تھا کہ عام مسلمان پروانہ وار آپ کے اطراف گھر آتے تھے۔ زبان سے جھڑکے جاتے تھے، دل سے کھنچے چلے آتے تھے۔

سختی کا اظہار اصلاح و درستی کے لیے تھا نہ کہ دل کی قساوت کی وجہ سے۔ تنبیہہ سے کام لینا اور عفو و درگزر کو راہ نہ دینا بالکل ایسا تھا جیسے کوئی بچہ گڑھے میں گر رہا ہو اور اس کا باپ اسے زور سے پکڑ کر کھینچے۔ اس کھینچنے میں بچے کو اذیت ضرور ہوگی لیکن اس سے کم جو گڑھے میں گرنے کے بعد ہوتی۔ اس زور سے کھینچنے کے بعد باپ کو افسوس بھی ہوتا ہوگا کہ کاش اتنی زور سے کھینچنا نہ پڑتا۔

یہی حال مولانا کا تھا۔ مقام و منصب کی ذمے داری سختی پر مجبور کرتی تھی اور نرم دلی ندامت پر اُکساتی تھی۔ آپ خود فرماتے تھے۔

"یہ طرز میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے اور مجھے بعد کو بڑی ندامت بھی محسوس ہوتی ہے اور رہ رہ کر سوچتا ہوں کہ بجائے اس طرح کہنے کے اس طرح بھی کہہ سکتا تھا۔ بجائے یوں سمجھانے کے یوں بھی سمجھا سکتا تھا لیکن عین وقت پر مصلحت اصلاح کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ اور کوئی مصلحت پیشِ نظر رہتی ہی نہیں۔ اور یہ جب تک ہے جب تک میں نے اپنے ذمے اصلاح کی خدمت سمجھ رکھی ہے اور اگر کبھی اس سے قطع نظر کر لی تو پھر میں انشاء اللہ خوش اخلاق بن کر بھی دکھلا دوں گا۔ میرا اصلی مذاق تو یہی ہے کہ کسی سے کچھ تعرض نہ کروں۔"

اور یہ بھی فرمایا۔

"میرے قلب میں حرارت ہے۔ قساوت نہیں اور مزاج میں حدت ہے شدت نہیں۔"

آپ کی اسی توازن طبع۔ سختی و نرمی کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے ادنیٰ مرید میں بھی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی احتیاط کا پہلو اُجاگر ہو گیا تھا۔ ایسے افراد جو نہ صرف یہ کہ مولوی نہیں تھے بلکہ عام کتابی علم سے بھی ناآشنا تھے، اس کے باوجود ایسے محتاط بن گئے جو اولیاء اللہ کی صفات ہوتی ہیں۔

الہ آباد کے ایک نائی تھے۔ حضرت سے بیعت ہوئے تو اپنا پیشہ محض اس وجہ سے چھوڑ دیا کہ اس میں اکثر مسلمانوں کی داڑھیاں مونڈنی پڑتی تھیں۔ انہوں نے پکوان سیکھا اور اس کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا۔

فتح پور کے ایک معمار آپ کے مرید ہوئے تو اس کی بڑی احتیاط ہو گئی کہ امانی میں بھی ویسی ہی تیز دستی سے کام کرنا چاہیے جیسا کہ ٹھیکے میں کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا کے ایک خادم کا قیام مدرسہ دیوبند میں ایک صاحب کے ہاں ہوا۔ جب رات ہوئی اور لالٹین آئی تو خادم نے پوچھا، اس میں جو تیل ڈالا گیا ہے، وہ کہیں مدرسے کا تو نہیں؟

یہ سوال کرنا تھا کہ میزبان نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور پوچھا "کیا تم مولانا تھانوی کے مرید ہو؟"

یہ حال جب معمولی لوگوں کا تھا جو تعلیم یافتہ تھے، ان کا حال تو پوچھنا ہی کیا۔ خواجہ عزالحسن مجذوب آپ کے نہایت چہیتے مرید تھے۔ وہ ایک دفعہ سفر پر جا رہے تھے۔ اسٹیشن پہنچ کر اسٹیشن ماسٹر سے خواہش کی کہ سامان تلوا کر اس کا محصول بتائے۔ اسٹیشن ماسٹر نے تساہل کی بنا پر انکار کیا۔ خواجہ صاحب مصر ہوئے۔ اسٹیشن ماسٹر نے جھنجلا کر کہا، جب میں اجازت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دے رہا ہوں تو اسباب تلوائے بغیر کیوں نہیں چلے جاتے۔ خواجہ صاحب نے اسے خوب لتاڑا۔ بددیانتی کی رپورٹ کرنے کی دھمکی دی۔ اس پر وہ بڑا پریشان ہوا۔ معافی چاہی اور فوراً سامان تلوا کر حسب ضابطہ محصول وصول کیا لیکن حیران ضرور ہوا کہ یہ کیسا آدمی ہے؟ خواجہ صاحب جب چلے گئے تو اس نے وہاں موجود کچھ لوگوں سے کہا، یہ آدمی مجھے نشے میں معلوم ہوتا ہے۔

اسٹیشن ماسٹر نے ٹھیک کہا تھا۔ مولانا سے تعلق رکھنے والوں پر شریعت کا نشہ طاری رہتا تھا کیونکہ ان کا مرشد خود بھی اسی نشے میں سرشار تھا۔

حضرت مولانا تھانوی سے ایک واقعہ کچھ اسی سے ملتا جلتا موجود ہے۔ آپ سہارن پور تشریف لے جا رہے تھے۔ کچھ گنے ساتھ تھے۔ آپ نے ضابطے کے تحت ان کو تلوانا چاہا۔ اسٹیشن کے ملازمین آپ سے واقف تھے لہٰذا ازراہِ عقیدت عرض کیا، آپ یونہی لے جائیں تلوانے کی ضرورت نہیں، ہم گارڈ سے کہہ دیں گے۔

آپ نے فرمایا ''یہ گارڈ کہاں تک جائے گا؟''

انہوں نے فرمایا ''غازی آباد تک۔''

ارشاد ہوا ''غازی آباد سے آگے کیا ہوگا؟''

عرض کی ''یہ گارڈ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا۔''

آپ نے پھر سوال کیا ''پھر آگے کیا ہوگا؟''

جواب ملا ''وہ کانپور تک پہنچا دے گا، وہاں آپ کا سفر ختم ہوگا۔''

آپ نے فرمایا ''نہیں، وہاں سفر ختم نہیں ہوگا بلکہ آگے ایک اور سفر آخرت کا بھی ہے۔ وہاں کا کیا انتظام ہوگا؟''

یہ سن کر سب نے سر جھکا لیا۔ یہ ثابت ہو گیا کہ جو خود عمل کرتے ہیں تب ان کے کہنے پر ان کے متعلقین عمل کرتے ہیں۔

اس دن کے بعد سے جب کوئی شخص تھانہ بھون اسٹیشن پر اترتا تھا، اس سے ریلوے والے پوچھتے تک نہیں تھے کہ سامان تلوایا بھی یا نہیں۔ سب یہی کہتے تھے کہ یہ تھانہ بھون والے مولانا صاحب کے پاس جا رہے ہیں اور وہاں جانے والا بلا اسباب تلوائے سفر نہیں کرتا۔

یہ ساکھ اس لیے قائم ہوئی تھی اور مریدوں میں شان استغنا اس لیے آیا تھا کہ آپ مریدوں کی تعداد بڑھانے کے شوق میں بغیر دیکھے بھالے ہر ایک کو مرید نہیں کر لیا کرتے تھے۔ انہوں نے چند اصول مقرر کیے تھے۔ طالب کے سامنے پہلے شرائط رکھتے تھے جب وہ ان شرائط پر پورا اُتر جاتا تھا اس کے بعد بیعت فرماتے تھے، وہ شرائط یہ تھیں۔

قرآن مجید جتنا پڑھا ہے یا جتنا یاد ہے کسی صحیح پڑھنے والے سے صحیح کرانا ہوگا۔

بہشتی زیور (آپ کی تصنیف) کے سب حصے یا سات حصے اور بہشتی گوہر اور اصلاح الرسوم اور قصد السبیل پڑھ کر یا سن کر اس کی پابندی کرنا ہوگی۔

میرے چھپے ہوئے وعظ ہمیشہ پڑھنا یا سننا پڑیں گے۔

ابتدائی تعلیم میرے کسی اجازت یافتہ سے حاصل کرنا ہوگی اور جب تک پچیس بار ان سے خط و کتابت نہ ہو چکے براہِ راست مجھ سے تعلیم کی استدعا نہ کی جائے۔

ان شرائط ہی سے ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ چاہتے تھے طالب بیعت اپنے اخلاق و عمل کو خود سنوارے۔

مستورات کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے شوہر یا شوہر نہ ہونے کی صورت میں کسی محرم، سرپرست کی صریح اجازت حاصل کر کے پیش کریں اس کے بعد پردے کے پورے اہتمام کے ساتھ بیعت فرماتے تھے۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ بیعت کے وقت عورت کے کسی محرم کو ضرور پاس رکھتے تھے یا پھر اپنی اہلیہ یا کسی محرم عورت کو اپنے پاس رکھتے۔

ایسے حضرات جو کسی صحیح سلسلے سے متعلق ہوں اور اپنے شیخ کی وفات پر آپ سے مکرر بیعت کے طلب گار ہوں ان کو اپنے سلسلے میں بیعت نہیں کرتے تھے بلکہ ان سے فرماتے۔

''پچھلی بیعت مع اپنی ساری برکات کے بدستور قائم ہے، تجدید بیعت کی حاجت نہیں البتہ طریق تعلیم کے لیے حاضر ہوں۔''

اتباع شیخ اصلاح باطن کی کنجی ہے لیکن آپ فرماتے تھے اس کے بھی حدود متعین ہیں، آپ فرماتے تھے، یہ اتباع نہ عقائد میں ہے نہ کشفیات میں، نہ امور معاشیہ میں، صرف طریق تربیت و تشخیص امراض میں ہے جن کا تعلق اصلاح تربیت باطنی سے ہے۔ وہ بھی اسی وقت تک جب تک کہ ان کا جواز مرید و شیخ کے درمیان متفق علیہ ہو اور اگر اختلاف ہو تو شیخ سے مناظرہ کرنا خلافِ طریق ہے۔ نہایت ادب کے ساتھ شیخ کو اطلاع کرے میں فلاں عمل کو جائز نہیں سمجھتا اور ہمارے سلسلے میں اس کی تعلیم ہے مجھ کو کیا کرنا چاہیے۔ اس پر اگر شیخ پھر بھی وہی حکم دے تو اس شیخ کو چھوڑ دینا چاہیے اور اگر وہ ترک کی اجازت دے تو یہ بھی اس کی متابعت ہے۔ مختصر یہ کہ جو مرض نفسانی اس نے تجویز کیا ہو یا جو تدبیر اس نے تجویز کی ہو یا عمل مشروع جس کا مشروع ہونا شیخ و مرید میں متفق علیہ ہو، تجویز کیا ہو یا جو تدبیر اس نے تجویز کی ہو یا عمل مشروع جس کا مشروع ہونا شیخ و مرید میں متفق علیہ ہو، تجویز کیا ہو ان چیزوں میں اتباع کامل کرے۔ ذرا بھی اپنی رائے کو دخل نہ دے اور باقی امور میں اتباع مراد نہیں۔''

☆☆☆

بڑی ضرورت اس بات کی تھی کہ رشد و ہدایت کے میدان کو وسیع کیا جائے۔ ایک طرف جہالت تھی یا جاہلانہ خیالات تھے جو لوگوں کے ذہنوں میں رچ بس گئے تھے، دوسری طرف انگریزی تعلیم و اقدار تھیں جو لوگوں کے ذہنوں کو خراب کر رہی تھیں۔ ہندوانہ تعلیمات تھیں جن کا اثر مسلمانوں پر بھی ہوا تھا۔ اس عالم میں ایک مصلح کی ذمے داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ تجدید دین کا یہی کام شاہ ولی اللہ نے کیا تھا اور اب یہی کام مولانا کے سامنے تھا۔ محض وعظ و تلقین کے ذریعے عہدہ برآ نہیں ہوا جا سکتا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ مستقل تصانیف عوام کے سامنے لائی جائیں۔ فرصت کم تھی اور کام بہت تھے۔

وہ قرآن پاک کے حافظ تھے، محدث تھے، فقیہہ تھے، خطیب تھے، صوفی تھے، مرشد کامل تھے، مصلح امت تھے۔ امت کے سیکڑوں مصائب کی اصلاح کی۔ ضروری تھا کہ اپنے ارشادات و خیالات کو قلم بند کریں تاکہ آپ جب اس دنیا میں نہ رہیں تو لوگ ان کتابوں کے ذریعے اصلاح احوال کریں۔ اس ضرورت نے آپ کو تصنیفات کی طرف راغب کیا۔ ان تصانیف کی تعداد کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ جس کی جان کو اتنے جھمیلے ہوں وہ شخص اتنا کثیر التصنیف ہو سکتا ہے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد جن میں چھوٹے بڑے رسائل اور ضمیمہ تصانیف سب داخل ہیں، آٹھ سو کے قریب ہے۔

ان تصانیف میں آپ کے ترجمہ قرآن کو زیادہ مقبولیت ملی۔ مولانا شاہ رفیع الدین کا ترجمہ بہت ہی صحیح تھا لیکن بہت ہی لفظی تھا۔ مولانا تھانوی نے اسے محسوس کیا اور ایک ایسا ترجمہ کیا جو صحیح بھی ہے اور فصیح بھی۔ ایک خاص بات اور ملحوظ رکھی کہ اس زمانے میں کم فہمی یا ترجموں کی عدم احتیاط کی وجہ سے جو شکوک قرآن پاک کی آیات میں عام پڑھنے والوں کو معلوم ہوتے ہیں ان کا ترجمہ ہی اس میں ایسا کیا گیا ہے کہ کسی تاویل کے بغیر وہ شکوک ہی ان ترجموں کے پڑھنے سے دل میں نہ آئیں اس لیے کہیں کہیں مزید تفہیم کی غرض سے قوسین میں ضروری تفسیری الفاظ بھی بڑھائے گئے ہیں۔ یہ مولانا کی عظیم الشان خدمت ہے۔

مولانا نے بارہ جلدوں میں قرآن پاک کی پوری تفسیر بھی فرمائی۔ یہ تفسیر ڈھائی سال کی مختصر مدت میں مکمل کی۔ یہ تفسیر اتنی جامع ہے کہ یہ قول اس کے لیے مشہور ہو گیا ہے کہ اردو کی یہ تفسیر عوام سے زیادہ علما کے دیکھنے کے قابل ہے۔

علوم القرآن کے مختلف مباحث و مسائل تو مولانا کی ساری تصنیفات و مواعظ، ملفوظات اور رسائل میں ملتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی یکجا کر دے تو خاصی ضخیم کتاب ہو جائے مگر ان پر مستقل طور پر بھی کم از کم چار کتب تحریر فرمائیں۔

علم حدیث سے بھی آپ کو بے حد شغف تھا۔ اس پر بھی آپ نے مختلف عنوانات کے تحت رسائل تحریر کیے۔

مولانا کو مسائل فقہ سے خاص ذوق تھا۔ ابھی تعلیم سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ فتویٰ نویسی کا آغاز کر دیا تھا۔ تقریباً ساٹھ سال اس فن سے وابستہ رہے۔ اس طویل عرصے میں ہزاروں مسئلوں کے جواب دیے۔ یہ جوابات متعدد ضخیم جلدوں میں جمع کیے گئے ہیں۔ یہ بھی آپ کی مستقل تصانیف ہی ہوئیں۔

بہشتی زیور کی دس جلدیں جو گھر عورتوں کی ضروریات کے لیے ہیں مگر ان میں تمام ابواب فقہ کے مسائل درج ہیں۔ جن کے جوابات ہندوستان کے حالات اور ضروریات اور اصطلاحات کے مطابق صرف انہی کتابوں سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ یہ کتاب آج تک مقبول چلی آتی ہے۔

بہشتی زیور کا مردانہ سلسلہ بہشتی گوہر کے نام سے تحریر فرمایا۔ اس میں خاص طور پر ان مسائل کا بیان ہے جو مردوں سے خاص ہیں جیسے جمعہ، جماعت، عیدین وغیرہ۔

علم کلام و عقائد و توحید پر متعدد رسالے قلم بند فرمائے۔ خاص نئے زمانے کے حالات کا خیال کر کے خود چند کتابیں تالیف فرمائیں اور دوسروں سے ترجمہ کروائیں۔

علم سلوک و تصوف، علما کا ہمیشہ سے خاص موضوع رہا ہے۔ قدما صوفیہ نے اس پر لاتعداد کتب تصنیف کی ہیں۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے اس کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے لیکن یہ بہت دور کی باتیں ہو گئی تھیں۔ زیادہ تر رسائل عربی میں تھے جو عوام کی پہنچ سے دور تھے۔ پھر ہندوستان میں ہندوؤں کے اثر سے اس میں ایسے مسائل شامل ہو گئے جو اسلام کی روح سے منافی تھے۔ مولانا نے اس فن پر بھی تحریریں لکھیں ''قصد السبیل'' جو مختصر سا رسالہ ہے لیکن کوزے میں دریا بند ہے۔

اہل تحقیق کے لیے اس فن شریف پر ایک جامع کتاب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تالیف فرمائی جو پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ یہ حقیقت طریقت، حقوق طریقت، تحقیق کرامت وغیرہ پر مشتمل ہے۔

اس تحقیق سے انہوں نے ثابت کیا کہ شریعت وطریقت الگ الگ دو چیزیں نہیں بلکہ احکام الٰہی کی بہ اخلاص تمام تعمیل وتکمیل ہی کا نام طریقت ہے۔

مثنوی مولانا روم کا شہرہ تصوف کی دنیا میں نیا نہیں۔ اس کی افادیت کے پیشِ نظر مولانا کی نظر بھی اس طرف گئی۔ اس مثنوی میں جو مسائل بیان ہوئے ہیں اسے قرآن وحدیث سے ثابت کرنے کے لیے ''کلید مثنوی'' تحریر فرمائی۔ اس مثنوی کی شرحیں تو لکھی گئی تھیں لیکن یہ کام نیا تھا۔

اسی طرح آپ دیوانِ حافظ کی طرف راغب ہوئے۔ دیوانِ حافظ کی پرجوش ومردافگن شراب نے بھی بہت سے بے احتیاط مے نوشوں کو راہ سے بے راہ کردیا تھا۔ مولانا تھانوی نے ''عرفان حافظ'' کے نام سے اس کی ایسی شرح لکھی کہ اس پھول سے ہر کانٹا الگ ہوگیا۔

طالبین وسالکین کی تعلیم وتربیت کے لیے ''تربیت السالک'' کا سلسلہ مرتب فرمایا جس میں سالکین کی مشکلات راہ ذاکرین وشاکرین وشاغلین کے شبہات وخطرات راہ کے لیے ہدایات درج ہیں۔ بارہ سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب ان کے لیے مفید تر ہے جو اس راہ پر چلنا چاہتے ہیں۔

آپ کے ملفوظات کو بھی آپ کی تالیفات ہی میں شمار کرنا چاہیے۔ ان ملفوظات کا سلسلہ تقریباً ساٹھ مجلدات اور رسائل میں مدون ہوا ہے۔

مولانا کا خاص موضوع اصلاح مسلمین تھا۔ اس سلسلے میں آپ کی سب سے اہم چیز ''مواعظ'' ہیں۔ آپ کے جو مواعظ مختلف شہروں میں ہوتے رہتے تھے آپ کے معتقدین انہیں لفظ بہ لفظ قید تحریر میں لاتے رہتے تھے۔

آپ کے ان مواعظ کی وسعت کا عالم یہ ہے کہ مجالس ومدارس اور خانقاہوں سے شروع ہوکر شادی وغمی کے رسوم اور روزمرہ کی زندگی تک محیط ہیں۔ عموماً واعظین صرف عقائد وعبادات پر گفتگو فرماتے ہیں لیکن مولانا کا طریقہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے اخلاق ومعاملات اور عملی زندگی کے کاروبار کی اصطلاح پر بھی زور دیتے تھے۔

تقریباً چار سو مواعظ جو احکامِ اسلامی، رد بدعات، تدابیر وتجاویز پر مشتمل ہیں مرتب ہوئے۔

مواعظ کے علاوہ اس سلسلے کی اہم کڑی ان کی کتاب حیٰوۃ المسلمین ہے جس میں قرآن، احادیث کی روشنی میں مسلمانوں کی دینی ودنیاوی ترقی وفلاح کا مکمل پروگرام مرتب فرمایا۔

اس سلسلے کی دوسری کتابیں ''اصلاح الرسوم' اصلاح امت، اصلاح انقلاب امت وغیرہ ہیں اور ہر ایک کا منشا یہ ہے کہ مسلمانوں کی اخلاقی، اجتماعی، معاشرتی زندگی خالص واسلامی طریق پر ہو۔

☆☆☆

کرامات کو لوگوں نے بزرگی کے لیے شرط قرار دے دیا ہے حالانکہ ان کرامات کی حقیقت صرف اتنی ہے جو حدیث مبارکہ سے ثابت ہے۔

''مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔''

یہ نورِ ربانی انبیائے کرامؑ کو بدرجہ اتم اور اولیائے کرامؒ کو حسب مراتب حاصل ہوتا ہے۔ لوگوں کے ذہنوں سے یہ بات نکل گئی اور کشف کرامات کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

مولانا تھانوی کو بھی ''فراست مومن' سے حصہ وافر ملا تھا۔ اسی کی روشنی میں سیکڑوں ایسے واقعات رونما ہوئے جنہیں کرامات کہہ لیا جائے۔

ان کی ایک بڑی کرامت یہ تھی کہ انہوں نے وقت کو اپنے تابع کرلیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے وقت میں برکت دے دی تھی۔ اسی عمر میں جو عام انسانوں کی عمر ہوتی ہے انہوں نے اتنے بڑے کام کرلیے جو ایک آدمی نہیں ادارے کرتے ہیں۔ جس مضمون یا مسئلے کی تلاش ہوتی، غیب سے اس کے سامان مہیا ہوجاتے اور وہ مشکل حل ہوجاتی۔

☆☆☆

ایسا نہیں تھا کہ سب آپ سے محبت کرنے والے تھے۔ جتنے محبت کرنے والے تھے اتنے ہی مخالفین بھی تھے جو کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے لیکن آپ جس طرح محبت میں غلو نہیں کرتے تھے اسی طرح مخالفت میں بھی مبالغے سے کام نہیں لیتے تھے۔ آپ حتی الامکان گریز کرتے تھے کہ مخالفین کے اعتراضات کے جواب دیے جائیں۔ ایک مرتبہ مخالفین نے آپ پر بے سروپا الزامات لگائے کہ آپ حکومتِ برطانیہ کے ایجنٹ ہیں۔ الزام بہت سخت تھا۔ آپ تو خاموش رہے لیکن عبدالماجد دریابادی نے اپنے اخبار ''سچ'' میں اس کی تردید کی اور اس الزام کے خلاف نہایت مدلل مضمون لکھا۔ مولانا کو مطلع بھی کردیا کہ یہ واقعہ ہوا ہے۔ کوئی

اور ہوتا تو ایک مضمون اپنی طرف سے بھی لکھ بھیجتا لیکن آپ نے لکھا تو یہ لکھا۔

''یہ آپ کی محبت ہے مگر مجھ کو تو طبعاً اچھا نہیں لگا۔ اس اتہام میں نہ ان کا ضرر نہ میرا بلکہ جواب دینے میں ان کا یہ ضرر کہ اب تو وہ اتہام میں معذور ہیں اور جب وہ جواب پر مطلع ہوکر قبول نہ کریں گے تو عاصی ہوں گے۔ تو ایک مسلمان کو عاصی بنانا کیا فائدہ۔

زمانہ طالب علمی میں آپ کو مناظروں کا بہت شوق تھا لیکن یہ دیکھ کر کہ اس میں مخالفین کا جواب دینا پڑتا ہے، آپ مناظروں کو ناپسند کرنے لگے تھے۔

☆☆☆

عمر کے آخری حصے میں جب مختلف شہروں میں پیغام حق کی منادی کرچکے اور مختلف امراض نے بھی آ گھیرا تو اپنے حق میں یہی مناسب سمجھا کہ خانقاہ امدادیہ ہی میں عزلت نشیں ہوجائیں اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہوکر وہ کام سرانجام دیں جو ہوا میں تحلیل نہ ہوں بلکہ اس وقت بھی وعظ وتلقین کا ذریعہ بنیں جب ظاہری زبان بند ہوجائے۔ اللہ نے ایسی برکت دی کہ آپ کے گوشہ نشین ہوجانے کے بعد خانقاہ کی رونق میں مزید اضافہ ہوگیا۔ قافلے کے قافلے آپ سے ملنے کے لیے آنے لگے۔ اللہ والوں کے اجتماع اب خانقاہ ہی میں ہونے لگے۔ ایسی روح پرور فضا ہوگئی کہ جو بھی چند روز یہاں قیام کرتا اس کی کایا پلٹ ہوجاتی۔

گوشہ نشینی صرف سفر وہجر کے لیے تھی ورنہ زائرین خانقاہ کو ملفوظات کے ذریعے اور دوسرے طالبین کو مکتوبات کے ذریعے برابر مستفیض فرماتے رہے۔ آپ کو اب یہ بھی اطمینان تھا کہ ایسے لوگ تیار ہوچکے ہیں جو طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں اور اپنی اپنی جگہ تبلیغ ورشد میں مصروف ہیں۔ سید سلیمان ندوی جیسے عالم کا تعلق خانقاہ سے قائم ہوا تو آپ نہایت قلبی اطمینان کے ساتھ کہا ''اب میرا کیا کام۔ اب مجھے اطمینان ہے کہ میرے مذاق کو سمجھنے والے اور اس کو پھیلانے والے موجود ہیں۔''

وہ اطمینان قلب کے ساتھ فرائض انجام دے رہے تھے کہ معدے کا عارضہ لاحق ہوگیا پھر جگر نے بھی عاجز کرنا شروع کردیا لیکن اعصاب ایسے مضبوط تھے کہ اس تکلیف دہ صورت حال کو مسلسل پانچ برس تک برداشت کرتے رہے لیکن بڑھاپا تھا۔ اس سے پہلے اگر بیماری آتی بھی تھی تو بہت جلد شفایاب ہوجاتے تھے۔ یہ کیفیت مسلسل رہی تو خیال ہوا کہ بڑھاپا ہے اور مرض کم ہونے کے بجائے بڑھتا جارہا ہے۔ اسی بیماری میں اگر بلاوا آگیا تو طویل کلام کی مہلت کہاں ملے گی۔ زبانی کچھ کہہ بھی دیا تو بات کا مفہوم مختلف ذہنوں میں مختلف انداز سے پہنچے گا۔ اس سے پہلے کہ دعوت نامہ آئے، وصیت لکھ کر احبا کے حوالے کردوں۔ آپ نے جو وصیت تحریر کی اس میں بھی خیر اندیشی اور مسلمانوں کی فلاح کا جذبہ صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔

آپ نے فرمایا ''میں اپنے دوستوں سے استدعا کرتا ہوں کہ میرے سب معاصی صغیرہ وکبیرہ عمد وخطا کے لیے استغفار فرمائیں اور جو میرے اندر عادات واخلاق ذمیمہ ہیں ان کے ازالے کی دعا کریں۔

اگر بعض بندگانِ خدا کو حاضرانہ غائبانہ میری زبان یا ہاتھ سے کچھ کلفتیں پہنچی ہیں اور کچھ حقوق ضائع ہوئے ہیں، اس کے لیے میں نہایت عاجزی سے سب چھوٹے بڑوں سے استدعا کرتا ہوں کہ دل سے ان کو معاف فرمادیں۔

وہ کوتاہیاں جو دوسروں سے میرے حق میں ہوگئی ہوں، وہ سب معاف کرتا ہوں۔

میری تحریرات میں جو مضامین از قبیل علوم مکاشفہ ہیں جو کہ علم تصوف کی ایک شکل ہے ان کو دلائل شرعیہ کے درجے میں نہ سمجھنا چاہیے بلکہ بالکل اعتقاد نہ رکھنا بھی جائز ہے اور اگر اعتقاد رکھے تو محض احتمال کے درجے سے تجاوز نہ کرے۔

میں سب مسلمانوں کو بہت تاکید کے ساتھ کہتا ہوں کہ علم دین کا خود سیکھنا اور اولاد کو تعلیم کرانا ہر شخص پر فرض عین ہے بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ فتن دینیہ سے حفاظت ہوسکے جن کی آج کل بے حد کثرت ہے اس میں ہرگز غفلت اور کوتاہی نہ کریں۔

تعجیل نہایت بُری چیز ہے۔ بے مشورہ کوئی کام نہ کریں۔ غیبت قطعاً چھوڑ دیں۔ پوری رغبت کے بغیر کھانا ہرگز نہ کھایا جائے۔ سخت حاجت کے بغیر قرض نہ لیں۔ فضول خرچی کے پاس نہ جائیں۔ سخت مزاجی اور تندخوئی کی عادت نہ کریں۔ ریا وتکلف سے بچیں۔ اقوال وافعال میں بھی طعام ولباس میں بھی۔ روایات وحکایات میں بے انتہا احتیاط کریں۔ اپنے قول پر جمود نہ کریں۔ کسی کے دنیوی معاملات میں دخل نہ دیں۔ فکر آخرت سے غافل نہ ہوں۔

میں درخواست کرتا ہوں کہ ہر شخص سورۂ یٰسین شریف یا تین بار قل ھواللہ شریف پڑھ کر مجھ کو بخش دیا کرے۔

میرے ایصالِ ثواب کے لیے کبھی جمع نہ ہوں۔ نیز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری مستعمل چیزوں کے ساتھ تعارف طریق سے تبرکات کا سا معاملہ نہ کریں۔"

علاج برابر ہو رہا تھا لیکن مرض میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ ہاتھ پاؤں متورم ہو گئے۔ بھوک تقریباً جاتی رہی۔ بستر پکڑنے کی نوبت آ گئی۔ بستر کے قریب ایک کرسی رکھی رہتی۔ جو ملنے آتا بیٹھ جاتا۔ اس عالم میں بھی پوچھنے والے مسائل کا حل پوچھتے تھے۔ ذہن اتنا حاضر تھا کہ مدلل جوابات سے نوازتے۔ پھر ناتوانی اور ضعف کی وجہ سے غنودگی کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ جب بھی ہوش آتا اور جتنی دیر بھی رہتا اپنے عارفانہ کلمات سے مستفیض فرماتے رہتے۔

سید سلیمان ندوی مزاج پرسی کے لیے آئے ہوئے تھے۔ حالت غیر دیکھی تو قیام کرنا پڑا۔ یہاں سے آپ کو سرکارِ بھوپال کی ایک ضروری دعوت پر بھوپال جانا تھا۔ وہ گیارہ جولائی 1943ء کو مولانا تھانوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک ہفتہ سے روز ہی حاضر ہو رہے تھے۔ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھے رہے پھر بڑی ہمت کر کے بھوپال جانے کی اجازت چاہی۔

"سرکار، ایک بہت ضروری کام سے بھوپال جانے پر مجبور ہوں، خصوصاً اس حالت میں کہ بلاوا اس طرف سے ہے۔"

"میری طبیعت کا خیال مت کرو۔ دنیا کے کام تو چلتے ہی رہتے ہیں۔"

"کوئی اور موقع ہوتا تو انکار کر دیتا لیکن معاملہ دین کا ہے۔"

مولانا تھانوی نے لیٹے لیٹے دونوں ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھا دیے اور فرمایا "جاؤ، خدا کے سپرد۔"

نقاہت بڑھتی رہی۔ اب اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ رفع حاجت کے لیے بھی بستر چھوڑ سکیں۔

مغرب کی نماز بستر پر لیٹے لیٹے ادا کی۔ کچھ دیر آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھتے رہے۔ کچھ دیر غشی کی سی کیفیت طاری رہی۔ پھر آنکھیں کھول دیں۔ آپ کی چھوٹی اہلیہ قریب تھیں۔

"میں تم دونوں کا ماہوار خرچ دے چکا ہوں؟"

"ہمیں بہت کچھ مل چکا ہے۔ آپ دے چکے ہیں، بے فکر رہیں۔" اہلیہ نے فرمایا۔

"آج تو ہم جا رہے ہیں۔" آپ نے کچھ دیر کے سکوت کے بعد فرمایا۔

"کہاں؟"

"تم نہیں جانتیں؟"

اس کے بعد جو غشی طاری ہوئی تو سوا گھنٹے تک طاری رہی۔ سانس کا زیر و بم بتا رہا تھا کہ آپ غشی میں ہیں پھر ایسا لگا کہ سانس آنا بند ہو گیا ہے۔

رشد و ہدایت کا آفتاب بجھ چکا ہے۔ ہر طلوع ہونے والے کا مقدر غروب ہونا ہے۔ یہ 19، 20 جولائی 1943ء کی درمیانی رات تھی۔ غروب ہونے والے کی عمر 82 سال تھی۔

صبح ہوئی نہیں تھی کہ تھانہ بھون کی تسکین گاہ الم کدہ بن گئی۔

اس سانحہ عظیم کی اطلاع دلوں پر برق بن کر گری۔ صبح ہوتے ہوتے ہزاروں محبت کے مارے، اشک فشاں جمع ہوئے۔ سہارن پور اور دوسرے شہروں سے اسپیشل ٹرینیں شیدائیوں کو لے کر آ گئیں۔

عیدگاہ میں نماز ادا کی گئی اور پھر آپ ہی کے وقف کردہ تکیہ میں جس کا نام "قبرستان عشق بازاں" تھا آپ کے جسم خاکی کو پیوند خاک کر دیا گیا۔

اخباروں اور رسالوں نے آپ کے علمی و عملی کارناموں پر متعدد مضامین شائع کیے جن کا سلسلہ ہفتوں چلتا رہا۔ سید سلیمان ندوی نے اپنے جذبات کو نظم کی شکل دی۔

داغ فراق یار مٹایا نہ جائے گا
اب دل کا یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا
حرف دم وداع خدا کے سپرد ہو
تا آخر حیات بھلایا نہ جائے گا

اے دل خموش صبر و رضا کا مقام ہے
نقش دوام نبض مٹایا نہ جائے گا
پیر مغاں نہیں ہے مگر مے کدہ تو ہے
جام و سبو یہاں سے ہٹایا نہ جائے گا
یونہی بچھا رہے گا یہاں خوان فیض عام
جب تک ہیں مہماں بڑھایا نہ جائے گا
چاہا خدا نے تو تری محفل کا ہر چراغ
یونہی جلا کرے گا بجھایا نہ جائے گا

☆☆☆

تلخیص: "حیات اشرف" مولفہ مولانا ڈاکٹر غلام محمد

باغی کمانڈر

محمد عفان

وہ آزادی کی خاطر حکومتِ وقت سے برسرِپیکار تھے۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا حق وصول کرنا چاہتے تھے، مگر دنیا انہیں پُرتشدد تحریک کا کارکن سمجھتی ہے۔ آخر وہ کون لوگ ہیں؟ ان کا مطالبہ کیا ہے؟

ایک جنگجو قبیلے کی داستان مختصر سا بیان

اُس نے سیاہ رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ چہرہ سیاہ پگڑی کے بڑے سے پلو سے ڈھکا ہوا تھا۔ کمر پر بندھی بیلٹ میں گولیاں لگی ہوئی تھیں۔ کاندھے سے خودکار رائفل لٹک رہی تھی۔ پیٹھ پر لٹکتے بیگ میں دستی بم اور دوسرا دھماکا خیز مواد رکھا ہوا تھا۔ اُس وقت میں مسلح باغیوں کے اہم ترین کمانڈر کے ساتھ صحرائے صحارا کی زرد اور دانے دار ریت پر چلتا ہوا جا رہا تھا۔

ہم پہاڑی غاروں میں باغیوں کے ٹھکانے سے نیچے اتر کر اس صحرائی بستی میں جا رہے تھے، جو ان توارگی باغیوں کا مضبوط گڑھ تھی۔ یہ میرے ساتھ چلنے والے باغی کمانڈر کا آبائی گاؤں بھی تھا۔ ہم دونوں ایک فٹبال گراؤنڈ کے قریب سے گزر رہے تھے۔ اُس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں اِدھر اُدھر ہونے کے بجائے اُس کے ساتھ ساتھ لگا ہوا چلتا رہوں۔ ایک میرا پاؤں رپٹ گیا۔

"دھیان سے چلو۔" یہ دیکھتے ہی اُس نے سرزنش کی۔

"پتا نہیں نائیجر آرمی نے کہاں کہاں بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہیں۔ خود بھی بچو اور ہمارے لیے بھی خطرہ نہ بنو۔" وہ مجھے ڈانٹ رہا تھا لیکن اُس کے لہجے میں وہ تشویش بھی نظر آ رہی تھی جو میری حفاظت کے خیال سے اُس کے دل میں تھی۔

"ٹھیک ہے، اب زیادہ احتیاط کروں گا۔" میں نے پاؤں رپٹ جانے کو جواز بنا کر صفائی پیش کرنے سے اجتناب برتتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا۔" وہ میرا جواب سُن کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم خاصے عقلمند ہو۔"

"شکریہ۔" میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ اب میں بالکل اُس کے کندھے سے لگا ہوا چل رہا تھا۔ بارودی سرنگوں کے بچھے ہونے کا سُن کر میرے جسم کا خون تو ویسے ہی خشک ہو گیا تھا۔ زمین پر پڑنے والے ہر قدم پر مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں اب دھماکا نہ ہو جائے۔ اُس دن پہلی بار مجھے حقیقت میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قدم قدم پر موت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

ہم جس صحرائی میدان سے گزر رہے تھے، وہاں پر بڑی تعداد میں بارودی سرنگوں کی موجودگی کی اطلاع تھی۔ ان میں سے متعدد کو باغیوں کے اسلحہ ماہرین نے ناکارہ بناڈالا تھا لیکن اب بھی انہیں شک تھا کہ اُن میں سے کافی ساری بارودی سرنگیں ہروقت چلتے پھرتے ریت کے ٹیلوں تلے دفن ہیں۔ اس لیے ہم نہایت احتیاط سے پھونک پھونک کر ایک ایک قدم آگے بڑھا رہے تھے کہ مُبادا ان میں سے کسی ایک پر ہمارا غلطی سے بھی کہیں پاؤں نہ پڑ جائے۔ ویسے بھی بارودی سُرنگیں ایسا دشمن ہیں کہ جس کا اُس وقت تک پتا نہیں چلتا، جب تک وہ آپ پر حملہ آور نہ ہو جائے۔ ایسا ہو تو پھر آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ جو کرتا ہے وہ اوپر والا ہی کرتا ہے۔

''احتیاط ہی ہماری زندگی بچا سکتی ہے۔'' اس نے شاید میرے چہرے پر چھائی زردی کو محسوس کر لیا تھا۔ ''اب اس ریت کو دیکھ کر کیا پتا چل سکتا ہے کہ کہاں پر موت ہماری منتظر ہے۔''

دنیا کے عظیم صحرائے صحارا میں درجۂ حرارت ایک سو ڈگری فارن ہائیٹ ہو چکا تھا۔ موسم شدید خشک اور گرم تھا۔ ہم گرم ریت پر تپتے سورج اور کھلے آسمان تلے پیدل چلتے جا رہے تھے۔ تیز لُو چل رہی تھی۔ اُڑتی ہوئی گہری زرد ریت شمال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے اس وقت جو ٹیلے موجود تھے، ضروری نہیں کہ چند گھنٹوں کے بعد جب ہم اس راستے پر واپس پلٹیں تو یہ اپنی جگہ پر موجود ہوں۔ ہم اُس وقت صحرائی وادی تزرزیت کے علاقے المصائف میں تھے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں نائیجر فوج سے برسرِ پیکار توارگ خانہ بدوش جنگجوؤں کا قبضہ ہے۔ ویسے بھی یہ علاقہ ان باغی اور مسلح خانہ بدوشوں کی آبائی سرزمین ہے۔

میں اس مقام پر گزشتہ دو دہائیوں سے جاری باغی خانہ بدوشوں اور نائیجر فوج کے درمیان ہونے والی مسلح کشمکش کے اثرات کا جائزہ لینے پہنچا تھا۔ جب میں اس صحرائی وادی میں پہنچا، اُس سے صرف چند روز پہلے ہی یہاں نائیجر فوج نے زمینی اور فضائی حملہ کیا تھا۔ حملہ بہت شدید تھا لیکن میرے ساتھ ساتھ چلنے والے باغی کمانڈر کے مسلح حملہ آوروں نے اس جھڑپ میں کامیابی حاصل کی تھی۔ انہوں نے فوج کو شدید نقصان پہنچا کر پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

نائیجر کے یہ تمام خانہ بدوش مسلح باغی نسلی طور پر توارگ اور اس کے دیگر ذیلی قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ 'توارگ' وہ صحرائی خانہ بدوش قبیلہ ہے جو شمالی افریقا کے صحرائے صحارا کی تجارتی گزرگاہوں پر گزشتہ کئی صدیوں سے اپنا تسلط قائم کیے ہوئے ہیں۔ یہ تجارتی گزرگاہ صدیوں سے نمک، سونا، مصالحہ جات اور غلاموں کی ترسیل کے حوالے سے پورے افریقی خطے میں وہی اہمیت رکھتی ہے جو تاریخ میں چین کے ریشم کی تجارت کے حوالے سے 'شاہراہِ ریشم' کی رہی ہے۔

نائیجر حکومت کے خلاف مسلح بغاوت 'موومنٹ آف نائیجیرین فار جسٹس' کے نام سے قائم ایک جماعت کی سرکردگی میں جاری ہے جس میں کبھی شدت اور کبھی کبھی جنگ بندی کے معاہدے بھی آجاتے ہیں۔ ماضی قریب میں اس تحریک کو لیبیا کے سربراہ معمر قذافی کی مضبوط حمایت حاصل تھی، تاہم اب معمر قذافی کے بعد یہ تنظیم تنِ تنہا جدوجہد میں مصروف ہے۔

گزشتہ دو دہائیوں سے جاری باغیوں کی یہ مسلح تحریک گزشتہ دو برسوں سے سنگین رُخ اختیار کر گئی ہے۔ کچھ عرصے پہلے باغیوں نے ایک کارروائی کے دوران 72 نائیجر فوجیوں کو گرفتار کر کے حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ... توارگ خانہ بدوش قبائلیوں کی سرزمین پر کان کنی کر کے نکالے جانے والے قیمتی یورینیم میں سے اُنہیں ان کا مالی حصہ ادا کرے۔ اپنے مطالبے کے کچھ عرصے کے بعد انہوں نے خیر سگالی کے اظہار کے لیے پکڑے گئے تمام فوجیوں کو رہا کر دیا تھا ماسوائے ایک کے۔ ''وہ جنگی جرائم میں ملوث تھا اس لیے ہم نے اُسے رہا نہیں کیا تھا۔'' باغی کمانڈر نے فوجیوں کو حراست میں لینے اور رہا کیے جانے کا واقعہ تفصیل سے سنانے کے بعد آخر میں وہ وجہ بیان کی جس کی وجہ سے ایک نائیجر فوجی بدستور اُن کی تحویل میں تھا۔

توارگ خانہ بدوش باغی جہاں ایک طرف حکومت سے اپنا مالی حصہ وصول کر لینے کے لیے برسرِ پیکار ہیں، وہیں انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم پر بھی توجہ دی ہے۔ ''مقامی توارگ باشندوں نے تزرزیت کے ایک علاقے میں اسکول بھی قائم کیا ہے۔ باغی کمانڈر بتا رہا تھا۔ ''ہم نے مقامی باشندوں سے کہا ہے کہ جب اُن کے بچے مویشی چرانے سے فارغ ہو جائیں تو انہیں اسکول بھیج دیا جائے۔ ہمارے یہاں اسکول نہیں تھا۔ ہمارے بچے بہت دُور واقع دوسرے گاؤں میں، دوسرے قبیلوں کے ہاں پڑھنے کے لیے جاتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اسکول کے لیے جو بچے گھر اور گاؤں سے نکلا وہ پھر کبھی نہیں لوٹا۔ ہمیں شک ہے کہ وہ نائیجر فوج کے ہتھے چڑھ جاتا ہوگا اور وہ ہم سے نسلی نفرت کی بنا پر اُسے مار ڈالتے ہوں گے۔ اس لیے

والدین نے بچوں کو اسکول بھیجنا ہی بند کر دیا لیکن اب ایسا نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے رُکا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اب ہمارے بچے اپنے ہی علاقے کے اسکول میں پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ یہاں پر نہ تو انہیں کوئی خطرہ ہے اور نہ ہی ان کے والدین کوئی ڈر محسوس کرتے ہیں اور ڈریں بھی تو کیوں آخر کو ہم سب توارگی ہی تو ہیں۔ پھر اپنوں سے ڈر کیسا۔ غیر ہوں تو پھر ڈر لگتا ہے نا۔''

جس وقت کمانڈر مجھے اس اسکول کے بارے میں بتا رہا تھا، اُس وقت ہم ایک کنویں کے گرد قائم اُسی گاؤں کی طرف بڑھتے جا رہے تھے جہاں یہ اسکول بنایا گیا تھا۔ یہ علاقہ لق و دق صحرا پر مشتمل ہے جہاں سے مویشیوں کی چراگاہیں دُور اور پانی اُس سے بھی بہت دُور ملتا ہے۔ اس لیے جس زمین پر پانی نکل آئے وہاں کنواں کھود لیا جاتا ہے اور پھر اسی کنویں کے گرد گاؤں بس جاتا ہے۔ یہ بھی ایسا ہی ایک بڑا سا گاؤں تھا جس کے بہت بڑے کنویں کے گرد خانہ بدوش توارگی آباد تھے۔ چارے اور خوراک کا انتظام تو وہ کہیں نہ کہیں سے کر لیتے تھے مگر صحرا میں پانی..... یہ تو ایک بہت ہی بڑی نعمت ہے۔

''صحرا میں زندہ رہنا ایک فن ہے۔ میں نے یہ فن اپنے باپ سے سیکھا تھا اور انہوں نے یہ طریقۂ حیات میرے دادا سے سمجھا تھا۔'' کمانڈر نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد باتوں کا سلسلہ ایک بار پھر شروع کیا۔ ''کس طرح نمک کے کاروانوں کے ساتھ سفر کیا جائے، صحرا میں کہاں کہاں پر چراگاہیں مل سکتی ہیں، خشک چٹیل پہاڑوں میں ہمیں کہاں کہاں پر جنگلی شکار مل سکتا ہے، کہاں پر پانی ہوگا، کہاں پر سفر کے دوران پڑاؤ ڈالا جائے یہ سب باتیں وہ بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ میں بھی یہ سب باتیں جانتا ہوں مگر اب صحرائی زندگی کا چلن بدل رہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کہنے لگا۔ ''ہمارے بچے شاید باپ داداؤں کی لگی بندھی زندگی کا ساتھ نہ دے پائیں۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ توارگی بھی بدل رہے ہیں۔ صحرا سمٹ رہا ہے اور پھیلی ہوئی دنیا بھی تیزی سے سمٹتی جا رہی ہے۔ ہمارے بچے بھی تبدیلی پسند ہیں۔ وہ بھی بدلی دنیا کے ہم قدم ہو کر چلنا چاہیں گے۔ دنیا میں زندہ رہنے کے لیے انہیں تعلیم کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس لیے ہم اسکول پر توجہ دے رہے ہیں۔ ہمارے بچوں کو آنے والے کل میں زندگی بسر کرنے کی تیاری، آج سے ہی شروع کرنی ہے۔ اس لیے آج اسکول کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں اس بات کا احساس ہے۔ اسی لیے ہم اپنے بچوں کے لیے اسکول تعمیر کر رہے ہیں، تاکہ انہیں آنے والے کل کے لیے تیار کر سکیں۔'' باتیں کرتے کرتے ہم گاؤں میں پہنچ چکے تھے۔ چند لمحوں بعد ہم اسکول کے احاطے میں تھے۔

احاطے میں قائم اسکول کی عمارت گارے سے تعمیر کی گئی تھی۔ اسکول میں تین کمرے تھے اور اس کی دیواروں پر جگہ جگہ گولیوں کے نشانات تھے۔ یہ وہ گولیاں تھیں جو نائیجر فوج کے مختلف حملوں کے دوران اُن پر برسائی گئی تھیں۔

یہاں ہمیں بیٹھے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کندھوں پر کلاشنکوف لٹکائے چار مسلح باغی، نائیجر فوج کے اُس سپاہی کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے آپہنچے، جو اُن کے مطابق توارگی باشندوں کے خلاف جنگی جرائم میں ملوث تھا۔ اُسے سامنے نظر آنے والے پہاڑوں میں بنے ہوئے قدرتی غاروں میں سے کسی ایک میں قید رکھا گیا تھا۔ نائیجر فوج کا یہ قیدی سپاہی اُس وقت نہایت ڈرا، سہما ہوا تھا۔ اس کا جسم خاک سے اٹا ہوا تھا۔ بکھرے بال، آنکھوں میں خوف، ڈھلکے ہوئے کندھے، فوجی جوتوں کے کھلے ہوئے بند اور جسم پر پھٹی ہوئی کیموفلاج فوجی قمیص اس بات کا اشارہ تھی کہ اس پر تشدد بھی ہوا ہے اور اب وہ اپنی زندگی سے قدرے مایوس بھی ہے۔ باغیوں کے مطابق اس کی عمر ستائیس سال تھی لیکن گول چہرے اور سیاہ رنگ والا یہ فوجی اس سے کہیں کم عمر دکھائی دے رہا تھا۔ اُسے ہمارے سامنے زمین پر لا کر بٹھا دیا گیا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے جب نائیجر فوج ان باغیوں کے خلاف زمینی حملے میں پسپا ہو گئی تھی، تب انہوں نے اُن پر ایک رات ہیلی کاپٹروں سے فضائی حملہ کیا تھا۔ اس حملے میں کئی توارگی باشندے، متعدد باغی اور اس علاقے میں باغیوں کا ایک مقامی کمراہم کمانڈر بھی ہلاک ہو گیا تھا۔

''یہ ہمیں مارنے کے لیے ہیلی کاپٹر خرید سکتے ہیں لیکن ہمارے ہاں اسکول بنوانے اور پانی کے لیے کنویں کھدوانے کے لیے اُن کے پاس پیسے نہیں ہیں۔'' کمانڈر تیز لُو چل رہی تھی۔ سب خاموش تھے اور تیز ہوا کی سرکش سرسراہٹ کے ساتھ ساتھ صرف ایک آواز آ رہی تھی وہ بھی خانہ بدوش توارگی کمانڈر کی، جس کا شکوہ کچھ بے جا بھی نہ تھا۔

''یہ قبریں دیکھو۔'' وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اسکول کے فٹبال میدان کے ایک کنارے پر بنی تین قبروں کے قریب لا کر بولا۔ یہ تینوں قبریں نئی بنی ہوئی لگ رہی تھیں۔ ان پر چھوٹے چھوٹے پتھر ڈال کر ریت کو اُڑنے اور قبروں کو بے نشاں ہو جانے سے بچانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ''یہ تینوں قبریں گاؤں کے بزرگوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی ہیں۔ یہ تینوں غیر مسلح تھے، جب ہلاک کیے گئے۔ وہ بہت عمر رسیدہ تھے۔ اتنے کمزور تھے کہ ان کے ہاتھ بندوق پکڑ ہی نہیں سکتے تھے مگر پھر بھی یہ نائیجر فوج کی گولیوں کا نشانہ بنے۔'' میں کمانڈر کے لہجے سے تاسف کا اظہار صاف محسوس کر سکتا تھا۔ ''یہ قبر دیکھو۔ یہ بوڑھا تو نابینا تھا۔ وہ دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ جب حملہ ہوا تو گاؤں والے جان بچانے کے لیے بھاگے مگر یہ بے چارہ تو بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ حملے کے وقت یہ میدان میں سو رہا تھا اور مارا گیا۔'' کمانڈر نے ایک قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''انہوں نے ہم پر بہت ظلم کیا ہے۔ ہمارے بے گناہ دیہاتیوں کو گرفتار کر کے اُن کے ذریعے، اُن راستوں پر بارودی سرنگیں بچھوائی ہیں جو ہماری گزرگاہیں ہیں۔ جن پر ہمارے نمک کے کارواں چلتے ہیں۔ جن پر ہماری عورتیں اور بچے مویشیوں کو چرانے کے لیے لے کر جاتے ہیں اور لاعلمی میں بارودی سرنگوں پر پاؤں پڑنے کے باعث لاتعداد معصوم لوگ موت کے منہ میں جا چکے ہیں جبکہ کئی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معذور بن گئے ہیں۔''

یہ سن کر میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ فوج تمہیں مجبور کرنے کے لیے ایسا کر رہی ہو؟'' میں نے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اس نے تائید کی۔ ''لیکن یہ کیسا طریقہ ہے۔ ہم صرف حکومت کے خلاف ہیں۔ فوج ہم پر حملہ کرتی ہے تو ہم بھی جواب دیتے ہیں لیکن ہم نہتے لوگوں کو نشانہ نہیں بناتے۔ یہ ہماری خانہ بدوش روایات کے منافی ہے۔ اب یہی دیکھ لو۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر واپس اسکول کی طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگا۔'' کچھ عرصہ پہلے نائیجر فوج نے ہمارے اس گاؤں پر حملہ کیا تھا۔ ہم اُس وقت یہاں نہیں تھے بلکہ اوپر پہاڑوں پر اپنی پناہ گاہوں میں تھے۔ گاؤں میں صرف نہتے باشندے تھے مگر انہوں نے ان پر تشدد کیا۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔'' یہ کہہ کر اس نے اسکول کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''گاؤں کے تمام مردوں کو جمع کر کے اسکول کے عقب میں لے گئے اور اُن پر انہوں نے بدترین تشدد کیا۔ ان کے سروں سے ذرا اوپر فائر کیے انہیں ڈرانے کے لیے۔ اب تک اسکول کی کچی دیواروں میں وہ گولیاں دھنسی ہوئی ہیں جو نائیجر فوجیوں نے چلائی تھیں۔'' وہ خاموش ہوا اور پھر واپس پلٹا اور ایک قبر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ ''یہ دیکھو..... نائیجر فوج نے اس بوڑھے آدمی کو بدترین تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد گولی ماردی۔ اُس وقت میں سامنے والے پہاڑ پر موجود تھا۔ یہ بوڑھا درد کی شدت سے چلا رہا تھا مگر انہیں رحم نہیں آیا۔ جب وہ مار کھاتے کھاتے موت کے قریب ہو گیا تو انہوں نے اسے گولی ماردی۔ میرے کانوں میں اب بھی اس بوڑھے کی چیخیں گونجتی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ ''جانتے ہو..... وہ بوڑھا کون تھا۔'' یہ کہہ کر باغی کمانڈر خاموش ہوا اور گہری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''نہیں.....'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''وہ میرا باپ تھا۔'' یہ کہہ کر وہ میری طرف دیکھے بنا ہی تیزی سے پلٹا اور اسکول کی طرف بڑھنے لگا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ صدمے کے باعث میرا دل بھی بھر آیا تھا۔

☆☆☆

صحارا، دنیا کے مشکل ترین صحراؤں میں سے ایک ہے۔ ماہرینِ ارضیات کہتے ہیں کہ لاکھوں سال پہلے یہ علاقہ سرسبز و شاداب تھا۔ یہاں ہریالی اور پانی کی فراوانی تھی۔ اس کے کناروں پر سمندر بھی تھا لیکن ہزارہا سال کی ارضیاتی تبدیلیوں اور موسمی تغیرات کے باعث یہ زمین بدقسمتی سے دوچار ہوئی۔ زمین میٹھے پانی، نمکین سمندر اور ہریالی سے محروم ہوئی اور پھر جو کچھ باقی بچا وہ ہے سرخ مائل چٹانی پہاڑی سلسلے، ریتیلے میدان شوار گزار زندگی ان تمام عناصر سے مل کر جو چیز بنی، اُسے آج دنیا کا بہت بڑا اور نہایت دشوار گزار صحرا کا لقب دیا جاتا ہے۔

اس سرزمین پر اچھے دنوں میں حیاتیاتی تنوع کی بہتات تھی مگر جوں جوں بے رحم موسم اپنے پر پھیلاتا گیا، حیات مٹتی چلی گئی۔ جو باقی بچے، اُن میں توارگ کے یہ خانہ بدوش بھی ہیں جو ہزارہا سال سے اس سرزمین کی بے کیفی اور بے رحمی کا امتزاج بن کر شدید قحط، ظالم موسم، محدود خوراک اور معاش کے کم ترین وسائل کے ساتھ صحرائی زندگی کا ساتھ دے رہے ہیں۔

صحارا کے لاکھوں برس پہلے کے اچھے دنوں کو تو چھوڑیے، البتہ بُرے دنوں میں یہ صحرائی خانہ بدوش زندہ رہنے کے لیے نمک کے مرہونِ منت ہیں۔ صحارا کی صحرائی خانہ بدوشی کا چلن جن خطوط پر آج استوار ہے، یہ صدیوں نہیں بلکہ ہزاروں برس پرانا ہے۔ انسانی جسم کے لیے نمکیات نہایت ضروری عناصر میں شامل ہیں۔ صحارا کے ان خانہ بدوشوں کے لیے نمک زندگی کا ایک دوسرا نام بھی ہے لیکن ذریعۂ معاش کی نظر سے۔

صحارا کی سرزمین پر نمک کی تہیں وافر مقدار میں موجود ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کبھی سمندر اس سرزمین کا

دوست تھا۔ یہ نمک اب ان کے محدود معاشی وسائل کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ سیکڑوں برس سے صحرائے صحارا کے صرف توارگی ہی نہیں دیگر خانہ بدوش قبائل بھی کئی کئی دنوں کی مسافتیں طے کر کے اپنے درجنوں اونٹوں پر مشتمل کاروانوں کے ساتھ اُن مقامات تک پہنچتے ہیں جہاں نمک ملتا ہے۔ پھر وہ یہ خام نمک اونٹوں پر لاد کر صحرائی منڈیوں کا رُخ کرتے ہیں اور اس کڑی مشقت کے بدلے میں نمک دے کر اتنی رقم، اجناس اور ضروریات کی دیگر چیزیں حاصل کر لیتے ہیں کہ جسم اور سانس کی ڈوری ایک دوسرے سے بندھی رہے۔

صحارا کے خانہ بدوش کڑے سے کڑے موسمی حالات اور جسمانی امتحان سے گزرتے ہیں تب کہیں جا کر، اپنی دھرتی پر موجود کچھ نمک لاکر دو وقت کی روٹی کا بندوبست کرتے ہیں۔ اب تک نمک ہی توارگی خانہ بدوشوں کے لیے اپنی سرزمین کی واحد قیمتی دولت تھا لیکن سائنس کی ترقی کے بعد معلوم ہوا کہ اس زمین کی تہوں میں تو ہیرے جواہرات کی طرح مہنگی ترین یورینیم کے وافر ذخائر بھی موجود ہیں۔

توارگ تو خانہ بدوش ہیں۔ علم اور سرکار جیسی طاقت سے محروم ہیں لیکن جب قیمتی معدنیات کی موجودگی کا انکشاف ہوا تو نائیجر حکومت نے ان ذخائر کو نکالنا شروع کر دیا۔ سرکار کو دولت کے حصول کا اہم اور آسان راستہ مل گیا تھا۔ توارگیوں کو امید تھی کہ یہ دولت اُن کا حق ہے، حکومت اس دولت کا کچھ حصہ تو اُن کی فلاح و بہبود پر بھی خرچ کرے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ اُدھر سرکار کا خزانہ بھرتا گیا اور اِدھر خانہ بدوشوں کی محرومیاں بڑھتی چلی گئیں۔

یوں، جب اپنی زمین کی دولت سے سرزمین کے اصل باشندوں کو اپنا حق نہ ملا تو وہ حکومت سے برسرِ پیکار ہو گئے۔ اب یہ صحرائی خانہ بدوش اپنے حق کے لیے مسلح لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ایک طرف سرکار اور اس کی منظم مسلح فوج ہے تو دوسری جانب صحرائی باغی، جو کل بھی خانہ بدوش تھے اور آج بھی مگر اب زمانہ بدل رہا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ آنے والے کل میں زندہ رہنے کے لیے تعلیم ضروری ہے، سڑکیں ضروری ہیں اور سب سے بڑھ کر معاشی وسائل درکار ہیں۔ ان خانہ بدوشوں کو علم ہے کہ اس خطوط پر اُن کے پُرکھوں کی زندگی قائم تھی، وہ چلن اب ختم ہو رہا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے انہیں وسائل چاہئیں، نئے انداز زندگی کو اختیار کرنے کے لیے سہولتیں چاہئیں اور یہ سب کچھ انہیں صرف سرکار دے سکتی ہے۔ باغیوں کا کہنا ہے کہ ہم اپنے وسائل سے اپنی زندگی تبدیل کرنا چاہتے ہیں، سہولتیں چاہتے ہیں، بدلتے زمانے کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں۔ حکومت ہماری زمین کے وسائل بروئے کار لا رہی ہے تو اس میں سے ہمیں ہمارا حصہ بھی دے۔ یہ خانہ بدوش اقلیتی حصہ نہیں مانگ رہے بلکہ اجتماعی طور پر اپنی بھلائی کے لیے مالی وسائل کے طلب گار ہیں۔ یہی بات مجھے باغی کمانڈر نے اُس دن نہایت وضاحت سے سمجھائی تھی۔

توارگی باشندے صحرائے صحارا کے اصل بیٹے ہیں۔ ان کی زندگی خانہ بدوشی سے عبارت ہے۔ خوراک، پانی اور معاش ان کے لیے توارگی لوگ ہمیشہ سے اپنے کاروانوں کے ساتھ اُڑتی ریت، چٹیل پہاڑوں اور تنگ صحرائی گھاٹیوں میں سرگرداں رہے ہیں لیکن اُن کے قدم کبھی بھی اپنے صحرا سے باہر نہیں نکلے۔ وہ بے آب و گیاہ صحارا کے باشندے ہیں، مسائل میں گھرے رہے ہیں لیکن کبھی بھی انہوں نے ترکِ صحرا کا نہیں سوچا۔ ان کی کتنی نسلیں اس صحرا کی ریت کو اوڑھ کر ابدی نیند سو رہی ہیں، یہ بات مجھے تو کیا، خود انہیں بھی معلوم نہیں۔ توارگیوں کی بے شمار نسلیں اسی ریت پر جنم لے کر اسے ہی اوڑھ کر دنیا سے مٹ گئیں مگر اب بھی وہ صحرا کے سچے ساتھی ہیں۔

جہاں معاش کمزور ہو، وہاں وعدہ خلافی، خوں ریزی اور لوٹ مار کے واقعات بھی عام ہو جاتے ہیں۔ گزشتہ کئی صدیوں سے توارگی باشندوں کی بھی یہی وجہِ شہرت ہے لیکن کیا کیا جائے۔ ان سب باتوں کے باوجود صحرائی خانہ بدوشوں کی سرزمین تاجروں کے کاروانوں کے لیے کئی صدیوں سے ایک ایسی اہم گزرگاہ رہی ہے جس کے ذریعے وہ سامانِ تجارت افریقا کے کئی دوسرے ملکوں تک لاتے اور لے جاتے رہے تھے۔ نہ تو تاجروں کے لیے اس رہ گزر سے صرفِ نظر ممکن تھا اور نہ ہی صحرائی خانہ بدوشوں سے مفر۔ اس رہ گزر سے گزرتے ہوئے اکثر تاجر توارگی قزاقوں کے ہاتھوں لٹتے بھی رہتے تھے۔ لٹنے والے زیادہ تر وہ تھے جو خانہ بدوشوں کو خوش کیے بغیر گزر جانا چاہتے تھے۔ کئی گزر بھی جاتے تھے لیکن اکثر پھنس جاتے تھے۔

صحرائی توارگیوں کی ایک کہاوت ہے۔ ''ہم نے ہاتھ کو بوسہ دے لیا تو تم خود کو محفوظ سمجھ سکتے ہو۔'' یہ کہاوت خانہ بدوشوں کے قانونِ لوٹ مار کی تشریح ہے۔ جس کارواں نے صحرا پار کرنے کے لیے توارگیوں کو کچھ حصہ ادا کیا، انہیں توارگی گائیڈ اور محافظ خود راہ پار کرا دیتے تھے ورنہ اگر قسمت ساتھ نہ دے، مال و اسباب منزل تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔ تجارتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کارواں صدیوں سے دریائے نائیجر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس صحرا سے گزرا کرتے تھے اور اپنی حفاظت کے لیے ان خانہ بدوشوں کو اپنا رہنما کرتے اور باحفاظت رہنے کے لیے تواریگیوں کو رقم بھی دی جاتی تھی۔ تواریگیوں کو نذرانہ پیش کیے بغیر اُن کا مال محفوظ نہیں رہتا تھا اور کبھی کبھی تو جان کے لالے بھی پڑ جاتے تھے۔

اب اس تاریخی پس منظر میں تواریگی نفسیات کا تجزیہ کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ آج یہ کیسے ممکن ہے کہ کمزور معاش کے حامل تواریگی اپنا حصہ لیے بغیر نائیجر سرکار کو اپنی سرزمین کی تہوں میں موجود قیمتی ترین دولت باہر لے جانے دیں گے۔ اسی لیے گزشتہ دو دہائیوں سے نائیجر حکومت اور تواریگی باغیوں کے درمیان وسائل اور مال کی جنگ جاری ہے۔

خانہ بدوش قبائل کی سرکشی اپنی مثال آپ ہوتی ہے۔ تواریگی خانہ بدوش ہیں، کیسے ہار مان سکتے ہیں مگر حکومت کو اپنے اختیارات اور طاقت کا زعم ہے، ویسے یہ زعم تو ہر حکومت کو ہوتا ہے سو اُن کو کیوں نہ ہوا اسی لیے دونوں کے درمیان لڑائی جاری ہے اور اس لڑائی میں کیا کچھ ہو رہا ہے، اس کی ایک جھلک اُس روز مجھے باغی کمانڈر نے دکھانے کی کوشش کی تھی۔ ویسے میں بھی اس دشوار ترین صحرا میں یہی کچھ دیکھنے اور تواریگیوں کو جاننے کے لیے ہی آیا تھا۔

آج جس سرزمین پر تواریگی اپنے حقوق کے لیے سربکف ہیں، بیسویں صدی کے نصف اول میں شمالی افریقا کا یہ خطہ فرنچ نوآبادیاتی کے تسلط میں تھا۔ تواریگیوں کی سرکشی سے یہ نوآبادیاتی حکمران بھی بہت خائف تھے۔ فرنچ حاکموں نے اِن صحرائی خانہ بدوشوں کی سرکشی کو کم کرنے کے لیے صحارا کو مختلف ملکوں کے مابین بانٹ دیا تھا۔ یوں بیسویں صدی میں اس عظیم صحرا کے حصے بخرے کرکے اُسے نائیجر، الجیریا، مالی اور لیبیا میں شامل کر دیا گیا۔ انتظامی تقسیم تو کر دی گئی مگر مزاج کیسے بدلے جاتے۔ سرشت تو وہی رہی خانہ بدوشی، سرکشی اور زندہ رہنے کے لیے لوٹ مار۔

جن ملکوں کے مابین صحرا کو تقسیم کیا گیا تھا، انہوں نے بھی خانہ بدوشوں کے اصل مسائل سے صرفِ نظر کیا۔ اس فیصلے سے خانہ بدوشوں کا احساسِ محرومی تو ختم نہیں ہوا، البتہ تواریگی اقلیت میں ضرور آ گئے۔ فرنچ تسلط ختم ہو جانے کے کئی عشروں بعد، آج بھی یہ اقلیت میں ہیں تمام تر پرانے مسائل کے ساتھ۔

صحرائے صحارا کی انتظامی تقسیم ہوئی تو تواریگی اپنے تمام تر خانہ بدوش روایتی ورثے کے ساتھ صحرا کے اُس حصے میں سمٹ آئے جو آج نائیجر میں شامل ہے۔ انہوں نے یہیں بس نہیں کی۔ اپنے پالتو مال مویشیوں، اونٹوں اور اسبابِ حیات کو سمیٹا اور صحرا کے مزید اندرونی حصوں میں سمٹتے چلے گئے۔ بدترین صورتِ حال بدستور اُن کے ساتھ ساتھ تھی۔

گزشتہ کئی دہائیوں سے تواریگی جن مسائل کا شکار تھے، اس میں مزید اضافہ کیا کم ہوتی ہوئی سالانہ بارشوں کی اوسط شرح نے۔ ماہرینِ ماحولیات کہتے ہیں کہ صحارا میں کم ہوتی ہوئی بارشوں کی اصل وجہ عالمی ماحولیاتی تغیرات ہیں۔ صحارا میں پانی کی کمی ہوئی تو اس نے خانہ بدوشوں کے اہم ترین ذریعۂ معاش اور وسیلۂ حیات پالتو مویشیوں پر بہت بُرا اثر ڈالا۔

''ہمارے لیے ہمارے مویشی، ہمارے اونٹ ہی سب کچھ ہیں۔'' اُس دن صحرا میں گھومتے ہوئے، ایک تواریگی خانہ بدوش چرواہے نے مجھ سے باتیں کرتے ہوئے نہایت سادگی سے کہا۔ ''جب پانی کی کمی ہوگی تو ہمارے مویشی کیسے زندہ رہ پائیں گے اور جب یہی نہیں رہیں گے تو ہماری زندگی، ہماری بقا خود سوال بن جائے گی۔'' چرواہا خاصا عمر رسیدہ تھا۔ اس کی بات کے پیچھے کئی دہیوں کا خانہ بدوش زندگی کا تجربہ بول رہا تھا۔ ''ہمارے جانور ہماری زندگی کی ضمانت ہیں۔ ہم ان کا دودھ پیتے ہیں، ان کا گوشت کھاتے ہیں، ان کی کھال کی تجارت سے پیسا کماتے ہیں۔ اگر ہمارے یہ مویشی مر جائیں تو سمجھ لو تواریگی بھی زندہ نہیں رہ پائیں گے۔ یہی ہماری زندگی کا محور ہیں۔'' مجھے اس خانہ بدوش چرواہے کی بات سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اتنی سادہ سی بات کو آخر کوئی سمجھنے سے کیسے انکار کر دیتا مگر حکومت، بات تو سمجھنے کی ہے اور سمجھ کر اقرار کرنے کی۔ اگر سمجھنے کے باوجود بھی سمجھنے سے انکار کیا جائے تو پھر زندہ رہنے کے لیے ہر راہ سے گزر جانا صرف تواریگی ہی نہیں، دنیا کے ہر انسان کا اپنی بقا کے لیے بنیادی حق ہے۔

قلتِ آب، کم ہوتی بارشوں اور عالمی موسمیاتی تغیرات کے سبب جب گزشتہ دہائی میں تواریگیوں کے سماجی و معاشی حالات مزید خراب ہونے لگے تھے، تب انہوں نے سرِ عام یہ سوال اٹھانا شروع کر دیا تھا ''جب ہماری سرزمین سے نائیجر حکومت قیمتی معدنیات یورینیم اور دیگر دھاتوں کو نکال کر دولت کما رہی ہے تو پھر ہمیں زندہ رکھنے کے لیے اس میں سے کچھ خرچ کیوں نہیں کیا جاتا؟'' بات آگے بڑھی اور پھر یہ بحث سنجیدہ سے سنگین نوعیت اختیار کر گئی۔

90ء کی دہائی میں تواریگی باشندوں نے نائیجر حکومت

سے اپنا حق وصول کرنے کے لیے 'تواریگ ملیشیا' قائم کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ نائیجر حکومت سے لڑ کر اپنا حق وصول کرنے کے لیے قائم ہونے والی تواریگی ملیشیا کو عسکری تربیت لیبیا کے اُس وقت کے حکمران معمر قذافی کے حکم پر لیبیائی فوج نے دی تھی۔

تواریگی باغیوں اور نائیجر حکومت کے درمیان کئی برسوں کی لڑائی کے بعد، آخر اُن کے درمیان امن معاہدہ ہو گیا مگر کچھ ہی عرصے کے بعد حالات پھر بگڑ گئے۔

2007ء میں نائیجر حکومت نے ایک فرنچ ٹھیکے دار کمپنی سے تجارتی معاہدہ کیا۔ کمپنی کو صحرا میں موجود یورینیم کی بھاری مقدار کو تیزی سے باہر نکالنا تھا۔ اس طرح نائیجر دنیا بھر میں یورینیم پیدا کرنے والا دوسرا سب سے بڑا ملک بن جاتا۔ ساتھ ہی نائیجر حکومت نے کئی اور بڑی بڑی مغربی کمپنیوں سے تجارتی معاہدے بھی کیے، جن کی رُو سے صحرا میں کان کنی کے ذریعے یورینیم کے علاوہ دیگر قیمتی معدنیات کو بھی زمین کی تہوں سے باہر نکالا جانا تھا۔ اسی دوران پھر یہ بحث چھڑ گئی کہ جہاں ایک طرف صحرائی باشندوں کی سرزمین سے قیمتی معدنیات نکال کر حکومت بھاری زرِ مبادلہ حاصل کر رہی ہے، وہیں بھوک اور افلاس میں گھرے تواریگی خانہ بدوشوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے اس میں سے رقم کیوں خرچ نہیں کی جاتی؟

سوال سمجھ میں آنے والا تھا مگر حکومت نے ترقیاتی و فلاحی منصوبوں کے لیے تواریگی علاقوں میں مزید کسی قسم کی سرمایہ کاری کرنے سے انکار کر دیا۔ اس صورتِ حال پر دونوں فریقین میں ایک بار پھر تناؤ بڑھنے لگا اور تواریگی باغی پھر مسلح کارروائیوں کے لیے سرگرم ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ مسلح بغاوت اور بھوک و افلاس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گزشتہ برسوں کے دوران کئی بڑے بڑے اسمگلر گروہ اور عالمی دہشت گرد تنظیمیں بھی تواریگ میں داخل ہو گئیں ہیں اور انہوں نے غربت اور مجبوری کے ستائے ان لوگوں کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔

آج نائیجر حکومت کا دعویٰ ہے کہ سرزمینِ تواریگ القاعدہ کا ایک دہشت گرد مرکز ہے مگر خود خانہ بدوش باغی اس الزام سے انکار کرتے ہیں۔

☆☆☆

سورج مغرب میں جا کر ڈوب جانے کے لیے اپنا سفر جاری ہے طے کر رہا تھا۔ صحرا کی زرد ریت اب سُرخ مائل نظر آنے لگی تھی۔ ان باغیوں کا کوئی طے شدہ ٹھکانا نہیں ہے۔ انہیں رات اس صحرا میں گزارنا تھی مگر کہاں...... اس بات کا فیصلہ چلتے چلتے کرنا تھا۔

اُس وقت ہم صحرائی بستی سے خاصے دور تھے۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ میں اس بات سے قطعی لاعلم تھا کہ پڑاؤ کہاں ڈالا جائے گا۔ آخر کافی دُور تک چلنے کے بعد، اونچے اونچے ریت کے ٹیلوں والی ایک جگہ پر کارواں ٹھہر گیا۔ یہاں ریتیلے ٹیلوں اور ببول کے چند درختوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''یہ جگہ بالکل ٹھیک ہے۔'' باغی کمانڈر نے رُک کر چاروں طرف دیکھا اور پھر اس جگہ کو آج رات کے پڑاؤ کے لیے منتخب کرکے اپنے ساتھی سے کہا۔ اُس نے فوراً کارواں کو رُکنے کا حکم دیا۔ کچھ ہی دیر بعد خچروں پر لدا ہوا اسبابِ خورونوش اُتارا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں کیمپ لگ گیا۔

باغیوں کے ساتھ خچروں اور گدھوں پر پلاسٹک کے بڑے بڑے ڈرم لدے ہوئے تھے۔ جس میں پانی تھا۔ سورج تقریباً ڈھلنے والا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ لوگ منہ ہاتھ دھونے میں لگ گئے۔ میں چند قدم آگے بڑھ کر ببول کے ایک درخت سے ٹیک لگا کر مشاہدہ کرنے لگا کہ جب وہ جنگ نہیں کر رہے ہوتے ہیں تو اُس وقت کیا کرتے ہیں۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ آسمان پر ہلکا ہلکا دھندلکا چھانے لگا تھا۔ اسی دوران ایک باغی نے کعبے کی سمت رُخ کرکے اذان دی اور پھر وہ سب لوگ ایک امام کے پیچھے صف باندھ کر کھڑے ہو گئے اور باجماعت نمازِ مغرب ادا کرنا شروع کر دی۔ میرے لیے یہ بہت حیرت کی بات تھی۔ یہ وہ باغی تھے جو سرکار کی منظم فوج سے لڑ رہے تھے۔ اُن کی زندگی ہر وقت فضائی حملے کے نشانے پر تھی لیکن نماز کا وقت آتے ہی وہ سب کچھ بھول بھال کھڑے ہوئے۔ اسلحہ سامنے رکھا اور رکوع و سجود شروع کر دیا۔ حالتِ جنگ میں ہونے کے باوجود ان کا یہ کردار میرے لیے حیرت انگیز تھا۔ نمازِ مغرب کی ادائیگی سے فارغ ہو کر اُن میں سے کچھ آگ جلانے اور رات کے لیے کھانا تیار کرنے میں لگ گئے۔

صحرا کی وہ شام بڑی ہی سہانی تھی۔ دن بھر آگ برسانے والا سورج مغرب میں ڈوب چکا تھا لیکن اس کے باوجود ابھی کچھ روشنی باقی تھی۔ دن بھر چلنے والے لُو کے جھکڑ اب سرسراتی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں بدل رہے تھے۔ اُس وقت کچھ باغی سپاہی میری نظروں کے عین سامنے ایک ٹیلے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے چہرے اب بھی پگڑیوں کے پلّو سے بنے نقاب میں پوشیدہ تھے۔ اُنہیں اپنے چہروں کو بے نقاب کرنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے رات کی سیاہی پھیل جانے کا انتظار تھا۔ تواریگی باشندوں کی ثقافت کا یہ رُخ بھی میرے لیے دلچسپی سے خالی نہیں تھا۔

پگڑی، مسلم معاشرے کی مختلف تہذیبوں میں رائج ہے لیکن پگڑی کے پلّو کا جو استعمال تواریگی باشندے کرتے ہیں، اس کی مثال صرف مسلم دنیا میں ہی نہیں بلکہ کسی بھی تہذیب یا معاشرے میں نہیں ملتی۔ 'پردہ اور 'عورت' مسلم معاشرے میں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں لیکن تواریگی خانہ بدوش معاشرے میں یہ رواج اس کے بالکل برعکس ہے۔ تواریگی خانہ بدوش مرد، عورتوں کی طرح چہرے کو نقاب سے ڈھانپتے ہیں اور عورت کا چہرہ کھلا رہتا ہے۔ یہاں خانہ بدوش روایات و ثقافت کہیں کہیں مذہب اور عقیدے سے زیادہ طاقتور نظر آتی ہیں۔

مردوں کے چہرے بدستور نقاب میں رہتے ہیں البتہ رات کی تاریکی پھیلنے پر وہ چہروں کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ پگڑی کا پلّو ان کی گردن کے عقبی حصے کو بھی ڈھانپے رکھتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ پگڑی اور نقاب، دونوں صحرا کے ان بیٹوں کو تمازت، لُو اور گرمی لگ جانے سے بچاتا ہے۔ پگڑی کے باعث پسینے کی شکل میں خارج ہونے والا ان کے جسم کا پانی بھاپ بن کر اُڑ جانے کے بجائے سر کے گھنگریالے بالوں میں جذب ہو کر انہیں نم کیے رکھتا ہے۔ جس سے ان کے بدن میں شدید گرمی کے باوجود پانی کی کمی نہیں ہوتی اور گرمی کا احساس بھی کم ہو جاتا ہے۔ گردن کا پچھلا حصہ ڈھکا ہونے کی وجہ سے وہ لُو لگنے سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ پگڑی کی ایک اور خاصیت...... اس کی وجہ سے آپ یہ نہیں دیکھ سکتے کہ مخاطب کے چہرے کے تاثرات کیا ہیں۔ جس طرح تواریگی خانہ بدوشوں کی زندگی صحرا کے پرتوں میں کھُبی ہوئی ہے، اُسی طرح ان کے چہروں کے تاثرات اُن کے نقابوں کی اوٹ میں اوجھل رہتے ہیں۔ چہرے پر صرف آنکھیں نظر آتی ہیں جنہیں دیکھ کر کم از کم میں تو یہ جاننے سے ہمیشہ قاصر رہا ہوں کہ میری بات کا اثر میرے مخاطب پر کیا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ان آنکھوں کو دیکھ کر، چہرے کے اَن دیکھے تاثرات کو بھانپ لیتے ہوں مگر میں اس خاصیت سے محروم ہوں۔

ہوا میں خنکی در آئی تھی۔ موسم خوشگوار ہو چلا تھا۔ ماحول تاریکی میں ڈوب رہا تھا۔ ہم اپنی جگہ سے اٹھے اور الاؤ کے قریب آکر بیٹھ گئے۔ اندھیرا ہو جانے کے باعث انہوں نے اپنی پگڑیاں کھول دی تھیں، چہرے بے نقاب تھے۔ میں اشتیاق سے ان کے چہروں کو تکنے لگا۔ گہری آبنوسی رنگت والے ان صحرائی خانہ بدوشوں کے چہرے اُس وقت دہکتے الاؤ کے مانند آگ کی سرخ لپٹوں میں تمتما رہے تھے۔

ان باغیوں کے گالوں پر نیلے رنگ کے دھبے نما نشانات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ یہ وہ نشانات تھے جو دن بھر نقاب پہننے کے باعث کپڑے کی رگڑ کی وجہ سے بن گئے تھے۔ گالوں کے یہ نشانات تواریگی باشندوں کی پہچان ہیں۔ جو یہ بات جانتے ہیں وہ لاکھوں لوگوں کے بیچ موجود کسی ایک تواریگی کو بھی پہچان سکتے ہیں۔ صحارا کا صدیوں پہلے سفر کرنے والے غیر صحرائی سیاحوں نے چہروں پر نیلے رنگ کے ان نشانات کی وجہ سے ہی انہیں اپنی یادداشتوں، روزناموں اور سفرناموں میں 'نیلے انسان' کے لقب سے یاد کیا ہے۔

ہمارے سامنے الاؤ پر نوڈلز اُبالی جا رہی تھیں۔ ساتھ ہی بڑی سی کیتلی میں قہوہ بھی اُبل رہا تھا۔ باغی اس وقت نہایت خوش گوار موڈ میں تھے۔ وہ ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ سگریٹ پی رہے تھے اور باتوں باتوں میں ایک دوسرے کو چھیڑ رہے تھے۔

باغیوں کے اس گروہ میں ایک ڈاکٹر بھی ہے۔ وہ چہرے مہرے سے نہایت سنجیدہ لگتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گیا اور پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ اس سے باتیں کر کے مجھے لگا کہ وہ تواریگ ثقافت کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ اس کا اندازِ سخن عالمانہ تھا۔ "تواریگی مرد کس عمر سے پگڑی باندھنا اور نقاب اوڑھنا شروع کر دیتے ہیں؟" میں نے وہ سوال کر ڈالا جو کافی دیر سے میرے دماغ میں ہلچل مچا رہا تھا۔

"یہ ہماری بہت ہی قدیم رسم ہے۔ پگڑی بلوغت کی نشانی بھی ہے اور صحرائی زندگی میں یہ ہماری بقا کے لیے ضروری بھی۔ اس کے کئی فوائد ہیں۔" اس نے تفصیل سے جواب دینے سے پہلے تمہید باندھی۔ "جب بچہ اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ خاندان اور قبیلے کے مردوں کے ساتھ کارواں لے کر صحرا میں جا سکے، تب ایک رسم ادا ہوتی ہے۔ اس رسم میں بچے کے چچا اور ماموں وغیرہ بچے کی پگڑی کو باری باری آ کر اس کے سر کے گرد لپیٹتے ہیں اور پھر آخر میں چہرہ نقاب سے ڈھانپ دیتے ہیں۔ یہ رسم دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ اب لڑکے کا لڑکپن ختم۔ اب وہ ایک ذمّے دار مرد ہے اور اسے گھر کے دیگر مردوں کی طرح اپنی ذمّے داریاں ادا کرنی ہوں گی۔"

"دلچسپ...... لڑکے سے مکمل مرد بن جانے کے اعلان کا

طریقہ تو بہت ہی مزیدار ہے۔" میں نے اس کی بات سُن کر ...ہوئے کہا۔

"میں نسلی لحاظ سے نہیں، اپنی ثقافتی رسم کے لحاظ سے مرد بننے کا طریقہ بیان کر رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے فوراً جواب دیا۔

اس دوران اچانک میری توجہ ڈاکٹر اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک اور شخص کے چہرے پر مبذول ہو گئی۔ میں غور سے ان دونوں کے چہروں کے خطوط کو دیکھنے لگا۔ ان کے چہروں کے خطوط دیگر تواریگی خانہ بدوشوں سے کچھ مختلف تھے۔ اُن دونوں کے نقوش واضح طور پر افریقی تھے۔ گہری بھوری رنگت، گھنگریالے بال اور چوڑی ناک۔ ان کے ساتھ ایسے دو اور باغی بھی موجود تھے جن کے نقوش بھی باقی لوگوں سے کچھ مختلف تھے۔ سانولی رنگت، سیدھے سیاہ بال اور ستواں ناک، جیسی بحیرۂ روم کے لوگوں کی ہوتی ہے۔ جسمانی رنگت تو چھوڑیے، اُن کی آنکھیں بھی زرد یاقوت جیسی رنگت کی حامل تھیں۔

تواریگی باغیوں کے اس گروہ میں موجود کچھ لوگوں کے نقوش کا یہ تنوع مکمل طور پر میرے ذہن پر حاوی ہو چکا تھا۔ میں نے باقی تواریگی باشندوں پر گہری نظر ڈالی۔ دیگر باغی اپنے رنگ و روپ، قد کاٹھ اور چہرے مہرے سے لگ بھگ ایک جیسے ہی لگ رہے تھے۔ میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر ڈرتے ڈرتے ڈاکٹر سے پوچھا۔ "کیا تواریگ مکمل طور پر خالص خانہ بدوش نسل ہے یا اُن کے درمیان جنیاتی طور پر دوسری قوموں یا نسلوں کی آمیزش بھی ہے؟" میرا سوال سُن کر ڈاکٹر گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

"شاید مکمل طور پر نہیں لیکن تواریگی خانہ بدوش کی اکثریت خالص نسل ہے۔" کافی دیر بعد اُس نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

"نسلی آمیزش کی وجہ کیا ہے؟"

"غلامی......" اس نے میرا سوال مکمل ہوتے ہی ایک لفظ میں اپنا جواب دے ڈالا۔

"غلامی......" میں نے اس کا جواب سوالیہ انداز میں دہرا دیا۔

"صدیوں پہلے اکثر طاقتور قبائل تواریگ پر حملہ کر کے مردوں کو غلام بنا لیا کرتے تھے اور عورتوں سے شادیاں کر لیتے تھے۔ جس کی وجہ سے آج تواریگ کے خانہ بدوش قبیلے میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی رگوں میں غیر تواریگی خون دوڑ رہا ہے۔ یہ بات ہم ان کے چہرے کے نقوش، آنکھوں کی رنگت اور قد کاٹھ سے جان لیتے ہیں۔" اس نے دھیمے مگر افسردہ لب و لہجے میں جواب دیا۔ "مگر اس کے باوجود ہم تواریگی ہیں۔ اکثر دوغلی نسل والے تواریگی خود کو خالص ظاہر کرنے کے واسطے حسب نسب کے لیے باپ کے بجائے ماں سے رشتہ جوڑتے ہیں۔"

"بہت خوب۔" میں نے اس کی بات سن کر کہا۔ "کیا نسلی اختلاط کا اثر صرف جنیاتی حد تک محدود ہے یا اس کے اثرات زبان پر بھی پڑے ہیں؟"

"آپ کی بات ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔ "نسلی اختلاط کے باعث ہماری زبان پر بھی اس کا کافی گہرا اثر ہوا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ "آج تواریگ کے مختلف ذیلی قبیلوں کی زبانیں بنیادی طور پر ایک دوسرے سے کچھ مختلف ہیں لیکن ہماری مشترکہ بولی تماشیک ہے، جس کا تعلق ان بربر زبانوں سے ہے اور جو مراکش اور الجیریا میں بولی جاتی ہیں۔

"کھانا تیار ہے، چلیے آؤ۔" اسی دوران ایک باغی نے ہمارے قریب آ کر کہا اور ہم اٹھ کر اس طرف آ گئے جہاں کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔

چار پانچ لوگوں کی ٹولیاں بنا کر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان بڑے سے تسلے میں اُبلی ہوئی نوڈلز رکھی ہوئی تھیں۔ نوڈلز کو اُبالتے ہوئے اس میں چند مقامی مصالحے اور جڑی بوٹیاں بھی شامل کر دی گئی تھیں۔ جس کی وجہ سے یہ مزید لذیذ اور پُرغذائیت ہو جاتی ہیں۔

شہریوں کی نسبت اس مسلم خانہ بدوش قبیلے میں یہ بات نہایت معیوب سمجھی جاتی ہے کہ دسترخوان پر موجود ہر شخص علیحدہ پلیٹ میں کھانا نکال کر کھائے۔ یہ لوگ ایک بڑے سے تسلے میں کھانا ڈال کر ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ اُس دن میں نے یہ بات محسوس کی ہم سب نے صبح کو صرف ہلکا پھلکا ناشتا کیا تھا۔ اُس کے بعد پہلی بار کھانا کھا رہے تھے۔ سب کو شدید بھوک لگی ہوئی تھی۔ ہر شخص نوڈلز سے بھرا چمچہ منہ میں اُنڈیل رہا تھا لیکن بے صبرا پن کہیں نہیں تھا۔ ہر شخص سکون سے کھانا کھا رہا تھا۔ کوئی بھی شخص یہ کوشش نہیں کر رہا تھا کہ اپنی شکم سیری کے لیے دوسرے کا حصہ بھی بٹور لے۔ اُس دن مجھے سادہ سی اُبلی ہوئی یہ نوڈلز دنیا کے سیکڑوں لذیذ پکوانوں سے زیادہ ذائقے دار اور شکم سیر لگیں۔ اور لگتی بھی کیوں نہیں۔ اس رات کھانے میں نوڈلز کے ساتھ ساتھ قناعت، شکر، صبر اور خانہ بدوش باغیوں کی محبت بھی جو میرے ساتھ تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھانے سے فراغت کے بعد سستی چھانے لگی تھی۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ، بھوک اور تھکن کے بعد کھانا ملا تو غنودگی طاری ہونے لگی۔ اسی دوران ہمارے درمیان بڑی سی کیتلی میں گرم گرم قہوہ لا کر رکھ دیا گیا اور پھر کمانڈر نے چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں قہوہ نکال کر میرے اور ٹولی میں بیٹھے دیگر ساتھیوں کی طرف بڑھایا۔ قہوہ بہت ہی لذیذ تھا۔ ایک کے بعد ایک پیالی میں کچھ ہی دیر میں کئی پیالی قہوہ پی گیا۔

توارگ خانہ بدوشوں کی روایت ہے کہ دوران محفل اگر کسی مہمان کے قہوہ کی پیالی خالی ہو جائے تو میزبان فوراً کیتلی اٹھا کر اُسے بھر دیتا ہے۔ یہ اُس وقت تک ہوتا ہے جب تک یا تو کیتلی خالی نہ ہو جائے یا پھر میزبان خالی پیالی اپنے سامنے رکھ کر، اُس پر اپنے ہاتھ کی ہتھیلی نہ رکھ دے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہوتا ہے کہ اب نہیں......بس!

اُس دن چار پیالی قہوہ پینے کے بعد جب میں نے پیالی فرش پر رکھی تو کمانڈر کا ہاتھ ایک بار پھر کیتلی کی جانب بڑھا مگر میں نے جلدی سے ہتھیلی پیالی پر رکھ دی......اب بس!

☆☆☆

قہوہ پینے سے ایک بار پھر جسم میں چستی آگئی تھی۔ نیند کہیں دور بھاگ چکی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسی دوران باغیوں کی ایک اور ٹولی آکر ہمارے گرد ریت پر بیٹھ گئی۔ ہم نے باتیں شروع کر دیں۔

''تم یہاں آنے سے پہلے کیا کرتے تھے؟'' میں نے پچاس سالہ ڈاکٹر سے سوال کیا۔ مجھے اس کا نام معلوم نہیں تھا۔ ویسے اس گروہ میں سب اُسے ڈاکٹر کہہ کر پکارتے تھے۔

''میں اس جنگ میں شامل ہونے سے پہلے ایک نامی گرامی سرجن کا اسسٹنٹ تھا۔ کئی سال تک اس کے پاس کام کر کے اتنا تجربہ حاصل کر لیا ہے کہ اب اگر اس گروہ میں جھڑپوں کے دوران کوئی زخمی ہو جائے، گولی لگ جائے تو میں اس کا بہ آسانی علاج کر لیتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو تم اسی لیے ان کے ساتھ شامل ہوئے ہو؟'' میں نے اس کی بات سن کر کہا۔

''ہاں۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آخر یہ میرے اپنے ہیں اور اگر میں اپنے بھائیوں کی بُرے وقت میں کچھ مدد کر سکتا ہوں تو مجھے ایسا ضرور کرنا چاہیے۔'' اس کے لہجے میں عزم کا اظہار بھی واضح تھا۔

''یہ تمہاری آنکھ کو کیا ہوا تھا؟'' اس کی دائیں آنکھ بالکل سفید تھی۔ یہ دیکھ کر میں نے حیرت سے پوچھا۔

''جب میں ان میں شامل ہوا تو چند روز بعد ہی نائیجر فوج کے ساتھ ہماری جھڑپ ہوگئی جس میں یہ آنکھ ضائع ہوگئی۔'' اُس نے ہنستے ہوئے بتایا۔ ''ویسے، میں بھی اچھا خاصا زخمی ہو گیا تھا لیکن اپنا علاج خود کر لیا اور اب تمہارے سامنے ہوں۔''

ڈاکٹر کے برابر چوڑے کندھوں والا ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے برابر چھوٹی مشین گن رکھی ہوئی تھی۔ وہ خاصا چوکنا نظر آرہا تھا۔ ''اور تم؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ میرا سوال سمجھ گیا۔

''میں نائیجر کی ایک یونیورسٹی میں انجینئرنگ کا طالب علم تھا۔''

''تو یہاں کیسے آئے؟''

''میرے بھائی یہاں لڑ رہے تھے، ایسے میں، میں اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتا تھا، اس لیے اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے چلا آیا۔'' اس کا لہجہ مضبوط تھا جو اس کے عزم اور اس کی بات سچ ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔

میرے سامنے ہیما بیٹھا ہوا تھا۔ یہ نوعمر لڑکا تھا۔ اُس نے کبھی اسکول کا منہ نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود جب میں نے اس سے باتیں کیں تو مجھے لگا کہ اُس کے پاس بے شک کتابی علم نہ ہو مگر وہ اپنے باپ داداؤں کا سینہ بہ سینہ چلنے والا صحرائی علم بہت اچھی طرح حاصل کر چکا تھا۔ وہ بہت دلچسپ لڑکا تھا۔

ہیما اے ری گاؤں میں پیدا ہوا۔ وہیں اس نے پرورش پائی۔ اس کا باپ اونٹوں کے ایک کارواں کا مالک تھا۔ وہ ہر سال اپنا کارواں لے کر تجارتی سفر کیا کرتا تھا۔ باتوں باتوں میں اُس نے اُنگلی اٹھائی اور آسمان کی طرف اشارا کیا۔ اُس رات تاریک رات میں آسمان پر جگمگاتا زرد چاند اور ٹمٹماتے ہوئے ننھے ننھے ستارے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

''وہ دیکھو......'' اس نے ایک ستارے کی طرف اشارہ کیا۔ ''رات میں جب ہمارے اونٹ سفر کرتے ہیں تو ہم اُس تارے کو دیکھ کر سمت کا اندازہ کر لیتے ہیں کہ بلما کس سمت میں واقع ہے۔'' ہیما نے کہا اور میں اس کا روایتی علم سن کر حیران رہ گیا۔

بلما، صحارا کے شمال میں واقع وہ علاقہ ہے جہاں ہیما کا باپ ہر سال اپنے اونٹوں پر پیاز اور لہسن کی بوریاں لاد کر لے جاتا تھا اور وہاں سے اس کے بدلے میں نمک خرید لاتا، جسے وہ مقامی تجارتی منڈی میں فروخت کر کے دو وقت کی روٹی کا آسرا کر لیتا تھا۔ جنگ میں شامل ہونے سے پہلے ہیما اپنے باپ

کے کارواں کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ صحرا کا یہ خانہ بدوشی علم اُس نے انہی مسافتوں کے دوران حاصل کیا تھا۔

''بلما کے اس سفر کے دوران میں تیس دن تک صحرا میں پیدل چلا کرتا تھا۔'' ہیما نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا اور میں مسکرا دیا۔ صحرا اور اس کی مسافتیں...... یہ خانہ بدوش صحرائیوں کے بس کی ہی بات ہے ورنہ ہم شہریوں کے لیے تو تیس منٹ تک پیدل چلنا محال ہو جاتا ہے۔

''ان میں سب سے کم عمر کون ہے؟'' میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''بشیر۔'' اُس نے ایک شرمیلے لڑکے کی طرف اُنگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''تمہاری عمر کتنی ہے؟'' میں نے بشیر سے سوال کیا۔

''سترہ سال۔''

''پکی بات ہے؟''

''پتا نہیں......'' یہ سن کر وہ جھینپ گیا اور شرماتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کی عمر بارہ تیرہ سال لگ رہی تھی۔

اس گروہ میں شامل ہونے سے پہلے بشیر اپنے گھر کے پالتو مویشی چراتا تھا لیکن گزشتہ کئی مہینوں سے وہ باغیوں کے ساتھ ہے۔ ''تم ان میں کیسے شامل ہوئے؟'' میرا سوال سن کر وہ کچھ دیر شرماتا رہا اور پھر ڈاکٹر کے زور دینے پر کہنے لگا۔

''میں اُس دن مویشی چرا رہا تھا کہ جب چند گاڑیاں میرے پاس سے گزریں۔ میں گاڑیوں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا اور جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔'' اس نے اٹکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''انہوں نے گاڑی روکی اور مجھ سے کہا۔ ہم توارگیوں کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ چلو گے۔ بس پھر میں ان کے ساتھ آگیا۔''

''تم نے یہاں آکر اچھا کیا یا غلط؟''

''وہ میرا خوش نصیب دن تھا۔ پہلے میں اپنے مویشی چراتا تھا، اب توارگ کے لیے لڑ رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ نہ تو ذرا سا ہچکچایا، نہ ہی اٹکا اور نہ ہی شرمایا تھا۔

بشیر اس چھوٹی سی عمر میں کئی بڑے جنگی حادثے دیکھ چکا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے موت اپنی جھلک دکھا چکی تھی۔ ایک دن وہ باغیوں کی پک اپ کے پچھلے حصے پر سوار ہو کر کہیں جا رہا تھا گاڑی صحرا میں دوڑتے ہوئے بارودی سرنگ سے جا ٹکرائی تھی۔ گاڑی اُلٹ گئی اور دھماکے سے اُس میں سوار دو توارگی باغی موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے۔ جب کہ آٹھ لوگوں کو شدید نوعیت کے زخم آئے تھے۔ ''میں خوش قسمتی سے بچ گیا تھا مگر ہمارے بھائی مارے گئے۔ اب جن لوگوں نے یہ کیا ہے، ان سے بدلہ تو لینا چاہیے نا۔'' اس نے بہت معصوم سے لہجے میں مجھ سے سوال کیا مگر میں اُسے کیا جواب دیتا۔ میں شہری علم جانتا تھا اور وہ خانہ بدوش روایت کے پس منظر میں اپنے سوال کا جواب مانگ رہا تھا۔

''دھماکے سے بشیر اچھل کر...... پک اپ سے نیچے جا گرا تھا۔'' وہ خاموش ہوا تو ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا۔ ''دھماکے کے بعد جب ہم وہاں پہنچے تو اس کا کوئی پتا نہیں چل رہا تھا۔ اچانک میری نظر ایک بول کے پیڑ کے نیچے پڑی۔ یہ وہاں سو رہا تھا۔ ہم نے جا کر اسے اٹھایا۔ خوش قسمتی سے اسے خراش تک نہیں آئی تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے بشیر کی طرف دیکھا۔ ''بس! اُس روز تو اسے اللہ نے بچا لیا تھا۔'' ڈاکٹر نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر اس کے برابر بیٹھے ایک باغی نے اپنی زبان لحہ بھر کے لیے باہر نکالی اور پھر اندر کر لی۔ یہ توارگی خانہ بدوشوں کی اشاروں کی زبان کا ایک اشارہ ہے جس کا مطلب ہے کہ 'ہم اس بات کی تائید کرتے ہیں۔'

''جب لڑائی ختم ہو جائے گی، سب اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں گے، تب تم کیا کرو گے؟'' میں نے بشیر سے سوال کیا۔

''تب میں فوج میں سپاہی بننا چاہوں گا۔''

''1995ء میں جب بغاوت ختم ہوئی تھی تو باغیوں کو امن معاہدے کے تحت نائیجر فوج میں بھرتی کر لیا گیا تھا۔ اب بھی اگر بغاوت ختم ہوئی تو شاید ایسا ہی ہو۔'' میں نے بشیر کو مخاطب کر کے اپنے ترجمان کی مدد سے کہنا شروع کیا۔ ''تم ایسی فوج میں کس طرح شامل ہو سکتے ہو، جنہوں نے تمہارے بھائیوں کا خون بہایا ہے اور وہ کسی بھی وقت خود تمہیں بھی قتل کر سکتے ہیں؟'' میرا سوال سن کر بشیر خاصی دیر تک خاموش رہا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ آخر اُس نے اٹکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''پھر بھی...... میرا خیال ہے کہ فوج کی نوکری اچھی ہوگی۔'' اُس وقت بشیر کی بات سن کر وہاں موجود کئی توارگی باغیوں نے بھی لحہ بھر کے لیے اپنی زبانیں باہر نکالی تھیں۔

گفتگو کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ رات خاصی بھیگ چکی تھی۔ صحرا کا دن جتنا دشوار گزار ہوتا ہے، اُس کی رات اتنی ہی خوشگوار ہوتی ہے۔ دن کو چلنے والی تیز لُو اب ہوا کے خنک جھونکوں میں بدل گئی تھی۔ مجھے ہلکی ہلکی خنکی محسوس ہونے لگی تھی۔ اچانک ہوا کا سرسراتا تیز جھونکا مجھ سے ٹکرایا۔ جسم میں پھریری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوڑ گئی۔ میں نے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے۔

آخر خاصی دیر سے خاموش بیٹھا کمانڈر ہلکا سا کھانسا۔ شاید یہ اُس کا خفیہ اشارہ تھا۔ کئی باغی اٹھ کر چلے گئے۔ پھر اس نے ایک کو اشارے سے قریب بلایا اور اپنی بولی میں کچھ کہا۔ وہ سُن کر چلا گیا اور کچھ دیر بعد جب وہ لوٹا تو اس کے ساتھ نائیجر فوج کا وہ فوجی بھی تھا، جسے انہوں نے 'جنگلی قیدی' بنایا ہوا تھا۔ میں صبح اُسے گاؤں کے اسکول میں دیکھ چکا تھا۔ وہ آج صبح سے ہی اسے اپنے ساتھ ساتھ لیے پھر رہے تھے۔

''تم چاہو تو اس سے علیحدگی میں بھی بات کر سکتے ہو۔'' کمانڈر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کا اشارہ 'جنگلی قیدی' کی طرف تھا، جسے ہمارے سامنے زمین پر بٹھا دیا گیا تھا۔

یہ فوجی فُلانی قبیلے سے تھا۔ یہ وہ قبیلہ تھا جو کبھی تواریگ کے باشندوں کو غلام بنانے کے لیے اُن پر حملہ آور ہوتا تھا، آج اس قبیلے کا باوردی حملہ آور خود اپنے پُرکھوں کے غلاموں کی اولادوں کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔

فوجی نے بتایا کہ اس کا نام عبدالعزیز ہے اور وہ نائیجر آرمی کا لیفٹیننٹ ہے۔ اُس پر الزام تھا کہ اس نے نے ایک بوڑھے تواریگی کی ٹانگوں پر گولیاں چلائی تھیں۔

''یہ غلط ہے۔ میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا تھا۔'' جب میں نے اُس پر عائد الزام کو دُہرایا تو اس نے تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

''تو پھر سچ بات کیا ہے؟'' میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔ اُس وقت میرے اور اُس کے سوا، کوئی تیسرا فرد قریب موجود نہیں تھا۔ صرف چند مسلح باغی تھے جو دور کھڑے پہرا دے رہے تھے۔

''اُس دن باغیوں کی لگائی ہوئی بارودی سرنگوں سے ٹکرا کر ہمارے کئی فوجی ہلاک اور متعدد شدید زخمی ہو گئے تھے۔'' اُس نے مجھے 'سچ' بتانا شروع کیا۔ ''ہمیں زخمیوں کو وہاں سے نکالنا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ اُس علاقے میں جگہ جگہ۔۔ باغیوں کی لگائی ہوئی بارودی سرنگیں موجود ہیں۔ ایسے میں وہاں جانا اور بھی پُرخطر کام تھا۔ ہماری انٹیلی جنس ایجنسی نے بتایا تھا کہ وہ بوڑھا جانتا ہے کہ بارودی سرنگیں کہاں کہاں پر بچھی ہوئی ہیں اور اُن سے بچ کر وہاں تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے، جہاں ہمارے زخمی فوجی لاچارگی کے عالم میں طبی امداد کے منتظر تھے مگر.....'' یہ کہنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا اور پھر گہری سانس لے کر بولا۔

''ہم اس بوڑھے کو کہہ رہے تھے کہ ہمیں وہاں تک بحفاظت لے چلو مگر وہ تو مان ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی وجہ سے ہمارا کمانڈر بہت غصے میں تھا۔ اُسے بوڑھے پر شدید غصہ آ رہا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور مجھے دیکھنے لگا۔

''اور پھر ٹیش میں آ کر اُسے قتل کر دیا گیا۔'' میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا مگر وہ خاموش رہا۔ البتہ میری بات سُن کر اس کی نظریں ضرور زمین میں گڑ گئی تھیں۔

''میں قرآن پاک کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے بوڑھے پر گولی نہیں چلائی تھی۔'' کافی دیر بعد اُس نے نظریں اوپر اٹھائیں اور کہا۔

''تو پھر وہ کون تھا جس نے گولی چلائی؟'' سوال سُن کر ایک بار پھر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد جب تک اسے وہاں سے لے جایا نہیں گیا، نہ تو اُس نے زبان کھولی اور نہ ہی زمین پر سے نظریں ہٹائیں۔

☆☆☆

رات کافی سرد ہو چکی تھی۔ ریت کے ٹیلے پورے چاند کی روشنی میں بہت خوبصورت نظارہ پیش کر رہے تھے۔ خنکی کے باعث میں نے ہلکی جیکٹ پہن لی تھی۔ میں، کمانڈر اور اس کے چند دیگر پرانے جنگجو ساتھی آگ کے دہکتے الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ لکڑیاں کب کی جل چکی تھیں، اب صرف انگاروں کی تپش باقی تھی۔ دہکتے کوئلوں کی تپش اُس وقت خوشگوار احساس پیدا کر رہی تھی۔ صحرا بھی عجیب جگہ ہے۔ دن کو پڑنے والی تمازت جسم کو جھلسا رہی تھی تو رات کی خنکی سے کپکپی طاری تھی۔ اگلی صبح کا سورج نکلنے کے ساتھ ہی پھر ہم جہنم میں داخل ہو جاتے..... یہ میرے لیے یادگار اور بہت ہی شاندار تجربہ تھا صحرا کی مہمان نوازی کا۔

جنگجو خانہ بدوش ٹولیوں کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک الاؤ میں آگ اب بھی جل رہی تھی۔ اس کے اوپر قہوہ کی کیتلی ٹنگی ہوئی تھی۔ سب لوگ ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ کچھ سگریٹ پی رہے تھے، بعض کے ہاتھوں میں قہوہ کی پیالیاں تھیں۔ کچھ ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔ انہیں دیکھ کر ہرگز یہ نہیں لگتا تھا کہ وہ ایسے جنگجو ہیں جو اس وقت نائیجر فوج کے ساتھ مسلح محاذ آرائی میں مصروف ہیں۔ کسی بھی وقت حملہ ہو جانے کا ڈر تھا۔ جان جا سکتی تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ مجھ سمیت یہ سب لوگ اُس وقت محاذِ جنگ کے بجائے کسی نیشنل پارک میں بیٹھے تفریح کر رہے ہوں۔

اچانک مجھے گٹار بجنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے آواز کی سمت دیکھا۔ ایک جنگجو گٹار بجاتا ہوا ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ میرے برابر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں جو گٹار تھا، وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہت پُرانا اور ٹوٹا ہوا تھا۔ گٹار کی نچلی تار ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس نے اُس جگہ پر موٹر سائیکل کی بریک وائر کس کر، اُسے اپنے شوق کی خاطر کام چلاؤ بنالیا تھا۔ وہ بہت خوبصورت دُھن بجا رہا تھا۔ صحرا کی اُس رات میں وہ دُھن بہت ہی مدّھر لگ رہی تھی۔ میری توجہ پاکر اچانک اُس نے گٹار پر سے اُنگلیاں روکیں۔ ''کیا تم ٹناری وین کے بارے میں جانتے ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''نہیں.....'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''یہ نائجر کا ایک بہت مشہور بینڈ ہے۔'' اس نے بڑے شوق سے بتانا شروع کیا۔ ''اس بینڈ کے باقی اور میں نے اکٹھے ہی گٹار بجانا سیکھا تھا۔ یہ 1980ء کی دہائی کی بات ہے۔ اُس وقت ہم لیبیائی فوج میں تربیت حاصل کررہے تھے۔'' اس نے بڑے شوق سے مجھے بتانا شروع کیا۔ یہ بات بتانے کے بعد اس نے گٹار پر ایک خوبصورت دُھن چھیڑ دی۔ ساتھ ساتھ وہ مقامی بولی میں کچھ گا بھی رہا تھا۔ بول سمجھ نہیں آرہے تھے لیکن موسیقی عالمگیر زبان ہے۔ دُھن کو سمجھنے کے لیے بول کو سمجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس دُھن میں حوصلہ، عزم اور ہمت کا اظہار تھا۔ ساتھ ہی لہو کو گرما دینے کی طاقت بھی صاف محسوس کی جارہی تھی۔

''یہ توارِیگی لوگوں کی جدوجہد کے بارے میں رزمیہ گیت ہے۔'' دُھن میں میرا انہماک دیکھتے ہوئے باغی کمانڈر نے مجھے شانے سے پکڑ کر اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ میں نے سر ہلا کر ایسا اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہوں ''بہت خوب۔''

گیت کے بول تو سمجھ نہیں آرہے تھے لیکن صحرا کی وسعتوں میں، کھلے آسمان تلے پورے چاند کی چاندنی میں، دہکتے کوئلوں کے گرد، ٹھنڈی ریت پر بچھے قالین پر تکیے سے ٹیک لگا کر یہ دُھن سننے میں جو مزہ آیا، شاید وہ کہیں اور، ساری زندگی، کبھی بھی محسوس نہیں کرپاؤں گا۔

اچانک ہلکی سی آہٹ ہوئی، جس سے میرا انہماک ٹوٹ گیا۔ ایک باغی ہمارے سامنے قہوے کی کیتلی اور پیالیاں رکھ رہا تھا۔ باغی ہمارے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھے ہوئے تھے۔ سب شاید عالمِ وجد میں تھے یا پھر موسیقی نے اُن کی روحوں کو جھنجوڑ دیا تھا۔ اُس وقت وہ لوگ جنگجو نہیں بلکہ بہت ہی معصوم اور بے ضرر خانہ بدوش لگ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی کارواں نے رات پڑنے پر پڑاؤ ڈالا ہو۔ مجھے یہ لمحہ صدیوں پہلے کا محسوس ہو رہا تھا۔ صحرا کے بیٹوں کا یہ اصل روپ تھا۔ اُس وقت اُن کے چہرے نقابوں سے بے نیاز تھے اور ان کے چہروں کے تاثرات مجھ پر اپنا راز عیاں کررہے تھے۔

☆☆☆

صحارائی جنگجو باغیوں کے ساتھ کئی دن گزارنے کے بعد میں واپس اپنے ملک چلا آیا۔ واپسی کے کچھ دن بعد خبر آئی کہ حکومت اور جنگجو توارِیگی خانہ بدوشوں کے درمیان جنگ بندی کا معاہدہ طے پا گیا ہے۔ معاہدہ ہوئے کچھ ہی مہینے گزرے تھے کہ نائجر آرمی نے ملک کے طاقتور ترین صدر ممادو طنجا کی حکومت برطرف کرکے نئے آزادانہ عام انتخابات کے وعدے کے ساتھ اقتدار سنبھال لیا۔ توارِیگ کی پشت پناہی کرنے والے قذافی بھی نہ رہے۔ ان حالات میں فوج اور توارِیگ خانہ بدوشوں کی کیسے نبھے گی، کسی کو نہیں معلوم.....

مجھے یاد ہے کہ جب میں واپس آرہا تھا تو باغی کمانڈر مجھے اپنے علاقے سے روانہ کرنے کے لیے بہت دُور تک ساتھ آیا تھا۔ اس نے بطور مہمان مجھے رخصت کرتے ہوئے بھیڑ کا خشک دودھ، پنیر، اور دستکاری مصنوعات کی کچھ سوغات بطور تحفہ پیش کی تھیں۔ رخصت ہوتے وقت ہم کھڑے ہو کر کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وہ میرے توسط سے مغربی دنیا کو یہ پیغام دینا چاہتا تھا کہ صحارا، میں القاعدہ اور منشیات کے اسمگلروں کے بڑھتے ہوئے رسوخ کو ختم کرنے کے لیے لازم ہے کہ توارِیگ کو تسلیم کیا جائے۔ ''صحرا ہم توارِیگیوں کے لیے کوئی راز نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے لیے ایسی کھلی کتاب کی طرح ہے جو ہماری اپنی زبان میں لکھی ہوئی ہے۔'' اس نے اپنا موقف بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔ پھر اس نے توارِیگی خانہ بدوشوں کی ایک پرانی اور مشہور کہاوت دُہرائی۔ ''ہم دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ یہاں کس طرح لڑائی لڑی جاسکتی ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے اس کی بات سُن کر کہا۔ ''توارِیگی تاریخ غداری، وعدہ خلافی اور لڑائی سے بھری ہوئی ہے۔ کیا تمہارے اس پس منظر کے باوجود مغرب تمہیں تسلیم کرسکتا ہے، تم پر یقین کرسکتا ہے؟'' یہ کہہ کر میں خاموش ہوا اور اُس کی طرف دیکھا۔

''اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اس بات کا جواب دو۔''

اُس نے کچھ نہیں کہا مگر مجھے 'چنک' کی ایک آواز صاف سنائی دی تھی۔ معلوم نہیں اس نے زبان چٹخا کر نفی میں جواب دیا تھا یا زبان باہر نکال کر توارِیگ کے روایتی انداز میں میری بات کی تائید کی تھی۔ میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔ اُس کا چہرہ نقاب میں تھا ورنہ شاید میں اُس کے چہرے پر آنے والے تاثرات کو ہی دیکھ کر بھانپ جاتا کہ وہ میرے سوال کے جواب میں کیا کہنا چاہتا تھا۔

شوقِ پرواز

طارق عزیز خان

کبھی کبھی شوق گلے کا پھندا بن جاتا ہے۔ ان دوستوں کے ساتھ بھی یہی ہوا، زندگی موت کی دہلیز پر پہنچ گئی تھی، مگر زندگی بچانے والا بہت بڑا ہے۔ حوصلے نے ان کا ساتھ دیا۔ سعی مسلسل کام آئی لیکن عجب انداز سے۔ ہر انسان کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔

جلتے ہوئے ہوائی جہاز کے نزدیک ان پر کیا گزری؟

امریکی ریاست کولوریڈو کے جنوب مغرب میں سان جوآن (San Juan) کا پہاڑی سلسلہ واقع ہے۔ یہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کے سب سے بڑے پہاڑی سلسلے روکی (Rocky) کا ذیلی سلسلہ ہے جو کولوریڈو سے ہوتا ہوا جنوب میں ریاست نیو میکسیکو تک پھیلا ہوا ہے۔ موسم گرما میں سان جوآن کے پہاڑوں کے قرب وجوار میں واقع چھوٹے بڑے قصبے سیاحوں اور شکاریوں کی آماجگاہ بنے رہتے ہیں۔ گرمیوں میں ان پہاڑوں پر ہائیکنگ کا لطف اُٹھایا جاسکتا ہے جبکہ سردیوں میں سان جوآن کی برف سے ڈھکی اعلائیں برف پر پھسلنے والوں کی جنت سمجھی جاتی ہیں۔ اس پہاڑی سلسلے کے جنوب میں ایک چھوٹا سا قصبہ ڈرینگو واقع ہے۔ ریاست کے بیشتر شہروں اور قصبوں کی طرح ڈرینگو میں رہنے والے ہر دوسرے فرد کی روزی سیاحوں سے وابستہ ہے۔ 45 سالہ جسٹن فرینک کا ڈرینگو میں ایک چھوٹا سا ریستوران تھا۔ اس ریستوران کی سب سے خاص بات جسٹن کی بیوی مارتھا کے ہاتھ سے بنے لذیز کیک اور تلی ہوئی چائنیں تھیں۔ سیاح اور قصبے کے شہری ریستوران میں آتے تو انہیں لذیز کھانوں کے ساتھ جسٹن فرینک کی ہوابازی کے قصے بھی سننا پڑتے۔ جسٹن کو ہوابازی سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ اس کے پاس چھوٹے ہوائی جہاز اُڑانے کا باقاعدہ لائسنس موجود تھا۔ وہ مقامی ہوابازی کلب کا ممبر بھی تھا اور ہفتے میں ایک آدھ بار چھوٹے طیارے کے ساتھ پہاڑوں کا ایک طائرانہ چکر بھی لگاتا تھا۔ جب وہ اپنے ہم عمر دوستوں ٹومی لیز اور لیری گومز کو اپنے ساتھ پیش آئے ہوابازی کے واقعات سناتا تو وہ ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتے۔

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم دونوں بھی تمہارے ساتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پرواز کا لطف اُٹھا سکیں؟'' ایک دن لیری نے اس سے پوچھا۔

''کیوں نہیں!'' جسٹن نے جواب دیا۔ ''اگر تم لوگ چاہو تو ہم ایک پُرجوش پرواز کا پروگرام بنا سکتے ہیں۔''

اس ملاقات کے بعد جسٹن نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر طے کیا کہ وہ لوگ اگلے ہفتے ایک چھوٹے سینا طیارے کے ذریعے سان جوآن کے پہاڑی سلسلے پر پرواز کریں گے۔ جسٹن اس مہماتی پرواز کے لیے بہت پُرجوش تھا۔ وہ لیری اور ٹومی پر اپنی ہوابازی کی دھاک بٹھانا چاہتا تھا۔ یہ جنوری 2003ء کی ایک روشن لیکن سرد صبح تھی۔ اس صبح تینوں دوست مقامی ہوابازی کلب میں اکٹھے ہوئے۔ انھوں نے ملکر ناشتا کیا اور پھر کلب سے متصل انٹراسٹریٹ پر پہنچ گئے۔ جسٹن نے دیگر سے ایک چھوٹا سفید رنگ کا سینا طیارہ باہر نکالا۔ اس میں چار افراد کی گنجائش تھی۔ جسٹن پارٹی کے پاس کچھ زیادہ سامان نہیں تھا۔ ان کا پروگرام تھا کہ وہ برف سے ڈھکے پہاڑوں پر کم و بیش ایک گھنٹا پرواز کا لطف اُٹھائیں گے۔ لیری اور ٹومی کے پیچھے بیٹھ جانے کے بعد جسٹن نے پائلٹ سیٹ سنبھالی اور ٹھیک ٹو بجے ٹیک آف کیا۔

وہ طیارے کو بتدریج بلندی تک لے جاتے ہوئے سیدھے پہاڑوں کی طرف بڑھا۔ اس نے طیارے کو دائیں رُخ پر گھمایا اور دو ہزار فٹ کی بلندی پر ہموار پرواز شروع کی۔ لیری اور ٹومی برفیلے پہاڑوں پر اُڑتے ہوئے ہیجانی کیفیت میں تھے۔ یہ ان کی زندگی کے سب سے انمول لمحے تھے۔ وہ خود کو پرندے کی طرح اُڑتا محسوس کر رہے تھے۔ ہوائی جہاز نے ایک غوطہ لگایا اور وہ زمین کے مزید قریب ہو گئے۔

''تم نے کمال کر دیا۔'' ٹومی نے بلند آواز سے جسٹن کو داد دی۔ ''کیا خوبصورت نظارہ ہے۔''

تینوں دوست بہت پُرجوش تھے۔ انہیں ایک پہاڑی پر برف پر منہ مارتے بارہ سنگھوں کا ریوڑ دکھائی دیا۔ ہوائی جہاز کی آواز سنتے ہی چند ایک نے تھوتھنی اُٹھا کر اوپر دیکھا اور پھر اپنے مشغلے میں مصروف ہو گئے۔ تینوں دوست بہت پُرجوش تھے اور ایک دوسرے کو زمین پر کچھ نہ کچھ دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ قریب پندرہ منٹ تک دائرے کی صورت میں ہوابازی کے جوہر دکھانے کے بعد جسٹن نے طیارے کا رُخ شمال میں بہتے دریائے ریوگرانڈے (Rio Grande) کی طرف کر دیا۔ دریا کا نظارہ ان کی شاندار پرواز کا آخری مرحلہ تھا۔ جسٹن کا پروگرام تھا کہ دریا پر طائرانہ نظر ڈالیں گے اور پھر واپس ڈوریگو کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا کہ اچانک ایک گڑبڑ ہو گئی۔

طیارہ ایک وادی کو پار کر کے بلندی کی طرف بڑھا تھا کہ اس کا انجن بند ہو گیا۔ جہاز کو زوردار جھٹکا لگا اور وہ تیزی سے زمین کی طرف گرنے لگا۔ لیری اور ٹومی کو لگا جیسے یہ کرتب بھی جسٹن کے پروگرام کا حصہ ہے۔ تاہم جہاز کا پتھر کی طرح زمین پر گرنا جاری رہا تو ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ زندگی سے بھرپور جہاز کے کیبن کے ہنستے کھیلتے ماحول میں موت کی سنسناہٹ سنائی دینے لگی۔ جسٹن اپنی پوری توانائی کو بروئے کار لاتے ہوئے تھروٹل اسٹک سے جوج رہا تھا۔ تاہم ہر گزرتے لمحے جہاز کی بلندی کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے دونوں دوستوں کے حواس گم ہو چکے تھے۔ ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ ایک دوسرے کو تھامے موت کو قریب آتا محسوس کر رہے تھے۔ وہ اس وقت 800 فٹ کی بلندی پر تھے اور جہاز کے نیچے جانے کا مطلب تھا کہ وہ سیدھے برف سے ڈھکے پہاڑوں سے ٹکرانے والے تھے۔ پائلٹ سیٹ پر بیٹھے جسٹن نے سوچا کہ یہ اس کے پاس آخری موقع ہے۔ اگر اس نے جلد ہی کچھ نہ کیا تو پھر ایک خوفناک حادثہ ان کا مقدر ٹھہرے گا۔ اس نے تھروٹل اسٹک کو آگے پیچھے کر کے جہاز کے نیچے گرنے کی رفتار کم کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ وہ ہنگامی لینڈنگ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جسٹن نے طے کیا کہ وہ ممکنہ حد تک جہاز کو ایک رُخ پر موڑتے ہوئے اس کی نیچے گرنے کی رفتار کم کرے گا اور اسے کسی ڈھلان پر اُتارنے کی کوشش کرے گا۔ اس نے خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی اور پیچھے بیٹھے اپنے خوفزدہ دوستوں کو دلاسہ دیا۔

''گھبراؤ نہیں دوستو، میں اسے نیچے اُتار لوں گا۔''

جسٹن کی کوششوں کے نتیجے میں جہاز کے نیچے گرنے کی رفتار میں کچھ کمی محسوس ہوئی۔ تینوں دوستوں کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ بلندی بتدریج کم ہونے لگی۔ اچانک جہاز کے پر نیچے موجود درختوں کی بلند شاخوں سے ٹکرائے اور انہیں تیز جھٹکا لگا۔ لیری اور ٹومی اپنی سیٹوں سے اُچھل کر کیبن کی دیوار سے ٹکرائے۔ ان کی چیخیں نکل گئیں۔ پائلٹ سیٹ پر بیٹھے جسٹن نے اپنا سر گھٹنوں میں دے دیا۔ درختوں کی ٹہنیاں ٹوٹنے کی بھیانک آوازیں آئیں اور جہاز شاخوں کو چیرتا ہوا ایک دھماکے کے ساتھ نیچے زمین پر موجود برف میں

دھنس گیا۔ لیری اور ٹومی بے ہوش ہو گئے لیکن کرشمہ یہ ہوا کہ خود جسٹن کو ایک خراش تک نہ آئی۔ اس نے خود کو پائلٹ سیٹ سے آزاد کیا اور اس مصیبت سے باہر نکلنے کی فکر کرنے لگا۔ اچانک اسے کچھ رسنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ایک خوفناک منظر اس کے سامنے تھا۔ جہاز کے انجن سے ایندھن رس رہا تھا۔ جسٹن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اسے آنے والے خطرے کا احساس ہو گیا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ایک معمولی سی چنگاری بھی اس پلے کو آگ کے گولے میں تبدیل کر سکتی تھی۔ وہ اچھل کر پیچھے کیبن میں پہنچا اور اپنے ساتھیوں کو ہوش میں لانے کے لیے جھنجوڑنے لگا۔

''لیری، ہوش میں آؤ'' جسٹن چلایا ''ہمیں فوری طور پر جہاز سے باہر نکلنا ہے۔''

لیری نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''ایندھن رس رہا ہے۔'' جسٹن نے لیری کو جھنجوڑا۔

''میری ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔'' لیری درد سے کراہا ''مجھے سے بلا بھی نہیں جا رہا۔''

''ہمت کرو میرے دوست، ورنہ ہم جل کر راکھ ہو جائیں گے۔''

جسٹن اور لیری اپنے تیسرے ساتھی ٹومی کو ہوش میں لانے اور جہاز سے نکلنے کی جدوجہد کرنے لگے۔ سب سے پہلے جسٹن جہاز سے باہر کودا۔ جیسے ہی اس کے پیروں نے برف کو چھوا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لیری کو کندھوں سے پکڑا اور باہر کی طرف کھینچ لیا۔ لیری نے درد سے ہونٹ بھینچ لیے لیکن وہ کسی نہ کسی طرح کیبن سے باہر نکلنے میں کامیاب رہا۔ ٹومی ابھی بھی کیبن میں تھا۔ جسٹن اور لیری نے ٹوٹے ہوئے دروازے سے ٹومی کو باہر کھینچنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی وہ اسے ہوش میں لانے کی تدبیر بھی کر رہے تھے۔ اس کا چہرہ خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پر گہری چوٹ تھی اور وہ جہاز کی پچھلی سیٹ پر پھنسا بے سدھ پڑا تھا۔ جسٹن اور لیری کو اسے باہر نکالنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ ادھر ایندھن مسلسل رس رہا تھا اور کسی بھی لمحے جہاز بم کی طرح پھٹ سکتا تھا۔

''اُٹھ جاؤ، ٹومی، ایندھن پھیل رہا ہے۔'' جسٹن نے ہوائی انداز میں ٹومی کو جھنجوڑ ڈالا۔ اس نے پورا زور لگایا اور بھاری بھرکم ٹومی کو جہاز سے باہر کھینچ لیا۔ تاہم وہ اب بھی بے ہوش تھا۔ جسٹن نے اپنے حواس برقرار رکھے اور اسے ٹانگوں سے گھسیٹ کر جہاز سے دور لے جانے میں کامیاب رہا۔ اس دوران لیری بھی اپنی زخمی ٹانگ کو سنبھالتا لنگڑاتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ اب تینوں دوست جہاز سے کم از کم پچاس فٹ دور تھے۔ جسٹن نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ برف سے ڈھکا اونچا نیچا علاقہ تھا۔ ان کے چاروں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دیودار اور دوسرے اقسام کے درختوں کا جنگل اُگا ہوا تھا۔ برف نہ صرف زمین پر تھی بلکہ درختوں کی شاخیں بھی اس کے بوجھ سے جھول رہی تھیں۔ موسم انتہائی سرد اور درجہ حرارت نقطہ انجماد سے کئی درجے نیچے تھا۔ جسٹن کے کان رستے ہوئے ایندھن کی آواز سن رہے تھے وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس کے پاس جہاز میں موجود ضروری سامان کو باہر نکالنے کا کوئی موقع ہے؟

اچانک ٹومی نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔ جسٹن اس کی طرف لپکا۔ اس نے غور کیا کہ ٹومی کے سر پر اور پسلیوں میں گہرے زخم تھے جن سے خون رس رہا تھا۔

''ٹومی میرے دوست ہوش میں آؤ، ہمیں اس ویرانے سے باہر جانے کا راستہ تلاش کرنا ہے۔''

''ہمیں ایندھن میں ڈوبے اس ملبے سے کچھ اور دور

معجزہ اور سحر میں فرق

معجزہ اور سحر میں فرق یہ ہے کہ معجزہ براہِ راست خدا کا فعل ہے جو بغیر اسباب کے ایک صادق کی صداقت کے لیے عالم وجود میں آتا ہے اور وہ کسی اصول وقوانین پر مبنی نہیں ہوتا کہ ایک فن کی طرح سکھایا جا سکے اور ہر وقت اس کے دکھانے پر قادر ہو، تاوقتیکہ مخالفین صداقت کے سامنے بطور چیلنج اس کو دکھانے کی ضرورت پیش نہ آئے، ایسی صورت میں جب نبی خدا کی طرف رجوع کرتا ہے تو خدا کی جانب سے اس کو دکھانے کی قوت پیدا کی جاتی ہے۔

سحر اور جادو ایک فن ہے جن کو اس کے مقررہ اصول وقوانین کی پابندی کے ساتھ ہر فن دان ساحر ہر وقت کام میں لا سکتا ہے، اس کے اسباب اگرچہ عام نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن اس فن کے واقف کار اس سے واقف ہوتے ہیں۔

(عجائب القصص از علامہ عبدالواحد بن محمد المفتی الحسینی)

مرسلہ: احمد رشیدی، کوٹ ادو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانا ہوگا۔'' زخمی لیری نے جسٹن کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کسی بھی لمحے دھماکا ہوسکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' جسٹن نے سر ہلایا ''ٹومی کو دور لے جانے میں میری مدد کرو۔''

جسٹن نے ٹومی کو کندھے پر لادا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے لیری کو سہارا دیا اور اسے کھڑے ہونے میں مدد دی۔ تینوں زخمی دوست گھٹنے گھٹنے برف میں دھنسے آگے بڑھنے لگے۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ میں سے اٹھتی ٹیسیں لیری کو بے حال کیے دے رہی تھیں۔ اس نے جسٹن کی طرف دیکھا جو اپنے سے قریب ڈیڑھ گنا وزنی ٹومی کو کندھے پر اٹھائے برف کو چیرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ لیری نے گھٹنے کے بل جھک کر زخمی ٹانگ کو پکڑا اور جسٹن کے قدموں کے نشان پر چلنے لگا۔ قریب پانچ سے سات منٹ کی جدوجہد کے بعد تینوں دوست جہاز سے مزید کچھ فٹ کی دوری پر آنے میں کامیاب ہوگئے۔ انہیں ایک بڑے پتھر کی اوٹ مل گئی۔ ٹومی اور لیری محفوظ پناہ گاہ میسر آتے ہی وہاں ڈھے گئے جبکہ جسٹن فکرمندی سے جہاز کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اپنے دوستوں کو تباہ شدہ جہاز سے باہر نکالنے میں کامیاب رہا تھا اور اب اسے اس سرد ویرانے سے باہر نکلنے کی تدبیر کرنی تھی۔ اسے معمولی نوعیت کی چوٹیں آئی تھی تاہم اس کے دونوں ساتھی بُری طرح زخمی تھے۔ انہیں فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ لیکن وہاں مدد تو کجا دور دور تک کسی انسان کا نام و نشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جہاز کا پائلٹ اور ٹیم لیڈر ہونے کے ناطے دونوں دوستوں کو بچانے کی ذمے داری اب اس پر تھی۔ اس کا ذہن اپنے بچاؤ کی ترکیبیں سوچ رہا تھا۔ تاہم جسٹن کی فوری پریشانی جہاز کو لے کر تھی۔ انہیں جہاز سے باہر آئے قریب پندرہ منٹ ہو چکے تھے۔ ایندھن اب بھی مسلسل رس رہا تھا۔ لیکن غیر متوقع طور پر دھماکا نہیں ہوا تھا۔ جسٹن سوچ رہا تھا کہ وہ جہاز کے ریڈیو کے ذریعے اپنی مدد کی پکار کو میلوں دور تک پہنچا سکتا تھا۔ تاہم اس کے لیے جہاز کے اندر جا کر بیڑی کو آن کرنا پڑتا اور یہ بات وہ جانتا تھا کہ بیڑی کا سوئچ پریس ہوتے ہی چنگاری پیدا ہوگی اور پھر سب کچھ جل کر بھسم ہو جائے گا۔ اچانک جسٹن کو اپنی جیب میں موجود سیل فون کا خیال آیا۔ وہ جوش سے اچھل پڑا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر جلدی میں فون باہر نکالا۔ خوش قسمتی سے بیڑی کے سیل پورے تھے لیکن..... سروس سگنل غائب تھے۔ جسٹن نے بیڑی کی طاقت بچانے کے لیے موبائل آف کر دیا۔ اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے بے بسی سے جہاز کے ملبے کی طرف دیکھا۔

''آخر یہ پھٹ کیوں نہیں رہا۔'' جسٹن بڑبڑایا۔ وہ ایک بار پھر جہاز کے اندر جا کر ریڈیو آن کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے چند منٹ مزید انتظار کیا۔ لیکن مسلسل رستے ایندھن میں جہاز کا ملبے سے مشابہ ڈھانچا اس کے سامنے موجود رہا۔ اس نے اپنے زخمی ساتھیوں پر ایک نظر ڈالی اور فیصلہ کیا کہ وہ جہاز تک جائے گا اور ریڈیو آن کر کے ایک ایس او ایس کال کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس نے اپنے آپ کو بیڑی آن کرنے کا خطرہ مول لینے پر تیار کیا اور نپے تلے قدم اٹھاتا جہاز کی طرف چل پڑا۔ وہ جہاز کے ٹوٹے ہوئے کیبن کے قریب پہنچا۔ اس نے ہونٹ بھینچے اور ایک جھٹکے سے دوبارہ پائلٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جسٹن نے بیڑی کے چھوٹے سے سرخ بٹن کی طرف دیکھا۔ اسے لگا جیسے ہی وہ اسے آن کرے گا۔ کھیل ختم ہو جائے گا۔ اسے اپنی گیارہ سالہ بیٹی یاد آ گئی۔ کیا وہ اسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھ پائے گا؟ کیا اس نے جہاز کے اندر آ کر کوئی غلطی کی ہے؟ اس کے ذہن پر سوالات کی یلغار ہوگئی۔ اس نے فوری طور پر جہاز سے نکلنے کا سوچا لیکن اسی لمحے اسے دور سے ٹومی کی کراہ سنائی دی۔

''نہیں، میں یہ خطرہ مول لوں گا۔'' جسٹن نے سر جھٹکا، گہری سانس لی اور پھر کانپتی انگلیوں سے بیڑی کے بٹن کو پریس کر دیا۔ کلک کی وہ معمولی سی آواز کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لیے جسٹن سن ہو کر رہ گیا۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس نے جلدی جلدی ریڈیو کا ڈائل گھمایا اور فریکوئنسی سیٹ کرنے لگا۔

''ہیلو، مے ڈے، مے ڈے۔'' جسٹن بار بار یہی الفاظ دُہرانے لگا۔ ''ہمارا سیسنا طیارہ حادثے کا شکار ہوگیا ہے، ہم ڈرینگو سے 30 کلومیٹر شمال میں موجود ہیں اور ہمیں مدد کی فوری ضرورت ہے۔''

جسٹن کی پکار کے جواب میں اسے سوائے شوں شوں کے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے پیغام کو کسی نے سنا یا نہیں، تاہم اس نے چند بار مزید کوشش کی اور پھر اچانک اس کی چھٹی حس نے اشارہ دیا اور وہ کود کر جہاز سے باہر آیا اور بغیر اِدھر اُدھر دیکھے وہ ہنٹا چلا گیا۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ ابھی وہ آدھے ہی راستے میں تھا کہ اچانک اس کے عقب میں ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ جسٹن اچھل کر برف پر گرا۔ اس نے لیٹے لیٹے اپنے پیچھے دیکھا۔

جہاز دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ وہ دھماکے سے تباہ ہوگیا تھا۔ جسٹن نے اُٹھ کر پھر دوڑ لگائی۔ ایک اور ہلکا دھماکا ہوا۔ تاہم خیریت رہی اور وہ اپنے ساتھیوں تک پہنچ ہی گیا۔

''کیا ہوا؟'' لیری نے امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے مدد کا پیغام دے دیا ہے۔''

''کیا کسی نے سنا؟''

''ہمیں اچھی امید رکھنی چاہیے۔'' جسٹن نے گول مول جواب دیا۔ ''ٹومی کا کیا حال ہے؟''

''یہ ایک بار پھر بے ہوش ہوگیا ہے۔''

''اسے ہوش میں لاؤ، اسے سونے مت دینا۔'' جسٹن نے کہا اور لیری کے ساتھ مل کر ٹومی کو ہلانے جلانے لگا۔

''اپنے آپ کو سنبھالو، ٹومی، مدد پہنچ رہی ہے۔'' جسٹن نے برف کو ہاتھوں میں مسل کر ٹومی کے منہ میں ڈالا۔ اس نے لیری کو ٹومی کا خیال رکھنے کو کہا اور اِدھر اُدھر گھوم پھر کر علاقے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ کوشش کر کے ایک قریبی درخت پر چڑھا اور کچھ بلندی سے علاقے پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ یہ چیڑ کے درختوں سے ڈھکی ایک وسیع پہاڑی ڈھلان تھی۔ شمال مشرق میں سان جولیان کا بلند پہاڑی سلسلہ دکھائی دے رہا تھا۔ مغرب میں اونچے نیچے ٹیلے اور کھائیاں تھیں جبکہ جنوب میں گھنا جنگل واقع تھا۔ جسٹن جانتا تھا کہ اس جنگل میں سے ہو کر ایک ہائیکنگ ٹریک ڈرینگو کے قصبے کی طرف جاتا ہے۔ تاہم زمین پر جمی برف اور گھنے جنگل کی وجہ سے وہ درست اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ ٹریک کس طرف ہے؟ اس وقت دن کے گیارہ بجے کے قریب کا وقت تھا۔ آسمان پر اکا دُکا بدلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہوا سرد تھی اور ہڈیوں کو چیرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جسٹن کی پریشانی کی وجہ ریڈیو پر نشر ہونے والی وہ خبر تھی جس میں شام کے وقت برف باری کا امکان ظاہر کیا گیا تھا۔ مطلب یہ کہ اس کے پاس مدد لانے کے لیے چند ہی گھنٹے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ رات کے وقت درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے 20 ڈگری تک نیچے گر جائے گا۔ ان کے پاس سردی سے محفوظ رہنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اگر وہ محض امید کے سہارے یونہی پڑے رہے تو پھر اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ لوگ صبح تک فراسٹ بائٹ یا پھر ہائپوتھرمیا کا شکار ہو جاتے۔ جسٹن کی پریشانی کی ایک اور وجہ وہاں آوارہ گھوم پھر رہے درندے تھے۔ سان جوآن کے پہاڑ بھیڑیوں، کایوٹی اور کوگر (Cougar) کی مسکن تھے۔ موسم سرما میں

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟
کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک
المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خورک کی کمی کا شکار بھوکے درندے اس کے زخمی ساتھیوں کے خون کی بو سونگھ کر وہاں آسکتے تھے۔ جسٹن اس سے زیادہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے جو کچھ کرنا تھا دن کی روشنی ہی میں کرنا تھا۔ اس نے ایک بار پھر موبائل فون آن کیا۔ ہاتھ اِدھر اُدھر گھما کر سگنل پکڑنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ درخت سے اُتر کر دوبارہ اپنے ساتھیوں کے قریب پہنچا۔ ٹومی ہوش میں آچکا تھا اور درد سے کراہ رہا تھا۔ جسٹن نے اپنے دوستوں کے زخموں کا جائزہ لیا اور فکر مند ہوگیا۔ حالات ابتری کی طرف جارہے تھے اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کی تباہی کا ذمے دار ہے۔

''مجھے معاف کردو۔'' جسٹن نے لیری کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''یہ میری غلطی ہے۔ میں نے ہی اس سیر کی تجویز پیش کی تھی۔''

''تم نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا۔'' لیری نے بے بسی سے جواب دیا۔ ''صرف یہ سوچو کہ ہم اس مصیبت سے کیسے نکلیں؟''

''کیا تمہاری مدد کی پکار کسی نے سنی تھی؟'' ٹومی نے جسٹن کو مخاطب کیا۔

''سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس بارے میں کچھ زیادہ یقین نہیں.... لگتا ہے کہ اب مجھے کچھ اور کرنا ہوگا۔''

''تم کیا سوچ رہے ہو؟''

''میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا۔'' جسٹن نے کہا۔ ''اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ میں یہاں سے باہر نکلوں اور مدد لے کر واپس آؤں۔''

جسٹن نے انہیں بتایا کہ وہ لوگ ڈوبینگو سے زیادہ سے زیادہ 30 کلومیٹر شمال میں تھے۔ اگر وہ ڈھلان سے نیچے اُتر کر جنگل پار کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو پھر اندھیرا ہونے سے پہلے ڈوبینگو پہنچ سکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آبادی سے قریب ہونے کی صورت میں اس کا موبائل فون سگنل پکڑ سکتا تھا۔ جسٹن نے خیال ظاہر کیا کہ اگر فوری طور پر مدد وہاں پہنچ جاتی تو پھر ان کے جھلسے ہوئے جہاز سے نکلتا دھواں ان کی نشاندہی کرسکتا تھا۔ تاہم وہ حتمی طور پر نہیں جانتا تھا کہ اس کی مدد کی پکار کسی نے سنی تھی یا نہیں؟

''دیکھو لیری، اگر ہم مدد کے انتظار میں رہے تو سردی سے اکثر کر مر جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' لیری نے سر ہلایا۔ ''تم اپنی کوشش کر دیکھو۔''

لیری کے خاموش رہنے پر جسٹن نے اسے تسلی دی اور ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں تھا۔ تاہم اس نے آگے بڑھنے سے پہلے اپنی پینٹ میں اڑسا ہوا چاقو کھولا اور ارد گرد موجود درختوں کی شاخیں کاٹنے لگا۔ کچھ دیر کی محنت کے بعد وہ موٹی ٹہنیوں اور شاخوں کا ایک ڈھیر جمع کرنے میں کامیاب رہا۔ اس نے شاخوں کو پتھر سے ٹکا کر ایک کام چلاؤ چھت تیار کی اور اپنے ساتھیوں سے اس میں دبکا رہنے کو کہا۔ جسٹن برف میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پہاڑی ڈھلان سے نیچے اُترنے لگا۔ اس وقت تک دوپہر ہوچکی تھی۔ آسمان پر بادل دکھائی دے رہے تھے اور ٹھنڈی سرد ہوا چل رہی تھی۔

اونچے نیچے راستوں اور برفیلے سرد ماحول میں جسٹن کا امتحان شروع ہوچکا تھا۔ گھٹنوں تک جمی برف میں اسے بنا کسی سہارے کے آگے بڑھنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ اس کے پاس کوئی نقشہ یا کمپاس نہیں تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آسمان پر سورج کے راستے کا اندازہ لگاتا اور اپنے راستے پر چل پڑتا۔ قریب دو گھنٹے تک پیدل چلنے کے بعد تھکن اس پر غالب آنے لگی۔ اس کا سانس بار بار پھول رہا تھا۔ اس نے موبائل ہاتھ میں تھام رکھا تھا اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے آن کرکے امید بھری نظروں سے سگنل سیل کی طرف دیکھتا اور مایوس ہوجاتا۔ مزید ایک گھنٹا پیدل چلنے کے بعد جسٹن کو محسوس ہوا کہ وہ ایک گھاٹی کے کنارے پہنچ گیا تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور چکرا کر رہ گیا۔ وہاں ہر طرف نظارے ایک جیسے ہی تھے۔ ایک جیسے درخت، برف کی سفید تہی ہوئی چادر اور ٹھہرا ہوا سرد موسم۔ کہیں سے کسی چرند پرند کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا اور آسمان کالے سیاہ بادلوں سے گھرتا جارہا تھا۔ موسم کو ابتری کی طرف مائل دیکھ کر جسٹن نے اپنی رفتار تیز کردی۔ وہ برف میں راستہ بناتا درختوں کے درمیان آگے بڑھتا رہا۔ اگلے ایک گھنٹے کے دوران موسم نے تیزی سے کروٹ لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان بادلوں سے ڈھک گیا اور بوندا باندی شروع ہوگئی۔ جسٹن کے آگے بڑھنے کی رفتار سست ہوتی گئی۔ شام ہونے پر برف باری شروع ہوگئی اور ماحول دھندلانے لگا۔ کم ہوتی روشنی ظاہر کررہی تھی کہ مختصر سا دن تیزی سے رخصت ہورہا تھا۔ بدقسمتی سے جسٹن ابھی تک جنگل ہی میں بھٹک رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ نہ صرف قصبے کی طرف جانے والے راستے کو کھو بیٹھا تھا بلکہ اس مقام سے اسے جائے

وقوعہ کا بھی درست اندازہ نہیں رہا تھا۔ شاید اس نے اپنے زخمی ساتھیوں کو قدرت کے رحم و کرم پر چھوڑ کر غلطی کی تھی۔ اس نے ایک بار پھر موبائل آزمایا لیکن نتیجہ پہلے جیسا ہی تھا۔ جسٹن پر خوف اور مایوسی ایک ساتھ حملہ آور ہوئی۔ وہ خود کو تھکا ہوا محسوس کرنے لگا۔ اس نے خود کو تسلی دی۔ اسے چلتے رہنا تھا ورنہ وہ جما دینے والی سردی کا شکار ہوسکتا تھا۔

کچھ ہی دیر میں اندھیرا پھیل گیا۔ اسے دور پہاڑوں سے بھیڑیوں اور گیدڑوں کی پکار سنائی دینے لگی۔ یہ چاند کی آخری تاریخیں تھیں اور جسٹن کو اندھیرے میں درست راستہ تلاش کرنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ اچانک ایک چھوٹی سی ندی اس کے راستے میں حائل ہوگئی۔ خوش قسمتی سے اس کا پانی بہہ رہا تھا اور وہ کم گہری بھی تھی۔ جسٹن نے فیصلہ کیا کہ وہ ندی کے اندر اس کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ چلے گا۔ اس نے پانی سے اپنا حلق تر کیا اور ندی میں قدم رکھ دیا۔ پانی بے حد ٹھنڈا تھا۔ تاہم جمی ہوئی برف میں چلنے کی نسبت بہتے ہوئے پانی میں چلنا آسان لگ رہا تھا۔

☆☆☆

جسٹن کے روانہ ہونے کے بعد لیری اور ٹومی نے حالات پر غور کیا۔ ان کے سامنے سب سے پہلا مرحلہ خود کو ٹھنڈ سے محفوظ رکھنے کا تھا۔ جسٹن ان کے لیے ایک عارضی چھت کا انتظام کرگیا تھا۔ وہ کچھ دیر اسی ٹھکانے میں دبکے رہے۔ اس دوران آسمان بادلوں سے ڈھکنے لگا۔ موسم بدلتا دیکھ کر انھوں نے اِدھر اُدھر سے مزید شاخیں جمع کرنے کا فیصلہ کیا۔ گو کہ وہ دونوں شدید زخمی تھے لیکن انہوں نے ہمت جمع کی اور کچھ دیر کی محنت کے بعد اپنے ٹھکانے کو مزید بہتر بنانے میں کامیاب رہے۔ انھوں نے کچھ شاخیں برف پر رکھ کر اس کا فرش بنایا اور ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھ گئے۔ خود کو جنگلی ماحول میں بے یار و مددگار محسوس کرکے وہ دونوں اداس ہوگئے تھے۔ عارضی چھت ان کی حفاظت کرسکتی تھی لیکن وہ انہیں اس بات کا احساس بھی دلا رہی تھی کہ شاید انہیں رات وہیں گزارنی پڑے۔ دوپہر کے بعد ہلکی بارش اور برف میں وہ اپنے عارضی ٹھکانے میں محفوظ رہے۔ سہ پہر کے بعد موسم کی شدت میں اضافہ ہونے لگا اور ٹھنڈ بڑھنے لگی۔ مدد کے لیے ان کا انتظار طویل ہوتا جارہا تھا۔ وہ جسٹن کے بارے میں سوچنے لگے۔ کیا وہ قصبے تک پہنچ پائے گا؟ کہیں وہ راستہ تو نہیں بھٹک گیا؟ کب شام ہوئی اور کب اندھیرا پھیلا وہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ اس ویرانے میں سرد رات ان کے لیے امتحان بن کر آگئی تھی۔ درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے کئی درجے نیچے تھا۔ برف باری مسلسل ہورہی تھی اور ڈھلان پر حاوی ہورہا تھا۔ وہ دور و نزدیک سے آتی بھیڑیوں کی آوازیں سن رہے تھے۔ بھوکے درندے رات پڑنے پر اپنی کمین گاہوں سے باہر نکل آئے تھے اور اب شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ لیری نے سوچا کہ اگر مدد آنے سے پہلے بھیڑیے ان تک پہنچ گئے تو سب کچھ ختم ہوجائے گا۔ ان کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ بھوک پیاس، تھکن اور زخموں سے چور ان کے پاس لڑنے کی طاقت نہیں بچی تھی۔ دونوں دوست اگلے تین گھنٹوں تک وہیں دبکے اپنی سلامتی کی دعا کرتے رہے۔

''حوصلہ رکھو میرے دوست، جسٹن مدد لے کر آتا ہی ہوگا۔'' لیری نے ٹومی کو تسلی دی۔

''میں نہیں بچ سکتا، یہ ٹھنڈ مجھے نگل رہی ہے۔''

''ہمیں کچھ اچھا سوچنا چاہیے۔'' لیری نے ٹومی کو ٹوکا۔ ''یہ بتاؤ، تمہارے اس فارم ہاؤس والے منصوبے کا کیا ہوا؟''

''میں نے زمین خرید لی ہے۔'' ٹومی نے کپکپاتے ہوئے بتایا۔ ''سردیاں ختم ہوتے ہی میں کام شروع کردوں گا اور پھر وہاں اعلیٰ نسل کے گھوڑے دوڑتے دکھائی دیں گے۔''

''بہت خوب، ہم گرمیوں میں گھوڑوں کے ساتھ شکار کو چلیں گے۔'' لیری کا جملہ پورا ہوا ہی تھا کہ اسے بہت قریب سے بھیڑیے کی کریہہ غراہٹ سنائی دی۔ دونوں دوست لرز کر رہ گئے۔ وہ خوف سے کانپتے ہوئے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے لگے۔ کئی منٹ خاموشی سے گزر گئے۔ اس دوران غراہٹ دوبارہ سنائی نہیں دی۔

''میں گھوڑے خریدنے کے لیے ڈینور جاؤں گا۔'' ٹومی نے اندھیرے میں نظریں گڑاتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ ''میں نے وہاں.....'' ابھی اس کا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ ان دونوں کو چند میٹر کے فاصلے پر جگمگاتے ہوئے درجن بھر جگنو دکھائی دیے۔ خوف کی تیز لہر ان کی اندر تک اُتر گئی۔ بھیانک غراہٹوں نے انہیں احساس دلا دیا کہ یہ جگنو نہیں بلکہ درندوں کی چمکتی ہوئی بے چین آنکھیں تھیں۔ بھوکے بھیڑیے انسانی خون کی بو سونگھتے ہوئے ان تک آپہنچے تھے۔ لیری اور ٹومی کا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ سمجھ گئے کہ موت ان کے سر پر سوار تھی۔ ان کا شوق پرواز موت کے سفر میں بدل گیا تھا۔ بھیانک دردناک سسکتی ہوئی موت.....

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جسٹن فریک نپے تلے قدم اُٹھاتا ندی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ تھکاوٹ ٹھنڈ اور خوف اس پر غالب تھے۔ وہ چلتے ہوئے کئی بار گر چکا تھا لیکن حرارت سے بھرپور زندگی کی طلب اسے مسلسل چلنے پر مجبور کررہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر جیب سے اپنا سیل فون نکال کر دیکھا۔ سگنل اب بھی نہیں مل رہے تھے۔ اس نے سر جھٹک کر موبائل آف کرنا چاہا کہ تب ہی اس کی نظر ایک کمزور سگنل پر پڑی۔ جسٹن کے ہیجان میں اضافہ ہوگیا۔ وہ موبائل تھامے ندی سے باہر نکلا۔ اس نے کھلے حصے کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے سگنل پکڑنے کی کوشش کی۔ اچانک ہی سگنل طاقتور ہونے لگے۔ وہ خوشی سے جھوم اُٹھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کال رجسٹر میں موجود پہلا ہی نمبر پریس کیا۔

''ہیلو، مارتھا، ڈارلنگ میں جسٹن بول رہا ہوں۔'' کال رسیو ہوتے ہی جسٹن چلّایا۔ لیکن دوسری طرف سے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ وہ برابر بولتا رہا لیکن اسے مارتھا کی آواز سنائی نہ دی۔ اس نے اسی کو غنیمت جانا اور اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے بات چیت جاری رکھی۔

''میں تمہاری بات سن رہی ہوں۔'' اچانک مارتھا کی کمزور آواز سنائی دی۔ ''ایک ہیلی کاپٹر اور پیدل گروپ تمہاری تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔''

''آئی لو یو ڈارلنگ، مجھ سے بات کرتی رہو۔'' جسٹن پُرجوش آواز میں بولا۔

''تم کہاں ہو؟'' مارتھا نے پوچھا۔

''میں حتمی طور پر کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' جسٹن نے اپنے قرب و جوار میں دیکھا۔ ''ہم ڈریسنگو کے 25 سے 30 کلومیٹر شمال میں موجود ہیں۔ میں ایک ندی کے کنارے ہوں۔ ہمارا طیارہ تباہ ہوچکا ہے اور میرے ساتھی زخمی ہیں۔ یہاں ہر طرف برف ہی برف ہے۔''

''تم اپنے حواس برقرار رکھنا، مدد بہت جلد تم تک پہنچ جائے گی۔'' مارتھا نے اسے یقین دلایا۔

''حادثہ پیش آئے پورا دن گزر چکا ہے۔ لیکن میں نے ہیلی کاپٹر کی آواز اب تک نہیں سنی۔'' جسٹن نے کہا۔

''وہ دوپہر کے بعد تم لوگوں کی تلاش میں روانہ ہوئے تھے۔ شاید وہ دوسری طرف نکل گئے ہوں، میں ابھی انھیں اس کال کے بارے میں بتاتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' جسٹن نے موبائل بند کرکے آسمان پر نظریں جما دیں۔ وہ ہیلی کاپٹر کے انتظار میں وہیں موجود رہا۔ تاہم اس کا انتظار طویل ہوتا رہا اور مدد کہیں سے آتی دکھائی نہ دی۔ ایک بار پھر اس پر مایوسی چھانے لگی۔ اس نے موبائل آن کرکے نمبر پریس کیا۔ وہ جھنجلا گیا، سگنل غائب تھے۔ جسٹن اگلے دو گھنٹے تک وہیں موجود رہا۔ اس کا موبائل کبھی سگنل پکڑ لیتا اور کبھی نہیں۔ اب رات گہری ہوتی جارہی تھی۔ برف باری اپنے جوبن پر تھی۔ جسٹن ٹھنڈ، خوراک کی کمی اور تھکن کا شکار تھا۔ اس نے ایک درخت سے ٹیک لگائی اور اپنے انجام کے بارے میں سوچنے لگا۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ شاید وہ غنودگی میں تھا کہ اس نے ہیلی کاپٹر کے پنکھوں کی تیز گرج سنی۔

''میں یہاں ہوں۔'' جسٹن ہڑبڑا کر اُٹھا اور حلق کے بل چلّایا۔ ہیلی کاپٹر نیچی پرواز کرتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ اس کے نیچے لگی بڑی سرچ لائٹ سے جنگل میں دائرہ نما روشنی حرکت کرنے لگی۔ جسٹن نے چیخنا چلّانا جاری رکھا۔ ہیلی کاپٹر عین اس کے سر پر پہنچا اور پھر تیزی سے ایک طرف نکل گیا۔ اس پر سوار مددگار ٹیم نے درختوں کے درمیان اُچھلتے کودتے جسٹن فریک کو دیکھ لیا تھا۔

☆☆☆

لیری اور ٹومی نے بھیڑیوں کو قریب محسوس کرکے شور مچانا شروع کردیا۔ وہ درندوں کو خود سے دور رکھنے کے لیے چیخ چلّا رہے تھے۔ بھیڑیے ایک لمحے کو ٹھٹک کر رکے لیکن پھر دانت نکوستے ہوئے دھیرے دھیرے اپنے شکار کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کی تعداد پانچ تھی اور وہ شکار کو گھیرنے کے لیے بے تاب دکھائی دیتے تھے۔ لیری اور ٹومی ٹھکانے سے باہر نکل آئے اور اپنے زخموں کی پروا نہ کرتے ہوئے شور مچانے لگے۔ ادھر بھیڑیے انہیں نظروں میں تولتے آگے بڑھنے لگے۔ وہ جان گئے تھے کہ ان کا شکار بے بس اور زخمی تھا۔

''جلدی کرو میرا کیمرا اُتارو اور فلش آن کرو، جلدی کرو۔'' ٹومی نے چلّاتے ہوئے لیری سے کہا۔

''ٹھیک ہے میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں۔'' لیری نے عجلت میں ٹومی کے گلے میں لپٹا کیمرا اُتارا۔ اس کا فلش آن کیا اور قریب آتے درندوں کی طرف کرکے اس کا بٹن پریس کردیا۔ ایک ساتھ دو باتیں ظاہر ہوئیں۔ فلش چمکنے سے بھیڑیے چونکے اور ساتھ ہی نیچے وادی سے کسی ہیلی کاپٹر کے پنکھوں کی آواز سنائی دی۔ لیری نے دوسری اور پھر تیسری بار فلش چمکایا۔ خوش قسمتی یہی اور بھیڑیے چمکتی روشنی سے گھبرا کر

اندھیرے میں غائب ہوگئے۔

''یہ ہیلی کاپٹر کی آواز تھی۔'' ٹومی خوشی سے چلّایا۔ ''تم نے سنا۔''

''ہاں میں نے سن لیا۔''

دور گھاٹی پر ہیلی کاپٹر کی پروازیں جاری تھیں۔ لیری اور ٹومی بے چینی سے اس کے قریب آنے کا انتظار کررہے تھے۔ ایک ایک لمحہ ان پر بھاری تھا۔ کچھ دیر تک گھاٹی پر پرواز کے بعد ہیلی کاپٹر تیزی سے ڈھلان کی طرف آیا۔ اس نے جائے حادثہ کے قریب کئی چکر لگائے۔ تاہم بدقسمتی سے اس پر سوار مددگار ٹیم کے ارکان شور مچاتے لیری اور ٹومی کو نہ دیکھ پائے۔ ہیلی کاپٹر نے اِدھر اُدھر کے ٹیلوں پر پرواز کی اور ایک بار پھر ان کی طرف آیا۔

''فلش چمکاؤ۔'' ٹومی نے لیری سے کہا۔ ''وہ ہمیں دیکھ نہیں پارہے۔''

لیری نے کیمرے کا رخ آسمان کی طرف کرکے متعدد بار فلش چمکایا۔ اس دوران ہیلی کاپٹر عین ان کے سر پر سے گزرا۔ ایک لمحے کو انھیں لگا جیسے مددگار ٹیم نے انھیں دیکھ لیا تھا۔

☆☆☆

ہیلی کاپٹر کو کچھ فاصلے پر کھلی جگہ میں اُترتے دیکھ کر جسٹن نے اس طرف دوڑ لگا دی۔ وہ برف میں اُچھلتا ہوا کچھ ہی دیر میں وہاں پہنچ گیا۔ ہیلی کاپٹر سے امدادی ٹیم کے دو کارکن باہر نکلے انہوں نے لپک کر جسٹن کا ہاتھ پکڑا اور اسے اوپر کیبن تک پہنچا دیا۔

''میرے ساتھی زخمی ہیں۔'' جسٹن نے پنکھوں کے شور میں چلّا کر امدادی کارکنوں کو بتایا۔ ''وہ وہاں اس طرف ہیں۔''

''ٹھیک ہے، ہم وہیں جارہے ہیں۔''

ہیلی کاپٹر میں جسٹن کو ایک انجکشن لگایا گیا اور اسے ایک گرم جیکٹ پہننے کو دی گئی۔ اس دوران ہیلی کاپٹر نے جسٹن کی راہنمائی میں اس کے دوستوں کی تلاش جاری رکھی۔ انہوں نے پہاڑی ڈھلان پر کئی چکر لگائے لیکن نیچے کچھ دکھائی نہیں دیا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ یہی وہ جگہ تھی؟'' ٹیم لیڈر نے جسٹن سے پوچھا۔

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' جسٹن نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''شاید یہی جگہ ہو یا پھر وہ اس طرف عالی پہاڑی پر ہوں۔''

مددگار ٹیم نے جسٹن کے اشارے پر جنوبی سمت میں واقع ایک پہاڑی ٹیلے کی چھان بین کی لیکن نتیجہ صفر نکلا۔ وہ واپس پہلے والی پہاڑی کی طرف آئے۔ ہیلی کاپٹر نے بلندی مزید کم کی اور ٹیم کا ہر ممبر آنکھیں پھاڑے نیچے پڑ رہی روشنی کے دائرے میں دیکھنے لگا۔ انہوں نے وہاں کے دو مزید چکر لگائے لیکن ان کی تلاش لاحاصل رہی۔ جسٹن کی پریشانی بڑھ گئی تھی۔ اس کے زخمی ساتھی پچھلے پندرہ گھنٹوں سے بے یارو مددگار اس برفیلے ویرانے میں پڑے ہوئے تھے اور وہ مدد موجود ہوتے ہوئے بھی ان تک نہیں پہنچ پارہا تھا۔ کیا ایسا تو نہیں تھا کہ وہ دونوں جنگل کے خطروں کا شکار ہوچکے تھے۔ جسٹن نے ایک جھرجھری لی۔ وہ ایسا سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

''ہمارا ایندھن ختم ہورہا ہے۔'' کیبن میں پائلٹ کی آواز گونجی۔ ''ہمیں تلاش کا کام صبح تک ملتوی کرنا ہوگا۔''

''نہیں تب تک بہت دیر ہوجائے گی۔'' جسٹن جلدی سے بولا۔ ''پلیز کچھ بلندی کم کرکے ہمیں ایک چکر اور لگانا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے، لیکن یہ آخری چکر ہوگا۔''

ہیلی کاپٹر خطرناک حد تک کم بلندی پر اُڑنے لگا۔ اس کے پنکھوں کی ہوا سے درختوں کی شاخیں جھول رہی تھی۔ اس پر سوار ہر فرد کی نگاہ نیچے زمین پر جمی ہوئی تھی۔ اچانک انھیں درختوں کے درمیان سے بار بار چمکتی روشنی دکھائی دی۔

''وہ رہے۔'' جسٹن کی جوشیلی آواز گونجی۔ ''وہ رہے اس طرف، وہ ہمیں اشارہ کررہے ہیں۔''

''ہاں، میں نے دیکھ لیا ہے۔'' پائلٹ نے کہا۔ ''میں اُترنے کے لیے کھلی جگہ دیکھ رہا ہوں۔''

مددگار ٹیم کے ارکان نے جسٹن کے زخمی ساتھیوں کو دیکھ لیا تھا۔ اب انھیں زمین پر اُترنے کے لیے مناسب جگہ کی تلاش تھی۔ تاہم ان کی یہ تلاش ایک اور مصیبت ثابت ہوئی اور انھیں کچھ دیر کی چھان بین کے باجود وہاں کوئی ایسی جگہ دکھائی نہ دی جہاں وہ اُتر سکتے۔ ڈھلان غیر ہموار تھی اور وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بلند درخت اُگے ہوئے تھے۔ یہاں اُترتے وقت اندازے کی معمولی سی غلطی خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔ ہیلی کاپٹر کم از کم دو سو فٹ کی بلندی پر تھا۔ اس خطرناک علاقے میں رسی کی سیڑھی کے ذریعے کچھ لوگوں کو نیچے اُتارنا بھی ممکن نہیں تھا۔ بالآخر کچھ دیر کی تلاش کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بعد پائلٹ کو کسی حد تک ہموار قطعہ دکھائی دیا۔ یہ جگہ لیری اور ٹومی کی جائے پناہ سے قریب آدھ کلومیٹر دور ایک بلند ٹیلے کے عقب میں تھی۔ گو کہ اس مقام پر بھی درختوں کا جنگل موجود تھا، تاہم اگر احتیاط برتی جاتی تو وہاں اُترنے کا خطرہ مول لیا جاسکتا تھا۔ پائلٹ نے اپنے ساتھیوں کو ہوشیار رہنے کی ہدایت کی۔ اس نے ہیلی کاپٹر کا رُخ موڑا اور مقررہ مقام کے اوپر پہنچ کر اسے دھیرے دھیرے نیچے کرنے لگا۔ بلندی کم ہونے لگی۔ تاہم ابھی ہیلی کاپٹر زمین سے چالیس فٹ اوپر معلق تھا کہ تبھی ایک گڑبڑ ہوگئی۔ اس کی دُم پر لگے روٹر قریب ہی موجود ایک درخت کی شاخ سے ٹکرائے۔ ہیلی کاپٹر کو جھٹکا لگا اور وہ خطرناک انداز میں گھوم کر منہ کے بُل نیچے جھک گیا۔ کیبن میں موجود افراد نے دانت بھینچ کر اپنی سیٹوں کو تھام لیا۔ پائلٹ نے تھروٹل اسٹک سے زور آزمائی کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بلندی مزید کم ہوئی اور لگ بھگ چالیس ٹن وزنی ہیلی کاپٹر ترچھے رُخ سے زمین پر ڈھے گیا۔

☆☆☆

ادھر ہیلی کاپٹر کو ٹیلے کے عقب میں غروب ہوتا دیکھ کر ٹومی اور لیری کچھ حیران ہوئے۔ انہیں ایک ہلکا سا دھماکا سنائی دیا۔ وہ سمجھ نہیں پائے کہ دراصل وہاں کیا ہوا تھا؟ انہیں اور کچھ نہ سوجھا تو انہوں نے حلق پھاڑ کر چلّانا شروع کردیا۔ وہ ٹیلے کی طرف منہ کر کے بلند آواز سے اپنی موجودگی کا احساس ... دلانے لگے لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ لیری اور ٹومی کا حوصلہ جواب دے گیا۔ انہیں لگا ہیلی کاپٹر وہاں سے واپس چلا گیا تھا۔ کیا مددگار ٹیم نے انہیں نہیں دیکھا تھا؟ اس سوال کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ انہوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کامیابی کے اس قدر قریب پہنچ کر ناکامی کا سرد اندھیرا ان کا مقدر بن گیا تھا۔ دونوں دوست مایوسی کی انتہا پر تھے۔ اچانک ہی ٹومی ہمت کر کے دوبارہ کھڑا ہوا اور اس نے بنا کچھ سوچے سمجھے ایک بار پھر مدد کے لیے چلّانا اور شور مچانا شروع کردیا۔ لیری کو لگا وہ پاگل ہو چکا ہے۔

''ہم یہاں ہیں، خدا کے لیے اس طرف آؤ، ہمیں بچاؤ۔'' ٹومی بار بار یہی فقرے دُہرا رہا تھا۔ لیری اسے تسلی دینے کے لیے کھڑا ہوا۔ تاہم ابھی وہ کچھ بول نہیں پایا تھا کہ نیچے ترائی سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ دونوں دوست چونک گئے۔ وہ آوازوں کی سمت میں دیکھنے لگے۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بلند ہوگئیں اور ساتھ ہی انھیں ایک درجن سے زیادہ انسانی ہیولے بڑی بڑی ٹارچ پکڑے اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ لیری اور ٹومی نے ایک طویل سانس خارج کی۔ ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بالآخر مدد ان تک پہنچ گئی تھی۔ وہ خوشی سے جھوم اُٹھے۔ آنے والے افراد زمینی مدد گار ٹیم کے ارکان تھے۔ ان میں پانچ پیشہ ور امدادی کارکن، ایک ڈاکٹر اور باقی ماہر شکاری تھے۔ یہ لوگ ہیلی کاپٹر ٹیم سے الگ تھلگ ان کو تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے تھے۔ انہوں نے لیری اور ٹومی کو گرم کمبل دیے۔ انہیں پینے کو برانڈی دی اور ابتدائی طبّی امداد مہیا کی۔ لیری اور ٹومی کو سکون کا احساس ہوا لیکن اگلے ہی لمحے انہیں جسٹن فریک کی فکر ستانے لگی۔ اس کے دوست کا کیا ہوا؟ کیا وہ ڈوبرینگو تک نہیں پہنچ پایا؟ ہیلی کاپٹر جو کچھ دیر پہلے تک وہاں پرواز کر رہا تھا اچانک کہاں غائب ہوگیا؟ لیری نے امدادی ٹیم کے لیڈر کو مختصراً اب تک کے حالات بتائے۔ ان کی نشاندہی پر چار افراد کا ایک گروپ قریبی ٹیلے کی طرف روانہ ہوگیا۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ امدادی ہیلی کاپٹر آڑھے ترچھے انداز میں برف میں دھنسا ہوا تھا۔ کچھ لوگ اس کے قریب تھے اور اپنے دیگر ساتھیوں کو باہر نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ خوش قسمتی سے جسٹن فریک سمیت وہ سب ٹھیک تھے اور ان میں سے کسی کو بھی گہرے زخم نہیں آئے تھے۔ پیدل ٹیم کے ایک رکن نے جسٹن کو اس کے دوستوں کے زندہ بچ جانے کی خوشخبری سنائی۔ اگلے ایک گھنٹے کے دوران وہ سب دو بڑے امدادی ہیلی کاپٹروں میں ڈوبرینگو شہر کی طرف پرواز کر رہے تھے۔ اس وقت دور مشرق سے نکلتے سورج کی کرنوں نے ماحول کو روشن کردیا تھا۔ رات کی طویل خوفناک سیاہی چھٹ گئی تھی اور امیدوں کو جواں کردینے والا حرارت سے بھرپور نیا روشن دن طلوع ہوگیا تھا۔ ڈوبرینگو کے مقامی اسپتال میں لیری اور ٹومی کو آپریشن کے کئی مراحل سے گزرنا پڑا۔ دو ہفتے بعد جسٹن فریک نے اپنے دوستوں سے ملاقات کی۔

''تم تو کل آنے والے تھے۔'' ٹومی نے جسٹن کو دیکھ کر ہانک لگائی۔

''ہاں دراصل میں ایک ہوائی سفر کے انتظامات میں اُلجھا ہوا تھا۔'' جسٹن نے شوخی سے دونوں دوستوں کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم میرے ساتھ پرواز کا لطف اُٹھاؤ گے۔''

''تم اکیلے نہیں جاسکتے۔'' لیری اور ٹومی یک زبان ہو کر بولے۔ ''کچھ دن کی بات ہے، ہم سب ایک بار پھر اپنی ادھوری پرواز مکمل کریں گے۔''

ذہن رسا

انور فرہاد

خداوند کریم جسے چاہے اوج کمال عطا کرے۔ خصوصیات سے مالا مال کردے۔ پاکستان میں کبھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں رہی، مگر ہم بی ناقدر ٹھہرے۔ وہ بھی باکمال گیت کار تھا۔ ایسے ذہن رسا کا مالک کہ فی البدیہہ گیت پیش کردیتا۔ ایسا بے نظیر برصغیر میں کوئی دوسرا گیت کار نہیں۔ اس نے اتنے گیت، اتنی کم عمری اور کم وقت میں پیش کیے جس کی مثال نہیں۔ اس کے گیت فوراً ہی مقبول ہوجاتے تھے۔

لالی ووڈ کے ایک مایہ ناز گیت کار کو خراجِ تحسین

ٹرانسپورٹر کی بیوی پڑھی لکھی نہیں تھیں، مگر اسے عطیۂ خداوندی ہی کہا جاسکتا ہے کہ انہیں میر، غالب، سودا اور مومن کے علاوہ مختلف معروف شعراء کے ڈھیروں اشعار ازبر تھے۔ انہیں وہ تنہائی میں گنگنانے کے علاوہ اکثر موقع محل کے لحاظ سے اپنی گفتگو کے دوران بھی استعمال کرتی تھیں اور اپنے مخاطب کی حیرانگی میں اضافہ کرتی تھیں۔ شاید یہ ان کے دادھیال ہی کا اثر تھا کہ ان کی گود میں پرورش پانے والے ننھے خواجہ کمی الدین نے جب ہوش سنبھالا تو گویا اس کے رگ و پے میں شعر و شاعری رچ بس چکی تھی۔ اکثر وہ بھی ماں کی طرح شعر گنگنانے لگتا۔ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ کھیل کے دوران بھی میر یا غالب کا کوئی شعر پڑھنے لگتا۔ اس کی یا ساتھیوں کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اس سے کوئی غرض نہیں۔ چشمے سے جس طرح پانی بہتا ہے اسی طرح اس کے منہ سے ماں کی زبانی سنے ہوئے اشعار پھوٹتے رہتے تھے۔ شاید اس کے پیچھے قدرت کی یہ حکمت عملی تھی کہ آنے والے دنوں میں اسے ہزاروں گیتوں، غزلوں، قوالیوں، دھمالوں اور نعتیہ کلام کا شاعر بنانا مقصود تھا۔

ہزاروں گیتوں کے خالق خواجہ پرویز کو بھی اللہ پاک نے کچھ اسی اہتمام کے ساتھ فلمی دنیا تک پہنچایا تھا، وہ جو کہتے ہیں گاڈ گفٹڈ تو خواجہ صاحب کو بھی شاعری عطیۂ خداوندی کے طور پر ملی تھی۔ ہماری پاکستانی فلمی صنعت کے سنہری دور کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس دور کی کامیاب فلمیں خواجہ پرویز کے سپرہٹ نغموں کی مرہونِ منت ملیں گی۔ برصغیر کی فلموں میں کامیاب گیتوں کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک دو نہیں سیکڑوں گیت اور گانے ایسے ہیں جنہوں نے فلموں کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا ہے، اس دور میں بھی انہوں نے دھوم مچائی اور آج بھی ان کی پسندیدگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔

وہ شوگر کے مریض تھے۔ شوگر کا بڑھنا بھی اچھا نہیں ہوتا اور ضرورت سے زیادہ گھٹنا بھی۔ ایک دن ان کا شوگر لیول اچانک انتہائی کم ہوگیا۔ انہیں فوری طور پر اسپتال پہنچایا گیا اور جب شوگر لیول سنبھل گیا تو انہیں گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ دو دن بعد مکمل چیک اپ کے لیے انہیں میو اسپتال میں داخل کیا گیا۔ یہ 20 جون 2011ء کی دوپہر ایک بجے کی بات ہے، وہ اسپتال کے پرائیویٹ کمرے میں بیٹھے لنچ لے رہے تھے کہ اوپر سے فوری بلاوا آ گیا اور وہ لنچ ادھورا چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوگئے۔

کیسی عجیب بات ہے، وہ جو دوستوں اور اپنے چاہنے والوں کے لیے تقریباً روز ہی اپنے گھر میں محفل سجایا کرتا تھا اور طرح طرح کے رنگ برنگے کھانوں سے ان کی تواضع کیا کرتا تھا، وہ اپنے دسترخوان ہی سے اٹھا لیا گیا۔ کیسی عجیب موت تھی اس کی!

پاکستانی فلمی دنیا کے بے شمار شاعر و نغمہ نگار گزرے ہیں جن کے ذکر کے بغیر پاکستان فلم انڈسٹری کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ ان میں خواجہ پرویز کا نام بھی ان کی بہترین نغمہ نگاری کی وجہ سے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ان کی بعض خوبیاں انہیں دوسروں سے الگ، منفرد اور ممتاز ثابت کرتی ہیں۔

وہ مشرقی پنجاب کے شہر امرتسر میں 28 دسمبر 1932ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والدین نے ان کا نام خواجہ محی الدین رکھا۔ انہوں نے میٹرک تک تعلیم امرتسر ہی میں حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد وہ اہلِ خانہ کے ہمراہ لاہور آ گئے اور گوالمنڈی کے علاقے میں رہائش اختیار کی اور تمام عمر اسی علاقے میں بسر کی۔ لاہور آمد کے بعد گورنمنٹ کالج سے ایف اے اور پھر دیال سنگھ کالج سے بی اے پاس کیا۔ شعر و سخن کا ذوق ابتدا ہی سے تھا جو ایامِ جوانی میں پروان چڑھا۔ اسے دیال سنگھ کالج کے زمانے میں خوب جلا ملی۔ ان کے ہم جماعتوں میں ولی صاحب (ہدایت کار ولی احمد خان) کے صاحبزادے ظفر اقبال بھی شامل تھے جن کی وجہ سے خواجہ صاحب، ولی صاحب کے قریب ہوئے۔ پچاس کی دہائی میں ولی صاحب کے معاون کی حیثیت سے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا اور پانچ سال تک اس حیثیت سے ان کی تین فلموں گڈی گڈا، لکن چھپی اور سوہنی کمہارن میں انہیں اسسٹ کیا۔ ولی صاحب کی فلم ''گڈی گڈا'' جو اُن کی پہلی فلم تھی، اُس میں انہوں نے اپنی اداکاری کا شوق بھی پورا کیا۔ یہ ان کی جوانی کا دور تھا۔ یہ فلم کامیاب بھی ہوئی تھی۔ کامیاب فلموں سے وابستہ تمام لوگوں کو کامیاب سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ وہ چاہتے تو اداکاری کے میدان میں بھی اپنی قسمت آزما سکتے تھے۔ مگر اس سلسلے میں انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹری ہی جاری رکھی۔ ولی صاحب کی مزید دو فلموں میں بھی ان کی معاونت کی اور جب ولی صاحب نے تین فلموں کے بعد اپنا ادارہ بند کردیا تو نامور شاعر سیف الدین سیف کے ادارے سے وابستہ ہوگئے اور تقریباً پانچ سال تک ان کو بھی اسسٹ کرتے رہے۔

دس سال کا عرصہ کافی ہوتا ہے یہی سمجھا جارہا تھا کہ خواجہ صاحب اچھی خاصی ڈائریکشن کی سدھ بدھ حاصل کرچکے ہیں لہٰذا اپنے مستقبل کے لیے وہ اسی فیلڈ کا انتخاب کریں گے، مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ان کے اندر چھپے ہوئے شاعر نے نہ انہیں ادارکار بننے دیا نہ ہدایت کار۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ ایک دن معلوم ہوا کہ وہ نغمہ نگار بن گئے ہیں۔ فلمساز، ہدایت کار اور اداکار دلجیت مرزا کی فلم ''رواج'' کا ایک گانا جو مالا کی آواز اور ماسٹر عنایت حسین کی دھنوں پر تیار کیا گیا تھا۔ ''وعدہ کر کے نبھانا کہیں چھوڑ کر نہ جانا'' ہٹ ہوگیا تو لوگوں نے پوچھا ''ارے یار! یہ خواجہ پرویز کون ہے؟'' تو دلجیت مرزا نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔ ''اور کون ہوگا، آپ سب کا جانا پہچانا خواجہ محی الدین۔ ولی صاحب اور سیف صاحب کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر۔''

''اچھا! یہ وہی ہے! یہ تو بڑا زبردست کھلاڑی نکلا۔ اس نے تو پہلی ہی گیند میں چھکا مار دیا۔''

فلمی دنیا میں ایسے چھکے مارنے والوں کو معاف نہیں کیا جاتا۔ فوراً گرفتار کرلیا جاتا ہے پھر خواجہ صاحب بھلا کیسے بچ سکتے تھے؟ فلم سازوں، ہدایت کاروں اور موسیقاروں نے انہیں ایسا گرفتار کیا کہ وہ تادمِ مرگ رہائی حاصل نہ کرسکے۔ انہیں اس اعتماد کے ساتھ فلموں کی نغمہ نگاری سونپی جاتی کہ وہ اپنے گیتوں سے ان کی فلموں کی کامیابی یقینی بنادیں گے اور

اس سلسلے میں انہوں نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا۔ اللہ رب العزت نے انہیں فلمی گیت نگاری میں زبردست صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ شاعری کوئی آسان کام نہیں، اس پر فلمی نغمہ نگاری اور بھی ٹف جاب ہے۔ موسیقار پہلے دُھن تیار کرتے ہیں جن پر فلمی شاعر کو سیاق و سباق (فلمی پچویشن) کے لحاظ سے گیت لکھنا پڑتے ہیں۔ مگر یہ خواجہ صاحب پر اللہ کا خاص کرم ہی تھا کہ اس تمام مشکل مرحلے کے باوجود پلک جھپکتے میں وہ گیت لکھ دیا کرتے تھے اور وہ عوام اور خواص میں مقبول بھی ہوتے تھے اور فلموں کی کامیابی کے ضامن بھی ہوتے تھے۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی کہ وہ اپنے گیتوں میں عام فہم اور روزمرہ کی زبان استعمال کرتے تھے۔ اس طرح ان کے گیت جلد ہی زبان زدِ عام ہوجاتے تھے۔ ان کے گیتوں کے الفاظ ایسے میٹھے اور سُریلے ہوتے تھے کہ سننے والوں پر ایک طلسمی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ ان کی ان شاعرانہ خوبیوں سے فلمسازوں اور موسیقاروں نے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ملکہ ترنم میڈم نور جہاں نے خواجہ پرویز کے لکھے ہوئے پانچ ہزار سے زائد گیت گائے جبکہ دیگر گائیکوں نے ان کے جو گیت، غزلیں، دھمالیں، قوالیاں، نوحے اور نعتیہ کلام گائے ان کی تعداد بھی ہزاروں میں ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی نغمہ نگاری کے سفر کے دوران جو گیت لکھے ان میں نوے فیصد بے حد مقبول ہوئے۔ یہ انوکھا اعزاز برصغیر ہندو پاک میں کسی اور شاعر کو حاصل نہیں ہوا۔

شباب کیرانوی ابھرتی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے فوراً ان سے رابطہ کرتے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے صاحبزادوں ظفر شباب اور نذر شباب نے بھی خواجہ پرویز کے گیتوں اور غزلوں سے اپنی فلموں میں چار چاند لگائے۔ یہ ان کے ابتدائی دور کی بات ہے جب ان کی وابستگی شباب پکچرز سے تھی۔ اس کے بعد تو وہ ایسے چل نکلے کہ ہر فلمساز، ہدایت کار اور موسیقار کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ خواجہ پرویز کے گیت ان کی فلم میں ضرور شامل ہوں۔ وہ جو مثل مشہور ہے کہ جام نہیں کام پیارا ہوتا ہے تو خواجہ صاحب کی یہ مانگ دلوں میں گھر کر جانے والی نغمہ نگاری ہی کی وجہ سے تھی۔ کیا اردو اور کیا پنجابی فلم، جس کے لیے بھی وہ گیت لکھتے اس کی دھوم مچ جاتی۔ فلم کی نمائش سے پہلے اور بعد میں ہی نہیں، برسوں گزرنے کے بعد آج بھی اس کی تروتازگی میں، اس کی

ہم گھوم چکے بستی بن میں
اک آس کی پھانس لیے من میں
کوئی ساجن ہو، کوئی پیارا ہو
کوئی دیپک ہو، کوئی تارا ہو
جب جیون رات اندھیری ہو
اک بار کہو تم میری ہو

جب ساون بادل چھائے ہوں
جب پھاگن پھول کھلائے ہوں
جب چندا روپ لٹاتا ہو
جب سورج دھوپ نہاتا ہو
یا شام نے بستی گھیری ہو
اک بار کہو تم میری ہو

ہاں دل کا دامن پھیلا ہے
کیوں گوری کا دل میلا ہے
ہم کب تک پیت کے دھوکے میں
تم کب تک دور جھروکے میں
کب دید سے دل کو سیری ہو
اک بار کہو تم میری ہو

کیا جھگڑا سود خسارے کا
یہ کاج نہیں بنجارے کا
سب سونا روپا لے جائے
سب دنیا، دنیا لے جائے
تم ایک مجھے بہتیری ہو
اک بار کہو تم میری ہو

ابن انشا

پسندیدگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی..... ان کے چند گیتوں اور غزلوں کی مثال پیش کرتا ہوں، میری بات کی صداقت کا اندازہ آپ کو خود ہو جائے گا۔

جب کوئی پیار سے بلائے گا
تم کو ایک شخص یاد آئے گا
(مہدی حسن، فلم زندگی کتنی حسین ہے)

تیرے بِنا یوں گھڑیاں بیتیں جیسے صدیاں بیت گئیں
(نور جہاں، مسعود رانا، فلم آنسو)

سامنے آ کے تجھ کو پکارا نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیری رسوائی مجھ کو گوارا نہیں
(مہدی حسن، فلم درد)
تم ہی ہو محبوب مرے میں کیوں نہ تمہیں پیار کروں
تم ہی تو میری دنیا ہو، میں کیوں نہ اقرار کروں
(مسعود رانا، آئرن پروین فلم آئینہ)
ہم نے جو دیکھے خواب سہانے
آج ان کی تعبیر ملی
(رنگیلا، فلم رنگیلا)
کس نے توڑا ہے دل حضور کا
کس نے ٹھکرایا تیرا پیار
(مالا، فلم رنگیلا)
ایک چہرہ مرے خوابوں میں سجا رہتا ہے
دل کے ہر گوشے میں جس طرح خدا رہتا ہے
(مہناز، فلم پرنس)
مرے دل کی ہر تمنا ترے پیار سے سجی ہے
تو سدا رہے سلامت تیرے دم سے ہر خوشی ہے
(طاہرہ سید، فلم آئینہ)
سن وے بلوری اکھ والیا
اساں دل تیرے نال لالیا
(نور جہاں، فلم انوٹا)
منڈا شہر لاہور دا، میرے دل تے تیر چلائے
(نور جہاں، فلم اصغرا)
وے اک تیرا پیار مینوں ملیا
میں دنیا توں اور کی لینا
(نور جہاں، فلم سالا صاحب)
دوروں دوروں اکھیاں مارے منڈا پٹواری دا
(نور جہاں، فلم دبئی چلو)
دنیا تے پیار ملے کوئی دلدار ملے
لڈی ہے جمالو پاؤ
(نور جہاں، فلم صاحب جی)
اک اجنبی چہرے سے ملاقات ہوئی ہے
(نیرہ نور، فلم باغی حسینہ)
میری چچی دا چھلا ماہی لالیا
دو دل اک دوجے کولوں دور ہو گئے
میرا لونگ گواچا
کی دم دا بھروسا یار
میرا کالا ہے دلدار گوریاں نوں پرا کرو

الف سے اچھی گاف سے گڑیا جیم سے جاپانی
(احمد رشدی، فلم خاموش نگاہیں)
اپنوں نے غم دیے تو مجھے یاد آ گیا
اک اجنبی جو غیر تھا اور غمگسار تھا
(فلم انجان، مہدی حسن)
او سن لے او جانِ وفا
تو ہے دنیا مری، اے مری زندگی
(احمد رشدی، مالا فلم سنگدل)
مرے پردیسی بابو، مجھے تم بھول نہ جانا
(مالا، فلم فسانۂ دل)
تیری محفل سے یہ دیوانہ چلا جائے گا
شمع جلتی رہے پروانہ جلا جائے گا

کہاں تک سنو گے، کہاں تک سناؤں؟ خواجہ صاحب کے ایسے سدا بہار گیتوں غزلوں کی تو بہت لمبی فہرست ہے۔ یہ جو چند مثالیں پیش کی گئی ہیں، ان سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ خواجہ پرویز کیسے قادر الکلام شاعر و نغمہ نگار تھے۔ کیسے میٹھے میٹھے اور شہد بھرے بول لکھتے تھے جو کانوں میں رس گھولتے تھے جو دلوں میں اُتر جاتے تھے۔ جن پر گزرتے ہوئے وقت کی گرد آج بھی نہیں جم سکی ہے۔ جواہر سنگیت ہیں جن کی تر و تازگی کسی وقت بھی کسی دور میں بھی ماند نہیں پڑ سکے گی۔

پاکستان سے لے کر بھارت تک کئی گانے والوں نے اپنے البم کے لیے بھی ان سے گیت لکھوائے۔ ٹی وی والوں نے بھی اپنے مختلف پروگراموں کے لئے ان سے گیت اور غزیں لکھوائیں۔ ان کی صلاحیت اور فنی خوبیوں سے فائدہ اٹھانے والوں میں اسٹیج ڈرامے والے بھی پیچھے نہیں رہے۔ ان سے بے شمار اسٹیج ڈرامے لکھوائے گئے۔ ان سے اسٹیج ڈرامے ڈائریکٹ کروائے گئے۔ فلم والے حقیقی معنوں میں جن کا وہ قیمتی اثاثہ تھے، ان کی اضافی خوبیوں سے اپنا دامن کیوں نہ بھرتے؟ لہٰذا ان سے فلمی کہانیاں بھی لکھوائی گئیں، مکالمے بھی تحریر کروائے گئے۔ اللہ میاں نے ان میں جن صلاحیتوں کی دولت عطا کی تھی انہیں وہ دوسروں پر نچھاور کرتے رہے۔ بڑا فنکار دل کا بھی بہت بڑا ہوتا ہے۔ انہوں نے پاکستانی فلمی صنعت میں بہت سے موسیقاروں اور گلوکاروں کو متعارف کرایا۔ ایسے گانے والے اور گانے والیاں جو زیادہ مقبول نہیں تھے جنہیں نظر انداز کیا جاتا تھا۔ خواجہ صاحب نے اپنے گیت ان سے بھی گوائے اپنے گھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سجائی جانے والی نجی محفلوں میں بھی نئے گلوکاروں کو سننے سنانے کا موقع فراہم کرتے۔

ان کی شعر و شاعری کی طرح ان کی مہمان نوازی بھی بہت غضب کی ہوا کرتی تھی۔ وہ اپنے مہمانوں کی نہ صرف انواع واقسام کے پکوانوں سے تواضع کرتے تھے بلکہ اپنی باغ و بہار باتوں اور لطیفوں سے بھی ان کے تفننِ طبع کا سامان مہیا کرتے تھے۔ ان کے مہمان محض فنونِ لطیفہ سے وابستہ افراد ہی نہیں ہوا کرتے تھے۔ بلکہ سیاسی اور سماجی حلقوں سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات بھی ان میں شامل ہوتی تھیں.... فی البدیہہ شعروں کی طرح انہیں فی البدیہہ جملے کہنے کا بھی ملکہ حاصل تھا جنہیں سن کر ان کے مہمان قہقہے لگاتے ہوئے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ ان کی ایسی محفلیں رات رات بھر جاری رہتیں۔ وہ اکثر ایسی محفلوں میں فلم انڈسٹری کے حوالے سے اپنی زندگی کے اہم واقعات بھی سناتے تھے۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کے قائل تھے اور دوستوں اور احباب کو بھی اس بات کی تلقین کرتے تھے۔ ان کی ایک فلم ''آنسو'' کا ایک گیت بھی ان کے اسی خیال کی ترجمانی کرتا ہے۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
پیار کرنا ہی ہمارا کام ہے

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ خواجہ صاحب اس شعر کی زندہ مثال تھے وہ امن شانتی اور پیار محبت کا جیتا جاگتا پیکر تھے۔ ان کی محفل میں روزانہ شریک ہونے والوں میں سے اگر کوئی ایک بھی موجود نہ ہوتا تو وہ ساری رات فون کر کے اس کی خیریت دریافت کرتے رہتے۔ اپنے دوستوں کی پسند معلوم کر کے کھانے پکواتے۔ فلمی دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں مگر انہوں نے کبھی کسی کو برا نہیں کہا، گیت لکھتے وقت بھی وہ کبھی محبوب کو برا نہیں کہتے تھے یا گلہ شکوہ نہیں کرتے تھے۔ خود بھی کبھی کسی کو گلہ شکوہ کا موقع نہیں دیتے تھے۔ نصرت فتح علی خان نے ان سے اپنے لیے قوالی لکھنے کی فرمائش کی۔

''میں قوالی نہیں لکھتا'' کہنے کو تو انہوں نے کہہ دیا مگر پھر احساس ہوا کہ کہیں خان صاحب کو میری بات سے دکھ نہ ہو۔ ایک رات میں انہیں پانچ قوالیاں لکھ کر دیں۔ جنہوں نے پاک و ہند سمیت دنیا بھر میں دھوم مچا دی۔

خواجہ پرویز کی سنہری یادیں، باتیں ہمارے ساتھ رہیں گی۔ اچھے لوگ موجود ہوں یا نا موجود، انہیں ہمیشہ اچھے لفظوں میں ہی یاد کیا جاتا ہے۔ بھارت کے معروف شاعر و نغمہ نگار گلزار کہتے ہیں۔

''خواجہ پرویز عظیم نغمہ نگار تھے۔ انہوں نے بہت سے یادگار گیت تخلیق کیے۔''

''وہ عظیم انسان تھے'' یہ بھارتی اداکار راج ببر کے تاثرات ہیں۔ ''میں پہلی بار پاکستان گیا تو ہوٹل کے کمرے میں..... ساری رات وہ باتیں کرتے رہے اور میں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتا رہا۔ ان کی کمی ہمیشہ محسوس کروں گا۔''

گلوکار ہنس راج ہنس کہتے ہیں۔ ''ان کی مہمان نوازی اتنی شاندار ہوتی تھی اور پھر لذیذ پکوان کے ساتھ ان کی دلچسپ باتیں اور ماضی کے قصے، بہت مزہ آتا تھا۔''

پاکستان فلم انڈسٹری کے سنہرے دور کی بات کی جائے تو وہ خواجہ پرویز کے گیتوں کے بغیر ادھورا لگتا ہے'' اداکار ریشم کہتی ہیں۔ ''خواجہ پرویز نے اپنے سدا بہار گیتوں کے ذریعے فلم انڈسٹری کی جو خدمت کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔''

گلوکار شوکت علی کے جذبات ملاحظہ فرمائیے ''خواجہ پرویز کی شاعری، گفتگو اور ان کا مسکراتا چہرہ کبھی نہیں بھلا سکتا۔ وہ بہترین نغمہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ فنکاروں کی پسندیدہ شخصیت تھے۔''

''وہ محفلوں کی جان تھے'' گلوکار ارشد محمود ان کے بارے میں مزید کہتے ہیں ''وہ فنکاروں کے قدر دان اور سچے انسان تھے۔''

موسیقار وجاہت عطرے کا خیال ہے ''ان کے ڈیرے میں فنکار برادری کی بڑی خوش گوار راتیں گزرتی تھیں۔ وہ خوشیاں بانٹنے میں اپنی مثال آپ تھے۔''

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی صفات کی خوشبو بھی پھیلتی رہے گی جب جب وہ لوگوں کو یاد آئیں گے ان کی خوبیاں اور اچھائیاں بیان کی جاتی رہیں گی۔ ایسے لوگ کبھی نہیں مرتے جو لوگوں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ خواجہ پرویز بھی کہنے کو تو اس دنیا سے منہ موڑ گئے۔ 80 سال کی عمر میں چاہنے والوں کا ساتھ چھوڑ گئے اور میانی صاحب کے قبرستان میں شعر و شاعری کی دلدادہ اس ماں کے پہلو میں جا کر ابدی نیند سو گئے جس کے دودھ کے اثر سے وہ شعر و سخن کا سرچشمہ بنے تھے مگر وہ اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں اور جب تک ان کے امر سنگیت کانوں میں رس گھولتے رہیں گے ان کی موت واقع نہیں ہوگی، وہ زندہ و تابندہ رہیں گے۔

فلمی الف لیلہ

علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزاول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کر دیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید و شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستاں در داستاں سرگزشت

قسط 203

مغل بادشاہوں نے ہندوستان پر لگ بھگ آٹھ سو سال حکومت کی۔ ایک زمانے میں برصغیر کے طول و عرض پر مغلوں کی حکمرانی تھی۔ انہوں نے جنگیں بھی لڑیں، فتوحات بھی حاصل کیں اور خود سر و ہٹیلے راجپوتوں اور مرہٹوں پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قابو بھی پایا۔ ان میں سے بعض بادشاہوں کا دورِ حکومت مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ جب ملک میں امن وامان اور خوشحالی کا دور دورہ تھا، رعایا مطمئن تھی، ملکی نظم ونسق کے لیے جو نظام قائم کیا گیا تھا، بعد میں انگریزوں نے بھی انہیں اپنایا اور حالات کے مطابق بہتر بنایا۔ مغل بادشاہوں کی سب سے بڑی غلطی یا کمزوری یہ تھی کہ وہ ہندوستان کو تسخیر کرنے اور اس پر حکمرانی کرنے میں اتنے مصروف رہے کہ انہوں نے بحری طاقت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی حالانکہ اس زمانے میں بھی بحری طاقت رکھنے والے ممالک کو دوسروں پر برتری حاصل تھی لیکن ہندوستان اتنا بڑا ملک تھا کہ اس پر بحری طاقت کے ذریعے قبضہ نہیں کیا جا سکتا تھا، یہی وجہ ہے کہ برطانیہ جیسی عظیم بحری قوت نے ہندوستان میں سیاست اور مکروفریب کے ذریعے اپنے پیر جمائے۔ پہلے انہوں نے ملکی بندرگاہوں کو تجارت کے لیے استعمال کرنے کی اجازت طلب کی۔ شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں انہیں بنگال اور جنوبی ہند کی بندرگاہوں پر تجارتی مال واسباب لانے اور یہاں سے مال لے جانے کی اجازت دی گئی تھی۔ رفتہ رفتہ انہوں نے پیر پھیلا کر یہاں چھوٹی چھوٹی فوجی چھاؤنیاں قائم کر لیں۔

مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں جب سلطنت کا زوال شروع ہو چکا تھا، نااہل اور عیاش حکمراں امورِ مملکت سے بے خبر ہو کر عیش وعشرت میں مصروف تھے۔ امرا بھی اسی طرح سازشوں، خوشامدوں اور آسائشوں کو ترجیح دینے لگے تھے۔ فوج کمزور پڑ گئی تھی۔ کئی صوبے دار بار بار بغاوت کرتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں حالات سے فائدہ اُٹھا کر انگریز تاجروں نے، جنہیں تمام وقت اپنی حکومت کی تائید، حمایت اور سرپرستی حاصل تھی، ملک گیری کا منصوبہ بنایا اور پھر جو انجام ہوا، وہ تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔

ہندوستان پر اشوک اعظم جیسے بادشاہ نے بھی حکومت کی تھی جس کی حکومت کی سرحدیں کابل سے جنوبی ہند تک پھیلی ہوئی تھیں مگر اشوک کے جانشینوں کو اتنے طویل عرصے تک ملک پر حکمرانی کا موقع نہیں ملا جس کی وجہ سے مغلیہ سلطنت کے مقابلے میں اس کا دورِ حکومت ہندو مورخوں کی کوششوں کے باوجود مغلوں کے مقابلے میں مختصر اور پھیکا پھیکا سا لگتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں مغلوں کے علاوہ بھی کئی بادشاہوں نے حکومت کی ہے لیکن کسی بادشاہ یا اس کے دورِ حکومت کے حوالے سے فلم سازوں نے فلمیں بنانا ضروری نہیں سمجھا۔ وجہ یہ ہے کہ مغلوں جیسا جاہ وجلال، شان وشوکت اور رنگینیاں کسی اور بادشاہ کے دور میں نہ تھیں۔ پھر مغلوں نے ملک میں ایسی یادگار اور حسین عمارتیں تعمیر کرائیں، نئے شہر آباد کرائے اور مختلف ثقافتی حوالوں سے جو شہرت حاصل کی وہ کسی اور بادشاہ کے حصے میں نہیں آئی۔ اکبر کے نورتن، شاہجہاں کا تختِ طاؤس اور تاج محل، مختلف مقبرے اور شہر انہیں وجود میں لانے کا سہرا مغلوں کے سوا کسی اور بادشاہ کے دور میں نظر نہیں آتا۔

چند سال قبل ''اشوکا'' کے نام سے بالی ووڈ میں ایک فلم بنائی گئی تھی جس میں شاہ رخ خان نے اشوک کا کردار ادا کیا تھا لیکن اس فلم میں اشوک اعظم کے دور کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ یہ ایک خیالی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستان میں ہندو حکمرانوں کے نام پر فلمیں بنانے کا سلسلہ شروع ہوا ہے مگر یہ بھی برائے نام ہے۔ مثلاً شیواجی، بھگت سنگھ، منگل پانڈے۔ یہ حکمرانوں کی کہانیاں نہیں ہیں، مطلب یہ بیان کرنا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اور غیر مسلم فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے مغل بادشاہوں اور ان سے وابستہ کرداروں کے بارے میں فلمیں اس لیے بنائیں کہ وہ اس دور کی شان وشوکت اور رنگینیاں پیش کر کے فلم بینوں کی توجہ حاصل کر سکتے تھے۔ مغل بادشاہوں اور شہزادوں سے رومانی کہانیاں بھی وابستہ ہیں مثلاً شہزادہ سلیم سے انارکلی کا عشق۔ ممتاز محل سے شاہجہاں کا عشق، جہانگیر کے شہنشاہ بننے کے بعد اپنی منظورِ نظر یعنی نور جہاں کو شیر افگن سے زبردستی حاصل کرنے کی داستان۔ یہ سب تاریخی حقائق ہیں سوائے انارکلی کے جس کے بارے میں کوئی باقاعدہ تحقیق نہیں کی گئی ہے کہ اس کردار اور داستان کی حقیقت کیا ہے؟ اس میں سچ کتنا ہے اور مبالغہ آمیزی کتنی ہے؟

مغل بادشاہوں نے مذہبی رواداری کی بھی نادر مثالیں قائم کی ہیں۔ انہوں نے معزز ہندو راجپوتوں کی لڑکیوں سے شادیاں کیں اور اس طرح راجپوتوں سے رشتہ داری قائم کر لی۔ اکثر حکمراں تو بہت زیادہ ہندو نواز تھے جو مسلمان علما کو گراں گزرتا تھا۔ اورنگزیب عالمگیر نے شریعت کو رواج دینے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن ہندوؤں کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی۔ اورنگ زیب نے پچاس سال حکومت کی اور بیشتر عرصہ دکن اور دیگر علاقوں میں جنگ کرتے ہوئے گزارا۔ اورنگزیب کے بعد ہی صحیح جانشین نہ ہونے کی وجہ سے مغلیہ سلطنت کے زوال کا آغاز ہوا لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عالمگیر کے عہد میں مغلیہ سلطنت کی سرحدیں کابل سے راس کماری تک پھیلی ہوئی تھیں۔

انڈیا میں جھانسی کی مہارانی کے بارے میں بھی ایک فلم بنی تھی لیکن یہ رومانی نہیں بلکہ ایک باغیانہ جدوجہد کی کہانی تھی۔

مغل بادشاہوں کے عہد کے بارے میں پہلی فلم ''نور جہاں'' 1933ء میں بنائی گئی تھی۔ فلم ساز ادارہ میڈن تھیٹرز کلکتہ تھا۔ یہ جہانگیر اور نور جہاں کی داستان تھی۔ یہ ایک خاموش فلم تھی اگرچہ اس زمانے میں بولتی فلموں کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسی نام کی دوسری فلم امپیریل کمپنی نے بنائی تھی۔ یہ بھی خاموش فلم تھی۔ اس کے ہدایت کار عذرا میر تھے۔ جلو بائی، ڈیوڈ، عبد، مبارک اور مظہر خاں اس کے نمایاں اداکار تھے۔

''ملکۂ نور جہاں'' کے نام سے تیسری فلم 21 سال بعد ریلیز ہوئی تھی۔ اس کی کاسٹ میں آشا ماتھر، کمل کپور، پردیپ کمار وغیرہ شامل تھے۔ یہ 1954ء میں ریلیز ہوئی تھی مگر بہت بڑے پیمانے پر نہ بنائے جانے کی وجہ سے اس کو زیادہ کامیابی اور مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔

''نور جہاں'' نام کی ایک رنگین فلم رینتھ پروڈکشن نے بنائی تھی۔ اس کے فلم ساز شیخ مختار تھے۔ ایم صادق نے ہدایت کاری کی تھی۔ اداکاروں میں مینار کماری، پردیپ کمار، جانی واکر، رحمٰن، للتا پوار، ہیلن، نگار سلطانہ، شیخ مختار اور سہراب مودی شامل تھے۔ یہ فلم 1967ء میں ہندوستان میں اور 1980ء میں پاکستان میں ریلیز ہوئی تھی۔ یہ کامیاب فلم تھی لیکن اس کی ریلیز سے پہلے ہی فلم ساز شیخ مختار کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس طرح مغلیہ دور کے عہد کی چار فلمیں ''نور جہاں'' کے نام سے بنائی گئیں۔

1924ء میں شاہجہاں کے نام سے بھی ایک فلم [illegible]نک کمپنی نے بنائی تھی جو 1946ء میں ریلیز ہوئی اور بہت کامیاب ہوئی۔ اس فلم میں سلمیٰ آغا کی والدہ نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ سہگل کے گانے بے حد مقبول ہوئے تھے۔ اس شاہجہاں کے موسیقار نوشاد تھے۔ گانے مجروح سلطان پوری نے لکھے تھے۔ فلم کی کاسٹ میں راگنی، سہگل، نسرین (سلمیٰ آغا کی والدہ) جراج، ہمالیہ والا، ایم وی کنور وغیرہ شامل تھے۔

اب تک جن مغل بادشاہوں کے بارے میں فلمیں بنائی گئی ہیں ان میں شہنشاہ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں شامل ہیں۔

1926ء میں ایک خاموش فلم ''ممتاز محل'' بھی شاہجہاں اور ممتاز محل کے بارے میں بھی بنائی گئی تھی۔ ''ممتاز محل'' کے نام سے ایک اور فلم 1944ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے ہدایت کار کیدار شرما اور موسیقار کھیم چندر پرکاش تھے۔ اس کی کاسٹ میں خورشید، چندر موہن، یعقوب، سلوچنا، جہاں آرا کجن نمایاں اداکار تھے۔ 1957ء میں ہدایت کار رام دریانی نے بھی ''شاہجہاں'' کے نام سے ایک فلم بنائی تھی جس کی کاسٹ میں وینا جیراج، شیلا رامانی قابلِ ذکر ہیں۔ 1935ء میں ایک فلم ''جہاں آرا'' بنی تھی۔ جہاں آرا شاہجہاں کی لاڈلی بیٹی تھیں اور شاعرہ بھی تھیں۔ اس فلم کے اداکاروں میں جہاں آرا کجن، یوسف آفندی، آغا ببر خان اور شیلا قابلِ ذکر اداکار تھے۔

نرگس اپنی ماں جدن بائی کے ساتھ

''تاج محل'' کے نام سے ایک فلم 1941ء میں ریلیز ہوئی تھی جس کے اداکاروں میں سروجنی، مبارک، ایس نذیر وغیرہ شامل تھے۔ ثریا نے اس فلم میں بے بی ثریا کے نام سے کام کیا تھا۔ ''تاج محل'' نام کی دوسری فلم 1963ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ اس کے ہدایت کار ایم صادق اور موسیقار روشن تھے۔

پاکستان میں بھی ''تاج محل'' کے نام سے ایک فلم 1968ء میں بنائی گئی تھی جس کے فلم ساز جگدیش چندر آنند اور ہدایت کار ایس ٹی زیدی تھے جو ہندوستان میں ''مغل اعظم'' کی تیاری کے دنوں میں کے آصف کے معاون خصوصی تھے۔

تاج محل کے نام سے انڈیا میں 2005ء میں بھی ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فلم بنائی گئی تھی۔ اس کے ہدایت کار اکبر خان اور موسیقار نوشاد تھے۔ یہ فلم بہت بڑی لاگت سے بنائی گئی تھی لیکن بدقسمتی سے ناکام رہی۔ اس کی کاسٹ میں میڈم نور جہاں کی بیٹی سونیا جہاں، ذوالفقار سید، کبیر بیدی، منیشا کوئرالہ، سعید جعفری وغیرہ شامل تھے۔

''جہاں آرا'' کے نام سے ایک فلم 1964ء میں بھی ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے ہدایت کار ونود کمار اور موسیقار مدن موہن تھے۔ پرتھوی راج، مالا سنہا، بھارت بھوشن، ششی کلا، مینو ممتاز اور اوم پرکاش اس کے اہم اداکار تھے۔ اس فلم کی موسیقی بہت مقبول ہوئی تھی۔

یہ بات کچھ عجیب سی لگتی ہے کہ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے بانی ''بابر'' کے بارے میں صرف ایک ہی فلم بنائی گئی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ فلم سازوں کو ''بابر'' کے بارے میں ایسا مواد نہ مل سکا ہو جس سے فلم میں دلکشی پیدا ہوتی۔ بابر کے جانشین اور دوسرے مغل شہنشاہ ''ہمایوں'' کے بارے میں بھی صرف ایک ہی فلم بنائی گئی جو فلم ساز و ہدایت کار محبوب خاں نے بنائی تھی۔

''شہنشاہ بابر'' کے نام سے بنائی گئی فلم کے مصنف وجاہت مرزا تھے جو اس کے ہدایت کار بھی تھے۔ موسیقی کھیم چند پرشاد نے بنائی تھی۔ خورشید، سلوچنا، سوشیل کمار، مجید اور شیخ مختار اس کے نمایاں اداکار تھے۔ یہ فلم 1944ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔

''ہمایوں'' ہالی ووڈ کے معیار کی فلم تھی جو بہت بڑے پیمانے پر بنائی گئی تھی۔ اس فلم کو دیکھ کر ہالی ووڈ کے معروف فلم سازوں نے محبوب کے ساتھ مل کر فلمیں بنانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس سلسلے میں ہدایت کار محبوب ہالی ووڈ بھی گئے تھے مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور یہ منصوبہ ملتوی کر دیا گیا۔ اس فلم کے موسیقار ماسٹر غلام حیدر تھے۔ دینا اور اشوک کمار نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ چندر موہن نے ہمایوں کا اور شاہنواز نے بابر کا کردار ادا کیا تھا۔ یہ ایک اعلیٰ معیاری فلم تھی جسے محبوب خاں نے آرٹ کا نمونہ بنا دیا تھا لیکن یہ فلم سپرہٹ نہ ہوسکی غالباً چٹ پٹے واقعات کی کمی کے باعث فلم بینوں کی دلچسپی کا مرکز نہ بن سکی۔ محبوب خاں نے تاریخی واقعات کے مطابق یہ فلم بنائی تھی اور فلمی ضروریات کے لیے اس میں مبالغہ آمیزی نہیں کی تھی۔

شہنشاہ ہمایوں کے بارے میں تو صرف ایک ہی فلم بنائی گئی لیکن اس کے دور کے حوالے سے چار فلمیں مختلف اوقات میں بنائی گئیں۔ اس سلسلے کی پہلی فلم ''بچہ سقہ'' کے نام سے 1930ء میں بنائی گئی تھی۔ یہ ایک خاموش فلم تھی۔ یہ ایک حقیقی تاریخی واقعے پر مبنی تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر جان بچانے کے لیے بھاگا اور طغیانی کے باوجود دریا میں کود گیا تو خوفناک لہروں نے اس کو موت کے منہ تک پہنچا دیا تھا۔ اتفاق سے دریا میں ایک سقہ بھی اپنی مشک کے سہارے سے تیر رہا تھا۔ اس نے ہمایوں کی جان بچائی اور مشک کی مدد سے دونوں نے دریا پار کرلیا۔ بچہ سقہ اس بات سے لاعلم تھا کہ اس نے جس شخص کی جان بچائی ہے وہ ہندوستان کا شہنشاہ ہمایوں ہے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر ہمایوں نے اس کو اپنے بارے میں بتایا اور قول دیا کہ اگر اس کو دوبارہ ہندوستان کی بادشاہت ملی تو وہ بچہ سقہ کو (جس کا نام نظام تھا لیکن بچہ سقہ کے نام سے مشہور تھا) ایک دن کے لیے بادشاہ بنائے گا۔ شیر شاہ سوری کی حادثاتی موت اور اس کے نااہل جانشینوں کی وجہ سے ہمایوں نے دوبارہ بادشاہت حاصل کرلی اور اعلان کیا کہ نظام سقہ کو اس کے دربار میں پیش کیا جائے۔ نظام دربار میں اس کو شاہی جاہ وجلال کے ساتھ دیکھ کر بہت حیران اور مرعوب ہوا۔ بادشاہ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور نظام سقہ کو ایک دن کی بادشاہت دے دی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ نظام سقہ نے من مانے فیصلے کیے یہاں تک کہ چمڑے کے سکے بنانے کا بھی حکم دیا جس کی تعمیل کی گئی۔

اسی موضوع پر 1933ء میں ایک اور فلم ''ایک دن کا بادشاہ'' کے نام سے بنائی گئی تھی۔ مظہر خان، سیتا دیوی وغیرہ اس کے اداکار تھے۔ یہ بھی خاموش فلم تھی۔ 1945ء میں اسی موضوع پر ایک اور فلم ''ایک دن کا سلطان'' بنائی گئی۔ سہراب مودی اس کے فلم ساز اور ہدایت کار تھے۔ اداکاروں میں مہتاب، واسطی، صادق علی وغیرہ شامل تھے۔ اس کے موسیقار رفیق غزنوی تھے۔ اس سلسلے میں بنائی جانے والی فلموں میں سب سے کامیاب فلم تھی۔

1965ء میں ''ایک دن کا بادشاہ'' کے نام سے اسی موضوع کو فلمایا گیا۔ دراصل یہ فلمیں بھی بلاواسطہ شہنشاہ نصیرالدین ہمایوں ہی سے تعلق رکھتی تھیں اس لیے انہیں ہمایوں کے بارے میں فلمیں کہنا غلط نہ ہوگا۔

ہمایوں کے بعد جلال الدین اکبر نے بارہ سال کی عمر میں امورِ سلطنت سنبھالے۔ بیرم خان ان کے اتالیق مقرر ہوئے۔ اکبر کے بارے میں پہلی فلم ان کے نام سے نہیں بلکہ

''چاند بی بی'' کے نام سے بنائی گئی۔ چاند بی بی دکن کی ایک ریاست کی ملکہ تھی۔ اکبر کے زمانے میں اس کو تسخیر کرنے کے لیے فوجی کارروائی کی گئی لیکن چاند بی بی جس دلیری اور ثابت قدمی سے مغل شہنشاہ کی افواج کا مقابلہ کیا تھا، وہ بھی تاریخ کا حصہ ہے۔ بالآخر فتح اکبر کی افواج کو ہی حاصل ہوئی تھی لیکن چاند بی بی نے بہادری کی ایک نئی تاریخ رقم کردی۔

یہ فلم 1936ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی شکیلہ نے اس میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ صادق علی، کملا بائی وغیرہ بھی کاسٹ میں شامل تھے۔

شہنشاہ اکبر کے بارے میں دوسری فلم ''شہنشاہ اکبر'' کے نام سے 1943ء میں بنائی گئی تھی جس میں بکرم کپور، لیلا چٹنیس، حسن بانو اور کے این سنگھ نے اہم کردار ادا کیے تھے۔ اس فلم کے ہدایت کار ایف آر ایرانی اور موسیقار جھنڈے خان تھے۔

فلم ''تان سین'' اپنے زمانے کی بہت کامیاب اور خوبصورت فلم تھی۔ بلاواسطہ طور پر اس کا تعلق بھی شہنشاہ اکبر ہی سے تھا کیونکہ ''تان سین'' اکبر کے دربار کا شاہی گویا تھا اور گائیکی میں آج بھی اس کا نام عزت اور احترام سے لیا جاتا ہے۔ اس فلم میں گلوکارہ، اداکارہ خورشید نے تانی کا اور سہگل نے تان سین کا کردار ادا کیا تھا۔ فلم میں درباری سازشوں کے ساتھ ساتھ موسیقی اور رومان کا جو عنصر شامل کیا گیا تھا اس نے اور خورشید اور سہگل کے نغمات اور اداکاری نے اس کو ایک یادگار فلم بنا دیا تھا جسے آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس فلم میں اکبر کی فرمائش پر تان سین دیپک راگ گاتا ہے جس کے نتیجے میں اس کا جسم جھلس جاتا ہے۔ اس اثر کو ختم کرنے کے لیے تانی ملہار راگ گا کر اسے صحت یاب کر دیتی ہے۔

سہگل کا مشہور کلاسیکی گانا

دیا جلاؤ، دیا جلاؤ
جگمگ، جگمگ
اور خورشید کا گایا ہوا نغمہ
برسو رے.....

آج بھی لافانی نغمات تصور کیے جاتے ہیں۔ اس فلم کے موسیقار کھیم چندر پرکاش تھے۔

تاریخی فلم ''بیرم خان'' 1946ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ یہ بھی اکبر ہی کے دور سے تعلق رکھتی تھی۔ بیرم خان وہ اتالیق تھا جس نے بارہ سالہ اکبر کو امورِ حکمرانی سکھائے تھے لیکن بعد میں سازشی درباریوں نے اس پر حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کا الزام عائد کر دیا تھا۔ یہ بہت اعلیٰ معیاری فلم تھی جس میں ''جاگیردار'' نے بیرم خان کا یادگار کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کے موسیقار ماسٹر غلام حیدر تھے۔ اداکاروں میں جاگیردار کے علاوہ مہتاب، بریش، للیتا پوار اور شاہنواز بھی کاسٹ میں شامل تھے۔

تان سین کے حوالے سے ایک فلم ''سرسنگھار چتر'' بھی 1962ء میں بنی تھی مگر قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ کرسکی۔ اس کے موسیقار ایس ترپاٹھی تھے۔ بھارت بھوشن اور انیتا گوہا نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔

اکبر اور جہانگیر کے حوالے سے کچھ اور فلمیں بھی بنائی گئیں مگر کامیابی حاصل نہ کرسکیں۔ 1934ء میں ''عدلِ جہانگیر'' کے نام سے ایک خاموش فلم بنی تھی۔ اسی موضوع پر دوسری فلم 1939ء میں بنائی گئی تھی۔ ان میں دو فلمیں ''انارکلی'' کے نام سے بنی تھیں۔ ان میں دراصل شہزادہ جہانگیر سے ایک کنیز انارکلی کے عشق کے حالات کو اہمیت دی گئی تھی۔ ''انارکلی'' کے نام سے انڈیا میں تین اور پاکستان میں ایک فلم بنائی گئی۔ پاکستان میں فلم ''انارکلی'' کے ہدایت کار انور کمال پاشا تھے۔ موسیقار ماسٹر عنایت حسین اور رشید عطرے تھے۔ سدھیر اور نور جہاں کے علاوہ ظریف، راگنی اور ہمالیہ والا بھی اس کے اہم اداکار تھے۔ اس فلم کے گانے سیف الدین سیف، شورش کاشمیری اور قتیل شفائی نے لکھے تھے۔ یہ فلم نور جہاں کے نغمات کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ فلم کے تمام گانے سپرہٹ تھے۔

ایک فلم ''شہنشاہ جہانگیر'' کے نام سے بھی بنائی گئی تھی۔

مغلیہ دور کی سب سے یادگار فلم ہمارے خیال میں سہراب مودی کی فلم ''پکار'' تھی۔ یہ 1939ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کا اتنا شہرہ تھا کہ وہ گھریلو اور بزرگ خواتین جنہوں نے کبھی سنیما گھر کا منہ نہ دیکھا تھا، وہ بھی ''پکار'' دیکھنے پہنچ گئیں۔ ہم نے یہ فلم چھ سال کی عمر میں دیکھی تھی۔ کچھ عرصے بعد دوبارہ دیکھی تو اس وقت کچھ سمجھ دار ہوگئے تھے۔

یہ فلم دراصل جہانگیر اور نور جہاں کی محبت کے بارے میں تھی۔ ملکہ کے تیر سے ایک دھوبی ہلاک ہوجاتا ہے۔ دھوبن فریاد لے کر ''زنجیرِ عدل'' ہلاتی ہے اور جہانگیر نور جہاں کو قید میں ڈلوا دیتا ہے۔ وہ دھوبن سے کہتا ہے کہ ملکہ نے تمہارے شوہر کو ہلاک کیا ہے، تم اس کے شوہر کو ہلاک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جدن بائی

ملبوسات، بالوں کی وگ، سیٹ اور ماحول پیش کیا گیا۔ ''مغل اعظم'' کو نقادوں نے ''سیلولائیڈ پر شاعری'' کہا ہے۔ مغل بادشاہوں کے بارے میں اس سے اچھی فلم ابھی تک نہیں بنائی گئی اور نہ بنائی جاسکے گی۔ اس فلم میں پرتھوی راج نے اکبر کا، دلیپ کمار نے شہزادہ سلیم کا اور مدھوبالا نے ''انارکلی'' کے یادگار کردار غیر فانی بنادیے۔ اس فلم کے موسیقار نوشاد تھے۔ اس میں استاد بڑے غلام علی خاں کے دو الاپ بھی شامل تھے جن کے لیے پچاس ہزار روپے معاوضہ ادا کیا گیا تھا۔ یہ فلم موسیقی، مکالموں، شان وشوکت اور جنگ وجدل کے بھرپور مناظر کی وجہ سے یاد رکھی جائے گی۔ اس فلم پر بے تحاشا روپیا صرف کیا گیا لیکن فلم نمائش کے لیے پیش ہوئی تو سب نے اعتراف کیا کہ ایک ایک پائی صحیح طریقے پر خرچ کی گئی ہے۔

انڈیا میں چند سال قبل ''اکبر جودھا'' کے نام سے بھی ایک فلم بنائی گئی جس میں ہندو تعصب نمایاں ہے۔ تاریخی حقائق سے قطع نظر اس فلم میں دکھایا گیا ہے کہ اکبر جودھا بائی کے عشق میں گرفتار ہوگیا تھا جس نے شہنشاہ سے شادی کے لیے چند شرائط پیش کیں جنہیں اکبر نے منظور کرلیا۔ یہ فلم سراسر تاریخ سے متصادم اور غیر حقیقی واقعات پر مبنی ہے۔ اس فلم میں رتیھک روشن نے اکبر کا اور ایشوریا رائے نے جودھا بائی کا کردار ادا کیا ہے۔ مکالمے بہت بے اثر ہیں اور ان کی ادائیگی اور لب ولہجہ بھی درست نہیں ہے۔

ایک اور فلم کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ یہ 1955ء میں ''عدل جہانگیر'' کے نام سے بنائی گئی تھی۔ اس فلم کے اداکاروں میں پاکستانی اداکار درپن بھی شامل تھے۔ پاکستان میں ان کا فلمی نام عشرت تھا مگر ہندوستان میں ''درپن'' رکھ دیا گیا۔ پاکستان واپس آکر بھی وہ اسی فلمی نام سے کام کرتے اور فلمیں بناتے رہے۔

پاکستان میں 1968ء میں ''شہنشاہ جہانگیر'' کے نام سے ایک اور فلم بنائی گئی تھی۔ صبیحہ خانم، سنتوش کمار، اعجاز، کمار اور سلونی اس کے نمایاں اداکار تھے۔ اس فلم کے ہدایت کار پرویز اور موسیقار کمال احمد تھے۔ یہ فلم کامیابی حاصل نہ کرسکی۔

آیئے، آخر میں حساب لگاتے ہیں کہ انڈیا میں مغلیہ دور حکومت کے بارے میں کل کتنی فلمیں بنائی گئیں۔ ان کی کل تعداد 33 کے قریب ہے۔ ان فلموں میں سے 24 فلموں کے ہدایت کار ہندو اور پارسی تھے۔ مسلمان فلم سازوں نے 9 فلمیں بنائیں۔ ان فلموں کے موسیقاروں

کردو۔ یہ کہہ کر سینہ تان کر سامنے کھڑا ہوجاتا ہے۔ دھوبن انصاف کے اس معیار سے متاثر ہوکر اپنے شوہر کا خون معاف کردیتی ہے اور اس طرح ہنسی خوشی یہ فلم ختم ہوتی ہے۔

''پکار'' نے ہندوستان میں فلمی کامیابیوں کے تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے اور لوگ دیوانہ وار سنیما گھروں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ مغل بادشاہوں کے بارے میں بنائی گئی فلموں میں بہت ممتاز تھی۔ جہانگیر کے کردار میں چندر موہن اور نور جہاں کے کردار میں نسیم بانو کو دیکھ کر فلم بین یقین کرنے پر مجبور ہوجاتے تھے کہ جہانگیر اور نور جہاں واقعی ایسے ہی ہوں گے۔ سہراب مودی اور شاکر علی نے بھی اس فلم میں اہم کردار ادا کیے تھے۔ اس فلم کا نسیم بانو کا گایا ہوا ایک نغمہ

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے
بج رہا ہے اور بے آواز ہے

آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔ اس فلم کے مکالمے کمال امروہوی نے لکھے تھے اور تاریخی فلموں کے مکالموں کے لیے ایک مثال قائم کی گئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ سہراب مودی نے اس فلم کے لیے کافی عرصے تحقیق کرائی تھی اور وہی ملبوسات، ساز وسامان، سیٹ اور مکالمے استعمال کیے گئے تھے جو بعد میں تاریخی فلموں کے لیے پیروی کا سبب بن گئے۔ مثلاً شہنشاہ کی دربار میں آمد کے موقعے پر چوبدار جو اعلان کرتا ہے، وہ بعد کی فلموں میں بھی اپنایا گیا۔ ہر کردار کے مکالمے اس کے مطابق ہی لکھے گئے تھے۔

آپ نے دیکھا کہ مغل بادشاہوں میں فلم سازوں کو کس قدر دلچسپی تھی اور ان کے بارے میں درجنوں فلمیں بنائی گئیں کیونکہ فلم سازوں کے لیے ان میں فلم بینوں کے لیے ہر طرح کی دلچسپی اور تفریح کا سامان موجود تھا۔

مغلیہ دور کے بارے میں عظیم ترین فلم ''مغل اعظم'' تھی جو دس سال کی محنت کے بعد ہدایت کار کے آصف نے بنائی تھی۔ اس فلم کے لیے بھی تحقیق کی گئی اور اس کے مطابق

اردھیر ایرانی

اس پہلی کامیابی کے بعد انہوں نے اپنی فلموں میں حب الوطنی کا جذبہ، قوم پرستی کا جوش شامل کرنا شروع کردیا۔ پھر بھارتی کلچر کو خوبصورت انداز میں فلموں کے ذریعے پھیلانے کی نوبت آئی۔ انڈیا کی شاید ہی کوئی فلم ہو جس میں ہندو مذہب کے رسم ورواج اور پوجا وغیرہ کے مناظر نہ دکھائے جاتے ہوں۔ بھگوان کی مورتی کا کسی نہ کسی بہانے درشن ضرور کرایا جاتا ہے۔ اس طرح بھارت نے تفریح کے ساتھ ساتھ بیرونی ملکوں میں اپنا کلچر بھی مقبول بنایا۔ بھارت کے تاریخی اور تفریحی مقامات پر فلموں کی شوٹنگ کی گئی جس کی وجہ سے دنیا بھر کے سیاحوں نے بھارت کا رُخ کرلیا۔ ملکی محکمۂ سیاحت نے بھی اپنا فرض بخوبی ادا کیا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ بھارت کی سب سے زیادہ زرمبادلہ کمانے والی صنعت سیاحت ہے اور دوسرے نمبر پر فلموں کو شمار کیا جاتا ہے۔ گویا فلم انڈسٹری بھارت کی سب سے زیادہ کمانے والی دوسری بڑی انڈسٹری ہے جبکہ ہماری کسی حکومت نے آج تک فلمی صنعت کو انڈسٹری تسلیم ہی نہیں کیا۔ عقلمندوں اور احمقوں میں یہی فرق ہوتا ہے۔ اب بھارتی فلمیں سیاحت کو فائدہ پہنچارہی ہیں اور سیاحت بھارتی فلموں کو دنیا میں مقبول کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

بھارتی فلموں میں جب ملک کے تمام خوبصورت حصے رنگین آمیزی کے ساتھ دکھادیے گئے تو بھارت کو ایک ماڈرن اور ترقی یافتہ ملک ظاہر کرنے کے لیے بھارتی فلموں میں غیر ممالک کے خوبصورت مقامات گانوں اور مناظر بھی دکھائے جانے لگے۔ فلم ممبئی سے شروع ہوتی ہے۔ گانا ہالینڈ میں فلمایا جاتا ہے۔ پھر کچھ مناظر بھارت کے نظر آتے ہیں اس کے بعد یورپ کا کوئی خوبصورت شہر، کچھ مناظر میں نظر آتا ہے۔ اس ''ملاوٹ'' کے ذریعے بھارتی فلم ساز دنیا کی آنکھوں میں کامیابی سے دھول جھونک رہے ہیں اور بھارت کی اصلی تصویر فلموں میں نظر ہی نہیں آتی۔ اگر کسی فلم میں اصلی تصویر

میں 8 مسلمان اور 25 فلموں کے موسیقار غیر مسلم تھے۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آزادی سے پہلے اور بعد میں بھی مغلیہ دورِ حکومت سے ہندوستانی کتنے متاثر اور مرعوب تھے لیکن رفتہ رفتہ تعصب کی بنا پر نہ صرف ان موضوعات پر فلمیں بنانا ترک کردیا گیا بلکہ ''جودھا اکبر'' جیسی فلموں میں تاریخی حقائق کو مسخ کرکے پیش کیا گیا۔ آزادی کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں نمایاں تبدیلیاں کی گئی ہیں جن میں مسلمان حکمرانوں کو ظالم، غیر منصف اور متعصب دکھایا گیا ہے۔ چند سال بعد آنے والی بھارتی نسلیں (ہندو مسلمان بھی) ہندوستان کی تاریخ سے ناواقف ہوں گے کیونکہ ان میں مسلمانوں کا کردار کم اور بُرے انداز میں پیش کیا جائے گا اور تاریخی حقائق کو بھی تبدیل کردیا جائے گا۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ نامور مغل بادشاہوں میں سے صرف ایک شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر ایسا حکمراں ہے جس کے بارے میں ایک بھی فلم نہیں بنائی گئی کیونکہ ان کی زندگی کے واقعات میں فلمی مواد نا پید ہے۔

☆☆☆

پاکستان میں بھارتی فلموں کے پروانے یا تو جذبۂ حب الوطنی سے عاری ہیں یا پھر بھارتی پروپیگنڈے سے متاثر ہیں۔ اندرا گاندھی نے مشرقی پاکستان کو پاکستان سے الگ کرکے ہمیں وہ نقصان نہیں پہنچایا تھا جو بالی ووڈ کی فلمیں ہمارے معاشرے اور نوجوان نسل کو پہنچارہی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک کے سیاست دانوں کو سیاسی جوڑ توڑ اور بلیک میلنگ سے فرصت نہیں ملتی۔ ان کا اول وآخر مقصد اقتدار سے چمٹے رہنا اور ملک وقوم کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے رہنا ہے ورنہ وہ یہ سوچتے کہ دنیا میں فلم کے میڈیم کی آج کل کتنی اہمیت ہے۔ جو کام فوجیں نہیں کرسکتیں، وہ فلمیں کررہی ہیں۔ سوویت یونین کو فتح کرنے کے لیے امریکا کو فوج نہیں بھیجنی پڑی تھی۔ اس نے صرف ہالی ووڈ کی فلموں کا انبار لگادیا تھا جس سے روسیوں کے ذہنوں کو اپنی چمک دمک میں گرفتار کرلیا۔

بھارتی لیڈروں اور حکمرانوں کو بھی یہ گر معلوم ہے۔ وہ گزشتہ نصف صدی سے اپنی فلموں اور فلم سازی کو فروغ دینے میں مصروف ہیں۔ انہوں نے دنیا بھر میں پہلے تو بھارتی فلموں کی اپنے سفارت خانوں میں نمائش شروع کی۔ پھر فلم انڈسٹری کو مقامی پریس سے ملایا اور آہستہ آہستہ غیر ملکیوں کو بھی بھارتی فلمیں دیکھنے کے لیے راغب کرلیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آیا۔ کئی کئی سپرہٹ فلموں کے پروڈیوسر اپنا گھر نہیں بنا سکے۔ سارا منافع فلم ڈسٹری بیوٹر اور سنیما اونر کھاتے رہے۔ ایک سنیما سے چار سنیما اور ایک کوٹھی سے چار کوٹھیاں بناتے رہے۔ جس صنعت کا صنعت کار یعنی فلم ساز ہی کنگال ہوگا وہ صنعت کیسے چلے گی؟

اس بحث کو چھوڑیے۔ آیئے آج ایک نئے موضوع پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بالی ووڈ کی فلموں نے پاکستان کی ایکٹریسوں اور تعلیم یافتہ نسل کو نیم عریاں تو کر دیا، پہلے مغربی فلموں کا اثر تھا، اب بھارتی فلموں کا ننگا پن اور فحاشی پھیل رہی ہے۔ اخلاق برباد کرنے کے بعد اب بھارتی فلم سازوں نے گالم گلوچ کو مقبول کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یاد رہے کہ بھارت میں نہ تو عریانی اور فحاشی کو بُرا سمجھا جاتا ہے اور نہ بدزبانی اور گالی گلوچ کو، مگر ہمارے معاشرے میں یہ بہت معیوب ہیں۔ بھارتی فلموں کی مہربانی سے ہمارے ڈراموں میں بھی بغیر آستینوں، کھلے گلوں اور ننگی پنڈلیوں کی نمائش شروع ہوگئی ہے جو معاشرے میں عام ہوتی جارہی ہے۔

فلم شاہ جہاں کا منظر

ہے۔ پھر زبان بھی خراب ہورہی ہے۔ ''یار'' کہنے کا فیشن عام ہوگیا جو ایک بے ہودہ بدتمیزی کا مظہر ہے مگر بھارتی فلموں کے ذریعے ہمارے ڈراموں میں ماں بیٹے کو بیٹا باپ کو بیوی شوہر کو۔ ساس بہو کو سب ایک دوسرے کو ''یار'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ اخلاق کے رکھوالے اور سنسر نہ جانے کہاں سویا پڑا ہے۔ اب تو بچہ بچہ ایک دوسرے کو یار کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ بہن بھائی کو، بھائی بہن کو بے تکلفی میں ''ارے یار'' کہتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ لفظ گالی سمجھا جاتا تھا۔

بھارتی فلموں میں گالیاں دینا عام ہوچکا ہے۔ ماں، بہن کی گالی فلموں میں دی جاتی ہے۔ ناشائستہ اور بے ہودہ الفاظ اور گالیاں فلموں کی کامیابی کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ معاشرے کی سچی تصویر ہے مگر یہ بھارتی

مختار بیگم

پیش کی جائے تو اس کے خلاف تحریک اور مظاہرے شروع ہوجاتے ہیں۔ بہرحال یہ ایک طویل داستان ہے جسے مختصر طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔

بھارتی فلمیں غیر قانونی، ناجائز اور سنیما ٹوگرافی ایکٹ کے خلاف پاکستان میں لائی اور دکھائی جارہی ہیں۔ سارا کھیل پیسے کا ہے اور درجہ بہ درجہ پیسا ہر ایک میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ بھارتی فلموں پر پابندی کے باوجود آج پاکستانی سنیما گھر بھارتی فلموں سے کیوں اور کیسے بھرے ہوئے ہیں؟ سنیما والے کو بھی ملک اور اپنے کلچر سے زیادہ روپیا عزیز ہے۔ وہ یہ شور مچاتا ہے کہ اگر بھارتی فلمیں نہ منگائیں تو سنیماؤں میں کیا دکھائیں؟ بھائی، بھارت کے علاوہ بھی دنیا کے تمام ملکوں میں فلمیں بنائی جاتی ہیں اور یہ بہت اعلیٰ معیار کی فلمیں ہوتی ہیں۔ پاکستانی فلمی صنعت کو ختم کرنے میں فلم ڈسٹری بیوٹر اور سنیما اونر کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

ثبوت کے طور پر یہ دیکھ لیجیے کہ بھارتی فلموں پر پابندی لگنے کے بعد ہی پاکستان میں فلمی صنعت نے ترقی کی تھی اور ہر سال ایک سو سے سوا سو تک معیاری فلمیں ریلیز ہوتی تھیں۔ جو لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ جب تک مقابلہ نہ ہوگا، پاکستان میں اچھی فلم کیسے بنے گی؟ یہ لوگ یا تو احمق ہیں یا دوسروں کو احمق سمجھتے ہیں۔ مقابلہ تو تب ہوگا جب یہاں فلمیں بنیں گی۔ پہلے فلم بنانے کا ماحول اور سہولتیں تو پیدا کیجیے۔ اس کے بعد مقابلہ بھی کرلیں گے۔ 1955ء سے 1980ء تک بھارتی فلموں پر بندش کے زمانے میں ہی پاکستان میں فلم انڈسٹری نے بے پناہ ترقی کی تھی۔ پھر جاہل بدمعاشوں، اسمگلروں، جوئے بازوں کے حوالے فلم انڈسٹری کو کر دیا گیا جنہوں نے اچھی فلم بنانے والے ذہین لوگوں کو پیسے کے بل پر نکال باہر کیا اور ایسی فلمیں بنائیں جن کو دیکھ کر شرم آتی ہے۔ پاکستانی فلم ساز کے پاس بھی ''پیسا'' نہیں

فلم اچھوت کنیا میں اشوک کمار

ہونے لگے ہیں۔ خود بھارت کے نفسیاتی اور سماجی ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ رجحان بہت خطرناک ہے جن سے سب سے زیادہ بچے متاثر ہوں گے جو کل کے شہری بنیں گے۔ تیار ہوجایئے، اب یہ گالیاں ہمارے بچوں کی اور بڑوں کی زبانوں پر بھی آپ سنیں گے تو پھر ٹی وی ڈرامے والے کیوں پیچھے رہیں گے؟

قائداعظم کے پاکستان میں یہ بے ہودگیاں؟ خدا کی پناہ! غالب کی زبان میں اتنا کہہ سکتے ہیں ''شرم تم کو مگر نہیں آتی۔''

جس قوم کے لوگ دولت کے پجاری بن جائیں۔ وہ پستی کی انتہا تک گر سکتی ہے۔ کیا کوئی لیڈر، حکمراں، عالم، دانشور، سماجی وفلاحی انجمن اس طرف بھی توجہ دیں گی؟

☆☆☆

بھارتی فلموں کا تذکرہ چل نکلا ہے تو کچھ ذکر مدراس (جنوبی ہند یا تامل ناڈو) کی ایکٹریسوں کا بھی ہوجائے جنہوں نے بمبئی کی اردو فلموں میں بہت نام پیدا کیا اور کامیابیاں سمیٹیں۔

ایک زمانے میں پدمنی اور راگنی مدراس سے آئی تھیں۔ راج کپور نے پدمنی کو اپنی ایک فلم میں ہیروئن بھی بنایا تھا مگر وہ زیادہ مقبولیت حاصل نہ کرسکیں۔ اس کے بعد ریکھا آئیں اور انہوں نے کافی عرصے تک بمبئی کی اردو فلموں پر راج کیا۔ جیا پرادھا، ہیما مالنی، وجنتی مالا، وحیدہ رحمان، سری دیوی نے بھی بہت کامیابیاں حاصل کیں اور صفِ اوّل کی اداکارائیں بن گئیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ودیا مالنی نے مدراس میں ناکام ہونے کے بعد بمبئی کا رُخ کیا جہاں فلم ''پری نیتا'' نے دھوم مچادی۔ اس فلم کے ہیرو سیف علی خاں تھے۔ ان کے بعد ایک عجیب وغریب نام والی ہیروئن ''دیپکا پڈوکون'' کی آمد ہوئی۔ یہ کسی فلم کی ہیروئن سے زیادہ

معاشرے کی تصویر ہوگی، پاکستانی معاشرے میں گالی آج بھی گالی ہے مگر شاید بھارتی فلموں کی مہربانی سے کچھ عرصے بعد یہ بھی گھروں میں عام ہوجائے گی اور ہمارا معاشرہ بے حیائی اور عریانی کے بعد بدزبانی اور گالیوں کو بھی قبول کرلے گا۔

چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔ شیلا کی جوانی اور منی بدنام ہوئی جیسا بے ہودہ، ناشائستہ... لفظ اب ہمارے اخبارات، ڈراموں اور گھروں میں بولا جاتا ہے۔ ''تیرے بن لادن'' جیسی فلم میں بھی گیتوں اور مکالموں میں ناشائستہ الفاظ شامل تھے۔ فلم ''کھٹا میٹھا'' میں گالی اور الو کے پٹھے جیسے مکالمے بولے گئے ہیں۔ ایک بار نہیں، کئی بار۔ ''شیلا کی جوانی'' جیسا گانا اور رقص اس سے پہلے ہمارے ہاں شاید چھپ چھپ کر دیکھا جاسکتا تھا اب یہ سارے گھر والوں کے سامنے دیکھا جاتا ہے۔ چھوٹے بچوں کی زبانی شیلا کی جوانی کا گیت سن کر ماں باپ بہت خوش ہوتے ہیں۔ اداکار ہی نہیں اداکارائیں بھی بے ہودہ الفاظ اور گالیوں سے پرہیز نہیں کرتیں۔ عشقیہ بہت کامیاب فلم ہے جس میں ہیروئن نے بے دھڑک غیر مہذب اور غیر اخلاقی مکالمے بولے۔ بعد میں ہیروئن ودیا بالن نے ایک انٹرویو میں کہا کہ میں ایسے مکالمے بولنے پر شرمندہ ہوں، میں عام زندگی میں ایسے الفاظ زبان پر لانے کا سوچ بھی نہیں سکتی مگر ڈائریکٹر کے دباؤ کی وجہ سے ایسا کرنا پڑا..... ودیا بالن بھی ٹھیک کہتی ہیں۔ جب ڈائریکٹر کے دباؤ پر جسم ننگا کیا جاسکتا ہے تو ننگے مکالمے بولنے میں کیا حرج ہے؟ مزے کی بات یہ ہے کہ انڈیا کی سبھی ہیروئنیں تعلیم یافتہ اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ طوائفوں کا دور اب وہاں ختم ہوچکا ہے مگر شریف زادیاں طوائفوں سے بڑھ گئی ہیں۔ راج کپور کی زندگی میں گھرانے کی کوئی بہو بھی فلموں میں کام نہیں کرتی تھی، اب اسی خاندان کی کرینہ کپور اور کرشمہ کپور کے تمام جسم کا فلم بین نظارہ کرچکے ہیں، لاحول ولاقوۃ۔

فلم ''گول مال'' اور ''جب وی میٹ'' میں کرینہ کپور نے خوب گالیاں دی ہیں۔ دیپکا پاڈوون نے فلم ''لفنگے پرندے'' میں گالیاں دیں۔ پریانکا چوپڑا نے فلم ''سات خون معاف'' میں خوب گالیاں سنائیں۔ یہ سپراسٹارز ہیں جو روایت کاروں کے دباؤ میں آکر ننگی بھی ہوجاتی ہیں اور ننگی گالیاں بھی دیتی ہیں تو پھر دوسرے درجے کی ہیروئنوں کو کیا نہ کرنا پڑتا ہوگا؟

فلموں کے گانوں میں بھی غیر اخلاقی الفاظ شامل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کسی جڑی بوٹی کا نام لگتا ہے لیکن اس عجیب و غریب اور مشکل نام کے باوجود وہ بالی وڈ میں مقبول ہو رہی ہیں۔ اسی دوران میں عامر خان کی فلم ''گجنی'' میں آسن نامی ایک ہیروئن نمودار ہوئیں۔ فلم بہت کامیاب ہوئی اور آسن بھی کامیاب ہیروئنوں کی صف میں شامل ہو گئیں۔

آیئے، مختصر طور پر جنوبی ہندوستان کی ان ہیروئنوں کا جائزہ لیتے ہیں جنہوں نے بمبئی کی فلموں میں بہت نام پیدا کیا اور کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے۔

ایک وہ زمانہ بھی تھا جب بمبئی کی ناکام ہیروئن مدراس کا رُخ کرتی تھیں جہاں کئی زبانوں میں فلمیں بنائی جاتی ہیں۔ مثلاً تامل، تیلگو، ملیالم، کنٹر وغیرہ۔ جن ہیروئنوں نے وہاں کامیابیاں حاصل کیں ان میں نغمہ، سمرن اور جیوتھیکا قابلِ ذکر ہیں۔ ان تینوں کو بالی وڈ نے مسترد کر دیا تھا۔

ودیا بالن کا تعلق دراصل ملایالم بولی جانے والے علاقے سے ہے۔ وہاں فلموں میں قسمت آزمانے اور ناکام ہونے کے بعد انہوں نے بمبئی کا رُخ کیا اور پہلی فلم ہی میں کامیابی حاصل کر لی۔ دیپکا پڈوکون نے بھی کناڈا کی فلموں سے آغاز کیا تھا۔ اس فلم کا نام ''ایشوریا'' تھا مگر شہرت انہیں شاہ رُخ خان کی فلم ''اوم شانتی اوم'' سے ملی اور اب وہ ایک کامیاب ہیروئن ہیں۔ اس کے بعد آسن کی آمد ہوئی۔ آسن کو جنوبی ہند کی فلموں میں بھی کامیابی حاصل ہوئی تھی مگر وہ نئی چراگاہوں کی تلاش میں بمبئی پہنچ گئیں۔ آسن نے عامر خان کے ساتھ فلم ''گجنی'' میں کام کیا اور فلم کے ساتھ وہ بھی کامیاب ہو گئیں۔ مدراس میں کملا ہاسن، وکرم اور وجے جیسے کامیاب ہیروز کے ساتھ کام کرتی رہی ہیں اور کامیاب بھی رہی ہیں۔

آسن کے بعد جنوب سے ایک اور اداکارہ ''سرما'' بمبئی آئیں۔ انہوں نے فلم ''بھلبلی'' میں کام کیا جو ایک کامیڈی فلم تھی۔ سنا ہے کہ اب مدراس کی دو اور ہیروئنیں بمبئی کے لیے پر تول رہی ہیں۔ یہ تو نئی جنوبی اداکاراؤں کی فہرست ہے۔ اس سے پہلے جن ایکٹریسوں نے بمبئی میں کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے اب ان کا تذکرہ بھی ہو جائے۔

ہیمی اور راگنی کی ناکامی سے قطع نظر مدراس سے 1950ء میں، ونجنتی مالا تامل ہٹ فلموں میں کام کرنے کے [illegible] 1954ء میں فلم ''ناگن'' ان کی پہلی فلم تھی [illegible] ان سے پہلے مدراس سے ان کی اردو فلم ''بہار'' سارے ہندوستان میں مقبولیت حاصل کر چکی تھی۔

وجنتی مالا ایک مقبول اور دلکش شخصیت تھیں۔ اداکاری میں بھی کم نہ تھیں اس لیے کامیابیاں حاصل کرتی رہیں۔ اکثر جنوب کی ہیروئنوں کی طرح وہ بہت اچھی ڈانسر بھی تھیں۔ ان کا دورِ عروج 1954ء سے 1960ء تک رہا۔ انہیں اپنے زمانے کے عظیم ترین اداکار دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا جن میں مدھومتی، گنگا جمنا، دیوداس اور لیڈر شامل ہیں۔ وہ دلیپ کمار کے اتنے قریب ہو گئی تھیں کہ دلیپ کے بچپن کے دوست لیکن حریف راج کپور نے ان کے لیے خاص طور پر رنگین فلم ''سنگم'' بنا کر انہیں اپنے کیمپ میں کھینچ لیا۔ اس کے بعد انہوں نے دلیپ کمار کے ساتھ کام نہیں کیا۔ 1960ء میں چند اور فلموں میں کام کرنے کے بعد انہوں نے ایک ڈاکٹر سے شادی کر کے فلمی دنیا کو خیر باد کہہ دیا اور سیاست میں حصہ لیا۔ وہ لوک سبھا کی ممبر رہی ہیں۔ ان کا شمار ہندوستانی فلموں کی ممتاز ہیروئنوں میں کیا جاتا ہے۔ آج کل وہ ایک خوشگوار اور گھریلو زندگی بسر کر رہی ہیں۔

70-80ء کی دہائی میں مدراس سے دو ہیروئنیں بمبئی آئیں۔ ان میں ایک ریکھا تھیں اور دوسری ہیما مالنی۔ رقص میں دونوں ماہر تھیں۔ اداکارہ بھی بہت اچھی تھیں لیکن ہیما مالنی کو گلیمر گرل کے طور پر بہت شہرت حاصل ہوئی تھی۔ ریکھا اداکارانہ صلاحیتوں کے اعتبار سے ان سے بہتر تھیں، ان دونوں نے بھی ملک گیر مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔

ہیما مالنی نے جو کہ تامل ہیں، اپنی اداکاری کا آغاز ایک تلگیو فلم سے کیا تھا۔ بمبئی میں انہوں نے دیو آنند کی فلم ''جانی میرا نام'' میں کام کر کے راتوں رات شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی۔ انہوں نے درجنوں کامیاب فلموں میں اداکاری کی۔ فلم ''سیتا اور گیتا'' جو 1972ء میں ریلیز ہوئی تھی، اس میں انہوں نے بیک وقت دو کردار ادا کر کے بہت داد حاصل کی تھی۔ ان کی سپرہٹ فلموں میں ''شعلے'' سرِفہرست ہے جس کی کامیابی کا ریکارڈ آج تک کوئی بھارتی فلم نہیں توڑ سکی۔ انہوں نے کئی ممتاز ہیروز کے ساتھ کام کیا۔ 1980ء میں وہ دھرمندر سے شادی کرنے کے بعد فلموں سے ریٹائر ہو گئی تھیں۔ دھرمندر پہلے ہی شادی شدہ اور صاحبِ اولاد تھے۔ فلموں سے الگ ہونے کے بعد وہ رقص کی تربیت اور مختلف تقریبات میں رقص کا مظاہرہ کرتی رہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ پہلی بار 2003ء میں فلم

[...]ہان میں نمودار ہوئیں۔ ''ویرزارا'' میں بھی انہوں نے اہم [...]دار ادا کیا تھا۔ یہ 2004ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

اداکارہ ریکھا تامل فلموں کے سپر اسٹار جیمنی گنیشن اور [...] ہیروئن پشاولی کی صاحب زادی ہیں۔ انہوں نے 1969ء میں ایک کینیڈ فلم میں کام کیا تھا۔ بمبئی میں ان کی فلم ''ساون بھادوں'' تھی جو 1970ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ [...]روع شروع میں وہ اردو ہندی نہیں بول سکتی تھیں مگر رفتہ رفتہ [...]یکھ لی۔ انہوں نے متعدد کامیاب فلموں میں کام کیا لیکن [...] بچن کے ساتھ ان کی جوڑی سب سے زیادہ پسند کی گئی [...]ی۔ یہاں تک کہ دونوں کا اسکینڈل بھی مشہور ہو گیا۔ ریکھا [...] میں یہ تسلیم کر چکی ہیں کہ وہ امیتابھ سے بہت محبت [...]رتی تھیں اور اب بھی کرتی ہیں مگر امیتابھ نے جیا بہادری [...] شادی کر کے ان کا دل توڑ دیا۔ انہوں نے کئی سپر ہٹ [...]لموں میں کام کیا ہے۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود آج بھی [...] اسمارٹ اور فٹ ہیں۔ انہوں نے خواتین کی فٹنس کے لیے [...] ویڈیو بھی جاری کیا ہے۔ انہوں نے آج تک شادی نہیں کی۔

جیا پرادھا تلگیو فلموں میں کامیابی حاصل کرنے کے [...] بمبئی میں آئیں تو ''سرگم'' کے نام سے بنائی جانے والی [...]فلم میں جلوہ گر ہوئیں۔ یہ فلم 1979ء میں ریلیز ہوئی [...]ی۔ ان کامیابیوں کے بعد انہوں نے اس زمانے کی مقبول [...]مور ہیروز کے ساتھ کام کیا۔ 1980ء کے آخر تک ان کی مقبولیت میں کمی ہونے لگی تھی جس کا بڑا سبب ہیما مالنی کی [...] لیکن وہ 1990ء تک فلموں میں کام کرتی رہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ایک تاجر سے شادی کر کے فلمی صنعت کو [...] کہہ دیا۔ آج کل وہ سیاست میں حصہ لے رہی ہیں۔

مذکورہ بالا ہیروئنوں کے بعد تامل فلموں کی ایک اور [...]کارہ سری دیوی بمبئی میں وارد ہوئیں۔ مدراس میں وہ [...] کانت اور کملا ہاسن کے ساتھ کام کر چکی تھیں۔ بالی وڈ میں [...] پہلی فلم ''سولہواں سال'' تھی جو بہت کامیاب فلم تھی۔ [...] کے بعد ان کی مقبول فلم ''ہمت والا'' تھی۔ وہ جسم کی [...] میں بہت روشن خیال اور بے باک تھیں۔ انہوں نے [...] اور دوسرے اداکاروں کے ساتھ بھی کام کیا لیکن انیل [...] کے ساتھ ان کی جوڑی بہت مقبول اور کامیاب رہی۔ [...] کے ساتھ مسٹر انڈیا، چاندنی، چالباز اور امیتابھ کے ساتھ [...]دا گواہ'' ان کی مشہور فلمیں ہیں۔ فلمی زندگی کے آخری [...] مادھوری ڈکشٹ اور جوہی چاؤلہ کی آمد نے انہیں

بہت متاثر کیا۔ ''جدائی'' ان کی آخری زمانے کی بہت بڑی ہٹ فلم تھی۔ مقبولیت میں کمی سے متاثر ہو کر انہوں نے انیل کپور کے بڑے بھائی اور فلم ساز بونی کپور کے ساتھ شادی کر کے فلمی صنعت کو خیر باد کہہ دیا۔

سری دیوی کے ریٹائر ہونے سے بمبئی میں مدراس کی مقبول اداکاراؤں کا دور ختم ہو گیا۔ اب دیپکا پڈوکون اور آسن کی آمد کے بعد ممکن ہے کہ بمبئی میں تامل ایکٹریسوں کا ایک نیا دور شروع ہو جائے۔

☆☆☆

پچھلے دنوں کئی قارئین نے ساغر صدیقی کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی فرمائش کی ہے۔ ساغر صدیقی کے بارے میں ایک بار سے زیادہ مختلف اوقات میں بیان کیا جا چکا ہے لیکن جن قارئین نے گزشتہ شمارے نہیں پڑھے ان کے لیے اور جنہوں نے پڑھے ہیں ان کی یادیں تازہ کرنے کے لیے ساغر صدیقی کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کی جا رہی ہیں۔

ساغر صدیقی کو بجا طور پر ایک درویش صفت اور دنیاوی معاملات سے بے تعلق شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ منشیات نے بھی ان کی زندگی کو تباہی سے دوچار کیا لیکن فطری طور پر بھی وہ ایک آزاد منش، دنیاوی ضروریات سے بے تعلق اور ایک انتہائی فیاض اور ہمدرد انسان تھے۔ اگر قناعت کا نمونہ دیکھنا ہو تو وہ جدید دور میں اس کی ایک نمایاں مثال تھے۔ اگر کسی نے ان کو غزل لکھوانے کا معاوضہ پانچ روپے دیا ہے تو وہ ایک آدھ روپیا اپنی فوری ضروریات پر خرچ کرنے کے بعد باقی رقم تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ گویا وہ توکل اور قناعت کی ایک چلتی پھرتی مثال تھے۔

آپ حیران ہوں گے کہ اتنے عظیم شاعر کو ایک غزل کا معاوضہ پانچ روپے دیا جاتا تھا۔ یہ ہمارے پبلشر حضرات کی ہمیشہ سے ذہنیت رہی ہے۔ موقع ملتا تو وہ انہیں چائے کی ایک پیالی کے عوض غزل لے کر ٹرخا دیا کرتے تھے۔ پبلشرز نے ان کے اس ردی کے بھاؤ خریدے ہوئے کلام سے کئی مجموعے شائع کر کے خوب دولت کمائی۔ ان کے تو آگے پیچھے کوئی تھا ہی نہیں۔ جن کے تھے انہیں کون سی رائلٹی یا منافع میں سے حصہ مل جاتا تھا۔ ان سے نام نہاد شاعر بھی چند روپے دے کر غزل لے لیتے تھے اور اپنا کلام فخریہ انداز میں مشاعروں میں سناتے تھے۔ ان میں سے بعض دیدہ دلیر حضرات نے اپنے کلام کے مجموعے بھی شائع کرائے اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہرت حاصل کی۔

سعادت حسن منٹو جنہیں اردو کا عظیم ترین افسانہ نگار کہا جاتا ہے، ان کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ ان کے بیشتر مجموعے ان افسانوں پر مشتمل ہیں جو پانچ دس یا پندرہ روپے کے عوض خریدے گئے اور آج تک ناشروں کی نسلیں ان کی کمائی کھا رہی ہیں۔

چھوڑیے، یہ ایک تکلیف دہ موضوع ہے۔ ادب اور ادبی رجحان کے اردو میں نہ پنپنے کا ایک بہت بڑا سبب یہ منافع خور اور خود غرض ناشر بھی ہیں جنہوں نے اردو ادب کے راستے میں بہت زیادہ رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ جس مصنف کا پہلا ایڈیشن ہی تمام عمر (بقول ناشر) ختم نہ ہوگا اسے منافع یا رائلٹی کیسے مل سکتی ہے؟

ساغر صدیقی کے بارے میں یہ بتا دیا جاتا ہے کہ وہ 1928ء میں مشرقی پنجاب کے ضلع انبالہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والدین کون تھے؟ کیا کرتے تھے؟ ان کی پیدائش کی تاریخ کیا تھی، یہ تو خود ساغر صدیقی بھی نہیں بتا سکتے تھے۔ البتہ یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے بچپن ہی سے جبر، ظلم اور محرومی کے حالات میں زندگی بسر کی۔ بچپن میں انہوں نے کنگھیاں بنانے کا فن سیکھ لیا تھا جو آمدنی کا ذریعہ تھا۔

ساغر صدیقی دراصل پیدائشی شاعر تھے۔ نہ تعلیم حاصل کی، نہ مطالعے کا موقع ملا مگر اوائل عمر ہی میں انہوں نے شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ وہ ترنم سے شعر پڑھتے تھے اس لیے جب مشاعروں میں جانا شروع کیا تو اپنے کلام اور طرزِ ادائیگی کی بنا پر بہت مقبولیت حاصل کی۔ سنا ہے کہ وہ جس مشاعرے میں جاتے تھے مشاعرے کو لوٹ لیتے تھے۔ بڑے بڑے شعرا دیکھتے رہ جاتے تھے۔

قیامِ پاکستان کے بعد وہ لاہور آ گئے اور تمام عمر لاہور کی سڑکوں، گلیوں اور چوباروں میں ہی گزار دی اور یہیں کی خاک میں دفن ہوئے۔ لاہور میں ادبی حلقوں کے علاوہ فلمی حلقوں میں بھی ان کی شناسائی ہو گئی تھی۔ دونوں جگہ انہیں کبھی ان کا حق نہ ملا۔ کوئی (ایک دو کے سوا) مخلص دوست نہ ملا۔ رشتے دار کوئی تھا ہی نہیں۔ ان حالات نے انہیں دل برداشتہ کر دیا۔ سرمایہ داری نظام کی دشمنی بچپن ہی سے ان کے خمیر میں تھی۔ بڑے ہو کر حالات کا جائزہ لیا تو ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز اُٹھانے والے شاعر بن گئے۔ شاعری کا معیار اتنا اونچا تھا کہ آج بھی ان کے برمحل اشعار سنائے جاتے ہیں۔ عدالت عالیہ کے ایک جج نے سماعت کے دوران میں ان کا یہ شعر پڑھ کر سامعین کو چونکا دیا تھا۔

جس عہد میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس عہد کے سلطاں سے کوئی بھول ہوئی ہے

ایسے زہر میں بجھے ہوئے اشعار انہوں نے بڑی فراوانی سے کہے مثلاً

اب شراروں کی فصل ہے ساغر
رنگ اُگتے تھے جن زمینوں میں
رونقِ جشنِ رنگ و بو کے لیے
زخم حاضر ہیں ، دماغ حاضر ہے

ان اشعار سے ان کی ذہنی پختگی، شدت احساس اور موجودہ نظام کے خلاف بغاوت کا ثبوت مل جاتا ہے۔ زمانے نے انہیں کچھ بھی نہیں دیا حالانکہ انہوں نے زمانے کو بہت کچھ دیا۔ ان کا کلام انتہائی اعلیٰ پائے کا ہے لیکن بدقسمتی سے آج تک نصاب میں شامل نہیں کیا گیا۔ اعتراض یہ ہے کہ وہ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ احسان دانش کا کلام یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے حالانکہ وہ بھی میٹرک تک نہ تھے مگر مطالعہ بہت زیادہ تھا۔

انہوں نے پہلے اپنا قلمی نام ناصر حجازی رکھا تھا جو بعد میں ساغر صدیقی ہو گیا۔ لاہور میں ان کی زندگی کا بیشتر حصہ گھربار، دولت اور کسی بھی سہولت کے بغیر گزرا ہے۔ ان کا بسیرا تھڑوں پر، دکانوں کے کونوں کھدروں میں، دکانوں کے برآمدوں میں۔ سڑکوں اور گلیوں میں تھا۔ نہ کبھی گھر کا سایہ نصیب ہوا نہ باقاعدہ زندگی بسر کرنے کا موقع ملا۔ نہ کوئی بیڈ روم، نہ کوئی بیڈ۔ نہ ڈھنگ کا لباس، نہ ضروریاتِ زندگی کی فراہمی۔

ساغر صدیقی نے اپنے بارے میں ایک مضمون لکھا تھا جو اُن کے مجموعۂ کلام اور دیگر جرائد میں شائع ہو چکا ہے۔ ممکن ہے یہ "خودنوشت" آپ کی نظر سے نہ گزرا ہو اس لیے حاضر ہے۔

"میری زندگی زنداں کی ایک لڑکی ہے۔" 1928ء کے کسی ماہ میں پیدا ہوا ہوں۔ گھٹنوں کے بل چلنے کا زمانہ سہارنپور اور انبالہ کی آغوش میں گزرا۔ انبالہ اردو اور پنجابی بولنے والوں کا سنگم ہے۔ ماں کی مامتا، باپ کی شفقت اور کہاں پیدا ہوا ہوں، یہ سب میرے لیے علی بابا چالیس چور کے پُراسرار غار کی کہانی ہے۔ میں نے دنیا میں خداوندِ رحیم وکریم سے بھائی بہن کا عطیہ کبھی نہیں پایا۔ معلوم نہیں کہ خدا کو اس تنہائی سے یگانہ بنانا مقصود تھا یا بیگانہ؟ بہرحال شاید میری

تسکین قلبی کے لیے کسی کا نام بھائی رکھ دیا ہو۔ اس طرح کی ایک وجود کا تذکرہ میرے بارے میں لکھنے والوں نے کیا ہے سراسر غلط ہے۔ دنیا کی چھ سمتوں پر نظر رکھنے والے صاحب فراست لاہور کی سڑکوں پر مجھے جب چاہیں ٹوٹا ہوا بازو کالی چادر میں چھپائے، احساس کے اُلٹے پاؤں سے چلتا دیکھ سکتے ہیں۔ اگر کوئی بھائی بہن ہوتا تو شاید یہ حال نہ ہوتا۔ میں نے لوگوں سے اپنا نام محمد اختر سنا البتہ ایک پُرشکوہ ماضی کی سرسراہٹ میں نے اپنے پاؤں کے نیچے سنی ہے۔"

امرتسر میں امین گیلانی میرے پہلے ادبی دوست تھے۔ انیس خلیلی مرحوم، ظہیر کاشمیری، احمد راہی، مرزا جانباز وغیرہ سے نشست و برخاست رہی۔ ساحر لدھیانوی ، نریش کمار شاد، شاد مرحوم ،لطیف انور گرداسپوری جن کا میں علم کے میدان میں بے حد احترام کرتا تھا۔ اور اب بھی کرتا ہوں میری یادداشت کا ابتدائیہ ہیں۔ سید عطاالله شاہ بخاری جیسے سید عالم کے دستِ شفقت سے سرفراز رہا۔ لدھیانہ میں مولانا عزیز الدین نظامی سے ملا۔ مولانا گرامی مرحوم کے شاگرد تھے اور فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ میں نے جالندھر، لدھیانہ، گورداسپور کے کئی مشاعروں میں شرکت کی۔ 1947ء میں تقسیم ہند کے وقت میری عمر انیس برس تھی۔ جیسے جیسے حالات کا ستم جاری رہا مجھے شعور اسرار ہائے کائنات کا حاصل ہوتا گیا۔ تقسیم کے بعد سے صرف شعر کہتا ہوں۔ شعر کھاتا ہوں اور شعر پیتا ہوں۔

یہ حیات کی کہانی ہے فنا کا ایک مسافر
تو لبوں سے مسکرا کر اسی جام کو لگا لے

محمود اختر، اختر جس کے معنی تارے کے ہیں آپ کی مثال ایک ٹوٹے ہوئے ستارے کی مانند تھی جس نے اپنا ابتدائی نام ناصر حجازی رکھا اور کچھ عرصے بعد تبدیل کر کے ساغر صدیقی رکھ دیا۔ ساغر نے تقسیم کے بعد اپنے تمام ماہ و سال، صبح شام لاہور کی سڑکوں پر گزارے۔ سڑکیں بچھونا اور آسمان کی کھلی چھت سر پر رہی۔ ہزاروں لوگوں کی ہزاروں نظریں اس فقیر کو دیکھتیں اور گزر جاتیں۔ لاکھوں کے اس ہجوم میں کسی نے بھی نہ سوچا کہ اس فقیر کے پاس چند لمحوں کے لیے رکیں۔ اس سے پوچھیں کہ وہ ان حالات کا کیوں کر شکار ہوا؟

یہ فقیر کبھی داتا دربار، کبھی ٹکسالی دروازے کے محلوں میں، کبھی بھاٹی دروازے کے باہر شہزاد ہوٹل کے ساتھ، کبھی [illegible] کارنر کے تھڑوں پر تو کبھی بھٹہ خشت کی اینٹوں پر نظر آنے والا کون ہے؟ بے رحم سماج کے نزدیک تو ساغر کی حیثیت بس ایک قدیمی عمارت کے کھنڈر کے مانند تھی جس کے قریب سے ہزاروں لوگ گزرتے ہیں لیکن انہیں اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ یہ عمارت کس کی تھی؟ کس نے تعمیر کروائی۔ کون لوگ اس میں رہے۔ انہوں نے کون کون سے نشیب و فراز دیکھے۔ یہ آج حوادث کا شکار کیونکر ہے؟ ان کے نزدیک تو بس وہ محض ایک عمارت ہے، کھنڈر ہے، یہی وجہ ہے کہ اس فقیر کی کہی غزلوں میں اس طرح کے اشعار دکھائی دیتے ہیں۔

ہوس مُشر ہو جس بادشاہ کی ساغر
تو اس غلام پہ درویش مسکراتا ہے

پھر اسی طرح وہ درج ذیل شعر کہتا ہے جو آج تک ہر خاص و عام کی زبان پر ہیں۔ یہ شعر اس شخص کے جذبات کی غمازی کرتے ہیں جو دل میں درد رکھتا ہے، درد محسوس کرتا ہے۔

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں
آؤ اک سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

اگر اسلام کی ساڑھے چودہ سو سال کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو بے شمار اللہ کے لوگ دکھائی دیتے ہیں کہ جنہوں نے جس روز جو کمایا اسی روز اپنی ضرورت کا استعمال کیا اور باقی راہِ حق میں تقسیم کر دیا اور اگلے روز کے رزق کی ذمے داری مالک پر چھوڑ دی۔ وہ دور جب لوگوں کی تنخواہ چھ سو روپے ماہانہ ہوتی تھی، اس وقت فقیر کو ایک گانے کے معاوضہ پانچ سو روپے ملتے تو فقیر پانچ روپے اپنی مدہوشی کے لیے رکھتا اور باقی تمام روپے کسی بزرگ کی درگاہ پر جا کر ضرورت مندوں میں تقسیم کر آتا۔

اسی طرح بزرگ ، درویشوں نے جابر حکمران کے خلاف کلمۂ حق بلند کیا۔ صدر ایوب نے الیکشن جیتنے کے بعد ساغر صدیقی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب سرکاری اہلکار فقیر کی تلاش میں لاہور کی سڑکوں پر نظر آئے تو فقیر نے سگریٹ کی ڈبی میں سے نکلی ایک پنی پر یہ شعر لکھا اور آگے چل دیا۔

جس دور میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس دور کے سلطاں سے کوئی بھول ہوئی ہے

ساغر صدیقی کے کلام کا ایک بڑا حصہ نہ چھپ سکا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس سے بڑھ کر ظلم یہ ہوا کہ آج کے معاصرین میں سے اکثر کا کہنا ہے کہ اس وقت کے کئی شہرت پسندوں نے محض ایک سگریٹ کے عوض غزل لکھوا کر اپنے نام سے چھپوائی۔ مشاعروں میں پڑھی اور بڑی شہرت پائی۔ اس دور کے کئی بڑے گائیکوں نے کلام گا کر لاکھوں روپے کمائے لیکن کسی کو اس بات کی توفیق نہ ہوئی کہ شاعر کے زخموں پر کچھ مرہم رکھ دیں۔ وہ تمام لوگ جو ساغر سے دوستی اور محبت کے دعوے دار رہے ان میں سے ایک بڑی تعداد مفاد پرستوں کی تھی اور کوئی معتقد نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فقیر نے یوں کہا۔

زہر قاتل ہے آبگینوں میں
سانپ پلتے ہیں آستینوں میں
کچھ فرشتوں کا نام انساں ہے
میرے احساس کے قرینوں میں
اب شراروں کی فصل ہے ساغر
رنگ اُگتے تھے جن زمینوں میں

ساغر صدیقی کی اس تحریر کو پڑھ کر چند باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے نوعمری ہی میں اپنے دور کی ان ہستیوں کی صحبت سے فائدہ اُٹھایا جو آفتاب و ماہتاب تھے۔ علمی، ادبی اور شعری محفلوں میں شرکت کی۔ اہل علم کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا رہا۔ اردو، فارسی کے صاحب علم لوگوں سے فیض حاصل کیا۔ ایسے شخص کو اَن پڑھ کون کہہ سکتا ہے۔ ان کے اشعار اردو کے بڑے بڑے شاعروں کے ہم پلہ ہیں۔ ان کی تحریر میں بھی روانی اور شائستگی ہے۔ اس تحریر کے پیچھے کسی مدہوش اور دنیا سے بے خبر انسان نہیں، حالات حاضرہ سے بخوبی واقف اور ان کا احساس رکھنے والے کا قلم نظر آتا ہے۔

ساغر کو اپنی محرومیوں کا بخوبی احساس تھا جس نے انہیں مزید حساس بلکہ زود حس بنا دیا تھا۔ نہ ماں باپ کو دیکھا، نہ بہن بھائی کی محبت اور ساتھ نصیب ہوا۔ دنیا کے بھرے بازار میں کوئی ایک بھی محرم راز اور ہمدرد نہ ملا جو ان کے زخموں پر مرہم رکھتا۔ لوگوں کی مفاد پرستی اور خود غرضی کا انہیں بخوبی احساس تھا۔ وہ عالم ہوش میں نہ تھے لیکن گرد و پیش کے حالات سے بخوبی آگاہ تھے اور ان کا ادراک رکھتے تھے۔ فقیری انہوں نے جان بوجھ کر اپنائی تھی کیونکہ تاریخ اسلام کے بے غرض اور انسان دوست لوگوں کی مثالیں ان کے سامنے تھیں۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے تاریخ اسلام کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ ان کی تحریر سے ان کے گہرے مطالعے کا بھی بخوبی احساس ہوتا ہے۔ ساغر پر نہ کسی نے تحقیق کی۔ نہ ان کے کلام کو تنقید کے لائق سمجھا۔ مرنے کے بعد بھی انہیں ان کا حق نہ ملا۔

انہوں نے مدرسوں سے تعلیم حاصل نہ کی تھی مگر وہ صاحب علم تھے۔ اگر پنجاب یونیورسٹی میں ان کی کتابوں کو ایک غیر تعلیم یافتہ فرد کی تخلیقات کہہ کر نصاب میں شامل نہ کیا تو یہ خود ان کی لاعلمی کا اظہار ہے۔

ساغر صدیقی جس غیر محسوس طریقے پر، خاموشی سے زندہ رہے، اسی طرح ایک دن خاموشی سے اپنے خالق کے پاس چلے گئے۔ جنازے میں گنتی کے لوگ شامل تھے جن میں شاعر، ادیب کوئی نہ تھا۔ انہیں میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اس زمانے میں تدفین و تکفین پر خرچہ نہ آتا تھا ورنہ شاید تدفین اور کفن کے لیے بھی چندے کی اپیل کی جاتی۔ حکومتی حلقوں نے نہ زندگی میں ان کی خبر لی نہ مرنے کے بعد۔ صرف ایک مداح اور دوست یونس ادیب ایسے تھے جو ان کی برسی پر مضامین لکھتے اور کسی مجلس کا بندوبست کرتے تھے۔ اب وہ بھی نہیں رہے تو ساغر صدیقی کو یاد کرنے والا اور ان کا نام لیوا کوئی نہیں ہے۔ غالب نے کتنا صحیح کہا ہے۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ساغر صدیقی تو زندگی میں بھی خاک ہی تھے۔ مرنے کے بعد خاک کی چادر اوڑھ کر سو رہے ہیں۔

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

☆☆☆

آیئے، قدیم لاہور کی کچھ قدیم و حسین یادگاروں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

لاہور کے شہر پناہ کے بارہ دروازے تھے۔ کچھ اب بھی خستہ حالت میں موجود ہیں۔ لاہور شہر کی فصیل شہنشاہ اکبر کے زمانے میں تعمیر کی گئی تھی تاکہ اسے حملہ آوروں سے محفوظ رکھا جائے۔ فصیل کے اندر شہریوں کی سہولت کے لیے تمام سہولتیں فراہم کی گئی تھیں۔ یہاں بازار بھی تھے اور دیگر سہولتیں بھی فراہم کی گئی تھیں۔ رنگ محل بھی ایک ایسا ہی تجارتی مرکز تھا جو اس زمانے میں بھی بہت رونق اور چہل پہل والا علاقہ تھا۔ ایک لحاظ سے یہ تجارتی مرکز بھی تھا۔ اس کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ شہر کے جتنے بھی دروازے تھے، ان سب کی آخری منزل رنگ محل ہی تھا۔ اس اعتبار سے اس کو شہر کے مرکزی علاقے کی حیثیت حاصل تھی۔

اس جگہ کا نام رنگ محل کیوں رکھا گیا؟ اس کی وجہ ایک قدیم اور خوبصورت عمارت ہے۔ یہ سرخ اینٹوں سے تعمیر کی

ہوئی عمارت ہے جو شاہجہاں بادشاہ کے ایک وزیر نے تعمیر کرائی تھی۔ اس عمارت کی ایک الگ داستان ہے جس کے نام سے یہ علاقہ آج تک منسوب ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال اور اختتام کے بعد جب انگریزوں کا دور حکومت آیا تو انہوں نے شہروں کی تعمیر نو اور تزئین پر بہت اہمیت دی۔ ہندوستان کے مشہور شہروں کلکتہ، بمبئی، لاہور، مدراس وغیرہ اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں جہاں انگریزی حکومت نے کشادہ سڑکیں اور خوبصورت دیدہ زیب عمارتیں تعمیر کرائیں۔ لاہور کی مال روڈ کسی زمانے میں دنیا کی حسین ترین شاہراہوں میں شمار کی جاتی تھی۔ اس کی ترتیب اور تعمیر انگریزی حکومت ہی کی مرہون منت ہے۔ ہندوستان کے بڑے شہروں کے بہت سے علاقے لندن کی یاد دلاتے ہیں۔ جن لوگوں نے لندن کے تمام علاقوں کو دیکھا ہے وہاں کئی جگہ پر انہیں لاہور کا کوئی علاقہ ضرور یاد آیا ہوگا۔ سڑکوں کی تعمیر، ریلوے لائن کا جال، اعلیٰ درجے کے تعلیمی ادارے بھی انگریزی عہد کی ہی یادگاریں ہیں۔ دہلی میں انہوں نے نئی دہلی کے نام سے ایک انتہائی خوبصورت نیا نویلا شہر تعمیر کر دیا جو آج بھی ان کی یاد دلاتا ہے۔ نئی دہلی کی تمام قابل ذکر سرکاری عمارتیں جن پر انڈیا آج ناز کرتا ہے۔ انگریزوں ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔

انگریزی حکومت نے سارے ملک میں سڑکوں، نہروں اور ریلوے لائنوں کا جال بچھا دیا تھا۔ بڑے اور اہم شہروں کے ریلوے اسٹیشن جو انگریزی حکومت نے تعمیر کرائے تھے آج بھی اپنی دلکشی کا ثبوت ہیں۔ لاہور کا ریلوے اسٹیشن خوبصورتی کا نمونہ ہے۔ دہلی کا ریلوے اسٹیشن بھی آج تک وہی ہے جو انگریزوں نے بنایا تھا۔ بمبئی، جس کا نام بگاڑ کر اب ممبئی رکھ دیا گیا ہے۔ وہاں کا ریلوے اسٹیشن ہو بہو لندن کے وکٹوریا کراس ریلوے اسٹیشن کا نمونہ ہے۔ لکھنو کا ریلوے اسٹیشن بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ آزادی کے بعد نئے ریلوے اسٹیشن نہ تو بھارت میں تعمیر کیے گئے نہ پاکستان میں بلکہ پرانے ریلوے اسٹیشنوں کا بھی حلیہ بگاڑ دیا گیا۔ اس کو آپ جملہ معترضہ سمجھ لیجئے کہ رنگ محل کے تذکرے کے ساتھ یہ تذکرہ بھی شروع ہو گیا۔

رنگ محل کی عمارت مالک کے بعد خستگی کا شکار ہو چکی تھی۔ 1849ء میں ایک انگریز مشنری تنظیم نے اس عمارت کو خرید لیا اور اس کو نئے سرے سے تعمیر کیا لیکن اس کے طرز اور انداز میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس عمارت کو سرخ اینٹوں ہی سے تعمیر کیا گیا اور یہاں مشن ہائی اسکول قائم کر دیا گیا۔ اس عمارت کو نئے سرے سے تعمیر کیا گیا ہے لیکن پرانی عمارت کے آثار اب بھی نظر آتے ہیں۔ اس اسکول کو بعد میں یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ کہنے کو یہ مشن کا ادارہ تھا لیکن ہر مذہب کے طلبا کو یہاں داخلہ مل جاتا تھا۔ ایک زمانے میں ایف سی کالج کی کچھ کلاسوں کی بھی اسی جگہ تعلیم دی جاتی تھی۔ بعد میں ایف سی (فورمین کرسچین کالج) کی عمارت کو نہر کے کنارے منتقل کر دیا گیا۔ یہ خوبصورت عمارت آج بھی اپنی شان و شوکت کے ساتھ موجود ہے۔

رنگ محل کے ایک علاقے کو نکسالی بازار بھی کہا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ نکسالی دروازے کے اندر اور رنگ محل کے درمیان میں بازار ہے۔ نکسالی دروازے کو مہاراجا رنجیت سنگھ کے عہد کے بعد نکسالی گیٹ کا نام دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مہاراجا رنجیت سنگھ کے زمانے میں یہاں ٹکسال قائم کی گئی تھی جس میں سکے ڈھالے جاتے تھے۔

رنگ محل آج بھی پہلے سے زیادہ بارونق علاقہ ہے۔ یہاں ہر قسم کے ٹریفک کی بھرمار نظر آتی ہے۔ ہمارے مزاج کی بدنظمی یہاں بھی عروج پر ہے۔ رنگ محل کے تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے یہاں ہر وقت ٹریفک اور کاروں کا اژدھام رہتا ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایل ڈی اے نے یہاں ایک پارکنگ پلازا بھی تعمیر کیا ہے جس کی وجہ سے پارکنگ کا مسئلہ کافی حد تک حل ہو گیا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس پارکنگ پلازا تک پہنچنا بھی ایک مسئلہ ہے۔ اس علاقے میں بڑے بڑے تجارتی مراکز ہیں جہاں پاکستان کے ہر شہر کے کاروباری ہول سیل مال خریدنے کے لیے آتے ہیں۔ اس لیے یہ خرید و فروخت کا ایک بہت بڑا مرکز ہے۔ اس بازار کے آس پاس دوسری مصنوعات اور اشیا کے بازار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رنگ محل کے علاقے میں ہر وقت چہل پہل اور ریل پیل نظر آتی ہے۔

لاہور کی ایک قدیم اور خوبصورت مسجد ''بھوری مسجد'' بھی اسی علاقے میں واقع ہے۔ اس کو عوام مائی بھوری کی مسجد کہتے ہیں۔ اس مسجد کے دونوں طرف سوہا بازار، صرافہ بازار ہیں۔ دوسری جانب ڈبی بازار، کشمیری بازار اور کیسرا بازار ہے۔

سوہا بازار بھی اسی علاقے میں ہے جہاں سونے کے بہترین زیورات بنائے جاتے ہیں۔ یہ تنگ گلیوں کی ایک بھول بھلیاں ہے جہاں نئے آنے والے اکثر راستہ بھول

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاتے ہیں۔ سوہا بازار قیامِ پاکستان سے پہلے بھی تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے یہاں غیر مسلموں کی اجارہ داری تھی لیکن اب مسلمان ہنرمند اور کاریگر شب و روز کام کرتے نظر آتے ہیں۔ تنگ گلیوں میں واقع سوناروں کی دکانیں ہر وقت روشنیوں سے جگمگ کرتی رہتی ہیں اور یہاں ہر وقت خریداروں خصوصاً خواتین کا ایک ہجوم نظر آتا ہے۔ سونارا بازار کے عقب میں صرافہ بازار ہے جو اپنی نوعیت کا انوکھا بازار ہے جو پاکستان سے باہر بھی دور دور تک مشہور ہے۔ بیرونِ ملک رہنے والی خواتین اسی بازار سے زیورات تیار کرانے کو اہمیت دیتی ہیں۔ دراصل یہ تمام علاقہ خواتین کی عملداری ہے۔ شادی بیاہ کے موقعے پر شہر بھر کی خواتین اسی بازار کا رُخ کرتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ آس پاس خواتین کی ضرورت کی دوسری اشیا بھی دستیاب ہوتی ہیں۔ یہاں کھسّہ اور چپلوں کی بے شمار دکانیں ہیں۔ کیسرا بازار اور ڈبی بازار کے ناموں سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ بازار دراصل رنگین اور نازک چوڑیوں کے لیے مشہور ہے۔ شہر لاہور اور دوسرے شہروں کے بیوپاری بھی چوڑیاں خریدنے کے لیے اسی بازار کا رُخ کرتے ہیں۔ یہاں برتنوں کی بھی بہت بڑی منڈی ہے۔ دھاتی برتن، چینی اور تانبے کے برتن، اسٹیل کے برتن ہر طرح کے برتن یہاں معقول قیمتوں پر مل جاتے ہیں۔

اس بازار کے نزدیک ہی کپڑے کی سب سے بڑی کلاتھ مارکیٹ اعظم کلاتھ مارکیٹ واقع ہے۔ شاہ عالمی کپڑوں کا بہت بڑا بازار ہے، ایک اندازے کے مطابق یہاں کپڑے کی بیس ہزار کے قریب چھوٹی بڑی دکانیں ہیں۔ یہاں ہر روز کروڑوں روپے کا بزنس کیا جاتا ہے کیونکہ دوسرے شہروں کے بیوپاری بھی یہاں خریداری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جہاں خواتین خریداری کرتی ہوں اور وہاں چٹپٹی کھانے کی چیزوں کی دکانیں نہ ہوں، یہ کیسے ممکن ہے؟ یہاں کھانے پینے کی بے شمار دکانیں ہیں جہاں خواتین ہر قسم کی چٹ پٹی چیزیں کھاتی نظر آتی ہیں۔

رنگ محل کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے قابلِ اعتبار اور غلام ایاز کا مقبرہ بھی چوک رنگ محل ہی میں واقع ہے۔ ایاز کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے سلطان محمود غزنوی نے ایاز کو بہت اہم عہدوں سے بھی نوازا تھا۔

ایاز کے مقبرے کے اردگرد ایک خوبصورت اور وسیع باغ بھی تھا جسے رنجیت سنگھ کے دور میں برباد کر دیا گیا کیونکہ یہاں تمسال قائم کرنی تھی۔ مقبرے کے ایک جانب ایک برآمدہ ابھی تک باقی ہے جسے لوگ نماز پڑھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ رنگ محل کے علاقے میں شہنشاہ شاہجہاں کے دورِ حکومت میں وزیر خاں نے پری محل کے نام سے ایک حویلی تعمیر کرائی تھی۔ اس کی نزاکت، نفاست اور حسن کی وجہ سے اس کو پری محل کا نام دیا گیا تھا۔ اس عمارت میں قیمتی پتھر اور جواہرات بھی لگے ہوئے تھے۔ جنہیں سکھوں نے نکال لیا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ نے اس حویلی کو فوج کی قیام گاہ بنا دیا تھا۔ اردگرد کی خوبصورت عمارتوں کو مسمار کر کے یہاں ایک کھلا میدان بنا دیا گیا تھا۔ نہ جانے سکھ حکمرانوں کو خوبصورت چیزوں سے اتنی نفرت کیوں تھی، جن کا حلیہ بگاڑنے میں انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کے دورِ حکومت کا انگریزی حکومت کے دور سے موازنہ کیا جائے تو دونوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ سکھوں نے عمارتوں اور خوبصورت یادگاروں کو تاخت و تاراج کر دیا جبکہ انگریزوں نے نہ صرف ان کو از سرِ نو تعمیر کرایا بلکہ نئی اور شاندار عمارتیں بھی تعمیر کرائیں۔

قیامِ پاکستان سے پہلے ان علاقوں میں غیر مسلموں کی واضح اکثریت تھی۔ مسلمانوں کی آبادی بھی ایک محدود علاقے میں تھی لیکن اکثریت ہندوؤں کی تھی جو کاروبار پر چھائے ہوئے تھے۔ جب فسادات کی آگ بھڑکی تو یہی علاقہ سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا۔ انہیں لوٹنے کے بعد عمارتوں اور بازاروں کو آگ لگا دی گئی جو کئی روز تک جلتی رہیں۔ اس کے نتیجے میں یہ علاقہ بالکل کھنڈر بن کر رہ گیا تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد ان علاقوں کو دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ ہیرا پھیری والی گلیاں اور بھول بھلیوں جیسے بازار تو آج بھی موجود ہیں لیکن بیشتر علاقوں کو وسعت دے کر خوبصورت عمارتیں اور پلازا تعمیر کیے گئے۔ پرانی اور مسمار شدہ عمارتوں کی جگہ خوبصورت عالی شان عمارتیں اور تجارتی مراکز قائم کیے گئے۔ یہ سب قیامِ پاکستان کے طفیل ہوا ورنہ اگر تقسیم نہ ہوتی تو یہ علاقے آج بھی ہندوؤں کے تسلط میں ہوتے۔

تقسیم کے بعد کاریگر، تجارت پیشہ لوگ اور ہنرمند ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تو انہوں نے بھی ان علاقوں کو از سرِ نو آباد کیا اور ہنرمندوں کا مرکز بنا دیا ورنہ مقامی مسلمانوں میں یہ استطاعت نہ تھی کہ اس طرح تجارت اور کاروبار کو از سرِ نو فروغ دیتے۔

شاہ عالمی میں اب ہزاروں کپڑے کی دکانیں صرف مسلمانوں کی ملکیت ہیں اور ہر روز کروڑوں کی خرید و فروخت

ہوتی ہے۔ رنگ محل کوئی ایک بازار نہیں ہے بلکہ مختلف بازاروں کا مرکز ہے۔ اس کے آس پاس اربوں روپے کا کاروبار ہوتا ہے۔ مقامی لوگوں اور سیاحوں کی سہولت اور آسائش کے لیے اس علاقے میں نظم و ضبط پیدا کرنے، ٹریفک کو کنٹرول کرنے اور ان علاقوں کو جدید تقاضوں کے مطابق خوبصورت بنانا ضروری ہے۔ یہاں آج بھی ایسے کاروباری موجود ہیں جن کے آباؤ اجداد بھی یہیں کاروبار کرتے تھے۔

لاہور کا رنگ محل واقعی رنگ محل ہے جہاں بے شمار رنگ نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

موسیقی یعنی ناچ گانا ہمیشہ سے برصغیر میں تفریح کا ایک لیا حصہ رہا ہے۔ ''نوٹنکی'' جو گاؤں گاؤں میں دکھائی جاتی تھی، اس میں کہانی کم اور ناچ گانا زیادہ ہوتا تھا۔ پھر تھیٹر کا زمانہ آیا تو تھیٹر میں بھی موسیقی خصوصاً گانوں کو ایک اہمیت حاصل تھی۔ برصغیر میں جب سنیما کا دور آیا تو وہی ہندو پارسی سیٹھ اس کے سربراہ تھے جو تھیٹر چلاتے تھے لہٰذا فلموں میں بھی گانوں اور ناچ کو لازماً شامل کر لیا گیا۔ اس طرح برصغیر میں فلم میں موسیقی ایک لازمی چیز تصور کی گئی اور آج بھی کئی فلموں کی نمایاں کامیابی میں ان فلموں کی موسیقی کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ گویا موسیقی برصغیر کے فلم بینوں کے مزاج میں شامل ہو کر اس کا ایک اہم حصہ بن گئی اور یہ رواج آج تک جاری ہے۔

ہندوستان میں جب پہلی بولتی فلم ''عالم آرا'' 1931ء میں بنائی گئی تو اس میں بھی گانے شامل تھے بلکہ مکالموں سے زیادہ گانے تھے اس لیے کہ تھیٹر کے دور میں بھی مکالمے اشعار اور گانوں کی صورت میں پیش کیے جاتے تھے۔ موسیقی ہماری فلمی صنعت کو ورثے میں ملی ہے۔ ''عالم آرا'' نے ہندوستان بھر میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ پردۂ فلم پر نمودار ہونے والے اداکار گانے بھی گائیں گے اور باتیں بھی کریں گے۔ عالم آرا کو ان لوگوں نے بھی دیکھا جنہوں نے کبھی فلم نہیں دیکھی تھی یہاں تک کہ وہ خواتین جنہوں نے کبھی گھر کے باہر قدم نہیں رکھا تھا، وہ بھی عالم آرا دیکھنے پہنچ گئیں اور انسان کی اس کاریگری پر حیران رہ گئیں۔ عالم آرا میں اور اس کے بعد بھی فلموں میں موسیقی کی ریکارڈنگ اور مکسنگ کا کوئی نظام نہ ہونے کی وجہ سے سازندے پردوں اور درختوں کے پیچھے چھپ کر ساز بجاتے تھے اور اداکار خود ہی گانے گایا کرتے تھے۔ ابتدا میں جو لوگ موسیقی ترتیب دیا کرتے تھے ان کا نام عموماً کوئی نہیں جانتا تھا حالانکہ وہ فلموں میں موسیقی کی ابتدا کرنے والے موسیقار تھے۔ بولتی فلموں کے آغاز کے دور کے چند موسیقار ترقی ہونے کے باوجود فلموں کی موسیقی بناتے رہے اور یہ لوگ اپنے ہنر میں ماہر تصور کیے جاتے تھے۔ آج کے نقاد اور موسیقار بھی انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

ابتدائی بولتی فلموں کے پرنٹس اب ناپید ہیں۔ ممکن ہے ہندوستان کے کسی فلمی ادارے میں کوئی کٹا پھٹا پرنٹ مل جائے لیکن پاکستان میں ان کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔ ہم تو آج سے تیس چالیس سال پہلے کی فلموں کے پرنٹ بھی حفاظت سے نہ رکھ سکے۔ 1931ء کی فلموں کے پرنٹس کی موجودگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بولتی فلموں میں جن موسیقاروں نے موسیقی ترتیب دی تھی ان میں سے بیشتر تو فراموش اور گمنام ہو چکے ہیں لیکن ان عظیم موسیقاروں میں سے کچھ بعد میں بھی کام کرتے رہے اور بہت اچھی موسیقی ترتیب دیتے رہے۔ ان میں ماسٹر غلام حیدر، آر سی بورال، انیل بسواس جیسے نام شامل ہیں۔ ان سے پہلے جن موسیقاروں نے ابتدائی بولتی فلموں میں موسیقی فراہم کی ان میں فیروز شاہ مستری اور پی ایرانی شامل ہیں۔ انہوں نے عالم آرا کی موسیقی بھی بنائی تھی۔ آج ان دونوں کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہیں۔

دوسری بولتی فلم ''ابوالحسن'' کی موسیقی ماسٹر جھنڈے خاں نے بنائی تھی۔ ان کا نام بعد کے موسیقار بھی بہت احترام سے لیتے ہیں۔ وہ ایک نمازی اور پرہیزگار انسان تھے۔ موسیقی ان کا شوق تھا جس میں انہوں نے بہت نام پیدا کیا تھا۔ انہوں نے جس فلم کی موسیقی ترتیب دی تھی اس کا نام ''دیوبانی'' یا ''دیوانی'' تھا۔ اس زمانے کے دوسرے ممتاز موسیقاروں میں برج لعل ورما، ماسٹر غلام حیدر اور ماسٹر مدھولال بھی شامل ہیں۔ ایک کرسچن موسیقار ایس پی ہوگن نے بھی ایک ابتدائی زمانے کی بولتی فلم کی موسیقی بنائی تھی۔

آر سی برال کو انڈین موسیقی میں بہت بلند مقام حاصل ہے۔ انہوں نے 1932ء میں ایک بولتی فلم ''بنگال'' بنائی تھی۔ جسے بروا نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ آر سی بورال کا تعلق بنگال سے تھا۔ بروا بھی بنگالی تھے۔ پی سی بروا نے پہلی بار فلم ''دیوداس'' میں ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے ''دیوداس'' کی ہدایت کاری کی جس میں دیوداس کا کردار کے ایل سہگل نے ادا کیا تھا۔

1931ء میں عالم آرا کے بعد 24 اور بولتی فلمیں بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بنائی گئی تھیں۔ اگلے سال بولتی فلموں کی تعداد 60 ہوگئی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فلم بینوں نے بولتی فلموں کو کتنا پسند کیا تھا۔ جیسے جیسے فلم سازی کی رفتار اور تعداد میں اضافہ ہوتا رہا نئے نئے موسیقار بھی نمودار ہوتے رہے جن میں بدری پرشاد، رفیق غزنوی، بلراج سنہا، کے بھولے، بشیر خاں دہلوی وغیرہ ان میں قابلِ ذکر ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ بولتی فلموں نے بہت ترقی کرلی۔ آر سی بورال، جھنڈے خاں اور رفیق غزنوی آنے والے دور میں بھی نامور موسیقار کہلائے۔ رفیق غزنوی تو فلموں میں گاتے بھی تھے۔ بنگال کے ایک اور موسیقار اداکار اور گلوکار پنکج ملک، سہگل کے ہم عصر تھے۔ پنکج ملک کی پہلی فلم ''یہودی کی لڑکی'' تھی۔ یہ فلم 1933ء میں بنائی گئی تھی۔ اس سال 73 بولتی فلمیں بنائی گئی تھیں۔

1935ء میں بنائی جانے والی فلم ''دیوداس'' کے موسیقار تی برن تھے۔ یہ بھی ایک بنگالی تھے۔ فلم ''دھرم کی دیوی'' کی موسیقی انیل بسواس نے بنائی تھی۔ ماسٹر غلام حیدر نے 1935ء میں فلم ''سورگ کی سیڑھی'' کی موسیقی بنا کر بہت مقبولیت حاصل کی اور پھر کافی عرصے تک موسیقار کی حیثیت سے کارنامے سرانجام دیتے رہے۔ لتا منگیشکر کو دریافت کرنے اور گلوکارہ بنانے کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ 1934ء میں ایک خاتون میوزک ڈائریکٹر عشرت سلطانہ فلمی افق پر نمودار ہوئیں۔ انہوں نے ایک فلم ''عدلِ جہانگیر'' کی موسیقی بنائی تھی جو بہت پسند کی گئی تھی۔ انہوں نے 1937ء میں فلم ''قزاق کی لڑکی'' کی موسیقی بنائی تھی۔ ایک اور خاتون گلوکارہ اداکارہ نرگس کی والدہ جدن بائی بھی تھیں۔ وہ اداکارہ بھی رہی ہیں۔ انہوں نے فلم ''تلاش حق' ہردے متھن، میڈم فیشن اور جیون سپنا'' کی موسیقی بھی ترتیب دی تھی۔

اس زمانے کی ایک اور خاتون موسیقارہ سرسوتی دیوی تھیں۔ انہوں نے 1935ء میں فلم ''جوانی کی ہوا'' کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ انہوں نے کئی معروف اور بہت معیاری اور مقبول فلموں کی موسیقی بھی بنائی تھی جن میں ''اچھوت کنہیا، پریم کہانی، طوفان ایکسپریس، ساوتری اور بھائی'' وغیرہ شامل ہیں۔ معروف اداکارہ اور گلوکارہ مختار بیگم نے بھی 1937ء میں ایک فلم ''پریم کی آگ'' کی موسیقی کمپوز کی تھی۔ ایک اور خاتون جنہوں نے موسیقاروں کی فہرست میں نام شامل کیا گوہر بائی کرناٹکی ہیں وہ فلم ''چابک سوار'' کی موسیقارہ تھیں۔

شروع شروع میں تو سازندے چھپ کر بیٹھ کر ساز بجاتے تھے لیکن کچھ عرصے بعد جب ٹیکنالوجی نے ترقی کی تو فلموں کی شوٹنگ کے ساتھ ہی گانوں کی ریکارڈنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا کیونکہ اداکار اور اداکارائیں خود ہی گلوکاری کرتے تھے۔

ہندوستان میں جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے بہت پرانی فلموں کے پرنٹ تیار کرکے انہیں بہتر صورت میں تبدیل کیا جارہا ہے۔ یہ تحقیق ثروت علی نے کی ہے جس کے لیے ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

☆☆☆

پاکستان میں جن دنوں فلمی صنعت کا عروج تھا، اس زمانے میں کاروباری اعتبار سے فیچر فلموں میں بھی تجربات کیے جاتے تھے۔ وہ عافیت کا دور تھا اس لیے ہر فن کار اور ہنر مند کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ دوسروں کے لیے نیا اور بہتر کام کرکے دکھائے۔ پاکستان کی پرانی فلموں کی یادیں تازہ کرنے کے سلسلے میں آج ہدایت کار علی حافظ کی فلم ''شکار'' کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔ یہ فلم ہالی ووڈ کی ایک کامیاب فلم ''دی ٹریپ'' سے اخذ کی گئی لیکن اس کو مصنف خورشید اللہ نے ایک نیا جامہ پہنا دیا تھا۔ ''شکار'' 73-1972ء میں ریلیز ہوئی تھی اور اس زمانے میں اس فلم کے بارے میں بے باکی اور روشن خیالی کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس فلم میں مرکزی کردار شاہد اور ممتاز نے ادا کیے تھے۔ یہ دونوں نسبتاً نئے اور نو آموز اداکار تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی اداکاری اور شخصیت میں تازگی اور بھرپور زندگی نظر آتی تھی۔

دراصل بنیادی طور پر ایک فرضی سرزمین کی کہانی تھی کیونکہ ہدایت کار اس فلم میں جو کہانی پیش کرنا چاہتا تھا وہ ہماری روزمرہ زندگی سے مختلف ماحول کا تقاضا کرتی تھی۔ ہدایت علی حافظ اس تجربے میں کامیاب بھی رہے اور ان کی فلم نے پاکستانی فلمی صنعت میں ایک نئے رجحان کا آغاز کیا تھا۔

جن مناظر پر سنسر نے اعتراض کیا تھا اور کچھ نقادوں نے بھی اس پر بہت لے دے کی تھی، وہ ذیل میں پیش کیے جارہے ہیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بعد کے دور کی مادر پدر آزاد فلموں کے مقابلے میں یہ فلم کافی معصوم تھی۔

ایک منظر میں فلم کی ہیروئن ممتاز ایک تالاب سے باہر نکلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس منظر میں ان کے جسم کو دکھانے کے بجائے صرف ننگی ٹانگیں دکھائی گئی تھیں۔ ممتاز اس زمانے کی خوبصورت، نوعمر اور خوش شکل اداکارہ تھیں اس لیے یہ منظر فلم بینوں کے لیے کافی ہیجان خیز تھا حالانکہ اس کے بعد بنائی جانے والی فلموں میں عریانی اور فحاشی کا جو مظاہرہ پیش کیا گیا، وہ کہیں زیادہ بے باک اور ترقی پسندانہ تھا۔

ایک اور منظر میں کامیڈین ننھا کو ایک خاتون (زرقا) کے ساتھ پہلوانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ دو مرد پہلوانوں کے بجائے ایک عورت اور مرد کا یہ کشتی کا مظاہرہ پاکستانی فلموں میں پہلی بار پیش کیا گیا تھا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ننھا ایک پہلوان ہے جس کو استاد نے ہدایت کی ہے کہ وہ اگر اچھا پہلوان بننا چاہتا ہے تو عورتوں سے دور رہے۔ اب مشکل یہ تھی کہ ننھا ایک لڑکی (زرقا) سے محبت کرتا ہے لیکن زبان سے اظہار نہیں کرسکتا اور استاد کی ہدایت کے مطابق اس سے دور دور رہتا ہے۔ زرقا کو اس مقابلے کے لیے داؤ پیچ سکھاتے ہیں۔ یہ مناظر بھی قابلِ اعتراض قرار دیے گئے تھے۔ لیکن یہ کامیڈی سے مناظر تھے جن میں اس قسم کی مبالغہ آمیزی اور اوور ایکٹنگ جائز سمجھی جاتی ہے۔

خورشید اللہ ایک خوبرو اور نوجوان مصنف تھے۔ انہوں نے فلمی مصنف کی حیثیت سے بہت کم کام کیا اور اس کے بعد اداکارہ لیلیٰ سے شادی کرکے لندن چلے گئے۔ ہارٹ فیل ہوجانے کی وجہ سے وہ جوانی ہی میں وفات پاگئے تھے۔

خورشید اللہ نے انگریزی فلم ''دی ٹریپ'' کا اردو نام ''شکار'' بہت سوچ سمجھ کر رکھا تھا جو کہانی کے مطابق تھا۔ فلم کو مختلف بنانے کے لیے انہوں نے اس کو ایک فرضی علاقے کے پس منظر میں بنایا تھا اور اس کا انداز کافی حد تک ہالی ووڈ فلموں کی طرح تھا۔ ماحول کو سجانے کے لیے عکاسی نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ ایم لطیف صاحب ایک پرانے اور تجربہ کار فلم ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے انگریزی فلموں کے انداز میں فلم کی ایڈیٹنگ کی تھی جس کی وجہ سے فلم کا ٹیمپو تیز اور موثر ہوگیا تھا۔

اس فلم کی سب سے نمایاں خوبی اس کی موسیقی تھی جو موسیقار اے حمید نے بنائی تھی۔ فلم میں چھ گانے تھے جو سب کے سب مقبول ہوئے تھے۔ اس فلم کے نغمات تسلیم فاضلی اور ریاض الرحمٰن ساغر نے لکھے تھے۔ اے حمید کی فلموں میں موسیقی کے اعتبار سے اس فلم کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ فلم کے نغمات کی تفصیل یہ ہے۔

1۔ جلوے کچھ ادا سے دکھائیں تمام رات
جاگیں تمام رات، جگائیں تمام رات (نغمہ نگار، تسلیم فاضلی)

2۔ دل لے کے مکر گیا، ہائے بجن بے ایمان نکلا
نغمہ نگار، ریاض الرحمٰن ساغر

3۔ یہ دن جوانی کے ایسے ہی بیتیں گے
نغمہ نگار، تسلیم فاضلی۔

4۔ کچھ اور پلا دے ساقیا
ہر غم کو بھلا دے ساقیا
نغمہ نگار، ریاض الرحمٰن ساغر

5۔ توبہ توبہ، اس لڑکے کو کیا ہوگیا
نغمہ نگار، تسلیم فاضلی۔

6۔ مر گیا، لٹ گیا، دل گیا، میں تباہ ہوگیا
نغمہ نگار، ریاض الرحمٰن ساغر۔

شکار میں جو ماحول اور کردار پیش کیے گئے ہیں ان کے پیشِ نظر اس فلم کی زیادہ تر شوٹنگ برف سے ڈھکے ہوئے شمالی علاقوں کے پہاڑوں میں کی گئی تھی۔ فلم کا بیشتر حصہ آؤٹ ڈور فلمایا گیا ہے جو موضوع کے اعتبار سے بہت مناسب تھا۔ یہ پاکستان کے خوبصورت ترین علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ خوبصورت قدرتی مناظر اور دلکش عکاسی کا بھی اس فلم کی کامیابی میں دخل تھا۔ فلم دیکھنے والا سینما گھر میں بیٹھے بیٹھے نیلا آسمان، سربلند سرسبز اور خشک پہاڑ۔ ندیاں اور آبشار دیکھ لیتا تھا۔ پس منظر کے مناظر اور اچھی عکاسی بھی اس فلم کا ایک سبب تھا۔

رقص بھی اس فلم میں دلکشی کا ایک سبب ہے خصوصاً ممتاز کا کٹھ پتلی رقص ایک جدت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ممتاز نے اس رقص میں سچ مچ کی کٹھ پتلی کا منظر پیش کردیا تھا۔ ممتاز کے ساتھ شاہد بھی اس رقص میں شامل تھے۔ یہ رقص فلم کی ایک نمایاں خوبی تھا۔

فلم کی کہانی کا خلاصہ ملاحظہ کیجیے۔

یہ بنیادی طور پر ایک شکاری کی کہانی ہے، یہ کردار ادیب نے ادا کیا ہے۔ ادیب کا نام فلم میں سلطان تھا۔ سلطان کے بھائی کو ایک ظالم اور عیاش چوہدری گلباز، مصطفیٰ قریشی نے قتل کردیا تھا۔ چوہدری گلباز سلطان کو بہکا کر کہیں بھیج دیتا ہے اور اس کی غیر موجودگی میں اس کی بیوی کو بے آبرو کردیتا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر اس کی معصوم بیٹی جو چھپی ہوئی تھی بولنے کی صلاحیت سے محروم ہوجاتی ہے۔ اس معصوم بچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو اس کا باپ مردہ سمجھتا ہے لیکن وہ چوہدری کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔

چوہدری کے منشی (محمود علی) کا بیٹا جانو (منور سعید) جو بذاتِ خود ایک اوباش اور بدفطرت انسان ہے، ایک دن موقع پا کر گونگی کو بے آبرو کرنا چاہتا ہے جو کہ اب جوان ہو چکی ہے۔ عین وقت پر فلم کا ہیرو شاہد وہاں پہنچ کر اسے جانو اور اس کے بدمعاش ساتھیوں سے بچا لیتا ہے۔ گونگی شاہد کو اپنے بارے میں کچھ بتا نہیں سکتی اس لیے وہ اس کو بے آسرا سمجھ کر اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ یہ گونگی ایک خوبصورت اور الہڑ لڑکی ہے جو شاہد کو پسند آ جاتی ہے۔

شاہد جنگل ہی میں پلا بڑھا ہے اور خود بھی ایک جنگلی بن چکا ہے لیکن گونگی اس کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیتی ہے اور اس کا جنگلی دل موم ہو جاتا ہے۔ وہ کھانے پینے کا سامان لینے کی لیے چوہدری گلباز کے گاؤں میں جاتا رہتا ہے جہاں اسے معلوم ہوتا ہے کہ گونگی چوہدری کے گھر ملازمہ ہے۔ شاہد گونگی سے بہت سے سوالات کرتا ہے لیکن وہ اس کو صحیح جواب نہیں دے سکتی۔ شاہد فیصلہ کرتا ہے کہ گونگی کو بے سروسامانی کے عالم میں جنگل میں رکھنے کے بجائے اس کو چوہدری گلباز کے گھر پہنچا دے۔ شاہد گونگی کو ایک رسی سے باندھ کر اپنے ساتھ لے کر گاؤں کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ راستے میں اس کا سامنا ایک ریچھ سے ہو جاتا ہے اور وہ شاہد پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ ریچھ سے لڑائی بھی اس فلم کا ایک دلکش منظر تھا۔ جس وقت شاہد اور اس ریچھ کے مابین لڑائی ہو رہی ہے، رسیوں سے بندھی ہوئی گونگی لڑھک جاتی ہے اور ایک پہاڑی سے نیچے لٹک جاتی ہے۔ گونگی ہونے کی وجہ سے وہ کسی کو امداد کے لیے پکار بھی نہیں سکتی۔ شاہد جب ریچھ کو مار کر فارغ ہوتا ہے تو اس کی نظر گونگی پر پڑتی ہے جو پہاڑ کی چوٹی سے لٹکی ہوئی ہے۔ شاہد اس کو رسی کی مدد سے اوپر کھینچ لیتا ہے۔ یہ تمام مناظر فلم بینوں کی دلچسپی کا باعث تھے چونکہ پہلی بار اس طرح کے مناظر کسی پاکستانی فلم میں دیکھنے کو ملے تھے۔

شاہد جب گونگی کو لے کر چوہدری کے پاس پہنچتا ہے تو پہلے تو وہ اس پر نوجوان لڑکی کو اغوا کرنے کا الزام لگاتا ہے مگر پھر شاہد اس کو تمام صورتِ حال سمجھا دیتا ہے۔ شاہد کی زبانی چوہدری کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پرانا دشمن سلمان زندہ ہے۔ چوہدری منشی کے بدمعاش بیٹے (منور سعید) سے کہتا ہے کہ وہ سلطان کو پکڑ کر اس کے پاس لائے۔

دوسری طرف سلطان بذاتِ خود چوہدری کے گھر پہنچ کر اس سے پرانا حساب چکانا چاہتا ہے۔ لڑائی میں دونوں خونم خون ہو جاتے ہیں۔ گونگی یہ منظر دیکھ رہی ہے، باپ کا خون دیکھ کر گونگی کو ماں کے خون کا منظر یاد آ جاتا ہے اور وہ بے اختیار چیخ پڑتی ہے۔ شاہد ادیب کو ادھ موا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ گونگی اس کا پیچھا کرتی ہے اور بالآخر اس کو پا لیتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور اس طرح کیجا ہو جاتے ہیں۔

''شکار'' اپنے موضوع اور پیشکش کے اعتبار سے ایک مختلف فلم تھی جو لوگ پاکستانی فلمی صنعت پر الزام لگاتے ہیں کہ یہاں فلم ساز ...ایک ہی ڈگر پر چلتے رہے اور ایک ہی قسم کی فلمیں بناتے رہے۔ نئے تجربات نہیں کیے یہ ایک غلط بیانی ہے۔ دراصل جب پاکستان میں فیچر فلموں نے کامیابی حاصل کرنی شروع کی اور فلم سازوں کا حوصلہ بڑھا تو انہوں نے مختلف موضوعات پر فلمیں بنائیں اور بہت اچھی فلمیں اس زمانے میں بنائی گئیں۔ تاریخی پس منظر رکھنے والی فلمیں بھی بنیں۔ فلسطین کی آزادی کے حوالے سے اور دنیائے عرب کو تقسیم کرنے کے لیے لارنس آف عربیا کے بارے میں بھی علامتی فلمیں بہت اچھے معیار کی اور موثر انداز میں بنائی گئیں۔ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کے واقعات بھی فلمائے گئے۔ معاشرتی مسائل پر بھی فلمیں بنائی گئیں۔ اعلیٰ معیاری رومانی اور میوزیکل فلمیں بھی بنائی گئیں۔ حقیقت پسندانہ موضوعات بھی فلمائے گئے۔ سیاسی پس منظر میں بھی فلمیں بنائی گئیں۔ اچھائی اور برائی کے فرق کو نمایاں کرنے والی فلمیں بھی پیش کی گئیں۔ آزادی کے موضوع کو بھی فلمایا گیا۔ غرضیکہ 1960ء اور 1980ء کے درمیان کے عرصے میں پاکستانی فلم سازوں نے فلموں کے موضوعات میں نت نئے تجربات کیے۔ نفسیاتی موضوعات بھی فلمائے گئے اور معاشرتی موضوعات کو بھی نئے نئے انداز میں پیش کیا گیا۔ ایسی فلموں کی ایک طویل فہرست ہے اگر درجہ بندی کے ساتھ ان کے بارے میں لکھا جائے تو ان الزامات کی تردید ہو جاتی ہے جو پاکستانی فلمی صنعت پر عائد کرنا ایک فیشن بن چکا ہے۔ افسوس کہ تمام پاکستانی فلموں کو محفوظ کرنے کا اور فلم سازوں کی طرف سے مناسب بندوبست نہیں کیا گیا پھر بھی ویڈیو اور سی ڈی کی دکانوں پر بے شمار پرانی اور یادگار فلمیں دستیاب ہو جاتی ہیں۔ دیکھیے اور پاکستانی فلموں کے درخشاں دور کو یاد کیجیے۔

جاری ہے

کولمبس ہی کیوں؟

مریم کے خان

امریکا کی دریافت کا سہرا کولمبس کے سر باندھا جاتا ہے لیکن یہ ایک جھوٹ ہے، بہت بڑا جھوٹ۔ اس جھوٹ کے پیچھے ایسی کیا بات ہے؟ کیوں یہ بات مشہور کی گئی، تحقیق کے متلاشیان کے لیے بطور خاص لکھی گئی تحریر۔

کرسٹوفر کولمبس کے احوال زیست کی ہلکی سی جھلک

جب موجودہ امریکی صدر اوباما کے آبا و اجداد کینیا کے جنگلوں میں بہت سادہ سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ تب آج سے کوئی پانچ سو سال پہلے کرسٹوفر کولمبس نے ہندوستان کا بحری راستہ تلاش کرنے کے ارادے سے یورپ کے مغرب کی طرف سمندر میں قدم رکھا تھا۔ اس وقت اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایک نیا براعظم دریافت کرنے جا رہا ہے۔ ایک طویل اور جوکھم بھرے سفر کے بعد وہ شروع میں چند جزائر تک پہنچنے میں کامیاب رہا تھا۔ وہاں موجود افراد کو اس نے سرخ ہندی قرار دیا تھا۔ اس کے خیال میں وہ ہندوستان کے ابتدائی جزائر تک پہنچ گیا تھا۔

پھر اس نے مزید سفر کیے اور آنے والے دو عشرے تک وہ مزید جزائر اور زمینیں دریافت کرتا رہا تھا۔ حتیٰ کہ آخری سفر میں وہ براعظم جنوبی امریکا کی سرزمین تک پہنچنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس کے خیال میں یہی ہندوستان کی سر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زمین تھی۔ لیکن ان سفروں کے دوران اور سالوں وہاں رہنے کے باوجود اسے کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس کے لیے ہندوستان مشہور تھا اور اہلِ یورپ وہاں تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھے۔ نہ شان و شوکت اور نہ دولت کی ریل پیل، اس کے بجائے یہاں جزائر اور براعظم پر وحشی اور نیم وحشی قبائل آباد تھے۔ جو سوائے سونے اور چاندی کے کسی دھات سے واقف نہیں تھے۔ ان کو لباس بُننا نہیں آتا تھا اور ان کو گندم اور کپاس کے بارے میں کچھ نہیں پتا تھا۔ ان کی زبان غیر تحریری تھی اور وہ بہت محدود قسم کے ذخیرہ الفاظ رکھتی تھی۔ ان سے زیادہ متمدن تو اہلِ یورپ تھے۔

کرسٹوفر کولمبس کی ذہنی سطح کا اندازہ کریں کہ وہ مرتے دم تک یہی سمجھتا رہا کہ اس نے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا ہے۔ حالانکہ یورپ کے شاہی درباروں میں وہ ہندوستان سے آنے والی چیزوں اور دستکاریوں کو دیکھ چکا تھا۔ دوسرے ابھی وحشی ایشیائی عیسائیوں کے ہاتھوں ایشیا کی مسلم تہذیب مکمل طور پر فنا نہیں ہوئی تھی اور پورے ایشیا میں اس کے اثرات اور ظاہرات جا بجا اس طرح پھیلے ہوئے تھے کہ کوئی اندھا ہی ان سے نظر چرا سکتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ کیا کولمبس نے ان اثرات پر ذرا بھی غور نہیں کیا تھا؟ کیا اسے مسلمانوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا؟ کیا اسے یہ علم بھی نہیں تھا کہ ہندوستان پر اس وقت مسلمانوں کی حکومت تھی اور منگولوں کے تباہ کن حملوں میں بغداد اور سلطنتِ خوارزم کی تباہی کے بعد یہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست بن گئی تھی؟ اسے معلوم نہیں تھا کہ ہندوستان میں بیک وقت ایک درجن سے زیادہ اعلیٰ زبانیں موجود تھیں جن میں دنیا کا بہترین ادب موجود تھا؟ اسے معلوم نہیں تھا کہ ہندوستان کے کاری گر ایسا کپڑا بُنتے تھے جو اہلِ یورپ نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا؟ ہندوستان میں لوگ دنیا کی ہر دھات کا استعمال کمالِ مہارت سے کرتے تھے۔

اسلامی تہذیب کا معمولی سا مشاہدہ ہی یورپ والوں کی آنکھ کھولنے کے لیے کافی ہوتا تھا اور کرسٹوفر کولمبس نے تو سالوں اسپین میں قیام کیا تھا۔ جب وہ ملکہ ازابلا اور شاہ... فرڈی نینڈ کے دربار میں ہوتا تھا تو اس وقت بھی بے شمار مسلمان اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ کیا کولمبس نے ان کو نہیں دیکھا تھا؟ اس کے باوجود وہ امریکا کی سرزمین کو ہندوستان سمجھنے کی فاش غلطی کس طرح کر بیٹھا تھا؟ کیا واقعی کرسٹوفر کولمبس اتنا ہی سادہ اور معصوم شخص تھا یا اس ساری کہانی کے پیچھے کوئی اور کہانی ہے۔ ممکن ہے تاریخ ہمیں جس طرح بتائی جا رہی ہے وہ واقعی ویسی نہ ہو۔ اصل تاریخ کچھ اور ہو جسے جان بوجھ کر گم کر دیا گیا ہو۔

کولمبس سے کہیں پہلے مشرق کا سفر کرنے والے مارکو پولو نے مشرق اور مسلمانوں کے بارے میں اس سے کہیں زیادہ معلومات دی تھیں اور ان میں سے بیشتر درست ثابت ہوئی تھیں اس کے باوجود اٹلی کے جہلا نے اسے دنیا کے سب سے بڑے جھوٹے کا خطاب دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں کرسٹوفر کولمبس نے نئی دنیا کے بارے میں غلط معلومات کی بھرمار کر دی تھی۔ اس نے تمام زمینی حقائق اور ہندوستان کے بارے میں دستیاب معلومات نظر انداز کر کے اپنی دریافت کی ہوئی سرزمین کو ہندوستان قرار دے دیا تھا۔ حالاں کہ اس نو دریافت شدہ سرزمین اور اس وقت کے ہندوستان میں ذرا سی بھی مماثلت نہیں تھی۔ ذرا اندازہ کریں کہ جس وقت ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کو چھوڑیں دور دراز کے ہندو راجے بھی عالی شان عمارتیں بنوا رہے تھے اور انہوں نے ایسے قلعے بنا لیے تھے جن کو فتح کرنے کے لیے سالوں درکار تھے۔ جو اس وقت دنیا میں دریافت شدہ تمام دھاتیں اور عناصر مہارت سے استعمال کرتے تھے۔ ہندوستان کا کاریگر ..... برتنوں سے لے کر کپڑوں تک میں ایسی کاریگری دکھاتے تھے کہ یورپ سے آنے والے انگریز بھی انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ ان کو اپنی صنعتوں کا مال کھپانے کے لیے مقامی صنعت کاروں کو تباہ کرنا پڑا تھا۔ جس وقت انگریزوں نے بنگال پر قبضہ کیا تو وہاں کے کپڑا بُننے والے ایسا ململ بناتے تھے جس کا ایک تھان انگوٹھی سے گزر جاتا تھا۔ اور یہ کولمبس کے دور سے زیادہ دُور کی بات نہیں ہے۔ ہندوستان اس وقت فنون اور حرفت کا مرکز تھا۔

اس داستان کو آگے بڑھانے سے پہلے کرسٹوفر کولمبس کے بارے میں بات ہو جائے کیونکہ اس داستان کا مرکزی کردار وہی ہے۔ کولمبس اٹلی کے ساحلوں پر آباد ایک چھوٹی سے ریاست جنیوا میں پیدا ہوا۔ واضح رہے کہ اس جنیوا کا سوئیٹزرلینڈ کے جنیوا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ آج کا جنیوا صرف ایک شہر ہے اور اٹلی کا جنیوا ایک آزاد اور خود مختار ریاست تھی۔ یہ ساحلی ریاست اپنے وجود کی حفاظت کے لیے بحریہ کی محتاج تھی یہی وجہ تھی کہ چند لاکھ کی آبادی والی اس ریاست کے پاس نہایت طاقت ور بحریہ تھی اور ریاست کے بیشتر وسائل

بحریہ کے لیے مخصوص تھے۔ یہاں کے اکثر نوجوان اپنا کیریئر جہاز رانی سے شروع کرتے تھے۔ بارہ تیرہ سال کے لڑکے کسی بحری جہاز پر ملازمت حاصل کر لیتے تھے یا ان کو صرف روٹی کپڑے کے عوض بھی رکھ لیا جاتا تھا۔ غربت اور فاقوں سے تنگ آئے لوگ صرف کھانے اور پہننے کے بدلے میں اپنے لختِ جگر جہاز رانوں کے سپرد کر دیا کرتے تھے۔

جہاز راں ان کم عمر بچوں سے جان توڑ مشقت کے علاوہ وہ سارے کام لیتے..... جو خطرناک ہوتے تھے۔ جیسے جنگوں کے دوران یہ بچے توپ کے گولے اور بارود کو لانے لے جانے میں استعمال کیے جاتے تھے۔ اسی طرح لڑائی کے دوران جنگجوان کو ڈھال کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس سخا کی کی وجہ سے بیشتر بچے جوانی کی عمر کو پہنچنے سے پہلے مارے جاتے تھے یا زخمی ہو کر معذور ہو جاتے تھے۔ جو بچتے تھے وہ بیس بائیس سال کی عمر میں پختہ کار جہاز راں اور جنگجو بن جاتے تھے۔

یورپ میں سلطنتِ روما کے زوال کے بعد پورا یورپ چھوٹے چھوٹے ملکوں میں بٹ گیا تھا اور خاص طور سے ساحلوں کے ساتھ بے شمار ریاستیں وجود میں آ گئی تھیں جن کی بقا کا دارومدار ان کی بحری طاقت پر تھا۔ اب بحری طاقت برقرار رکھنے کے لیے وسائل کا بڑا حصہ اس شعبے پر خرچ کیا جاتا تھا اور اس کی واپسی کے لیے بحریہ کو قزاقی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اس میں کوئی تعجب نہیں ہے کہ اس زمانے میں قزاقی سرکاری طور پر کی جاتی تھی اور اسے جرم نہیں بلکہ حق سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں جہاز راں ہونے کا مطلب قزاق ہونا بھی تھا۔ جنیوا کی ریاستی بحریہ بھی اس کام میں شامل تھی اور اس کے بحری جہاز افریقہ کے ساحلوں تک قزاقی کرتے تھے اور ان کا مرغوب نشانہ مسلمانوں کے بحری جہاز تھے جو پورے افریقا اور شام کے ساحل کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ مال و دولت کے علاوہ ان جہازوں سے مسافر بھی مل جاتے تھے جن کو غلام بنا کر فروخت کر دیا جاتا تھا۔

جنیوا کی بندرگاہ پر جب لوٹ کے مال سے بھرے بحری جہاز لنگر انداز ہوتے تھے تو اہلِ شہر میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی کیونکہ ان کی معیشت کا دارومدار ہی قزاقی پر تھا۔ ریاست کی اپنی کوئی پیداوار نہیں تھی اور سب باہر سے آتا تھا اس لیے بے تابی سے انتظار کرتے تھے کہ کب بحری جہاز آئیں گے اور ان کی ضرورت کا سامان آئے گا۔

کرسٹوفر کولمبس نے اس ماحول میں آنکھ کھولی اور

> ایک محفل میں دہلی اور لکھنؤ، دونوں مقامات کے اہلِ فن جمع تھے۔ علامہ اقبال کی نوعمری کے دن تھے۔ انہوں نے یہ شعر پڑھا، جو بے حد پسند کیا گیا۔
>
> موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
> قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے
>
> ان اہلِ فن نے اقبال کو دہلی یا لکھنؤ کسی ایک جگہ کی حمایت پر آمادہ کرنا چاہا۔ علامہ اقبال نے انہیں مقطع سُنا کر لاجواب کر دیا۔
>
> اقبال لکھنؤ سے نہ ہوتی سے بے غرض
> ہم تو اسیر ہیں خمِ زُلفِ کمال کے

شعور کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اس نے جان لیا تھا کہ اس دنیا میں اخلاق اور اصولوں کی کوئی اہمیت نہیں اگر اہمیت ہے تو دولت اور طاقت کی ہے۔ بلکہ اصل اہمیت طاقت کی ہے کیونکہ دولت بھی اس سے ملتی تھی۔ وہ ابھی دس سال کا تھا کہ اس نے بندرگاہ کے چکر لگانے شروع کر دیے تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے کام مل جائے لیکن کام کے لیے وہ ابھی بہت کم عمر تھا۔ کولمبس کا باپ ایک درزی تھا اور اس کی ماں بھی کام کرتی تھی تب اس کا اور اس کے نصف درجن سے زیادہ بہن بھائیوں کا پیٹ بھرتا تھا۔ خوراک نہایت مہنگی اور کم یاب تھی کیونکہ باہر سے آتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کولمبس اور اس کے بہن بھائیوں کو بھوکا سونا پڑتا تھا۔ اس کا ذکر اس نے اپنی بعض دستاویزات میں کیا ہے۔ کولمبس کا پس منظر نہایت غریبانہ اور معمولی تھا۔ دولت کے علاوہ وہ خاندان کے لحاظ سے بھی ممتاز نہیں تھا یعنی وہ ہر لحاظ سے سیلف میڈ انسان تھا۔

بھوک سے تنگ آ کر دوسرے بچوں کی طرح کولمبس بھی بندرگاہ کی طرف نکل جاتا تھا جہاں ان کو کھانے کو کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ جہازوں سے سامان اُترنے کے دوران اناج کا کچھ حصہ گر جاتا تھا یہ بچے وہی چن کر کھا لیتے تھے، اس طرح ان کو چھوٹی موٹی مزدوری کا کام بھی مل جاتا تھا اور اس کے عوض ایک دو سکے مل جاتے جس سے وہ اپنا پیٹ بھر لیتے تھے۔ مگر ایسا ہر روز نہیں ہوتا تھا اوّل تو بحری جہاز روز نہیں آتے تھے اور لازمی نہیں تھا کہ ہر بحری جہاز پر کھانے کا سامان ہو۔

پیٹ کھانے کو جتنا مانگتا تھا بہت کم خوش نصیبوں کو اتنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملتا تھا اور فاقے کرنے والوں میں کولمبس بھی شامل تھا۔ وہ رشک سے ان لڑکوں کو دیکھتا تھا جو کسی بحری جہاز پر ملازم تھے اور تین وقت پیٹ بھر کر کھاتے تھے۔ کولمبس کو اس بات کی پروا نہیں تھی کہ تین وقت کے کھانے کے عوض ان کی زندگیاں جہاز رانوں نے گروی رکھوالی تھیں۔ اسے اس کی پروا نہیں تھی کہ ان میں سے کم لڑکے جوانی کی عمر کو پہنچتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ اسے کسی بحری جہاز پر ملازمت مل جائے۔

لیکن اس کی خواہش پوری ہونے میں دو رکاوٹیں تھیں اوّل تو اس کی صحت کمزور تھی اور دوسرے وہ ابھی دس سال کا تھا۔ جہاز راں کم سے کم بارہ سال کے لڑکے بھرتی کرتے تھے اور ان میں بھی مضبوط جسموں والوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ کولمبس کا قد تو نمایاں تھا لیکن جسم پر گوشت نہ ہونے کے برابر تھا۔ گوشت ہوتا بھی کہاں سے جب کہ اسے ہفتے میں ایک دو بار ہی پیٹ بھر... کھانا ملتا تھا۔ بہر حال بندرگاہ کا چکر لگانے سے اسے پہلے کے مقابلے میں کھانے کو زیادہ ملنے لگا تھا۔ گرا ہوا اناج اور دوسری چیزوں کے ساتھ کبھی کبھی مزدوری مل جاتی تو اس کے وارے نیارے ہو جاتے تھے۔

خدا خدا کر کے اس کی زندگی میں وہ وقت آیا جب اسے ایک معمولی سے بحری جہاز پر بھرتی کر لیا گیا۔ لیکن اس کے لیے یہ دنیا کی بادشاہی سے بھی زیادہ تھا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور اس نے اس ڈر سے یہ بات اپنے ماں باپ کو نہیں بتائی کہ کہیں وہ اسے بھرتی ہونے سے نہ روک لیں۔ حالانکہ ماں باپ تو کوشش کرتے تھے کہ ان کے لڑکوں کو کسی بحری جہاز پر کام مل جائے اور ان پر سے اُن کا بوجھ ختم ہو۔ پھر بھی کولمبس کو ڈر لگا تھا۔ اس نے اپنے ماں باپ کو بے خبر رکھا اور جب تک وہ اپنے اوّلین بحری سفر سے واپس نہیں آ گیا اس کے ماں باپ کو پتا نہیں چلا تھا۔

یورپ میں پندرھویں صدی تک تعلیم کا رواج نہیں تھا۔ عام افراد ایک طرف رہے بادشاہ اور امرا تک اَن پڑھ ہوتے تھے۔ کلیسائی نظام میں تعلیم ایک بدعت تھی جو مسلمانوں کی ایجاد تھی اس لیے اس سے گریز کرنا لازمی تھا۔ سوائے بائبل کے کوئی کتاب پڑھنا ممنوع تھا اور سوائے یونانی اور لاطینی کے باقی زبانوں میں پڑھنا بھی منع تھا۔ اسکول اور کالج نہ ہونے کے برابر تھے۔ روشن خیال لوگ بہت چھپ چھپا کر اپنے بچّوں کو تعلیم دلاتے تھے۔ ایسے میں کولمبس جیسے غریب لڑکے کو پڑھنے کا موقع کہاں سے ملتا؟

صرف ایک جہاز رانی کا شعبہ ایسا تھا جس میں پڑھے لکھے افراد موجود تھے اور یہ مجبوری تھی کیونکہ بنا تعلیم اور خاص طور سے ریاضی سے واقفیت کے بغیر جہاز رانی کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ پھر جہاز رانوں کو نہ صرف کئی زبانیں لکھنا اور بولنا بھی ضروری تھا کیونکہ ان کو کئی جگہوں پر جانا ہوتا تھا اور اگر ان کو کئی زبانیں نہیں آتی تھیں تو ان کے لیے دوسروں سے تعلقات بنانا ممکن نہیں رہتا تھا۔ اس لیے جہاز راں تعلیم حاصل کرتے تھے۔

لازمی بات ہے جب کولمبس کو بحری جہاز میں ملازمت کرتے ہوئے کئی سال ہو گئے تو اس نے بہت کچھ سیکھ لیا... ہوگا۔ اطالوی اس کی مادری زبان تھی۔ اس کے علاوہ اسے لاطینی بھی آ گئی تھی۔ یورپ کے دوسرے ساحلی علاقوں میں بولی جانے والی بڑی زبانیں جیسے فرانسیسی، اسپینش اور پرتگیزی زبان میں بھی اسے اچھی دسترس حاصل ہو گئی تھی۔ یہ زبانیں بعد میں درباری مواقعوں پر اس کے بڑے کام آئی تھیں جب وہ بنا کسی ترجمان کے کسی بادشاہ سے اس کی زبان میں بات کرتا تو اس کے دل میں جگہ حاصل کر لیا کرتا تھا۔

زبانوں کے علاوہ کولمبس نے ریاضی اور بحری علوم میں دسترس حاصل کی، خاص طور سے اس نے بحری راستے جاننے والے آلات کا استعمال سیکھا۔ ان میں قطب نما اور اصطرلاب جیسے اہم آلات شامل تھے۔ کہتے ہیں کہ جوانی کی عمر کو پہنچنے تک کولمبس نے مسلم بحری ماہروں سے براہِ راست تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ کئی بار اٹلی سے ذرا ہی دور سسلی کے جزیرے تک گیا تھا جس پر ان دنوں مسلمان قابض تھے۔ مشہور بحری نقشہ نویس اور ماہرِ بحریات شریف ادریسی کا تعلق اسی جزیرے سے تھا۔ کولمبس نے وہاں سے یقیناً بہت کچھ سیکھا تھا۔ بہت کم عمری میں کئی مشکل علوم میں کولمبس کی مہارت اس کی فطری ذہانت کی دلیل تھی۔

ایک طرف کولمبس تعلیم حاصل کر رہا تھا تو دوسری طرف اس کے دل میں یہ ارمان انگڑائی لے رہا تھا کہ وہ بھی کوئی ایسی دریافت کرے یا کوئی ایسا سفر کرے جو اسے مشہور کر دے۔ اس نے مارکو پولو کی سرگزشت حیات پڑھی تھی۔ یہ ان دنوں یورپ میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب تھی۔ اس کتاب نے کولمبس کو مشرق کے رومان میں مبتلا کر دیا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ وہ بھی ایسا کوئی سفر کرے۔ کولمبس نے اصل میں چین کا سفر کیا تھا اور واپسی کے سفر میں وہ ایک منگول شہزادی کو ایران پہنچانے کے لیے سمندری راستے سے

ہندوستان پہنچا تھا اس طرح اس نے ہندوستان بھی دیکھ لیا تھا۔ مگر چین کی طرح اس نے ہندوستان پر بھرپور تحقیق نہیں کی تھی۔ صرف سرسری سا جائزہ پیش کیا تھا۔ شاید اسی وقت کولمبس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان کی طرف سفر کرے گا۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ اس وقت وہ پُریقین ہو کہ اگر وہ مغرب کی طرف سفر کرے گا تو بالآخر مشرق میں ہندوستان جا نکلے گا۔ لیکن جیسے جیسے اس کی معلومات بڑھتی گئیں اور اسے مسلم جہاز رانوں سے میل جول کا موقع ملا تو اسے احساس ہونے لگا کہ مغرب کی طرف ایک اور بڑی سرزمین ہے جو شاید ہندوستان سے بھی زیادہ بڑی ہے اور اب تک دنیا کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔

اس وقت کولمبس نے منصوبہ بنایا کہ وہ اس سرزمین کی طرف جائے گا اور اس کی دریافت کا سہرا اس کے سر بندھے گا۔ جب اس نے یہ فیصلہ کر لیا اس نے نئی دنیا کے بارے میں اپنے ہونٹ سی لیے اس نے رازداری کو اپنے اوپر اتنی سختی سے لاگو کیا کہ کسی ایک فرد نے اس کے منہ سے نہیں سنا کہ وہ ہندوستان نہیں بلکہ ایک نئی دنیا کی تلاش میں جا رہا ہے۔ اس نے اپنی کسی دستاویز میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ حد یہ کہ مرتے دم تک وہ دریافت ہونے والے براعظم کو ہندوستان کہتا رہا تھا۔ اس معاملے میں اس کی استقامت حیرت انگیز تھی۔ اسے معلوم تھا کہ تاریخ خود اس کی غلطی دور کر کے اسے اس دنیا کا دریافت کرنے والا تسلیم کر لے گی اور ایسا ہی ہوا۔

جب کرسٹوفر کولمبس نے تمام ضروری معلومات حاصل کر لیں اور اس نے محسوس کیا کہ اب وہ اس قابل ہے کہ کسی بھی سمندر میں سفر کر سکے تو اس نے اپنا منصوبہ لے کر یورپ کے ان درباروں کا رُخ کیا جو بحری مہم جوئی کی باقاعدہ سرپرستی کرتے تھے۔ ان میں سب سے اہم ملک پرتگال تھا۔ پرتگال بحراوقیانوس کے ساتھ اسپین سے جڑا ہوا ملک ہے۔ پرتگالی شروع سے ایک مہم جو قوم رہی ہے اور اس کی بحری تگ و تاز کی اس وقت بھی دھوم تھی۔ واضح رہے کہ افریقا کے اوپر سے چکر لگا کر ہندوستان تک کا بحری راستہ دریافت کرنے والا واسکوڈی گاما ایک پرتگالی مہم جو تھا۔ کولمبس اس امید کے ساتھ پرتگال پہنچا کہ اس کا منصوبہ منظور کر لیا جائے گا اور اسے مطلوبہ وسائل مہیا کر دیے جائیں گے۔ مگر اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اپنی صلاحیتوں سے کولمبس نے خاصی دولت کمائی تھی لیکن وہ اس مہم کے لیے بہت کم تھی اسے کسی دربار کی سرپرستی کی ضرورت تھی۔ مگر اسے ہر جگہ سے

ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ

موسم سرما کی طویل راتیں
دسمبر 2011ء کے شمارے کی زینتیں

خود کردہ / نشور ھادی
کچھ پانے کے لیے سب کچھ تیاگ دینے والے شخص کی حیرت انگیز کتھا

للکار / طاھر جاوید مغل
عمران اور تابش کے امتحان کی گھڑیاں
لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتی داستان کی سحر انگیزیاں

گرداب / اسما قادری
حالات و واقعات کے گرداب میں گرفتار
ماہ بانو کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ

سرورق
سانحۂ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھی گئی ایک دل گداز کہانی، سلیم فاروقی کے قلم سے پہلا رنگ
دوست و دشمن کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن جانے والی دوشیزہ کی سنسنی خیز داستان منظر امام کی کاوش

جرم کتھائیں
ہر جرم کے پیچھے کوئی نہ کوئی واقعہ مضمر ہوتا ہے...... انہی تغیرات سے جنم لینے والی...... ناقابل فراموش کہانیاں

چینی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے ... مشورے ... محبتیں ... شکایتیں ... اور نئی نئی دلچسپ باتیں ... آپ کے قلم سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مایوسی ملی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے اس نے اپنی آبائی ریاست میں کوشش کی ہو مگر اسے وہاں سے بھی جواب مل گیا تھا۔ اٹلی ویسے بھی سخت گیر کیتھولک عیسائی گرفت میں تھا جہاں مسلمانوں سے کسی قسم کا میل جول خارج از امکان تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کولمبس کو دور دراز کے درباروں کا رُخ کرنا پڑا۔ طویل عرصے تک کولمبس ناکامی کے تھپیڑے کھاتا رہا۔ لیکن اس دوران میں اس نے اپنے منصوبے کو مزید بہتر بنالیا تھا۔ اس نے بحرِ اوقیانوس کے ساحلوں کے ساتھ سفر کرکے اس سمندر کے مزاج کا اندازہ بھی کرلیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنی منزل تک ضرور پہنچے گا۔

اب ضرورت صرف اتنی تھی کہ کوئی دربار اس کے سفر کا بوجھ اُٹھالے۔ کولمبس بڑی خوشی سے اس دریافت کو اس دربار کے سپرد کرنے کے لیے تیار تھا۔ اسے تو تاریخ میں اپنا نام درکار تھا۔ دولت اور عہدے تو بہت سارے لوگوں کو مل جاتے ہیں لیکن ان میں سے تاریخ کے دھندلکوں میں ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتے ہیں۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ کولمبس کو صرف نام ملا اسے جو دولت اور عہدے ملے وہ اس سے چھن گئے۔ اس کا خاندان نیست و نابود ہو گیا۔ حد یہ کہ وہ کہاں مرکر کہاں دفن ہوا یہ بھی کسی کو نہیں معلوم۔ مگر اس کا نام تاریخ میں یوں زندہ ہے کہ دنیا میں شاید وہ سب سے زیادہ جانی پہنچانی شخصیات میں سے ایک ہے۔ یہ اس لحاظ سے اور بھی حیرت انگیز ہے کہ اس شخص کا آغاز اور انجام یقینی طور پر کسی کو نہیں معلوم۔

کرسٹوفر کولمبس کے لیے اسپین اور فرڈی ننڈ اور ملکہ ازابیلا کا دربار نیا نہیں تھا لیکن اسے اپنی بات ان تک پہنچانے میں اور پھر اپنی بات منوانے میں بہت وقت لگا تھا۔ پورے دو عشرے کی جدوجہد کے بعد کولمبس اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اور اسے سفر کے لیے وسائل اور افرادی قوت مل گئی۔

بہت مزے کی بات ہے کہ کرسٹوفر کولمبس سے کہیں زیادہ مسلمانوں کو جاننے والے اسپین کے عیسائی بھی نو دریافت جزائر اور... براعظم کو ہندوستان سمجھ رہے تھے یا انہوں نے کم سے کم کرسٹوفر کولمبس کو ایسا ہی تاثر دیا تھا۔ اسپین کی حکومت کے رویّے سے تو ایسا ہی لگتا ہے کہ اس نے کولمبس کو استعمال کیا تھا اور جب اس سے کام نکل گیا تو اسے دودھ سے مکھی کی طرح نہیں نکالا بلکہ اُٹھا کر جیل میں ڈال دیا۔ اسے ان سفروں سے جو ذاتی دولت ملی تھی وہ بھی چھین لی اور جہاں تک انعام و اکرام کا تعلق ہے تو شاہ فرڈی ننڈ جو اسپین کا سب سے بڑا عیسائی حاکم تھا اس نے کولمبس سے سرِ دربار کیے وعدے پوری ڈھٹائی سے توڑ دیے اور اسے منہ مانگا انعام دینے سے انکار کردیا۔ اپنی آخری عمر میں کولمبس اتنا نادار اور غیر معروف ہو گیا تھا کہ اس کے بارے میں یہی نہیں معلوم کہ اس کا انتقال کہاں ہوا تھا اور اس کا جائے مدفن کہاں ہے؟ یورپ کے چھ ملک اور گیارہ سے سترہ شہر اس کے جائے مدفون کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ ایک عجائب گھر میں اس کی غیر مصدقہ کھوپڑی بھی سجی ہوئی ہے اور اس کی بعض قبروں میں صرف ایک ہڈی ہے۔ اتنا بڑا اور اہلِ یورپ کے لیے بیش بہا کارنامہ انجام دینے والی ہستی کو تاریخ نے اتنی بے دردی سے فراموش کردیا کہ عجب ہوتا ہے۔ یہ اہلِ یورپ کا شیوہ نہیں ہے، وہ تو اپنے معمولی سے معمولی ہیرو کو اور اس کے کارناموں کو تاریخ میں محفوظ رکھتے ہیں۔ یہی نہیں وہ اس کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ ایسے مورخوں نے بھی کرسٹوفر کولمبس کو نظر انداز کردیا۔

اپنے تاریخی کارنامے کے باوجود اسپین میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور کیوں کہ وہ ایک غیر ملکی تھا (اس کا تعلق اٹلی سے بتایا جاتا ہے اگرچہ یہ بھی مصدقہ نہیں ہے) اس لیے جب اس سے اس کا سب چھین لیا گیا اور اس کے خاندان سے نئی دنیا کے جزائر اور زمینوں کی حکومت بھی چھین لی گئی تو پورے اسپین میں اس کا کوئی حامی نہیں رہا تھا۔ اسپین والوں نے کم ظرفی کی انتہا کرتے ہوئے اسے مکمل طور پر فراموش کر دیا۔ اور بعد میں نئی دنیا میں نہ تو اس کی کوئی یادگار قائم کی اور نہ اس کے نام سے کسی علاقے کو موسوم کیا۔ اس کے مقابلے میں ایک کہیں معمولی درجے کے جہاز راں امریگو نے جب شمالی امریکا دریافت کیا تو اس براعظم کو فوری طور پر اس کے نام سے موسوم کردیا گیا۔ ذرا تاریخ کا انتقام دیکھیے کہ دن میں سیکڑوں بار لفظ امریکا دُہرانے والے بھی اس امریگیم کے بارے میں کچھ نہیں جانتے..... جبکہ کولمبس کا نام آج کی جدید دنیا کا بچہ بچہ جانتا ہے۔

کولمبس کے بارے میں ہمیں جو معلوم ہوتا ہے وہ زیادہ تر اسپین کے مورخوں سے ملتا ہے۔ اس کے اپنے کچھ کاغذات ہیں اور کچھ اس کے ساتھیوں سے معلوم ہوا ہے۔ لیکن ان معلومات سے اس کی جو تصویر بنتی ہے وہ نہایت عجیب اور غیر منطقی سی لگتی ہے۔ ایک ایسا شخص جس نے دنیا کے دوسرے بڑے سمندر میں نامعلوم سمت میں سفر کرنے کی جرأت کی اور جس نے نئی دنیا کو دریافت کیا۔ لیکن دوسری

طرف وہ ساری عمر اس مغالطے میں رہا تھا کہ اس نے ہندوستان دریافت کیا ہے۔

جب ہم اس کے اس مغالطے کو دیکھتے ہیں تو کرسٹوفر کولمبس نہایت معمولی ذہن کا آدمی نظر آتا ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی تسلیم کرنے والی نہیں ہے کہ کوئی چھوٹی سوچ والا اور محدود ذہن کا حامل شخص ایسا منصوبہ سوچے اور پھر اس خوف ناک سفر پر روانہ ہونے کی جرأت کرے جس کا انجام بھی معلوم نہ ہو۔ کرسٹوفر کولمبس کی جب یہ تصویر جوڑی جاتی ہے تو اس میں جا بہ جا تضاد واضح نظر آتے ہیں۔ کیا یہ تضاد تاریخ کو مسخ کرنے کی وجہ سے ہیں یا آج کا مورخ اس کے بارے میں مبالغہ آمیز بات کرتا ہے۔ سچ کیا ہے، کولمبس کو اس کے کارناموں سے کم تر دکھایا جارہا ہے یا اس نے جو کیا اسے کہیں بڑھا چڑھا کر پیش جارہا ہے۔ شاید یہ دونوں ہی کام ہو رہے ہیں۔ مورخوں کا ایک گروہ اسے بڑھا چڑھا کر پیش کررہا ہے اور دوسرا گروہ اسے نظر انداز کررہا ہے۔ امریکا کو اس کی دریافت قرار دینا سب کی مجبوری ہے کیونکہ یہ ایسا اعزاز ہے جو تاریخ مسخ کرنے والے بھی اس سے چھین نہیں سکے تھے۔ لیکن انہوں نے اسے ایک ایسا کم ذہن شخص بنا کر پیش کیا جو اپنی زندگی کے آخری لمحے تک یہی سمجھتا رہا تھا کہ اس نے ہندوستان دریافت کیا ہے۔

آیئے دونوں پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں۔ اگر کرسٹوفر کولمبس اتنا ہی ذہین تھا کہ اس نے ایک انوکھا خیال پیش کیا اور پھر اس پر عمل درآمد کا طریقہ کار بھی واضح کر کے بتایا۔ جب اس نے ملکہ ازابیلا تک رسائی حاصل کی تو اس کا منصوبہ مکمل تھا اور وہ کئی سال سے اسے لے کر یورپ کے مختلف درباروں میں گھوم رہا تھا۔ ان میں پرتگال سے لے کر سسلی تک کئی دربار تھے مگر کسی نے اس کے منصوبے پر توجہ نہیں دی تھی۔ یہ ملکہ ازابیلا تھی جس نے اس غیر معمولی سفر کے اخراجات برداشت کرنے کی ہامی بھری تھی اور اسے ہر ممکن مدد کی یقین دہانی کرائی تھی۔

ان دنوں یہودیوں پر تحقیق کرنے والے یہ خیال بھی پیش کررہے ہیں کہ کرسٹوفر کولمبس کی مدد اور حمایت میں اسپین کے یہودی بھی پیش پیش تھے کیونکہ ان کو معلوم تھا جیسے ہی اسپین کے عیسائی مسلمانوں سے فارغ ہوں گے تو ان کا نمبر آجائے گا۔ اس وقت یہودی یورپ میں دوسرے درجے سے بھی نیچے کی کوئی مخلوق تھے اور ان سے امتیازی سلوک کیا جاتا تھا۔ ہر عیسائی ملک میں ان کو ذلیل کیا جاتا تھا اور ان کا قتلِ عام اور بربادی مذہبی فریضہ تھی۔ صرف ایک اسپین ایسا ملک تھا جہاں مسلمانوں کے زیرِ سایہ وہ سکون سے رہ رہے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کی حکومت ختم کرنے میں عیسائیوں کی ہر ممکن مدد کی تھی۔ جنگوں کے لیے پیسا زیادہ تر یہودی فراہم کرتے تھے اور ساری عیسائی فوج کا خرچ یہی لوگ اُٹھا رہے تھے اور جب عیسائی حکومت میں آگئے تو انہوں نے آنکھیں بدل لی تھیں۔ اب یہودیوں کے لیے وقت آگیا تھا کہ وہ اپنا کیا دھرا بھگتیں۔ اس لیے انہوں نے کرسٹوفر کولمبس کو مالی امداد فراہم کی تاکہ وہ ان کے لیے ایک نئی دنیا دریافت کرسکے۔ ممکن ہے اس قصے میں حقیقت نہ ہو لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ آج یہ نئی دنیا یہودیوں کے قبضے میں ہے۔

کرسٹوفر کولمبس اتنا ذہین آدمی تھا یا اس کے پاس ایسا کوئی منصوبہ ضرور تھا جس کی وجہ سے یہودیوں نے اس پر سرمایہ لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ پیسا خرچ کرنے کے معاملے میں یہودی کیا سوچ رکھتے ہیں۔ جب تک ان کو کئی گنا واپسی کا یقین نہیں ہوتا ہے وہ کسی کام پر پیسا نہیں لگاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ پیسا لگانے کے لیے تیار ہو گئے تھے تو اس کا مطلب ہے کہ ان کو کولمبس کی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ اس سے ہم یہ مراد لے سکتے ہیں کہ کولمبس کا منصوبہ مکمل تھا۔ اس کے پاس ایسی معلومات تھیں جن کی مدد سے وہ اگلے آدمی کو قائل کرسکتا تھا ساتھ ہی اس کا منصوبہ منطقی لحاظ سے بھی سمجھ میں آنے والا تھا اور جب وہ کسی کو اس کے بارے میں بتاتا تو اگلے کو بھی اس کی کامیابی کا یقین آجاتا تھا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ کرسٹوفر کولمبس معمولی ذہانت کا آدمی تھا اور اس کی کم علمی واضح ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کا جہاز راں ہو۔ لیکن یہ بات بالکل عیاں ہے کہ جب اس نے افریقا کے آخری جزیرے کینری سے بحرِ اوقیانوس کی وسعتوں میں قدم رکھا تو یہ اس سمت میں اس کا پہلا سفر تھا اور یہ معمولی قدم نہیں تھا۔ آج کے جدید دور میں بھی جہاز راں مکمل نقشوں اور نیوی گیشن کے آلات کے بغیر بڑے سمندروں میں سفر کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔

اس وقت تو اہلِ یورپ جہاز رانی کے معاملات میں مسلمانوں سے بھی پیچھے تھے۔ ان کے جہازوں میں جتنے بھی نقشے اور سمت معلوم کرنے کے آلات ہوتے تھے وہ سب کے سب مسلمانوں کے بنائے ہوئے ہوتے تھے۔

اس صورت میں سوال یہ ہے کہ اگر کرسٹوفر کولمبس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

احتمانہ حد تک بہادری کا ثبوت دیتے ہوئے اس سفر کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ تب بھی اس نے دوسروں کو کیسے راضی کیا تھا۔ خاص طور سے ملکہ ازابیلا کا راضی ہو جانا حیرت انگیز ترین بات ہے۔ ایک تو وہ حد درجے چالاک اور شاطر عورت تھی جس نے فرڈی ننڈ جیسے مکار کو اس طرح قابو کیا ہوا تھا کہ وہ اس کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ دوسرے وہ بے پناہ کنجوس تھی اور کسی بھی معاملے میں ایک سکہ خرچ کرتے ہوئے اس کی جان نکلتی تھی۔ وہ اپنے شوہر سے بھی اپنا حساب کتاب الگ رکھتی تھی۔ اس کی آمدنی میں سے فرڈی ننڈ ایک پیسا نہیں لے سکتا تھا۔ فرڈی ننڈ اور ملکہ ازابیلا نے مسلمانوں کے... خلاف جنگوں میں جو قرض لیا تھا وہ سب کا سب فرڈی ننڈ کو ادا کرنا پڑا تھا۔ ازابیلا خود کو صاف بچا گئی تھی۔ مگر اسی ازابیلا نے کولمبس کے منصوبے سے متاثر ہو کر اس کے سفر کے تمام اخراجات برداشت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جبکہ یورپ کے دوسرے شاہ انکار کر چکے تھے۔ ملکہ نے اس منصوبے کے لیے کھلے دل سے مدد دی تھی اور اس نے کامیابی کی صورت میں... پرکشش انعامات کا اعلان بھی کیا تھا۔

ملکہ ازابیلا اسپین کے ایک چھوٹی سی ریاست کی حکمران تھی۔ اس نے اپنے باپ سے یہ ریاست حاصل کی تھی۔ وہ بچپن سے غیر معمولی ذہین اور شاطر تھی تب ہی تو اس نے اس معاشرے میں ایک ریاست کی حکمرانی حاصل کر لی جہاں عورت کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ پھر اس نے نہایت ہوشیاری سے حکومت کی۔ اس وقت مسلم اقتدار اسپین میں آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ازابیلا مسلمانوں کی شدید ترین دشمن تھی اور اس نے اقتدار سنبھالتے ہوئے قسم کھائی تھی کہ وہ اسپین سے مسلمانوں کو نکال کر دم لے گی کہتے ہیں اس نے پادریوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے یہ قسم کھائی تھی۔ مگر اس نے بعد میں جو اقدامات کیے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی قسم میں سنجیدہ تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ اکیلے مسلمانوں سے نہیں لڑ سکتی تو اس نے شاہ فرڈی ننڈ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اس سے پہلے دونوں ریاستوں میں دشمنی تھی ازابیلا نے فرڈی ننڈ کو پیغام بھیجا کہ آؤ اپنی دشمنی کا رُخ مشترکہ دشمن کی طرف موڑ دیں۔

شاہ فرڈی ننڈ بھی مکاری میں کچھ کم نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ ایک تیر سے دو شکار کر سکتا ہے۔ ایک طرف وہ مسلمانوں کو اسپین سے بے دخل کر دے گا اور دوسری ازابیلا کی ریاست بھی اس کے اقتدار میں آجائے گی۔ مگر اس کا یہ منصوبہ اس وقت دھرا رہ گیا جب ازابیلا اس کے سامنے آئی۔ اس کے حسن نے شاہ کے ہوش اڑا دیے اور جب اس نے ازابیلا سے شادی کی درخواست کی تو اس نے چند شرائط پیش کر دیں اور شاہ نے بلا چون وچرا یہ تمام شرائط مان لیں۔ شادی کے بعد بھی وہ ایک طرح سے ازابیلا کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ بہت کم معاملات ایسے تھے جن میں فرڈی ننڈ نے ازابیلا سے اختلاف کیا اور کولمبس کا معاملہ ان میں سے ایک تھا۔ اس نے کولمبس کی مہم میں کسی قسم کا حصہ لینے سے صاف انکار کیا تو یہ ازابیلا تھی جس نے اکیلے ہی اس مہم کے تمام اخراجات برداشت کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ملکہ ازابیلا کو اس کے منصوبے کا سو فیصد نہیں تو نوے فیصد ضرور یقین تھا۔ اسی وجہ سے اس نے کولمبس کی مکمل مدد کا یقین دلایا تھا۔ یہی نہیں اس نے غیر معمولی فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے سفر کے لیے عملے کی فراہمی یقینی بنانے کے لیے ملاحوں کو تین گنا معاوضہ دینے کا اعلان کیا اس وجہ سے کرسٹوفر کولمبس کو اس سفر کے لیے عملہ میسر آیا تھا۔ ورنہ شروع میں اسے عملے کے معاملے میں بہت مشکل پیش آئی تھی۔ اور ایک وقت تو لگ رہا تھا کہ مالی وسائل اور بحری جہاز ہوتے ہوئے بھی صرف عملے کے نہ ہونے سے یہ سفر نا کام ہو جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ اسپین میں عملے کی بھرتی میں ناکامی کے بعد کولمبس نے افریقا کی شمال مغربی ساحلی پٹی سے عملہ بھرتی کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ مگر ملکہ ازابیلا نے یہ تجویز مسترد کر دی تھی۔ کیونکہ شمالی افریقا کی پٹی پر مسلمان آباد تھے اور ملکہ کسی صورت کسی مسلمان کو اس سفر میں شامل کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اس ساری داستان میں ایک بہت اہم سوال ہے کہ ملکہ ازابیلا کو کرسٹوفر کولمبس کی مہم کی کامیابی کا اتنا یقین کیوں تھا؟ کولمبس نے اسے کس طرح یہ اطمینان دلایا تھا کہ وہ ہندوستان تک رسائی حاصل کر لے گا؟ اس مضمون میں ہندوستان کا لفظ صرف اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ آج اسی بات پر یقین کیا جاتا ہے کہ کرسٹوفر کولمبس نے اصل میں ہندوستان کی سمت سفر کیا تھا۔ لیکن کیا واقعی ایسا ہی تھا؟

اس سارے معاملے میں بعض باتیں نہ صرف پرانے مورخوں نے نظر انداز کی ہیں۔ جن کی کوئی منطقی وجہ نہیں بنتی ..... بلکہ آج بھی کولمبس اور اس کے سفروں پر تحقیق کرنے والے ان کو مکمل طور پر نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔ ایک سوال تو یہ

ہے کہ مسلمانوں سے بے پناہ نفرت کرنے والی ملکہ کو آخر ہندوستان سے کیا دلچسپی تھی جہاں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ دوسرے اگر اس نے کسی مسلم ملک تک رسائی حاصل کرنا تھی تو اسپین کے ساحل سے تین میل دور ہی مسلم مملکت شروع ہو جاتی تھی۔ بحیرہ روم کی پوری افریقی پٹی مسلم ریاستوں سے بھری ہوئی تھی۔ پھر ملکہ ازابیلا اور کرسٹوفر کولمبس کو اتنا طویل بحری سفر کیوں سوجھا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ جب امریکا تک پہنچنے والے وحشی اسپینیوں کو پتا چل گیا کہ یہ ہندوستان نہیں ہے (یہ بات یقینی ہے کہ ان کو فوراً پتا چل گیا تھا) تو انہوں نے میکسیکو کا بحر الکاہل والا ساحل دریافت کرنے بعد آگے سفر کیوں نہیں کیا؟ اس طرف بہت بعد میں تقریباً دو صدیاں گزر جانے کے بعد سفر کیا گیا تھا اور یہ سفر کرنے والے اسپینش نہیں بلکہ امریکن تھے۔ کیا امریکا تک رسائی حاصل کرتے ہی ہندوستان جانے کی خواہش دم توڑ گئی تھی؟

یہ سوالات اشارہ کرتے ہیں کہ دال میں بہت کچھ کالا ہے۔ اسپین کی حکومت، کرسٹوفر کولمبس اور یورپ کے مورخین اس معاملے میں بہت کچھ چھپاتے آئے ہیں اور شاید آج بھی اس مہم سے وابستہ اصل حقائق کو چھپایا جا رہا ہے۔ آج بھی زور و شور سے ڈھول پیٹا جاتا ہے کہ کرسٹوفر کولمبس ہندوستان دریافت کرنے کے ارادے سے نکلا تھا۔ اور اس بات کو سب نظر انداز کر رہے ہیں کہ اس کا جذبہ مہم جوئی امریکا تک پہنچتے ہی کیوں سرد پڑ گیا تھا اور اس کے بعد وہ کئی سال وہاں رہا۔ لیکن اس نے آگے سفر کے بارے میں ایک بار بھی کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا۔ اس کے بجائے وہ اس سرزمین کے وسائل کی لوٹ مار اور مقامی باشندوں کے قتلِ عام میں لگ گیا تھا۔ واضح رہے کہ اس کے ساتھ جانے والوں میں وہ چھٹے ہوئے بدمعاش بھی تھے جو قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے ماہر تھے اور مختلف جرموں کی سزا میں سالوں سے جیلوں میں بند تھے۔ ان کو صرف اسی شرط پر رہائی ملی تھی کہ وہ اس سفر میں کولمبس کا ساتھ دیں گے۔ انہوں نے نئی دنیا میں پہنچ کر جو قتل و غارت گری مچائی تھی اس کی وجہ ان کی جبلت نہیں تھی بلکہ انہوں نے پہلے طے شدہ منصوبے پر عمل کیا تھا۔

کولمبس کے ساتھ جانے والے افراد میں نصف سے زیادہ تعداد مسلح سپاہیوں کی تھی اور وہ نہ صرف تربیت یافتہ تھے۔ بلکہ اس وقت کے لحاظ سے جدید ترین اسلحے سے لیس بھی تھے۔ ان کے پاس بارود تھا اور وہ اس کے استعمال سے بھی واقف تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ چند سو مسلح افراد کیا ہندوستان فتح کرنے جا رہے تھے۔؟ یقیناً نہیں کیوں اس وقت بھی ہندوستان کے بارے میں دنیا کا یہ تاثر تھا کہ سب سے بڑا ملک ہے اور اس کی طاقت اور دولت بے مثال ہے۔ اس لیے چند سو افراد کے ساتھ ہندوستان پر حملے کی تو کیا وہاں پر اپنے دفاع کا سوچنا بھی محال تھا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ چند سو افراد ہندوستان کے لیے نہیں بلکہ ایسے لوگوں کے خلاف کارروائی کے لیے جا رہے تھے جن کے بارے میں کولمبس اور اس کے سرپرستوں کو یقین تھا کہ وہ ان چند سو مسلح افراد کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔ اور بعد میں ایسا ہی ہوا۔ ان چند سو مسلح افراد نے جزائر کریبین جہاں سب سے پہلے کولمبس پہنچا تھا، مقامی قبائل میں تباہی مچا دی۔ وہ ان نہتے اور جنگ سے ناآشنا قبائل کے لیے قہر بن کر نازل ہوئے تھے۔ جس وقت کولمبس نے یہ جزائر دریافت کیے تھے تو یہاں کیوبا کو چھوڑ کر عام جزائر میں ایک لاکھ سے زیادہ لوگ آباد تھے۔ اور جب کولمبس تیسرے سفر کے دوران ان جزائر پر رکا تو یہاں مقامی آبادی فنا کے گھاٹ اُتر چکی تھی۔ ان میں سے ایک بھی فرد باقی نہیں رہا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسپین کے لوگوں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔

وحشی اسپینیوں نے ان کو صرف اپنے اسلحے سے ختم نہیں کیا تھا بلکہ وہ ان کو جان بوجھ کر ایسی بیماریوں کا نشانہ بنا رہے تھے جن کا انہوں نے کبھی سامنا نہیں کیا تھا۔ جیسے چیچک اور ہیضہ، مقامی لوگوں کا جسمانی حفاظتی نظام ان بیماریوں سے ناآشنا تھا اور وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اس لیے وہ چند سال کے اندر فنا ہو گئے۔ مقامی آبادی ختم ہو گئی تو ان کی جگہ اسپین سے آنے والے لوگ یہاں آباد ہونے لگے تھے۔

دراصل یہ اسپین کی فوجی چھاؤنیاں تھیں جہاں سے وہ دریافت ہونے والے براعظم پر حملے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس کے بعد اسپینی پہلے جنوبی امریکا پر حملہ آور ہوئے اور پھر دونوں طرف تاخت و تاراج کرتے چلے گئے تھے۔ یعنی ایک طرف تو انہوں نے موجودہ میکسیکو کی طرف پیش قدمی شروع کی اور دوسری جانب وہ جنوب کی طرف براعظم میں پیش قدمی کرنے لگے۔

مقامی قبائل ان لوگوں کا کسی صورت مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ دھاتی ہتھیاروں سے ناآشنا تھے اور پتھر اور ہڈی کے بنے ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ دوسری طرف اسپینی...

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہ صرف جدید ترین دھاتی ہتھیاروں سے مسلح تھے بلکہ ان کے پاس بارود کی صورت میں ایک خوف ناک ہتھیار موجود تھا۔ اس وقت ان کے پاس توپیں نہیں آئی تھیں۔ لیکن چند سال بعد جب یہ ہتھیار ان کے ہاتھ لگا تو اس کی مدد سے انہوں نے مقامی لوگوں پر قیامت ڈھا دی تھی۔ بے پناہ قتلِ عام اور غارت گری کا وہ طوفان اٹھا تھا کہ آج ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ انہوں نے وسطی اور جنوبی امریکا سے پوری پوری قوموں کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دیا۔

ایک طرف اسپینیوں نے پورا جنوبی امریکا قبضے میں کر لیا تھا۔ تو دوسری وہ میکسیکو اور موجودہ شمالی امریکا کے وسطی حصے تک پر قابض ہو گئے تھے۔ اس سے آگے وہ یوں نہیں جا سکے کہ یورپ کی دوسری اقوام ان کے مدِمقابل آ گئی تھیں اور انہوں نے شمالی امریکا پر اپنا حق جتاتے ہوئے اسپینیوں کو وہیں روک دیا تھا۔ آج ان ساروں خطوں میں آباد باشندوں کی اکثریت ہسپانوی نژاد لوگوں پر مشتمل ہے اور ان کی تعداد لگ بھگ چالیس کروڑ ہے۔ یہ شاید دنیا کی واحد قوم ہے جو اپنے آبائی وطن سے دس گنا زیادہ تعداد میں بیرونِ وطن پائی جاتی ہے۔ پورے جنوبی امریکا پر اسپین کی چھاپ ہے۔

پھر کتنی عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو اس قوم کی ہوس گیری کا یہ عالم تھا کہ جہاں تک ممکن ہوا یہ مقامی لوگوں کو ختم کر کے ان کی زمین پر قبضہ کرتی چلی گئی اور دوسری طرف اس نے امریکا پہنچتے ہی ہندوستان کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ تو کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے کبھی ہندوستان کا قصد کیا ہی نہیں تھا بلکہ ان کی نظریں شروع سے اس نئی دنیا پر مرکوز تھیں۔ وہ اسے فتح کرنے کا ارادہ لے کر اپنے ملک سے نکلے تھے اور انہوں نے اس پر قبضہ کر کے اپنے عزائم کی تکمیل کر لی تھی۔ تاریخ کا اتنا بڑا جھوٹ صرف اپنی درندگی چھپانے کے لیے تھا۔ آج مغربی مورخ جہاں یہ اقرار کرتا ہے کہ سفید فاموں کی آمد سے پہلے جنوبی اور شمالی امریکا میں دس کروڑ سے زیادہ انسان آباد تھے۔ وہیں وہ پوری ڈھٹائی سے اس بات کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ اب دونوں براعظموں میں ان کی تعداد ایک کروڑ بھی نہیں ہے۔ جنوبی امریکا میں کچھ مقامی نسلیں پھر بھی خود کو بچانے میں کامیاب رہی ہیں لیکن شمالی امریکا میں ریڈ انڈین صرف بیس لاکھ کی تعداد میں باقی رہ گئے ہیں اور ان کی آبادی رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے۔ صرف ان لوگوں کی نسل کشی سے توجہ ہٹانے کے لیے کولمبس کی طرف سے ہندوستان کی دریافت کا ڈھول پیٹا جاتا ہے اور امریکا کی دریافت کو اتفاقی ظاہر کیا جاتا ہے۔

اگر ایسا ہی ہے اور اسپینی اصل میں امریکا پر قبضے کا ارادہ رکھتے تھے تو اس سے یہ سوال جنم لیتا ہے کہ ان لوگوں کو اس براعظم کا علم کیسے ہوا اور ان کو یہ کیسے پتا چلا کہ وہاں نیم وحشی اور تقریباً ننگے لوگ آباد ہیں؟ جن کو قابو کرنا یا ختم کرنا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہی سوال اس سارے معمے کی کنجی ہے جسے مغربی مورخ گزشتہ پانچ سو سال سے چھپاتے آئے ہیں اور آج بھی چھپا رہے ہیں۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ اس سوال کا ہمارے پاس کیا ممکنہ جواب ہو سکتا ہے۔ ذرا سولہویں صدی کے بحیرہ روم اور اس کے آس پاس آباد اقوام کو ذہن میں لایئے تو یہ بات واضح تھی کہ اس وقت مسلمانوں سے زیادہ ترقی یافتہ اور متحرک قوم اور کوئی نہیں تھی۔ انہوں نے نہ صرف خشکی پر جہاں تک ہو سکا قبضہ کر لیا تھا بلکہ بحیرہ روم اس زمانے میں مسلمانوں کے لیے صحن کا تالاب بن گیا تھا اور یورپ کی مشہور بحری طاقتیں بھی کھل کر مسلمانوں کے مقابل آنے سے گریز کرتی تھیں۔

مسلم جہاز راں اس پورے علاقے میں دندناتے پھرتے تھے اور وہ صرف بحیرہ روم نہیں بلکہ پورے افریقا کی ساحلی پٹی پر جہاز رانی کرتے تھے۔ وہ اسکندریہ سے لے کر الجزائر تک اور الجزائر سے لے کر موریطانیہ تک ایک ایک ساحل سے اچھی طرح واقف تھے۔ یعنی وہ عملی طور پر بحیرہ اوقیانوس میں سفر کرتے رہتے تھے۔ مسلمان اس زمانے میں جہاں گرد تھے اور کسی بھی جگہ جانے سے ذرا بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ مسلم جہاز رانوں نے بحیرہ اوقیانوس کے اندر جانے کے بارے میں نہ سوچا ہو۔ وہ اس قابل تھے کہ اس سمندر میں سفر کر سکتے تھے۔ ایک تو ان کے پاس نسبتاً بہتر بحری جہاز تھے۔ دوسرے ان کے پاس اوقیانوس کے افریقی ساحلوں کے مکمل نقشے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ ہوا کس وقت چلتی ہے اور اس سے کس طرح فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے وہ قطب نما کا استعمال اچھی طرح جانتے تھے۔ اس کے ہوتے ہوئے راستہ بھٹکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کولمبس نے اپنے سفر میں جو قطب نما استعمال کیے تھے وہ مسلمانوں کے بنائے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ مسلمان جہاز راں ایک اور سمت نما آلے اصطرلاب کا استعمال بھی کرتے تھے۔ یورپی جہاز راں آنے والی مزید دو صدیوں تک اس کے استعمال سے ناواقف رہے تھے۔ جبکہ گہرے سمندروں میں سفر کے لیے یہ ایک لازمی آلہ ہے اور اس کے بغیر راستہ بھٹک جانے کا بہت زیادہ امکان رہتا ہے۔ کیونکہ قطب نما صرف سمت بتاتا ہے جبکہ اصطرلاب یہ بھی بتاتا تھا کہ جہاز اس وقت زمین کے کس حصے میں ہے۔ اس طرح آج سے پانچ چھ صدی پہلے بھی مسلم جہاز راں اتنے ہی اعتماد سے سمندر میں سفر کر سکتے تھے جتنے کہ آج کے جدید جہاز راں کرتے ہیں۔

گویا مسلم جہاز رانوں کے لیے بحیرہ اوقیانوس میں جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس صورت میں کوئی وجہ نہیں تھی کہ مسلم جہاز رانوں نے بحیرہ اوقیانوس میں سفر نہ کیا ہو۔ ان کے پاس بہتر جہاز بھی تھے، بہتر آلات بھی اور سب سے بڑھ کر عزم و حوصلہ تھا۔ ان کے لیے یورپ والوں کے مقابلے میں ایک آسانی اور بھی تھی۔ مسلمان سمندر میں بہنے والے پانی کے دھاروں سے واقف تھے۔ گرم پانی کے یہ دھارے خلیج فارس سے نکلتے ہیں اور دنیا بھر میں سفر کرتے ہیں۔ اصل میں یہی دھارے دنیا کا موسم بناتے ہیں۔ شمالی امریکا، یورپ اور جاپان کے سمندروں کو برف بننے سے بچاتے ہیں اور ان ملکوں میں موسم سرما قابلِ برداشت ہوتا ہے۔ اگر گرم پانی کے یہ دھارے نہ ہوتے تو یورپ اور شمالی امریکا کا بڑا حصہ منجمد شکل میں ہوتا اور یہاں سال کے دس مہینے برف جمی رہا کرتی۔ یعنی انسانوں کے لیے یہاں رہائش اختیار کرنا بہت ہی مشکل ہو جاتا۔

خلیج سے نکلنے والے چار دھاروں میں سے ایک افریقا کی مشرقی پٹی کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے اور انتہائی جنوب میں جا کر یہ مغربی افریقا کی طرف گھومتا ہے اور اوقیانوس میں داخل ہو جاتا ہے۔ وسطی افریقہ سے یہ مکمل طور پر اوقیانوس میں مڑ جاتا ہے اور پھر بہاماز کے علاقے میں شمالی امریکا کے ساحل کے ساتھ لگ کر بہتا ہے اور یہ بالکل شمال میں جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ اسی گرم پانی کے دھارے کی وجہ سے پورا امریکی ساحل اور کینیڈا تک کا ساحل شدید سردیوں میں بھی منجمد ہونے سے محفوظ رہتا ہے اور ساحلوں کا موسم بھی معتدل رہتا ہے۔ یہی گرم پانی کے دھارے ہیں جو دنیا کی سب سے زیادہ پائی جانے والی بحری مخلوق پلانکٹن کی پرورش کرتے ہیں اور اسی پلانکٹن سے سمندری مخلوقات کی نصف کے قریب غذائی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ گویا زمین پر حیات کی ایک بڑی وجہ یہ گرم پانی کے دھارے بھی ہیں۔

بات ہو رہی تھی گرم پانی کے دھارے کی جو افریقا کے مغربی ساحل سے امریکا کی طرف مڑ جاتا ہے اور اس کے ساتھ سفر کرنے والے بحری جہاز بہت کم وقت میں اور ہواؤں کا محتاج ہوئے بغیر امریکا کے ساحلوں تک جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ تقریباً تیس ناٹیکل میل فی گھنٹے کی رفتار سے سفر کرتے ہیں۔ مسلمان بحری رووں سے بھی واقف تھے۔ اور حیرت انگیز طور پر انہوں نے ان بحری رووں کے جو نقشے تیار کیے ہیں وہ آج کے نقشوں سے زیادہ مختلف نہیں ہیں اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مسلمان اس بات سے بھی واقف تھے کہ یہ روئیں شمالی اور جنوبی قطبین پر جا کر ختم ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ اس سے بھی واقف تھے کہ قطبین سے سرد پانی کی روئیں چلتی ہیں جو استوائی سمندروں کو ایک حد سے زیادہ گرم ہونے سے بچاتی ہیں۔ اگر یہ سرد روئیں نہ ہوں تو وسطی سمندر اتنے گرم ہو جائیں کہ ان میں کسی مخلوق کا زندہ رہنا محال ہو جائے۔ ان سمندروں کا درجہ حرارت شاذ ہی تیس ڈگری سینٹی گریڈ سے اوپر جاتا ہے۔ اگر یہی درجہ حرارت پینتیس ڈگری سینٹی گریڈ سے اوپر چلا جائے تو بیشتر مخلوقات فنا ہو جائیں۔

جب مسلمان ان بحری رووں سے واقف تھے اور یہ تک جانتے تھے کہ یہ روئیں قطبین میں جا کر ختم ہوتی ہیں تو انہوں نے لازمی طور پر ان رووں کے ساتھ سفر کر کے دیکھا ہوگا۔ تب ہی ان کو علم ہوا کہ یہ روئیں کہاں ختم ہوتی ہیں۔ اگر انہوں نے اوقیانوس والی گرم رو کے ساتھ سفر کیا تھا تو انہوں نے امریکا کے ساحل بھی دیکھے ہوں گے اور وہ یقیناً وہاں ساحلوں پر بھی اُترے ہوں گے۔ یہ انسانی فطرت ہوتی ہے وہ انجانی سرزمینوں کی سیر کرنا چاہتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مسلم جہاز راں امریکا اور بہاماز کے جزائر تک جا پہنچے تھے تو انہوں نے وہاں باقاعدہ رہائش کیوں نہیں رکھی اور اس کو مسلم دنیا میں متعارف کیوں نہیں کرایا اور اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ مسلمان امریکا تک پہنچ گئے تھے۔

اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے جس مسلمان بحری ماہر کا سراغ ملتا ہے وہ شریف ادریسی ہے۔ اس کا تعلق سسلی سے تھا اور اس زمانے میں سسلی پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ شریف نہ صرف بحری سفر کا ماہر تھا بلکہ وہ ارضیات اور بحری علوم پر بھی اس زمانے کے لحاظ سے اتھارٹی تھا۔ اس نے بہترین بحری نقشے تیار کیے تھے۔ اس وقت اہلِ یورپ کا خیال تھا کہ زمین چپٹی ہے اور اسی لحاظ سے وہ زمین اور بحر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے نقشے تیار کرتے تھے۔ظاہر ہے اس سے فاصلوں اور سمتوں میں بے پناہ غلطیاں آ جاتی تھیں۔ اس کے مقابلے میں شریف ادریسی نے بجا طور پر دنیا کو گول تصور کیا اور اس نے جو بحری نقشے تیار کیے وہ اس قسم کے تھے جو گول دنیا کے تصور کے تحت بنائے گئے تھے۔ اس سے مسلم جہاز رانوں کو فاصلوں اور سمتوں کا بہترین ادراک ہو گیا تھا اور ان کا راستہ بھٹک جانے کا امکان نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔

شریف نے دنیا کا ایک نقشہ چاندی کے پیالے میں بنایا تھا۔ اس طرح دنیا کی گولائی واضح کرنے میں بھی کامیاب رہا تھا۔ اس نے ایشیا، افریقا اور یورپ کا زمینی نقشہ غیر معمولی درستگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن اس نقشے کی سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس میں شمالی امریکا کو بھی دکھایا گیا ہے اور میکسیکو کا نقشہ تو اس کے آج کے نقشے سے ذرا بھی مختلف نہیں ہے جب کہ امریکہ کا ساحل بھی بڑی حد تک واضح ہے۔ آخر شریف نے یہ نقشہ کس طرح تیار کیا؟ آخر اسے کیسے پتا چلا کہ بحیرہ ظلمات کے پار ایک اور براعظم ہے ؟

اس سوال کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ مسلم جہاز راں کرسٹوفر کولمبس سے بہت پہلے نہ صرف اوقیانوس کا سفر کر چکے تھے بلکہ وہ وسطی اور کسی حد تک شمالی امریکا سے بھی واقف تھے۔ خاص طور سے جزائر کریبین ان کے لیے بالکل بھی اجنبی نہیں تھے اور میکسیکو کے ساحلوں تک ان کی رسائی تھی۔ یہ مسلم جہاز رانوں کی فراہم کردہ معلومات تھیں جن کی مدد سے شریف شمالی امریکا کا نقشہ بنانے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس نے صرف نقشے ہی نہیں بنائے بلکہ بحری راستوں اور علوم کے بارے میں ایک بیش بہا کتاب بھی لکھی تھی جس کا نام ''نزہت المشتاق فی اختراق آفاق'' ہے۔ یہ کتاب آنے والے کئی سو برس تک اہلِ یورپ کے لیے مشعلِ راہ کا کام کرتی رہی تھی اور وہ اس کی مدد سے اوقیانوس کا سفر کرنے میں کامیاب رہے تھے۔

شریف ادریسی کرسٹوفر کولمبس سے کوئی ڈھائی سو سال پہلے گزرا تھا۔ اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ کولمبس نے اس کی معلومات سے استفادہ کیا تھا۔ جیسا کہ بتایا ہے کہ یورپ کے پاس سوائے شریف کی مہیا کردہ معلومات کے اور کچھ تھا ہی نہیں۔ اس کی کتاب کو مسلم دنیا سے زیادہ یورپ میں پڑھا جاتا تھا۔ کیونکہ شریف کی یہ کتاب زیادہ تر ان خطوں کے بارے میں تھی جو اہلِ یورپ کی دلچسپی کے تھے۔ وہ ان سمندروں میں باقاعدگی سے سفر کرتے تھے۔

اس کتاب میں اس نے بعض ایسے واقعات بیان کیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان اس وقت تک امریکا تک کا بحری سفر کر چکے تھے۔ اس کی کتاب سے ایسا ہی ایک مضمون سید سلمان ندوی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں نقل کیا ہے جو درج ذیل ہے۔

''آٹھ مسلم جہاز راں مغرب کی طرف جانے کے ارادے سے ایک کشتی میں سوار ہو کر بحیرہ ظلمات میں داخل ہوئے۔ واضح رہے کہ مسلمان بحیرہ اوقیانوس کو بحیرہ ظلمات کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ لوگ پختہ عزم کر کے چلے تھے اس لیے راہ کی مشکلات کے باوجود انہوں نے سفر سے منہ نہیں موڑا۔ یہ لوگ جماعت مفروزین سے تعلق رکھتے تھے اور شمالی اور مغربی افریقا سے آئے تھے۔ (ان کا جہاز بھی چھوٹا تھا کیونکہ آٹھ افراد کوئی بڑا بحری جہاز نہیں سنبھال سکتے ہیں) دو ہفتے تک یہ لوگ سمندر کے تھپیڑے کھاتے رہے تھے اور جب کھانا پانی ختم ہونے سے ان کو موت سامنے نظر آنے لگی تو وہ ایک جزیرے تک پہنچ گئے تھے۔ اس جزیرے پر کوئی انسان نہیں تھا اور سوائے بکری نما ایک جاندار کے اور کوئی جاندار بھی نہیں تھا۔ وہ لوگ بکریاں دیکھ کر خوش ہوئے تھے مگر جب ذبح کر کے ان کو پکا کر کھانا چاہا تو ان کا گوشت از حد کڑوا ثابت ہوا تھا۔ ان میں سے کسی سے ایک لقمہ بھی نہیں کھایا گیا تھا۔ مگر یہاں ان کو پانی اور کچھ پھل مل گئے تھے۔ انہوں نے جزیرے پر موجود بکریوں کو ذبح کر کے ان کی کھالیں جمع کیں اور کشتی پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔

اس کے چند دن بعد وہ ایک ایسے جزیرے پر پہنچے جہاں سبزہ افراط سے تھا اور ساحل تک درخت آ رہے تھے۔ مگر ابھی انہوں نے ساحل پر لنگر ڈالا تھا کہ ان کو بے شمار چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار ایسے لوگوں نے گھیر لیا جو تیر کمان سے مسلح تھے اور ان کے رنگ تانبے کی طرح سرخ تھے۔ ان کے سر کے بال کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ان سب کو پکڑ کر لے گئے اور ایک جگہ قید کر دیا۔ وہ کوئی ایسی زبان بول رہے تھے جو ان ملاحوں کی سمجھ سے باہر تھی۔ لیکن ان کی قید کے تیسرے دن ایک مختلف حلیے کا شخص آیا اور ان سے عربی زبان میں بات کی۔ وہ حیران تھے کہ وطن سے اتنا دور یہ عربی بولنے والا کہاں سے آ گیا؟ اس نے ان کو بتایا کہ وہ اپنے وطن سے بہت دور آ گئے ہیں اور ان کو جلد یہاں کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

ان کو بادشاہ کے دربار میں پیش کیا گیا اور اس نے ان

کو واپس بھیجنے کا حکم دیا۔ ان آٹھوں افراد کو ایک کشتی میں بٹھا کر ان کے ہاتھ پاؤں اور آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں۔ کشتی ہوا کے ذریعے، بادبانوں کے سہارے واپسی کے رُخ پر چل رہی تھی اور کئی دن کے سفر کے بعد وہ ایک اور جزیرے تک پہنچے۔ یہاں سے ان کو مزید آگے روانہ کیا گیا تھا۔ پھر ایک جگہ پہنچ کر وہ آزاد ہوئے تو وہاں بربر ملے اور انہوں نے بتایا کہ وہ اب افریقا میں ہیں۔ جہاں بربر نسل کے لوگ آباد ہیں۔ بربروں نے ان کو بتایا کہ وہ اپنے وطن سے دو مہینے کی مسافت پر ہیں۔

شریف ادریسی کے کتاب کے اس اکتساب سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلم جہاز راں نہ صرف کولمبس سے کم سے کم ڈھائی سو سال پہلے امریکا کی سرزمین تک پہنچ چکے تھے۔ بلکہ وہاں مستقل سکونت بھی رکھتے تھے۔ اس کا ثبوت وہ عربی داں تھا جس نے ان ملاحوں کے لیے مترجم کے فرائض انجام دیئے تھے۔ وہ عرب تھا اور اس اجنبی سرزمین پر آباد تھا۔ ممکنہ طور پر ملاح پہلے جس جزیرے تک پہنچے تھے وہ جزائر کریبین کا کوئی غیر آباد حصہ تھا۔ وہاں بکریوں کی موجودگی ثابت کرتی تھی کہ اس وقت تک بیرونِ دنیا سے کوئی ان خطوں تک پہنچ چکا تھا کیونکہ ان علاقوں میں بکریاں نہیں پائی جاتی ہیں اور ان کو بعد میں لے جایا گیا تھا۔ ممکنہ طور پر پہلے پہنچنے والے مسلم جہاز رانوں نے تازہ گوشت کی خاطر بکریاں ساتھ رکھی تھیں اور کسی وجہ سے یہ اس جزیرے پر رہ گئیں اور وہاں ان کی نسل بڑھ گئی۔ کسی مقامی اثر کی وجہ سے ان کا گوشت کھانے کے قابل نہیں رہا تھا اور شاید یہ بھی ان بکریوں کو اس جزیرے پر چھوڑنے کی وجہ ہو سکتی تھی۔

پھر وہاں سے سیاح جب کسی براعظمی ساحل تک پہنچے تو ان کو گھیر کر گرفتار کرنے والے سرخ رنگ اور کھڑے بالوں والے لوگ یقیناً میکسیکو کے مقامی باشندے تھے جن کو بعد میں آنے والے وحشی ہسپانیوں نے ختم کر دیا تھا۔ وہاں عربی داں شخص کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ مسلمان نہ صرف وہاں پہنچ چکے تھے بلکہ انہوں نے مقامی قبائل سے ایسے تعلقات بنا لیے تھے کہ ان کو وہاں آباد ہونے کی اجازت مل گئی تھی اور یہ عرب باشندے ان کے معاشرے کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ وہ وہاں کے بادشاہ کے لیے کام کرتے تھے۔ اور شاید ان کی ملازمت پر ان سیاحوں کی جان بخشی ہوئی تھی۔

جب اسپین مسلمانوں کے قبضے میں آیا تو وہاں کے عیسائیوں کے مسلمانوں سے تعلقات کا آغاز ہوا اور انہوں نے مسلمانوں سے بہت کچھ سیکھا۔ اسپین کے لوگ اس سے پہلے وحشیوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن انہوں نے تعلیم حاصل کی اور مختلف فنون سیکھے اور پھر یہ فنون پورے یورپ میں پھیلائے۔ درحقیقت یہ فتح اسپین تھی جس نے یورپ کی تاریخ بدلنے میں اہم کردار ادا کیا اور اسے نشاۃ ثانیہ کی طرف لایا۔ عربوں اور خاص طور سے بربروں سے قریبی تعلقات کی وجہ سے اسپینی ان کے بہت سارے رازوں سے واقف تھے۔ اسپین کے باشندے فطری طور پر بہترین جہاز راں تھے اور اکثر مسلم جہازوں میں یہ بہ طور ملاح کام کرتے تھے۔ اسی طرح جنگوں میں قید ہو کر آنے والوں سے جہازوں میں غلام کے طور پر کام لیا جاتا تھا۔ اس سے بھی اسپینی مسلمانوں کے بہت سارے رازوں سے واقف ہو گئے تھے۔ ممکنہ طور وہ جان گئے تھے کہ مسلم جہاز راں ایک ایسے خطے سے واقف ہو چکے ہیں جس سے ابھی تک باقی دنیا بے خبر ہے۔ اسی طرح ان کے علم میں اس خطے کے وسائل آئے اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔

اسپینی شروع سے لالچی قوم رہی ہے اور جب ان کو پتا چلا کہ وہاں کے لوگ جنگجو نہیں ہیں اور ان کے ہتھیار معمولی قسم کے ہیں۔ سب سے بڑھ کر ان کے پاس سونے چاندی کی بہتات ہے تو ان کی رال مُری طرح ٹپکنے لگی تھی اور جب انہوں نے مسلمانوں پر قابو پا کر ان کو اسپین سے بے دخل کر دیا تو انہوں نے اس نئی دنیا اور اس کے وسائل پر قبضہ جمانے کی تیاری شروع کر دی تھی۔

لیکن اسپین والوں کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اچھے جہاز راں ہونے کے باوجود بحری علوم میں کمزور تھے۔ ان کے پاس نہ تو گہرے سمندروں میں رہنمائی کے لیے استعمال ہونے والے آلات تھے اور نہ ایسے جُرأت مند ملاح جو اپنی جان پر کھیل کر گہرے سمندروں میں جا سکیں۔ اس وجہ سے اس نئی دنیا کی طرف جانے کے لیے کوئی مہم ترتیب نہ دے سکے تھے۔ پھر مسلمانوں کی برسوں کی محنت کو وحشی اسپینیوں اور ان کے جاہل پادریوں نے چند سالوں میں برباد کر دیا تھا۔ عالی شان لائبریریاں جلا کر خاکستر کر دی گئی تھیں اور ہر ترقی کو مسلمانوں کی نشانی قرار دے کر تباہ کر دیا گیا تھا۔ حد یہ کہ بے شمار حسین اور خوب صورت عمارات کو محض اس لیے تباہ کر دیا گیا کہ وہ مسلمانوں نے بنائی تھیں۔ مسلم اقتدار ختم ہونے کے چند سال کے اندر اسپین کو اسی تاریک اور وحشت کے دور میں پہنچا دیا گیا تھا جہاں وہ مسلمانوں کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آمد سے پہلے تھا۔ ملک میں صنعتیں اور فنون تقریباً ناپید ہو گئے تھے۔ جو اسپینی مسلمانوں سے علوم حاصل کر چکے تھے۔ ان کو ''تائب'' کرایا گیا۔ سائنسی تحقیق کو مسلمانوں کی میراث قرار دے کر اس سے اجتناب کا حکم دیا گیا۔ اور ان احکامات کی خلاف ورزی کی سخت سزائیں مقرر تھیں۔

ملک کا مالیاتی نظام تباہ کر دیا گیا۔ جنگوں کی وجہ سے اسپین ویسے ہی بدحالی کا شکار تھا۔ اوپر سے مسلمانوں کے چلے جانے سے صنعت اور زراعت میں سارا کام رک گیا تھا۔ ایسے میں اسپین کے لوگوں کے پاس سب سے بڑا ذریعہ روزگار لوٹ مار تھی۔ جب مسلمان چلے گئے تو انہوں نے اپنوں کو ہی لوٹنا شروع کر دیا۔ مسلم دور کا امن و امان عنقا ہو گیا تھا۔ صورت حال یہ تھی کہ ملک انتہائی انتشار کا شکار تھا اور اس کی بقاء کی ایک ہی صورت تھی کہ اسپین کو نو آبادیاں مل جائیں جن کو لوٹ کر وہ اپنا ملک چلا سکیں۔ یہ نو آبادی ان کے پاس اس نئی دنیا کی صورت میں موجود تھی۔ مگر وہاں تک رسائی کیسے حاصل کی جا سکتی تھی۔ ایسے میں کرسٹوفر کولمبس ان کا نجات دہندہ بن کر آیا تھا اور اس نے کہا کہ وہ مغرب کی طرف سفر کرے گا۔

دوسری طرف مسلمان جنہوں نے اس نئی دنیا کو دریافت کیا تھا وہ اوّل تو وہاں کوئی فوجی مہم لے کر نہیں گئے تھے۔ یہ اصل میں ملاح اور تاجر تھے جنہوں نے کریبین کے جزائر اور امریکا کے ساحل تک رسائی حاصل کی تھی اور ان کا مقصد لوٹ مار نہیں بلکہ تجارت تھی۔ اس لیے عام طور سے لوگوں کو اس کا علم نہیں تھا۔ دوسرے مسلمان عموماً بحری مہمات سے گریز کرتے رہے تھے۔

اس کے بعد بھی مسلم حکمرانوں کا بحری جنگ کی طرف رجحان کم رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مسلم حکومتیں جہاں جہاں تھیں۔ ان سب مقامات پر زمینی رسائی تھی۔ دوسرے مستحکم مسلم حکومتوں کے آس پاس سمندر نہیں تھے۔ اس وجہ سے بھی انہوں نے بحریہ کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ ایک اسپین کی حکومت ایسی تھی جہاں تک سمندر سے رسائی کی جاتی تھی۔ مگر یہ سمندر بھی زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کے باوجود وسطی دور میں مسلم حکمرانوں نے بحریہ کی طرف توجہ دی تھی۔ اور خاص طور سے بحیرہ روم پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ ہو گیا تھا۔ اور ان کی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس وقت سلطنتِ عثمانیہ نے تین طرف سے سمندر میں گھرے ہونے کے باوجود بحری طاقت پر اتنی توجہ نہیں دی تھی۔ اس وقت بھی افریقا کے ساحلوں پر موجود چھوٹی چھوٹی مسلم مملکتوں کی بحری طاقت عیسائی یورپ کی مشترکہ بحری طاقت پر حاوی تھی اور ان کی جرأت نہیں تھی کہ ان کے مدِ مقابل آ سکیں۔ خاص طور سے عیسائی سے مسلم ہونے والے خیر الدین باربروسہ نے بحیرہ روم کو مسلمانوں کے صحن کا تالاب بنا دیا تھا۔ خیر الدین کا خاندان یونانی تھا اور وہ یورپی الاصل تھے۔ مسلمان ہونے سے پہلے بھی وہ جہاز رانی اور خاص طور سے بحری جنگوں کے ماہر تھے۔ بڑے بڑے اور مشہور عیسائی امیر البحر خیر الدین باربروسہ سے شکست کھا گئے تھے۔

لیکن اسپین کی طاقت ور بڑی مسلم مملکت کے خاتمے کے ساتھ ہی بحیرہ روم کے مغربی حصے میں مسلمانوں کی بحری سرگرمیاں کم ہونے لگی تھیں اور وہاں پر یورپی بحری طاقتیں سر اُٹھانے لگی تھیں۔ اس لیے مسلم جہاز رانوں نے نئی دنیا سے جو رابطے کیے تھے وہ ختم ہونے لگے۔ افریقا کی ساحلی پٹی تیزی سے مستحکم حکومتوں سے خالی ہونے لگی تھی۔ اس کی بجہ عیسائی قزاقوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیاں بھی تھیں۔ ویسے بھی بہ حیثیت مجموعی مسلمان زوال کا شکار تھے۔ دین سے دوری نے ان کو دنیا سے بھی دور کر دیا تھا۔ اب جوش و ولولے سے خالی مسلمان نئی سرزمینیں دریافت کرنے کے بجائے اپنے پُرانے علاقوں کو لوٹ رہے تھے۔

اسپین کے عیسائی جان گئے تھے کہ مسلمان ایک نئی دنیا دریافت کر چکے ہیں لیکن انہوں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اس دریافت کا سہرا ان کے سر بندھنا چاہیے اس لیے انہوں نے نئی دنیا میں پہنچتے ہی مسلم آثار مٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ورنہ وہاں پر مسلم آبادیاں تھیں۔ اس کے متعدد ثبوت ملے ہیں۔ بے شمار جگہوں پر کھدائی کے دوران وہاں سے مسلم سکے اور ایسی چیزیں ملی ہیں جن کا تعلق اس دور کے عربوں سے ہے۔ لیکن بدقسمتی سے آج بھی مغربی مورخ کے ذہن سے اسپین کا متعصب عیسائی نہیں نکلا.... اس لیے ایسی تمام دریافتیں دبا دی جاتی ہیں۔

1930ء میں امریکا میں شائع ہونے والے عربی اخبار ''الہدیٰ'' میں ایک شامی تاجر کا چشم دید واقعہ شائع ہوا۔ وہ میکسیکو کے علاقوں چاپاش اور بثلا سلا میں گھر گھر جا کر اپنا مال فروخت کرتا تھا۔ ایک روز وہ راستہ بھٹک گیا اور ایک اجنبی جنگل میں جا نکلا تھا۔ وہاں اسے ایک بستی ملی اور جب اس نے پہلے دروازے پر دستک دی تو اس سے برآمد ہونے والا شخص نہ صرف عربی قطع وضع رکھتا تھا بلکہ وہ خالص عربی

بول رہا تھا۔ صرف وہی نہیں بلکہ یہ پوری بستی ہی عربوں کی تھی اور وہ صدیوں سے وہاں آباد تھے۔ ان لوگوں نے اس شامی تاجر کو بتایا کہ بہت عرصہ پہلے وہ حملہ آور اسپینیوں سے بچنے کے لیے یہاں آ گئے تھے اور تب سے یہیں آباد تھے۔ ان کے رسم و رواج اور رہن سہن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس وقت بھی وہ خالص عرب ثقافت کے ساتھ میکسیکو میں رہ رہے تھے۔

یہ خبر اس وقت انڈیا سے شائع ہونے والے بعض اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی لیکن حسبِ معمول مغربی میڈیا نے اسے نظر انداز کر دیا۔ بلکہ دبا دیا۔ اس عرب قبیلے کا بھی پھر کچھ پتا نہیں چلا جو صدیوں سے وہاں آباد تھا عین ممکن ہے اسے وہاں سے اُٹھا کر کہیں اور بھیج دیا گیا ہو تا کہ شامی تاجر کے دعوئی کو جھوٹا قرار دیا جا سکے۔ یا سرے سے نابود کر دیا گیا ہو کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔

یورپ شروع سے نو آبادیوں پر گزارا کرنے والا خطہ ہے کیونکہ قدیم زمانے سے یہ براعظم قدرتی وسائل کی کمی کا شکار رہا... خاص طور سے خوراک اور ضروریات کے لیے وہ دوسرے خطوں کا محتاج رہا تھا۔ صرف ایک معاملے میں یورپ دنیا کے دوسرے حصوں سے برتر رہا... اور وہ تھی فوجی طاقت۔ ابتدا میں یونان ایک مشہور فوجی قوت رہا تھا اور اس کی ایران سے پنجہ آزمائی کی داستان ہزاروں سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ پھر اس کی جانشین سلطنت رومانی اور اس نے افریقا اور ایشیا کے بے شمار حصوں پر قبضہ کر کے نو آبادیات کی بنیاد رکھی تھی۔ یہاں سے ان کو خراج اور خوراک دونوں ملتی تھیں۔ پھر نو آبادیات کی یہ تاریخ بڑھتی چلی گئی تھی۔ یورپ کا تقریباً ہر چھوٹا بڑا ملک اس دوڑ میں شامل ہو گیا کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ افریقی اور ایشیائی ممالک پر قبضے کر کے ان کو اپنی منڈی بنا لیا جائے اور ان ملکوں کی دولت لوٹ کر لائی جائے۔ افریقا اور ایشیا میں شام کی ساحلی پٹی پر یورپ کا قبل مسیح سے قبضہ رہا تھا۔ لیکن اصل ممالک تو برصغیر اور مشرق بعید کے تھے۔ لیکن وہاں تک جانا بہت مشکل کام تھا۔ خشکی کے راستے یہ کام تقریباً ناممکن تھا کیونکہ اہلِ یورپ نے جب بھی ایشیا کی طرف پیش قدمی کی تو عام طور سے اس کا خاتمہ موجودہ ترکی یا زیادہ سے زیادہ ایشیائے کوچک یعنی موجودہ آرمینیا یا آذر بائیجان تک پہنچ کر ہو گیا تھا اور وہ اس سے آگے پیش قدمی نہیں کر سکے تھے۔ اب ایک ہی طریقہ تھا کہ سمندر کے راستے برصغیر اور مشرق بعید یعنی چین تک پہنچا جا سکے۔ مارکو پولو کی کہانیاں کتنی ہی ماورائی صحیح لیکن انہوں نے یورپ والوں کو مسحور کر لیا تھا اور وہ ہندوستان اور چین تک پہنچنے کے لیے بے تاب ہو گئے تھے۔

جب تک مسلمان اسپین پر قابض رہے اس کی ترقی کا ستارہ عروج پر رہا اور جب اسپین والوں نے مسلمانوں سے نجات حاصل کر لی تو چند دہائیوں کے اندر یہ ملک پھر اسی جگہ جا کھڑا ہوا جہاں مسلمانوں کی آمد سے پہلے تھا۔ تباہ شدہ معیشت کی بحالی کے لیے اسپین کے حکمرانوں نے اپنے لیے نو آبادیوں کی ضرورت محسوس کی تو ان کی اوّلین ترجیح یہ نئی دنیا تھی کیونکہ ان کی فوجی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ وہ کسی باقاعدہ ملک پر حملہ کر سکتے۔ پھر ان کے آس پاس فرانس، پرتگال اور اٹلی جیسی بڑی طاقتیں تھیں۔ سمندر پار افریقا میں اگرچہ اس وقت کوئی منظم مسلم سلطنت نہیں تھی لیکن مسلمانوں سے دو بدو مقابلہ کرنے کے خیال سے اسپین کے لوگوں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ بربروں سے وہ ویسے ہی بہت زیادہ خائف تھے۔ اس لیے افریقا جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اسپین والے کسی مسلم علاقے پر حملہ کر کے اس قوم کو پھر سے اسپین آنے کی دعوت دینا نہیں چاہتے تھے۔

اس لیے انہوں نے ایک ایسے خطے کا انتخاب کیا جہاں لوگ عموماً پُرامن اور فوجی لحاظ سے پسماندہ تھے۔ دنیا والے ان سے بے خبر تھے اس لیے اگر ان کو ختم کر دیا جاتا تو کوئی طوفان کھڑا نہیں ہوتا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ آج کا مغربی مورخ اس بات پر ذرا بھی شرم سار نہیں ... کہ جنوبی اور شمالی امریکا میں موجود عظیم الشان عیسائی سلطنتیں اصل میں مقامی باشندوں کی قبروں پر تعمیر کی گئی ہیں۔

جب اسپین کے حکمرانوں نے نئی دنیا جانے اور وہاں قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تو اب مسئلہ وہاں تک رسائی کا تھا۔ اس موقع پر قدرت نے ان کی مدد کے لیے کرسٹوفر کولمبس کو بھیج دیا۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ کولمبس سچ مچ ہندوستان دریافت کرنا چاہتا تھا اور جب اسے اسپینیوں کے ارادے کی بھنک پڑی تو اس نے ہندوستان کو بھلا کر اس نئی دنیا کو اپنا مطمع نظر بنا لیا۔ یا وہ بھی اسپینیوں کو اسی طرح بے وقوف بنا رہا تھا جس طرح اسپینی اسے بے وقوف بنا رہے تھے۔ یہ بات تو طے ہے کہ اسپینیوں جیسی جاہل اور وحشی قوم کو دنیا کے دوسرے سرے پر واقع ہندوستان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور جہاں تک تجارت کا سوال تھا تو اسپین میں اب صنعت و حرفت کا نام نہیں رہا تھا تو وہ تجارت کس چیز کی کرتے۔ ان کا ارادہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صرف لوٹ مار کا تھا اور ہندوستان جیسے طاقت ور ملک کو لوٹنے کا خیال بھی محال تھا۔ وہ بھی کوئی بارہ ہزار میل دوری پر جا کر۔ ان کا ارادہ شروع سے وہ نئی دنیا تھی جہاں سونے چاندی کی بہتات تھی بس ان کو ایک بار وہاں جانے کا راستہ چاہیے تھا۔

مگر بحیرہ اوقیانوس میں قدم رکھنے کے خیال سے اسپین کے ملاحوں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ ان کے پاس نہ تو وسائل تھے اور نہ ہی ایسے تربیت یافتہ جہاز راں تھے جو اس سمندر میں گھس کر نئی دنیا تک جانے کا راستہ تلاش کرتے۔ بلکہ شاہ فرڈی ننڈ کے خیال میں تو یہ کام ناممکن تھا۔ اس لیے کولمبس جب ہندوستان جانے کا منصوبہ لے کر اسپین کے دربار میں آیا تو شاہ فرڈی ننڈ نے اسے حقارت سے مسترد کر دیا۔ یہی نہیں اس نے کولمبس کو ایک خیالوں میں گم رہنے والا..... بے وقوف قرار دیا تھا۔ مگر کولمبس اور اسپین کی خوش قسمتی کہ ملکہ ازابیلا کو یہ منصوبہ بھا گیا اور اس نے شاہ کو بھی راضی کر لیا کہ اگر ایک بے وقوف اپنی جان خطرے میں ڈال کر ان کو نئی دنیا تک لے جا رہا ہے تو اس میں کیا حرج ہے۔ ان کا کچھ سرمایہ ہی لگے گا۔

شاہ بھی بادل ناخواستہ راضی ہو گیا تو ملکہ نے کولمبس سے باقاعدہ معاہدہ کر لیا۔ اب ذرا اس معاہدے کی شقیں دیکھیں تو کہیں سے بھی احساس نہیں ہوتا ہے کہ یہ ہندوستان جیسے عظیم ملک کی دریافت کے سلسلے میں کیا جا رہا ہے۔ اس کی اوّل شرط یہ تھی کہ کولمبس جو علاقہ دریافت کرے گا اسے وہاں کا گورنر بنا دیا جائے گا۔ اوّل تو ہندوستان کوئی گم شدہ یا نا معلوم علاقہ نہیں تھا جسے کسی کو دریافت کرنے پر الاٹ کر دیا جائے۔ دوسرے وہاں دنیا کی طاقت ور ترین حکومت تھی اور اس کے ہوتے ہوئے ایک چھوٹے سے علاقے کا شاہ اور ملکہ کولمبس کو کیسے یہ اختیار دے رہے تھے کہ وہ وہاں کا گورنر... ہوگا۔ ان دونوں کے زیرِ اقتدار رقبہ ہندوستان کے رقبے کا سواں حصہ بھی نہیں تھا۔

بہ قول مغربی مورخین کولمبس کو صرف ہندوستان جانے کا راستہ دریافت کرنا تھا تو اس معاہدے کی کیا تُک بنتی تھی۔ اس شق سے صاف ظاہر تھا کہ معاملہ ہندوستان کا نہیں بلکہ کسی اور سرزمین کا تھا۔ دوسری شق کے مطابق اس علاقے سے جو بھی مال و دولت حاصل ہوگی اس میں کولمبس کا حصہ بھی ہوگا۔ تیسری شق کے مطابق کولمبس کی اولاد کو بھی یہی حقوق حاصل رہیں گے جو کولمبس کو حاصل تھے۔ اگر چہ اسپین کی حکومت کی جانب سے یہ معاہدہ سراسر بد نیتی کے ساتھ کیا گیا تھا اور اسے لکھنے سے پہلے ہی شاہ فرڈی ننڈ اور ملکہ ازابیلا اس پر عمل نہ کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ گویا تاریخ کو ہی نہیں ایک دوسرے کو بھی دھوکا دیا جا رہا تھا۔

اس کے باوجود اس معاہدے کی ایک ایک شق چیخ چیخ کر گواہی دے رہی تھی کہ اصل میں یہ ایک کمزور اور دفاع سے لاچار قوم کے بارے میں کیا جا رہا ہے۔ جس کے بارے میں اسپین کی حکومت کو بھی یقین تھا کہ وہ کسی صورت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی..... اور یہ ساری معلومات ان کو عرب ملاحوں سے حاصل ہوئی تھیں۔ وحشی اسپینی جن کے منہ سے ابھی تک مسلمانوں کا خون ٹپک رہا تھا اب نئے شکار پر لپکنے کی تیاری کر رہے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ اس وقت اسپین کی مالی حالت نہایت کمزور تھی۔ حکمرانوں کا بال بال قرض میں جکڑا ہوا تھا اور خزانہ خالی تھا۔ مسلمانوں کی لوٹ مار سے جو حاصل ہوا تھا اس میں سے بھی اسپین کی حکومت کو کچھ نہیں ملا تھا اور محاصل کی آمدنی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ ان کو آمدنی کی اشد ضرورت تھی اور اگر جلد اسپین آمدنی کا کوئی نیا ذریعہ تلاش نہ کرتا تو وہ دیوالیہ ہو جاتا اور اس نے مسلمانوں کو بے دخل کر کے جو عزت کمائی تھی وہ سب خاک میں مل جاتی اور ارد گرد کی طاقت ور ممالک اس پر چڑھ دوڑتے اور اس کے ساتھ وہی ہوتا جو بھیڑیے اپنے کمزور اور زخمی ہو جانے والے ساتھی کے ساتھ کرتے ہیں۔

اخراجات کے لیے ملکہ ازابیلا نے اپنے زیورات فروخت کر دیے تھے۔ اگر چہ اس داستان میں خیال آرائی زیادہ لگتی ہے لیکن عین ممکن ہے کہ ملکہ ازابیلا کے پاس زرِ نقد کی شدید کمی ہو گئی ہو۔ اسے اپنی طاقت برقرار رکھنے کے لیے فوج کو تنخواہ بھی دینی ہوتی تھی۔ اس نے کولمبس کے سفر کا انتظام کر دیا۔ شاہ فرڈی ننڈ نے صرف سرکاری مدد کی تھی اور کسی قسم کے خرچ سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ ازابیلا کے اصرار پر راضی تو ہو گیا تھا لیکن دل سے اب بھی وہ اس مہم کا مخالف تھا اور اس کا خیال تھا کہ جانے والوں میں سے کوئی بھی زندہ واپس نہیں آئے گا اور ملکہ ازابیلا جو سرمایہ لگا رہی تھی وہ سب ڈوب جائے گا۔ شاہ فرڈی ننڈ اس وقت تک اپنے خیال پر قائم رہا جب تک کولمبس اپنے پہلے کامیاب سفر سے واپس نہیں آ گیا۔

اگر چہ مورخین کا کہنا ہے کہ کرسٹوفر کولمبس زندگی کے

آخری لمحات تک اس مغالطے میں رہا تھا کہ اس نے ہندوستان ہی دریافت کیا ہے لیکن رائم کا خیال ہے کہ اس نے بھی شاہ اور ملکہ اسپین کو اسی طرح بے وقوف بنایا تھا جیسے وہ اسے بے وقوف بنا رہے تھے۔ اس خیال کی کچھ وجوہات ہیں۔ اوّل کولمبس کا تعلق اٹلی سے تھا اور وہ ایک بندرگاہ میں پل بڑھ کر جوان ہوا تھا۔ بارہ سال کی عمر سے وہ بحری جہازوں پر کام کرنے لگا تھا اور سترہ اٹھارہ سال کی عمر تک پختہ کار ملاح بن چکا تھا۔ اٹلی اگر چہ بھی مسلمانوں کے قبضے میں نہیں رہا تھا لیکن اس کے آس پاس کئی جزائر مسلمانوں کے قبضے میں تھے اور ان کے توسط سے جہاز رانوں کا مسلمانوں سے رابطہ تھا۔ پھر یورپی ملاحوں کو مسلم جہاز رانوں اور ماہر بحریات کے تیار کردہ نقشوں اور آلات کی ہمیشہ ضرورت رہتی تھی۔ اس لیے بھی مسلمانوں سے رابطہ ناگزیر تھا۔ اس لیے اس بات کا پورا امکان ہے کہ کولمبس نہ صرف مسلم جہاز رانوں سے ملا تھا بلکہ اس نے ان کے علوم اور بحری سفر میں مہارت کا فائدہ بھی اُٹھایا۔ اس نے ان کے نقشے دیکھے تھے اور لازمی بات تھی اس نے شریف ادریسی کا بنایا ہوا دنیا کا نقشہ بھی دیکھا تھا جس میں جزائر کریبین کے ساتھ امریکا کا ساحل بھی واضح ہے۔

اس کے بعد کولمبس کس طرح دعویٰ کر سکتا تھا کہ وہ مغرب کی طرف سفر کر کے ہندوستان تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ جب کہ یہ کام زیادہ مغرب میں رہنے والی اور جہاز رانی میں ماہر قوم یعنی وائی کنگز بھی نہیں کر سکے تھے۔ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں..... کہ وائی کنگز شمالی امریکا میں نیو فاؤنڈ لینڈ تک جا چکے تھے اور اس کا ذکر تاریخی دستاویز میں ملتا ہے۔ مگر شمالی اوقیانوس کے طوفانی مزاج کی وجہ سے بار بار اس طرف جانے کی ہمت نہیں کر سکے تھے۔ جب وائی کنگز یا نارمن نسل کے لوگ آ کر انگلینڈ اور آئرلینڈ میں آباد ہوئے تب بھی ان کو پتا تھا کہ اوقیانوس کے پار ایک بہت بڑی زمین ہے۔

اس لیے نئی دنیا اتنی بھی اجنبی نہیں تھی۔ بس اس زمانے میں جہاز رانوں کے پاس ایسے ذرائع نہیں تھے کہ وہ اوقیانوس کو آسانی سے پار کر سکتے۔ مسلم جہاز راں یہ کام کر چکے تھے۔ مگر وہ اس کامیابی کو دنیا کے سامنے نہیں لا سکے اور کسی مسلم ملک نے اس طرف توجہ بھی نہیں دی تھی ورنہ یہ ممکن ہے کہ آج یہ دونوں براعظم مسلمانوں کے قبضے میں ہوتے۔ اور انکل سام کا وجود ہی نہ ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر مسلمان ایک سو سال اور اسپین میں رہ جاتے تو امریکا کی دریافت کا سہرا ان کے سر بندھتا اور آج یہاں بھی مسلمانوں کی حکمرانی ہوتی۔ لیکن تقدیر کا فیصلہ کچھ اور تھا۔

کولمبس پوری تیاری کر کے جا رہا تھا تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ مسلمانوں کے بنائے مستند ترین نقشوں کو نظر انداز کر دیتا۔ لیکن دوسری طرف اسے معلوم تھا کہ اسپین میں مسلمانوں سے نفرت کی جاتی تھی اور اگر وہ مسلم نقشوں کا ذکر کر کے نئی دنیا کی طرف جانے کی بات کرتا تو اس کی مدد سے انکار کر دیا جاتا۔ اس لیے اس نے ہندوستان کا شوشہ چھوڑا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اسپین کی حکومت خود اس نئی دنیا تک جانے کے لیے بے تاب تھی۔ کم سے کم ملکہ ازابیلا اس بارے میں اپنا ذہن بنا چکی تھی۔ اور اس نے کھل کر کولمبس کی مدد کی یہی نہیں بلکہ پادریوں کی مخالفت کے باوجود اسے سرمایہ اور بحری جہاز فراہم کیے تھے۔ کولمبس اور نئی دنیا میں پہنچنے والے ہسپانوی ملکہ ازابیلا کے اتنے شکر گزار تھے کہ آج درجنوں شہروں اور قصبوں کا نام اس ملکہ کے نام پر ہے۔ اس نے اسپین کو ختم ہونے سے بچا لیا تھا۔ نئی دنیا کی دولت نے اسپین کو چند سال میں یورپ کا طاقت ور ترین ملک بنا دیا تھا۔ حالاں کہ صنعتی انقلاب اور سائنس کے معاملے میں یہ باقی یورپ سے بہت پیچھے تھا۔ آنے والی تین صدیوں تک اسپین اسی دولت پر چلتا رہا جو جنوبی امریکا سے بحری جہازوں میں بھر بھر کر لائی جا رہی تھی۔ اس کا اندازہ صرف اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک وقت میں سونے اور چاندی سے بھرے چالیس چالیس بحری جہاز اسپین کی طرف سفر کرتے تھے اور آج بھی بحیرہ اوقیانوس کی گہرائیوں میں ایسے سیکڑوں جہاز ڈوبے پڑے ہیں جو سونے چاندی کے وزن کی زیادتی سے ڈوب گئے تھے۔

وہی وحشی اسپینی جو مسلمانوں کے جانے کے بعد آپس میں لڑ مرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کے حکمرانوں نے نہایت ہوشیاری سے ان کی وحشت کا رُخ نئی دنیا کی طرف موڑ دیا۔ اسپین سے لوگ بحری جہازوں میں بھر بھر کر نئی دنیا کا رُخ کرنے لگے تھے۔ جہاں وہ اپنے وحشی جذبوں کی تسکین کے ساتھ بے شمار دولت بھی حاصل کر سکتے تھے۔ ساتھ ہی وہ اپنے لیے نئی زمینیں بھی حاصل کرتے۔ جہاں جہاں ان کے قدم پہنچے مقامی لوگ صفحہ ہستی سے نابود ہوتے چلے گئے تھے۔ ان کی زمینوں پر اسپین سے آنے والوں نے اپنی بستیاں آباد کی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ لوگ مقامی نسل کے مردوں کو مار دیتے تھے اور ان کی عورتوں پر قبضہ کر کے ان سے اپنی نسل آگے بڑھانے کا کام لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک صدی کے اندر اندر اسپینیوں کی تعداد مقامی لوگوں سے تجاوز کر گئی تھی۔ مگر اس کا ان کو نقصان بھی ہوا تھا۔ مقامی عورتوں کی شمولیت سے ایک نئی نسل وجود میں آئی اور اسپینی پہلے کی طرح سفید فام نہیں رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جلد انہوں نے خود کو سفید فام نسل سے خارج سمجھ لیا تھا اور آج جنوبی امریکا سے لے کر شمالی امریکا میں کیلیفورنیا اور فلوریڈا تک میں آباد اسپینش نژاد باشندے خود کو سفید فام نہیں سمجھتے...... بلکہ وہ خود کو رنگ دار کہتے ہیں۔

کرسٹوفر کولمبس نے اتنا بڑا کام کیا اور اس نے بحیرہ اوقیانوس کو عبور کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ لیکن اس کے بعد وہ منظر عام سے غائب ہو گیا۔ اسے قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس پر کرپشن کے الزامات لگے۔ اس کا سگا بھائی اور جوان بیٹا نئی دنیا میں زندگی ہار گئے اور اسے بڑھاپے میں جا کر اپنی ذاتی دولت واپس ملی جس کا اب اس کے پاس کوئی مصرف نہیں تھا۔ شاہان اسپین نے اس سے جو وعدے کیے تھے وہ راکھ ثابت ہوئے اور وقت کا ایک تیز جھونکا ان کو اڑا کر لے گیا تھا۔ اس کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا۔ اسے احساس ہوا تھا کہ دھوکا دینے والے کو دھوکا ہی ملتا ہے اور اس کھیل میں زبردست ہی کامیاب ہوتا ہے۔ یقیناً شاہان اسپین زبردست تھے۔

کرسٹوفر کولمبس اکیلا تھا اور اسپین والے زبردست تھے اس لیے وہ خسارے میں رہا اور جب اس سے کام نکل گیا۔ نئی دنیا کی دریافت مکمل ہو گئی۔ راستے سمجھ میں آ گئے۔ اسپین کے جہاز ران بحیرہ اوقیانوس میں جہاز رانی کے قابل ہو گئے۔ انہوں نے جزائر کریبین اور جنوبی امریکا کے ساحل کے ساتھ بستیاں بھی بسا لیں تو ان کو کولمبس کی مزید ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ لہٰذا انہوں نے اسے الگ کر دیا اور جب اس کی طرف سے احتجاج کا خطرہ ہوا تو اسے اُٹھا کر جیل میں ڈال دیا۔

اسپین کے لالچی حکمرانوں کو ایک خطرہ اور بھی تھا۔ ابھی تک اس نئی دنیا پر صرف اسپین کی اجارہ داری تھی لیکن ان کو معلوم تھا جہاز رانی میں دوسری یورپی اقوام ان سے کم نہیں بلکہ پرتگالی اور انگریز جہاز راں ان سے کہیں بہتر ہیں۔ بعد میں ان ہی لوگوں نے اصل میں ہندوستان کی طرف جانے والے راستے ڈھونڈ نکالے تھے جو افریقا کے اوپر سے چکر لگا کر اور بحیرہ ہند سے ہو کر گزرتا تھا۔

اسپین کے شاہوں کو خطرہ محسوس ہوا کہ ان کی وعدہ خلافیوں سے دل برداشتہ ہو کر کولمبس کہیں کسی اور یورپی ملک کا رُخ نہ کر لے اور ان کو اس نئی دنیا تک لے جائے۔ جہاں ابھی اسپین والوں کا اقتدار اتنا مضبوط نہیں تھا۔ اگر کوئی اور یورپی طاقت وہاں تک رسائی حاصل کر لیتی تو وہ لازمی طور پر اپنا حصہ چاہتی اور اس طرح اسپین ایک جنگ میں کود جاتا جس کا فی الحال وہ متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ جنگی لحاظ سے فرانس، پرتگال اور برطانیہ اسپین سے کہیں زیادہ مضبوط تھے۔ آنے والے دنوں میں جب بھی اسپین کا مقابلہ کسی یورپی ملک سے ہوا اس نے ہمیشہ شکست ہی کھائی۔

اسپین کے حکمران چاہتے تھے کہ کسی اور یورپی ملک کی نئی دنیا تک رسائی سے پہلے وہاں کے زیادہ سے زیادہ علاقوں پر قابض ہو جائیں تاکہ ان کا حصہ زیادہ ہو۔ اس کے لیے کولمبس کو روکنا لازمی تھا۔ اسپین والوں کے علاوہ وہی اس نئی دنیا تک کسی کو لے جا سکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے اسے جیل میں ڈال دیا اور جب تک اسپینی جزائر کریبین، کیوبا اور جنوبی امریکا کے بڑے حصے پر قابض نہیں ہو گئے تھے انہوں نے کولمبس کو جیل سے نہیں نکالا تھا۔ وہ میکسیکو اور موجودہ کیلیفورنیا تک قابض ہو گئے تھے۔ پھر نئی دنیا سے حاصل ہونے والی دولت سے بھی اسپین نے خود کو مضبوط کر لیا تھا۔ سب سے بڑھ کر انہوں نے نئی دنیا میں وہ سارے نشانات مٹا دیے تھے جن سے پتا چلتا کہ ان سے پہلے کون کون سی اقوام وہاں تک رسائی حاصل کر چکی تھیں۔ بعد میں وہاں جانے والی دوسری یورپی اقوام کو کچھ پتا چلا بھی تھا تو وہ اس دھوکے میں شامل ہو گئیں اور تاریخ کے سچ کو جھوٹ کے پردے میں چھپا دیا گیا۔

لیکن جھوٹ کا سکہ ہمیشہ نہیں چلتا...، آج نہیں تو کل، کبھی نہ کبھی اس جھوٹ کا پردہ چاک ہو جائے گا کہ کولمبس ہندوستان دریافت کرنے کے ارادے سے بحیرہ اوقیانوس کے سفر پر روانہ نہیں ہوا تھا اور اتفاق سے امریکا دریافت کر بیٹھا تھا۔ اس سلسلے میں سچ اگر کچھ اور ہے تو وہ بھی تو سامنے آئے گا۔ جھوٹ کاغذ کی ناؤ کی طرح ہے جو پانی میں زیادہ دیر نہیں تیر پاتی اور... بلآخر ڈوب جاتی ہے۔ یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ کولمبس ہندوستان کی تلاش میں نکلا تھا یا نئی دنیا تک جانے کے ارادے سے نکلا تھا۔

زندہ رہنے کی للك ہر ذی روح میں ہوتی ہے۔ اس میں بھی تھی۔ وہ ماں بھی تھی اس لیے اپنی زندگی کے ساتھ اپنے بچّوں کی زندگی کو بھی محفوظ رکھنا چاہتی تھی؛ مگر قاتل لہریں مسلسل اسے موت کی طرف دھکیل رہی تھیں کہ اس سمندری تاجر کی نظر ان پر پڑگئی۔ ہر انسان کے اندر رحم کا جذبہ پرورش پاتا رہتا ہے۔ وہ کسی بھی ذی روح کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اس سمندری تاجر کے اندر بھی یہی جذبہ تھا۔ اسی لیے اسے اس "ماں" پر رحم آگیا؛ مگر وہ جانتا تھا کہ اس قوی ہیکل درندے کو ٹرالر پر سوار کرنا اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ اور وہ ان ماں بچّوں کو مرتے بھی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس کا حل کیا نکلا؟

مدد پُرخطر

ظفر سعید یوسفی

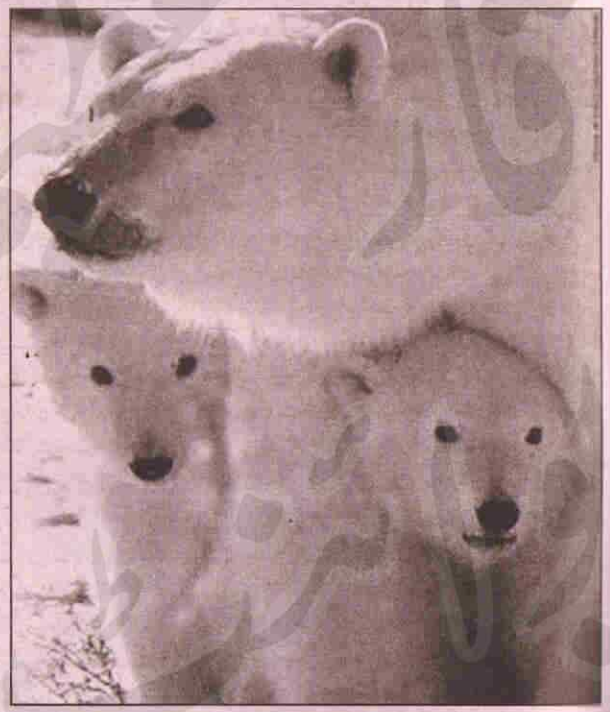

سمندری لہروں پر کی گئی جدوجہد کی دلچسپ کتھا

سمندر پُرسکون ہو رہا تھا میں نے جیمس بارلو سے کہا۔ "سمندر پر نظر رکھنا یہاں اس موسم میں بھی برف کے تودے مل جاتے ہیں۔"

"تم فکر مت کرو۔" کشتی کے اگلے حصے سے پائلٹ کرتے جیمس نے چلا کر جواب دیا۔ میں عقبی حصے میں موجود ایندھن کے ڈرم رسی سے باندھ رہا تھا۔ اگرچہ یہ پہلے بھی بندھے ہوئے تھے لیکن میں اس بات کو یقینی بنا رہا تھا کہ یہ کسی صورت آزاد نہ ہونے پائیں۔ تقریباً سولیٹر ایندھن والے یہ ڈرم لڑھکنے کی صورت میں کشتی کو غیر متوازن کر سکتے تھے اور کشتی کے اُلٹنے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ ہم جس سمندر میں سفر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتے رہتے تھے کسی حادثے کی صورت میں اس میں تیرا کی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ پانی کا درجہ منفی دو ڈگری سینٹی گریڈ سے اوپر نہیں آتا تھا۔ اس سرد ترین پانی میں کوئی انسان دس منٹ سے زیادہ نہیں گزار سکتا تھا اور یہ اس کی جان لے لیتا۔ اس لیے ہم بہت محتاط رہتے تھے۔

میرا نام جیڈ مارکس ہے اور میں ایک چھوٹا بزنس مین ہوں۔ میرا کام گرین لینڈ میں کام کرنے والے مختلف اداروں کو ایندھن کی سپلائی کا ہے اور میرے پاس ایک چھوٹا باؤزر ہے۔ کینیڈا کے انتہائی شمال میں نیوفاؤنڈ لینڈ کے ساحل پر ایک چھوٹا سا شہر نائن ہے۔ یہ اس شہر کا نام ہے اس سے مراد نمبر نہ لیا جائے۔ اس چھوٹے سے ساحلی شہر کا یہ نام کینیڈا کے قدیم باشندوں نے رکھا تھا۔ ایک زمانے میں یہاں ان کی بستی تھی لیکن اب ایک چھوٹا سا جدید شہر ہے یہاں زیادہ تر وہ بزنس مین رہتے ہیں جو گرین لینڈ اور آرکٹک سرکل میں کام کرنے والے تحقیقاتی اداروں کو ساز و سامان سپلائی کرتے ہیں۔ ان میں ایک میں بھی ہوں۔ میں شادی شدہ ہوں اور میرے دو بچے ہیں۔ جیمس میرا پارٹنر ہے اور وہ اکیلا رہتا ہے۔ ایک بار شادی کے ناکام تجربے کے بعد اس نے کانوں کو ہاتھ لگا لیا تھا حالانکہ میری بیوی مارین اسے اکساتی رہتی تھی کہ وہ دوبارہ شادی کر لے۔

شمالی آرکٹک سمندر سال میں صرف پانچ چھ مہینے کے لیے برف سے آزاد ہوتا ہے۔ اس دوران میں ہمارا کام چلتا تھا۔ باقی چھ مہینے ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے تھے لیکن یہ اچھا نفع بخش کام تھا۔ ہم اتنا کما لیتے کہ باقی چھ مہینے آرام سے گھر بیٹھ کر کھاتے تھے۔ میری بیوی مارین کا تعلق امریکا سے ہے اور کبھی کبھی ہم سردیاں گزارنے اس کے ماں باپ کے گھر جارجیا چلے جاتے تھے وہاں سردیوں میں بھی موسم نائن کی نسبت بہت اچھا ہوتا تھا، آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ منفی بیس سے تیس ڈگری سینٹی گریڈ کے مقابلے میں صفر یا اس سے ذرا اوپر کا درجہ حرارت اچھا ہی ہوتا ہے۔ میرے سسر کا سبزیوں کا فارم تھا اور میں اس کا ہاتھ بٹا دیتا تھا اس لیے وہ میری آمد سے خوش ہوتا تھا۔

اپریل سے ستمبر تک کا وقت ہوتا تھا جب ہم سپلائی کرتے تھے۔ اس وقت سمندر پر جمی برف پگھل جاتی تھی اور ہمارا چھوٹا سا باؤزر اس میں سفر کر سکتا تھا۔ یہ چالیس فٹ لمبی کشتی ہے۔ جس میں تقریباً پانچ ٹن تک کا وزن بار کیا جا سکتا ہے۔ گرما کے آغاز سے پہلے ہی ہمارے پاس آرڈر آنا شروع ہو جاتے تھے اور ہم اس مناسبت سے مختلف اقسام کے ایندھن اور چکنے تیل کی خریداری شروع کر دیتے تھے۔ نائن میں بندرگاہ پر ہمارا ایک چھوٹا سا گودام تھا جس میں سامان رکھا جاتا تھا۔ وہیں سے ہم اسے کشتی پر بار کر کے منزل تک لے جاتے تھے۔

جون کے آخر میں ہمیں گرین لینڈ کی بندرگاہ ٹاسی لاق تک جانا تھا۔ یہ گرین لینڈ کے مشرقی ساحل پر آرکٹک سرکل سے ذرا ہی نیچے واقع ہے اور اس تک جانے کے ہمیں کیپ فیئر ویل سے گھوم کر جانا تھا اور یہ سارا سفر کوئی دو ہزار سمندری میل کا تھا۔ ہمیں دو دن جانے میں اور دو دن آنے میں لگ جاتے۔ روانگی کے وقت ہماری کشتی پوری طرح مختلف اقسام کے ایندھنوں اور چکنا کرنے والے تیلوں سے بھری ہوئی تھی۔ باؤزر کے نیچے ٹنکی تھی جن میں ڈیزل، پیٹرول اور مٹی کا تیل ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اوپر ڈرموں میں بھی کئی طرح کا تیل موجود ہوتا تھا۔ عرشے پر موجود ڈرموں کو باندھ کر رکھنا پڑتا تھا۔ کیونکہ سفر طویل تھا اس لیے ہم نے ایک نوجوان باجا میور کو ساتھ لے لیا۔ یہ مقامی نسل سے تھا لیکن اسے کشتیوں پر کام کرنا آتا تھا۔ وہ گرمیوں میں کام کر کے اتنا کما لیتا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ سکون سے سردیاں گزار سکے۔

گرمیوں میں آرکٹک سمندر کے آس پاس جمی برف پگھل جاتی ہے لیکن ساتھ ہی یہ سارا سمندر برف کے تیرتے ٹکڑوں سے بھر جاتا ہے جنہیں آئس برگ کہتے ہیں۔ اس سمندر میں سفر کرنے والوں کے لیے اس سے زیادہ خطرناک چیز اور کوئی نہیں ہوتی ہے کیونکہ کسی تصادم کی صورت میں یہ بحری جہاز یا کشتی کی پگلی چادر کو توڑ ڈالتے ہیں اور وہ ڈوب جاتا ہے۔ ہمارے باؤزر کی تو کوئی اوقات ہی نہیں تھی یہ آئس برگ بڑے سے بڑے بحری جہاز کو ڈبو سکتے ہیں۔ مشہور زمانہ ٹائی ٹینک ایسے ہی ایک آئس برگ سے ٹکرا کر ڈوبا تھا۔ یہ آئس برگ کہاں سے آتے ہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سرما میں پورے آرکٹک سرکل میں شدید برف باری ہوتی ہے اور اتنی برف پڑتی ہے کہ اس سے بڑے بڑے پہاڑ وجود میں آجاتے ہیں۔ یہ پہاڑ گرمیاں آنے پر ٹوٹ کر سمندر میں گر جاتے ہیں، سمندروں کی برف پہلے ہی پگھل رہی ہوتی ہے اور یہ برف کے پہاڑ سمندری رو کے ساتھ جنوب کی طرف سفر کرتے ہیں۔ آرکٹک سے نکلنے والے سرد پانی کے دھارے ان آئس برگس کو جنوب کی طرف لے جاتے ہیں اور

جیسے جیسے یہ گرم سمندر میں پہنچتے ہیں تو پگھلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ عام طور سے یہ نیوفاؤنڈ لینڈ کے پاس پہنچتے پہنچتے مکمل طور پر پگھل جاتے ہیں لیکن کچھ بہت بڑے آئس برگس اس سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔

باؤزر کو کسی آئس برگ کی ٹکر سے بچانے کے لیے سفر کے دوران ایک آدمی ہمہ وقت سامنے نظر رکھتا ہے۔ اگر کوئی نظر رکھنے والا دستیاب نہ ہو تو ہم سفر کرنے کے بجائے رک کر لنگر ڈال دیتے ہیں لیکن بغیر نگرانی کے سفر کا خطرہ مول نہیں لیتے کیونکہ بعض اوقات ایک لمحے کی غفلت ہمیشہ کے لیے پچھتاوے کا باعث بن سکتا ہے۔ ہم نے طے کیا ہوا تھا کہ سفر کے دوران جب ایک آرام کر رہا ہو اور دوسرا محسوس کرے کہ اسے بھی آرام کی ضرورت ہے تو وہ کشتی روک کر لنگر گرا دے۔

اگر طوفان نہ آیا ہو تو شمالی سمندر عام طور سے کسی جھیل کی طرح پُرسکون رہتا ہے۔ اس وقت بھی سمندر پُرسکون تھا۔ نائن سے نکلنے کے بعد ہم نے کشتی کے بادبان کھول دیے تھے تاکہ انجن پر انحصار کم کیا جائے۔ صرف انجن کی مدد سے سفر کرنے سے اخراجات بہت بڑھ جاتے تھے۔ کیپ فیئر ویل تک ہم آسانی سے بادبان کی مدد سے سفر کر سکتے تھے کیونکہ ہوا عام طور سے موافق ملتی ہے۔ البتہ کیپ کے بعد سمندر میں ہمیں سرد دھارا کا سامنا کرنا پڑتا جو کشتی کو جنوب کی سمت دھکیلتی اور اس کے خلاف سفر کے لیے ہمیں انجن چلانے پڑتے۔ ساحل کے ساتھ سفر ممکن نہیں تھا کیونکہ گرین لینڈ کے ساتھ پورا ساحل زیرِ آب چٹانوں سے بھرا ہوا ہے اس لیے ہمیں کوئی چالیس میل تک کھلے سمندر میں نکلنا پڑتا۔

سفر کے دوسرے دن ہم کیپ فیئر ویل تک پہنچ گئے تھے۔ کشتی میں اور جیمس ہی چلا رہے تھے لیکن باجا کی وجہ سے ہمیں دوسرے کاموں میں سر نہیں کھپانا پڑتا تھا اس لیے ہمارا سفر بغیر رکے جاری تھا۔ میں اور جیمس باری باری چھ گھنٹے کی ڈیوٹی دیتے اور چھ گھنٹے آرام کرتے۔ کیپ سے نکلتے ہی آرکٹک سرکل سے نیچے کھلے سمندر میں آنے پر ہمیں سرد پانی کی رو سے واسطہ پڑا۔ یہ بڑا طاقت ور دھارا ہے جو چار سے چھ ناٹیکل میل فی گھنٹے کی رفتار سے جنوب کی طرف بہتا ہے۔ یہ دھارا یورپ کے ساتھ بہتا ہوا افریقا سے مڑ کر کریبین کی پر پہنچ کر ختم ہوتا ہے۔ شمال سے اس کے ساتھ برف کے ٹکڑے بھی چلے آرہے تھے لیکن ان میں کوئی خطرناک آئس برگ نہیں تھا، یہ چھوٹے ٹکڑے تھے جو سمندر کی جمی سطح سے

> مشہور فرانسیسی ادیب والٹیئر 1727ء میں انگلستان پہنچا تو اس نے دیکھا کہ انگریز فرانس کے سخت خلاف ہیں اور کسی بھی فرانسیسی کی جان کی خیر نہیں۔ ایک دن وہ لندن کے ایک بازار میں ٹہل رہا تھا کہ یکلخت اس کے اردگرد لوگ جمع ہو کر مخالفانہ نعرے لگانے لگے۔ والٹیئر نے ہجوم کے غیظ و غضب کی قطعی پروا نہیں کی اور بڑے اطمینان سے کہا: ”انگریزو! تم مجھے اس لیے مارنا چاہتے ہو کہ میں فرانسیسی ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ، کیا میرے لیے اتنی سزا کافی نہیں تھی کہ میں انگریز پیدا نہ ہوا۔“ یہ وار کارگر ہوا اور اس ہجوم نے والٹیئر زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔
>
> مرسلہ: تسنیم اسلم، ڈیرہ مراد جمالی

الگ ہو جاتے ہیں۔ صبح کی روشنی میں نیلگوں سمندر پر سفید برف کے ٹکڑے عجیب خوب صورتی پیدا کر رہے تھے۔ یہ بتدریج دھارا کے ساتھ شمال کی طرف جا رہے تھے اور کچھ آگے یہ پگھل کر غائب ہو جاتے۔ اس دن موسم کسی قدر گرم تھا اور فضائی درجہ حرارت چار ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔ جیمس پائلٹ کر رہا تھا اور میں عقبی حصے میں بندھے ڈرموں کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس وقت کشتی میں تقریباً بیس ہزار ڈالرز کا ایندھن موجود تھا اور اس ٹرپ میں ہمیں کم سے کم تین ہزار ڈالرز کی بچت ہوتی۔ صرف پانچ دن کی محنت کا یہ صلہ برا نہیں تھا خاص طور سے جب ہمارے پاس کام کی بھی کمی نہیں تھی۔ اس ٹرپ کے فوراً بعد ہمیں گرین لینڈ کے مغربی ساحل پر لگاتار تین سفر کرنے تھے۔ آنے والے دو مہینوں تک ہمارے پاس ایک دن کی مہلت بھی نہیں تھی۔ میں اس دوران میں اپنے بیوی بچوں سے کم ہی مل پاتا لیکن میں خوش تھا کیونکہ بزنس اچھا ہو رہا تھا۔

باجا عرشے کے اگلے حصے پر کھڑا سمندر کا نظارا کر رہا تھا جہاں صرف نیلا اور سفید رنگ تھا۔ اچانک اس نے مجھے پکارا۔ ”جیڈ! ادھر آنا یہ سمندر میں کیا ہے؟“

میں نے بتایا ہے کہ میں سمندر میں سفر کے دوران ہمیشہ محتاط رہتا ہوں اور کسی چیز کو نظر انداز نہیں کرتا اس لیے میں فوراً باجا کے پاس پہنچا۔ وہ ایک طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ دھوپ سے بچنے کے لیے اس نے آنکھوں پر ہاتھ سے چھجا بنا لیا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا لیکن مجھے کچھ مختلف نظر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں آیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”باجا کیا ہے سمندر میں؟“

”وہ اس طرف دیکھو چار پانچ ٹکڑوں کے درمیان کچھ ہلکا پیلا سا رنگ نظر آرہا ہے۔“

باجا تو جوان تھا اس کی نظر بھی اچھی تھی۔ چالیس سال کی عمر میں میری نظر اتنی اچھی نہیں رہی تھی اس لیے مجھے کوشش کے باوجود کچھ نظر نہیں آیا۔ میں نے پائلٹ روم سے آکر دوربین لی اور عرشے پر آکر اس کی مدد سے دیکھا تو مجھے فوراً ہی وہ چیز نظر آگئی جو باجا مجھے دکھانا چاہ رہا تھا۔ یہ ہلکے زرد رنگ کا جسم تھا اور برف کے ٹکڑوں کے درمیان میں تھا۔ میں نے دوربین کو واضح کیا اور میرے منہ سے نکلا۔ ”میرے خدا یہ تو برفانی ریچھ ہے۔“

باجا نے مضطرب ہوکر دوربین مجھ سے لے لی۔ وہ چند لمحے بعد بولا۔ ”ہاں یہ برفانی ریچھ ہے اور اکیلا نہیں ہے۔“

اس بار میں نے دوربین لے کر دیکھا۔ واقعی ریچھ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ دو عدد چھوٹے ریچھ بھی تھے۔ اس کا مطلب تھا یہ مادہ تھی اور اس کے ساتھ اس کے دو بچے تھے۔ یہ خاصی بڑی ریچھنی تھی۔ اس علاقے میں رہنے والوں اور سفر کرنے والوں کے لیے برفانی ریچھ اجنبی مخلوق نہیں ہوتے ہیں۔ میں نے متعدد بار ان کو نزدیک سے دیکھا ہے جب یہ خوراک کی تلاش میں بعض اوقات انسانی تنصیبات کے پاس چلے آتے ہیں جو پورے شمالی علاقے میں جابجا موجود ہیں۔ ریچھنی تیر رہی تھی اور اپنے بچوں کو بھی سہارا دے رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ ساحل سے کم سے کم سو میل دور سمندر میں کیا کر رہی تھی۔ اس دوران میں جیمس کو بھی اطلاع مل گئی تھی اور وہ کشتی روک کر باہر آگیا۔

”واقعی یہ تو ریچھنی اور اس کے بچے ہیں۔“ وہ دوربین سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھا یہ باجا مذاق کر رہا ہے۔“

”مگر یہ ساحل اور برف سے اتنی دور سمندر میں کیا کر رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”شاید یہ برف کے کسی بڑے ٹکڑے پر سوار ہوں گے اور ریچھنی کو اندازہ نہیں ہوا ہو گا کہ وہ کتنا دور نکل آئے ہیں۔ جب تک اسے اندازہ ہوتا گرمی کی وجہ سے برف کا ٹکڑا پگھل گیا ہوگا اس لیے اب یہ اپنے بچوں کے ساتھ تیرنے پر مجبور ہے۔“ جیمس نے حالات کا تجزیہ پیش کیا۔

”کیا یہ اتنا تیر لے گی؟“ باجا بولا۔ ”اس کے ساتھ تو بچے بھی ہیں۔“

”ہاں برفانی ریچھ بہت اچھے تیراک ہوتے ہیں۔“ جیمس نے لاپروائی سے کہا۔ ”یہ ضرورت پڑنے پر سینکڑوں میل تیر لیتے ہیں۔“

”وہ بڑے ریچھ ہوں گے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس کے ساتھ بچے بھی ہیں۔ یہ بچے یقیناً سینکڑوں میل نہیں تیر سکتے۔ ساحل یہاں سے کم سے کم سو میل دور ہے۔“

جیمس پائلٹ روم کی طرف جاتے جاتے رک گیا اس نے میری طرف دیکھا۔ ”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”جیمس اگر ہم ان کی مدد.....“

”اوہ.... کیا احمقانہ بات ہے۔“ جیمس میری بات کاٹ کر زور سے ہنسا۔ ”برفانی ریچھ کی مدد کا مطلب سمجھتے ہو! اس کے پاس جانا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ یہ صرف ایک ہاتھ مار کر ہماری کشتی اُلٹ دے گی۔“

جیمس کسی قدر مبالغے سے کام لے رہا تھا۔ بے شک برفانی ریچھ بہت طاقت ور ہوتا ہے۔ یہ زمین پر رہنے والا دنیا کا سب سے بڑا گوشت خور جانور ہے۔ جب یہ پوری طرح جوان ہوتا ہے تو اس کا وزن نصف ٹن ہو جاتا ہے اور اس کی اونچائی سات سے ساڑھے سات فٹ تک ہو جاتی ہے۔ شمالی امریکی سرخ ریچھ اونچائی میں برفانی ریچھ سے بڑا ہوتا ہے یہ دس سے بارہ فٹ تک اونچا ہو جاتا ہے لیکن اس کا وزن برفانی ریچھ جتنا نہیں ہوتا...... برفانی ریچھ کے وزن کی اصل وجہ وہ کئی سو کلوگرام بہت ٹھوس چربی ہوتی ہے جو اس کے جسم میں جمع ہوتی ہے اور موسم سرما میں جب شکار نہیں ملتا ہے تو یہی چربی اس کو زندہ رکھتی ہے۔ سرخ ریچھ کو کیونکہ سال کے بیشتر حصے میں کھانے کو ملتا ہے اس لیے اس کے جسم میں اتنی چربی جمع نہیں ہو پاتی ہے اور وہ زیادہ وزنی نہیں ہوتا۔

برفانی ریچھ سیل شکار کرتا ہے۔ اس میں والرس اور ہاتھی سیل تک شامل ہیں جن کا وزن نو ٹن تک ہو جاتا ہے۔ برفانی ریچھ کی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ خود سے بیس گنا وزنی ہاتھی سیل کو بھی شکار کر لیتا ہے۔ مگر اس کا پسندیدہ شکار فر سیل ہیں جو خود شکار کے چکر میں زیادہ تر زیرِ آب رہتی ہیں اور یہ سانس لینے کے لیے برف کی سطح پر گول سوراخ بنا لیتی ہیں۔ برفانی ریچھ کی قوتِ شامہ بہت تیز ہوتی ہے، یہ ایک میل کی دوری سے سیل کی بو محسوس کر لیتا ہے اور اسے تلاش کرتا اس گڑھے تک آجاتا ہے جو سیل نے سانس لینے کے لیے بنایا ہوتا ہے۔ ریچھ گھات لگا کر بیٹھ جاتا

عجیب تاریخ ہے ڈیرا غازی خان کے علاقے کی۔ اس میں غداری کی داستانیں بھی ملتی ہیں اور اس میں وطن پرستی اور قوم پرستی کے قصے بھی بھرے پڑے ہیں۔

ڈیرہ غازی خان پر کلہوڑوں کا قبضہ رہا پھر خان قلات کا قبضہ رہا۔ ان کے گورنر نے یہ علاقہ حاکم بہاولپور کو بیچ دیا۔ ان سے یہ علاقہ سکھوں نے چھینا مگر بعد میں نواب بہاولپور کو اجارے پر دے دیا۔ مطلب یہ کہ کھاؤ' کماؤ مگر اس میں سے ہمارا حصہ ہمیں دیتے رہو۔ بعد میں بہاولپور والوں نے یہ علاقہ سکھوں کو دے کر ان سے بہاول نگر کا علاقہ لے لیا۔ سکھ حکمرانی کرنے آئے تو بلوچوں نے تلواریں سونت لیں اور کھوسہ قبیلے نے یہ علاقہ سکھوں سے چھین لیا۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن انہوں نے یہ سرزمین انگریزوں کے حوالے کر دی۔ انگریزوں کو کسی جنگ کی زحمت بھی نہیں کرنی پڑی مگر بلوچوں نے پھر آزادی کی تحریکیں چلائیں' پھر حملے کیے۔ پھر غداریاں ہوئیں اور پھر بہادر مارے گئے۔ بڑی مشکل سے صلح ہوئی۔

اس کے بعد اسلحہ کی جنگ تو ختم ہوگئی پھر یہاں کے لوگوں نے انگریزوں کے خلاف عدم تعاون کی تحریک شروع کی۔ اس عدم تعاون تحریک کا لیڈر سردار محمد اسلم خان تھا۔ اس نے 1908ء میں یہ تحریک شروع کی۔ 1914ء تک وہ تحریکیں چلتی رہیں۔ 1915ء میں انگریزوں نے اسے جلاوطن کر کے یہاں سے نکال دیا۔ وہ افغانستان جا کے رہا اور فوت بھی وہیں ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں ابھی ترکِ موالات کی تحریک شروع نہیں ہوئی تھی لیکن اس نے اس سے قبل ہی یہ سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔

اقتباس: شیر دریا از رضا علی عابدی

تلاش: اظہر جمیل صدیقی

ہے اور جیسے ہی سیل سانس لینے کے لیے منہ باہر نکالتی ہے۔ برفانی ریچھ جھپٹ کر اسے پکڑ لیتا ہے اور اپنی بے پناہ قوت سے کام لیتے ہوئے اسے سوراخ سے باہر کھینچ لیتا ہے۔

برفانی ریچھ کی مادہ زیادہ بڑی اور وزنی ہوتی ہے پھر یہ بچوں والی ہو تو اس کے پاس جانا کسی طور عقل مندی نہیں۔ یہ حملہ کرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاتی ہے۔ ایک بار یہ پیچھے لگ جائے تو اس سے پیچھا چھڑانا بھی مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ برفانی ریچھ برف پر تیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے۔ غصے کی حالت میں یہ رفتار یقیناً بڑھ جاتی ہو گی۔ جیمس اس کے غصے سے ڈر کر اس کے پاس جانے سے انکار کر رہا تھا۔ یہ ریچھنی کشتی تو نہیں اُلٹ سکتی تھی لیکن قریب جانے کی صورت میں یہ اسے پناہ کے قابل سمجھ کر اس پر چڑھنے کی کوشش کر سکتی تھی اور اگر وہ کشتی پر چڑھ آتی تو ہم کہاں جاتے؟ میں نے جیمس سے کہا۔

”ٹھیک ہے ہم اس کے بالکل پاس نہیں جاتے .... لیکن محفوظ فاصلے تک تو جا سکتے ہیں۔ میں اس ریچھنی اور اس کے بچوں کی کچھ تصویریں بنانا چاہتا ہوں۔“

باجا خوش ہو گیا۔ ”واقعی یہ یادگار واقعہ ہوگا۔ میں نے آج تک کھلے سمندر میں تیرتا برفانی ریچھ نہیں دیکھا ہے۔“

جیمس ہچکچا رہا تھا لیکن ہمارے اصرار پر وہ مان گیا۔ اس نے کشتی آگے بڑھائی اور اسے نیم دائرے میں گھماتے ہوئے ریچھ کی طرف لے جانے لگا۔ وہ ٹھیک کر رہا تھا سیدھا لے جانا درست نہ ہوتا کیونکہ ریچھنی سمجھتی کہ کشتی اس پر اور اس کے بچوں پر حملہ کرنے آرہی ہے اور وہ ناراض ہو جاتی۔ جب باجا نے ریچھنی اور اس کے بچوں کو دیکھا تھا تو وہ نصف کلومیٹر کے فاصلے پر تھے۔ اتنی دور سے انہیں صاف دیکھنا ممکن نہیں تھا جب کہ درمیان میں برف کے بہت سارے ٹکڑے بھی تیر رہے تھے۔ لیکن یہ سارے ٹکڑے بہت چھوٹے تھے اور ریچھنی کے بچے بھی ان پر چڑھ کر پناہ نہیں لے سکتے تھے۔ اس لیے وہ ماں کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے اس کے سہارے تیر رہے تھے۔

جب کشتی ان کے پاس پہنچی تو اصل صورتِ حال سامنے آئی۔ ریچھنی بہت سستی سے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ بہت دیر سے اسی طرح تیر رہی تھی اور اس کی توانائی جواب دیتی جا رہی تھی۔ وہ شاید گھنٹوں نہیں بلکہ دنوں سے سمندر میں تھی اور اس کا رُخ جنوب سے شمال کی طرف تھا اس کا مطلب تھا یہ سمندر میں اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی آگے نکل گئی تھی۔ جیمس کا خیال درست تھا۔ ریچھنی شکار کے چکر میں کسی بڑے برف کے ٹکڑے پر سوار ہوئی ہوگی اور وہ اسے اس کے بچوں سمیت لے کر جنوب کی طرف سفر کرتا رہا ہوگا جب تک ریچھنی کو احساس ہوتا وہ بہت دور نکل گئی ہوگی۔ برف کا ٹکڑا پگھل گیا اور اس کے بعد سے ریچھنی اپنے بچوں سمیت جان بچانے کے لیے سمندر میں تیر رہی تھی۔

ریچھنی شاید بچوں کی وجہ سے کمزور ہو رہی تھی کیونکہ اس موسم میں جب فرسٹل سمیت تمام اقسام کی سیلوں کا شکار افراد سے ملتا ہے وہ خاصی کمزور ہو رہی تھی اور اس کے عظیم الجثہ جسم کی کھال چربی کی کمی سے کسی خالی لباس کی طرح پانی میں لہرا رہی تھی۔ اس کے دونوں بچے دودھ پینے والی عمر میں تھے اور ریچھنی کی ساری توانائی انہیں دودھ پلانے میں صرف ہو جاتی ہوگی وہ آنے والے سرما میں اپنے جسم میں چربی جمع نہیں کر پا رہی تھی۔ البتہ اس کے دونوں بچے موٹے تازے اور گول مٹول سے ہو رہے تھے۔ وہ یقیناً بم گر دودھ پی رہے تھے۔ اس وقت بھی وہ اپنی ماں کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ ان کی ننھی منی آنکھوں میں خوف و ہراس صاف نظر آ رہا تھا۔ اگر ان کی ماں ڈوب جاتی تو اس کھلے سمندر میں پھر انہیں کون بچاتا؟ ان سے زیادہ مخدوش حالت ریچھنی کی ہو رہی تھی۔ اپنی اور اپنے بچوں کی جان بچانے کے لیے اس نے اپنی توانائی کا بیشتر حصہ استعمال کر لیا تھا اور اس وقت تھکے ہارے انداز میں تیر رہی تھی۔ بلکہ تیر کیا رہی تھی خود کو سمندر کے اوپر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ڈوب گئی تو اس کے بچے بھی ڈوب جائیں گے۔ بچوں کو تیرنا آتا تھا لیکن وہ چھوٹے ہونے کی وجہ سے زیادہ دیر تیر نہیں سکتے تھے اور شاید چند گھنٹوں میں ڈوب کر ہلاک ہو جاتے۔ یہ بھی ممکن تھا کوئی کلر وہیل جو اکثر اس علاقے میں سیل کے شکار کے لیے منڈلاتی رہتی تھی ان بچوں کو اپنا لقمہ بنا لیتی۔

کشتی کو پاس پا کر ریچھنی کسی قدر چوکنا ہوئی تھی لیکن اس نے کشتی کی طرف آنے یا جارحانہ انداز اپنانے کی کوشش نہیں کی وہ بس محتاط انداز میں ہماری طرف دیکھتی رہی۔ جیمس نے ریچھنی سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر کشتی روک دی۔ یہ محفوظ فاصلہ تھا اگر ریچھنی کشتی کی طرف آنے کی کوشش کرتی تو جیمس فوراً اسے آگے لے جاتا۔ مگر ریچھنی نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ میں اندر کیبن سے اپنا جدید ڈیجیٹل کیمرا لے آیا تھا۔ یہ بہت شارپ اور بہترین ریزلیوشن کے ساتھ تصویریں اتار سکتا تھا۔ میں ریچھنی اور اس کے بچوں کی تصویر بنانے لگا۔ بہ ظاہر تو میں اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن میرے اندر کہیں اضطراب کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ مجھے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ کچھ دیر بعد ریچھنی ڈوب جائے گی تب اس کے بچوں کا کیا ہوگا۔ لازمی بات ہے ماں کے سہارے کے بغیر وہ بھی زیادہ دیر نہیں تیر سکیں گے اور ڈوب کر مر جائیں گے۔

باجا اور جیمس بھی اب بچوں اور ماں کو دیکھ رہے تھے۔ باجا نے مجھ سے فرمائش کی۔ ''ان تصویروں کا ایک سیٹ مجھے بھی دینا۔''

''ضرور میں ایک سیٹ تمہیں اور ایک جیمس کو دوں گا۔'' میں نے وعدہ کیا تو جیمس نے منہ بنایا۔

''مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیا اب ہم روانہ ہوں؟ ہم پہلے ہی تاخیر کر چکے ہیں۔''

جیمس کی بات سن کر مجھے دھچکا لگا تھا۔ ہم یہاں اتنے نزدیک آ کر اور صرف ان جانوروں کو دیکھ کر چلے جائیں۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ جانور تھے لیکن زندہ رہنے کا حق تو ان کو بھی تھا۔ میری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تو جیمس خود میرے پاس چلا آیا اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''جیڈ ہمیں جانا ہے۔ ابھی ہمیں واپسی کا سفر بھی کرنا ہے۔''

میں نے ریچھنی اور اس کے بچوں کی طرف دیکھا اور جیمس سے کہا۔ ''کیا ہم ان کی مدد نہیں کر سکتے؟''

''مدد۔'' وہ چلا اٹھا۔ ''تمہارا دماغ درست ہے ہم اس خونخوار درندے کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔ کیا تم انہیں کشتی پر سوار کرانا چاہ رہے ہو؟'' جیمس کا لہجہ آخری جملے پر طنزیہ ہو گیا تھا۔

''نہیں ..... لیکن میرا دل نہیں مان رہا کہ ان کو یہاں اس بے کسی کی حالت میں چھوڑ کر چلا جاؤں۔ ہم ان کی کوئی نہ کوئی مدد تو کر سکتے ہیں۔''

''جیڈ پاگل مت بنو۔ ان کی مدد تو وائلڈ لائف والے بھی نہیں کر سکتے ..... شاید تمہیں علم نہیں ہے ہر سال سو کے قریب برفانی ریچھ اور ان کے بچے اسی طرح سمندر میں دور نکل جاتے ہیں، اور پھر ڈوب کر ہلاک ہو جاتے ہیں کوئی ان کی مدد نہیں کرتا ..... جانوروں کے لیے کام کرنے والے بھی بس ان کی مووی بناتے ہیں لیکن ان کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کرتے ہیں۔''

''انہوں نے اپنی مووی بیچنا ہوتی ہے۔'' میں نے خفگی سے کہا۔ ''لیکن مجھے کوئی لالچ نہیں ہے، میں صرف ہمدردی

کے جذبے کے تحت ان کی جان بچانا چاہتا ہوں۔''

''محترم اور ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہم تو اس کے نزدیک بھی نہیں جا سکتے ہیں۔'' جیڈ بولا۔ ''اس کے نزدیک جانے کا مطلب سمجھتے ہو۔ یہ کشتی کو پناہ گاہ سمجھ کر اس پر چڑھنے کی کوشش کرے گی۔''

میں جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن ہم اس سے ہٹ کر بھی تو کچھ کر سکتے تھے۔ میں نے جیمس سے التجا کی۔ ''پلیز دوست میرا ساتھ دو ممکن ہے ہم انہیں بچانے میں کامیاب ہو جائیں۔''

جیمس میرا پارٹنر ہی نہیں میرا دوست بھی ہے اور وہ سمجھ گیا کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے اور میں ہر صورت ان برفانی ریچھوں کی مدد کروں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے کوئی بھی مشکل برداشت کرنی پڑے۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے دوست اگر تمہارے ذہن میں کوئی قابل عمل پلان ہے تو مجھے بتاؤ۔''

''اگر ہم کسی طریقے سے ریچھنی کو مجبور کر دیں کہ وہ ہمارے پیچھے آئے تو شاید اس کی اور اس کے بچوں کی جان بچ سکتی ہے۔''

''ہم کس طرح مجبور کر سکتے ہیں؟''

ریچھنی کی حالت ہر گزرتے لمحے خراب ہوتی جا رہی تھی، اس کے اگلے چوڑے پنجے ساکت تھے اور پاؤں بہت سست روی سے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے تاکہ وہ پانی کی سطح پر برقرار رہے ڈوب نہ جائے۔ میں، جیمس اور باجا سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگے جس سے ریچھنی کی جان بچ جائے۔ مگر خاصی دیر غور کے بعد کوئی قابل عمل ترکیب سمجھ میں نہیں آئی تھی، باجا نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ ریچھنی کی طرف رسی اور لائف رنگ پھینکی جائے تاکہ وہ اس کے مدد سے تیر سکے اور ہم اسے کشتی کی مدد سے کھینچ کر ساحل تک لے جا سکیں۔ ہوا بھرا ہوا ربر کا بنا گول رنگ اس لحاظ سے کارآمد تھا کہ ریچھنی اس پر پنجے گاڑنے کی کوشش کرتی اور وہ پھٹ کر بیکار ہو جاتا۔ اس لیے باجا کی تجویز مسترد کر دی دوسرے اس میں خطرہ تھا کہ رسی ریچھنی یا اس کے بچوں کے گرد لپٹ کر انہیں موت کے گھاٹ نہ اتار دے کیونکہ وہ رسی کو اس طرح تو نہیں پکڑ سکتے تھے جیسے کوئی انسان پکڑتا۔ تنگ آ کر جیمس نے کہا۔

''میرا خیال ہے ہم سوائے یہاں وقت برباد کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔''

اس وقت ریچھنی اپنے تھکے جسم کو سہارا دینے کے لیے ایک چھوٹے سے برف کے ٹکڑے کو پکڑے ہوئے تھی اور وہ بھی تیزی سے گھل رہا تھا۔ جیمس کا اصرار تھا کہ اب ہمیں ریچھنی اور اس کے بچوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر روانہ ہو جانا چاہیے۔ میں اب بھی اس کے لیے تیار نہیں تھا اور میں کوئی ایسی قابل عمل ترکیب سوچنے کی کوشش کر رہا تھا جس کی مدد سے ان کو بچا سکوں۔ اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے۔ ہم اپنی منزل یعنی ٹاکسلی لاق سے سو میل دور تھے۔ ویسے گرین لینڈ کا ساحل ہم سے چالیس میل مغرب میں بھی تھا لیکن وہاں تک جانا دشوار تھا یہ پورا ساحل چٹانوں سے بھرا ہوا تھا۔ سوچتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔

''جیمس اگر کسی طرح سے ریچھنی سے اس کے بچے حاصل کر لیے جائیں تو ہم اسے اپنے پیچھے آنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔''

جیمس نے یوں میری طرف دیکھا جیسے اسے میری دماغی حالت پر شبہ ہو۔ ''ریچھنی سے بچے حاصل کر لیے جائیں لیکن کیسے؟''

باجا بھی اس تجویز پر پریشان ہو گیا تھا۔ ''یہ بہت خطرناک ہوگا ریچھنی غصے میں حملہ بھی کر سکتی ہے۔''

''یہی تو میں چاہتا ہوں وہ حملہ کرنے کے لیے کشتی کی طرف آئے گی اور یوں ہم اسے اپنے پیچھے آنے پر مجبور کر دیں گے۔''

''ہم اسے مجبور کر دیں گے۔'' جیمس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''پورے سو میل تک مجبور کرتے رہیں گے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے کہا۔

''تم اس کی حالت دیکھ رہے ہو یہ بے چاری تو سو گز تیرنے کے قابل نہیں لگ رہی ..... سو میل دور تک کیسے جائے گی؟''

باجا نے جیمس کی تائید کی۔ ''اس میں بالکل طاقت نہیں ہے ایسا لگ رہا ہے اسے بہت دنوں سے کچھ کھانے کو نہیں ملا ہے۔''

''اسی وجہ سے اس نے شکار کی خاطر گرمائیں سمندر پر آنے کا خطرہ لیا اور اپنے بچوں سمیت بہہ گئی۔'' جیمس نے ریچھنی کی طرف دیکھا۔ ''یہ بالکل سو میل تک نہیں تیر سکتی ہے۔''

میں نے جیمس کی بات پر غور نہیں کیا میرا ذہن باجا کی بات میں الجھ گیا تھا۔ ریچھنی نے کئی دن سے کچھ کھایا نہیں تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس لیے وہ بھوکی اور ناتواں تھی۔ میں نے کہا۔ ''اگر ہم اسے کھانے کو دیں تو اس میں توانائی آجائے گی اور تب یہ سومیل تک تیر سکے گی۔''

''کھانے کو دیں۔'' جیمس نے میری بات پر غور کیا۔ ''ہمارے پاس سیل کا گوشت نہیں ہے۔''

''سیل نہیں ہے تو کیا ہوا ہمارے پاس ٹونا تو ہے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ٹاکلی لاق میں ہمارا ایک مشترکہ گورنی میٹ تھا اس نے ہم سے ٹونا مچھلی کی فرمائش کی تھی اور ہم اس کے لیے پورا ایک کریٹ لے کر جارہے تھے۔ اس میں کوئی چار پانچ کلوگرام وزنی نصف درجن ٹونا مچھلیاں تھیں۔ گورنی نے پورے گرما کا کوٹہ منگوایا تھا۔ ''میرا خیال ہے برفانی ریچھ ہر قسم کا گوشت شوق سے کھالیتا ہے۔''

''خاص طور سے جب وہ بھوکا ہو۔'' باجا نے تائید کی۔ ''گرین لینڈ پر یہ کچرے کے ڈبوں میں بچا کچا گوشت بھی چاٹ کر کھا جاتے ہیں۔''

جیمس راضی ہو گیا لیکن ابھی کچھ مسائل اور باقی تھے۔ ''چلو ہم نے اسے ٹونا کھلا دی تب بھی اس کے بچے اس سے کس طرح الگ کریں گے اور یہ بے شک بچے ہیں لیکن برفانی ریچھ کے ہیں ذرا ان کے پنجے دیکھو یہ تو پاس آنے والے کو لہولہان کر دیں گے۔ اس سے بھی بڑا مسئلہ ان کی ماں کو ان سے دُور کرنا ہے۔''

کیونکہ یہ میری تجویز تھی۔ اس لیے میرا ذہن زیادہ تیزی سے اس مسئلے پر سوچ رہا تھا۔ ''آرام سے .... آرام سے۔ ابھی اس کا حل بھی سوچتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''دیکھو ریچھنی کو الگ کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہے اگر ہم اسے مچھلی پھینک کر دیں تو یہ یقیناً بچوں کو چھوڑ کر اسے کھانے کے لیے لپکے گی اس دوران میں بچوں کو قابو کیا جاسکتا ہے۔''

''لیکن کیسے؟'' جیمس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ ''کم سے کم میں ان کے ناخنوں سے اپنی کھال اُتروانے کو تیار نہیں ہوں۔''

میں نے باجا کی طرف دیکھا۔ ''تمہارے پاس اس کا کوئی حل ہے۔''

وہ گڑبڑا گیا۔ ''میرے پاس....؟ نہیں تو۔''

''میں نے سنا ہے تم مچھلی والا جال پھینکنا جانتے ہو؟''

''ہاں لیکن یہاں جال کہاں ہے؟''

''جال ہے۔'' جیمس بولا۔ ''پچھلے سال میں نے مچھلی پکڑنے کے لیے ایک چھوٹا جال لیا تھا۔ سفر کے دوران بعض اوقات کہیں مچھلی کے جھنڈ مل جاتے ہیں اور مفت کی مچھلی کھانے کو مل جاتی۔''

مجھے بھی یاد آگیا جیمس نے ایسا ایک جال لیا تھا اور وہ شاید کشتی کے اسٹور روم میں پڑا ہوا بھی تھا۔ میں نے اسے یاد دلایا۔ ''تم نے ایک بار بھی جال استعمال نہیں کیا اور وہ ایسے کا ویسا ہی پڑا ہے۔''

جیمس کھسیا گیا۔ ''ہاں واقعی جال تو استعمال ہی نہیں کیا۔ ایک منٹ میں ابھی اسے لے کر آتا ہوں۔''

جیمس جال لینے گیا اور میں باجا کے ساتھ سرد خانے سے ٹونا کا کریٹ لے آیا، یہ خاصا وزنی تھا۔ جیسے ہی باجا نے کریٹ کا ڈھکنا ہٹایا۔ ریچھنی یک دم چونک گئی تھی۔ یقیناً اسے مچھلی کی بو لگی تھی اور وہ بھوک سے بے تاب تھی پہلی بار اس نے کشتی کو دلچسپی سے دیکھا۔ میں نے جلدی سے ڈھکن بند کر دیا کہ کہیں ریچھنی کشتی کی طرف نہ چلی آئے۔ جیمس ابھی تک نہیں آیا تھا خدا خدا کر کے وہ جال لایا اور میں نے اسے کشتی پائلٹ کرنے کو کہا۔ جال باجا نے سنبھال لیا۔ یہ ہاتھ سے پھینکا اور سمیٹا جانے والا جال تھا۔ باجا نے کچھ دیر اسے پانی میں پھینک کر سمیٹنے کی مشق کی۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔

''میں تیار ہوں۔''

میں نے چلّا کر جیمس سے کہا۔ ''جب میں کشتی چلانے کو کہوں تو تم اسے آگے بڑھاؤ گے لیکن سست رفتاری کے ساتھ۔''

''میں سمجھ گیا۔'' جیمس بولا۔

میں نے کریٹ سے ایک چھوٹی ٹونا نکالی۔ اس چھوٹی ٹونا کا وزن بھی چار کلوگرام سے کم نہیں تھا۔ مچھلی باہر آتے ہی ریچھنی بے تاب ہوگئی اس نے بچوں کو خود سے الگ کرنے کی کوشش کی اور کشتی کی طرف آئی۔ وہ اس وقت دس گز کی دوری پر تھی۔ بچے کوشش کے باوجود اس سے چمٹے رہے تھے اور وہ ان کے ساتھ ہی آئی تھی۔ ہمارا مقصد تو بچوں کو اس سے الگ کرنا تھا۔ اس لیے میں نے مزید انتظار کیے بغیر ٹونا پوری قوت سے سمندر میں اچھال دی۔ میں نے مچھلی اس طرح پھینکی تھی کہ ریچھنی کو تیر کر اس تک جانا پڑے لیکن وہ کشتی سے بھی دور رہے۔ مچھلی کے پانی میں گرتے ہی ریچھنی بہت تیزی سے اس تک گئی اس تیزی میں بچے اس سے دور ہوئے تھے لیکن وہ کشتی سے بھی دور تھے۔ باجا ان پر جال نہیں پھینک سکتا تھا۔ ریچھنی نے مچھلی ہاتھ میں آتے ہی اسے جس بے

جون ایلیا ہمارے عہد کے منفرد یگانہ روزگار شاعر ہیں، شاعر کے ساتھ روزگار کا لفظ لکھنے پر راقم معذرت خواہ ہے، برسوں پہلے جون سے ہماری ملاقات شادی کی ایک تقریب میں ہوئی، خوش قسمتی سے یہ ہم میں سے کسی کی شادی نہیں تھی اس لیے ہم خوشگوار موڈ میں ایک دوسرے کو ملے، میں نے انہیں پہچان لیا کہ جون ایلیا ہیں، وہ مجھے پہچان گئے کہ میں ان سے ملنا چاہ رہا ہوں۔ اس تقریب میں دلہا اور دلہن کے بعد ہم دونوں ہی مس فٹ لوگ تھے۔

یادش بخیر! یہ وہ دور تھا جب آتش کراچی یونیورسٹی میں تعلیم کے نام پر جانے کیا کیا حاصل کر رہا تھا، اس کے بعد شادی کی تمام رسمیں بشمول رُخصتی ہم نے جون کے ساتھ منائیں۔ اس تقریب میں جملہ انتظامات مع جون کے زاہدہ حنا کے ہاتھ میں تھے۔ جون تمام وقت اپنا ایک بچہ گود میں اٹھائے زاہدہ کو مصروف عمل دیکھنے میں مصروف رہے۔ بچے کی ٹانگیں خیر سے جون کی گود میں جون سے زیادہ لمبائی میں لگی آس پاس کے لوگوں سے ٹکراتی رہیں، جون کی نظریں زاہدہ پر اور سخن فقیر کی جانب تھا۔

ان دنوں عالمی ڈائجسٹ آئی سی یو میں اپنے آخری سانس گن رہا تھا۔ جون نے ہمیں بھی یہ منظر دیکھنے کی دعوت دی، یوں ہم جون ایلیائی حلقے میں داخل ہوئے۔ عالمی ڈائجسٹ کی کوتاہ نصیبی دیکھیے، ہم بھی ہاتھ میں آخری کیل لیے وہاں جا نکلے، خاکسار کا شمار تو ویسے بھی قسمت کے ان دھنی لوگوں میں ہوتا ہے جن کے بارے میں شاعر نے کہا تھا

ہم جہاں پہنچے ہمارے ساتھ ویرانے گئے

اقتباس: ظرافت از ضیاالحق قاسمی
مرسلہ: نبیلہ گبول، کوئٹہ

تابی سے کھانا شروع کیا اس سے پتا چلا کہ وہ کتنی شدید بھوکی تھی۔ وہ اسے چبائے بغیر بڑے ٹکڑوں کی صورت میں نگل رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کس ترکیب سے بچوں کو ریچھنی سے جدا کروں۔ میں نے باجا سے کہا۔ ''نیچے سے فشنگ راڈ لے آؤ۔''

کشتی میں سادہ فشنگ راڈز موجود تھیں۔ باجا بھاگ کر ایک راڈ معہ ڈوری اور کانٹے کے لے آیا۔ میں نے کانٹے دوسری ٹونا کے منہ میں اس طرح پھنسایا کہ اگر ریچھنی اسے پکڑ کر کھینچے تو وہ آسانی سے نکل جائے۔ جب تک میں نے یہ کام کیا ریچھنی چار کلوگرام وزنی ٹونا کھا چکی تھی۔ اب وہ پانی پر تیرتے اس کے ٹکڑے چن رہی تھی۔ میں نے فشنگ راڈ ہوا میں کی تو ٹونا سمندر کے اوپر جھولنے لگی۔ ریچھنی کو بو لگی تو وہ اس طرف آئی۔ راڈ بیس فٹ لمبی تھی اور اس کی مدد سے ریچھنی کو کشتی سے پندرہ فٹ تک دور رکھا جا سکتا تھا۔ بچے بدستور ریچھنی کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کشتی کے اتنے قریب آجائیں کی باجا ان پر جال ڈال سکے۔

ریچھنی ٹونا کی طرف آئی تو میں نے اسے اوپر اُٹھا لیا۔ ریچھنی کوشش کرنے لگی کہ کسی طرح پانی سے اچھل کر مچھلی تک پہنچ جائے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ برفانی ریچھ عام حالات میں ایک وقت میں ساٹھ سے ستر کلوگرام گوشت آرام سے کھا سکتے ہیں۔ ریچھنی نے تو ابھی صرف چار کلوگرام گوشت کھایا تھا اور وہ شدید بھوکی بھی تھی۔ بچے بدستور ماں سے چمٹے ہوئے تھے۔ ان کو خوف تھا کہ ماں سے جدا ہوئے تو ڈوب جائیں گے۔ مگر وہ ریچھنی کے لیے رکاوٹ بن گئے تھے۔ ان کی وجہ سے ریچھنی مچھلی تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ دو تین بار اس نے ناکام کوشش کی۔ وہ جب مچھلی پکڑنے کی کوشش کرتی میں فشنگ راڈ کو اوپر کر دیتا تھا۔ اس طرح ایک کھیل شروع ہوگیا۔ بھوک سے بے حال ریچھنی مچھلی تک رسائی کی انتہائی کوشش کر رہی تھی لیکن ناکام تھی۔ میں چاہتا تھا اسے احساس ہو کہ وہ بچوں کی وجہ سے ناکام ہو رہی ہے۔

بالآخر میں کامیاب رہا۔ ریچھنی اب غصے میں تھی کیونکہ کوشش کے باجود اسے کھانا نہیں مل پا رہا تھا اس نے غضبناک انداز میں ایک بچے کو جھٹک دیا وہ اس سے کچھ دور پانی میں جا پڑا اور وہیں تیرنے لگا۔ ایک اور ناکام کوشش کے بعد ریچھنی نے دوسرے بچے کو بھی جھٹک دیا۔ وہ مچھلی کے لیے دیوانی ہو رہی تھی۔ بچے اس کے غصے سے ڈر کر اس سے ذرا دور تیر رہے تھے۔ میں نے ریچھنی کو مزید دُور کرنے کے لیے فشنگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

راڈ کو گھمایا اور مچھلی کو ذرا نیچے کردیا۔ حسب توقع ریچھنی اس کے پیچھے آنے لگی۔ ماں دور ہوئی تو اس کے بچے اس کے پاس جانے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر ریچھنی کی رفتار تیز تھی۔ میں فشنگ راڈ کو گھماتا ہوا کشتی کے دوسری طرف لے گیا۔ ریچھنی بھی اس طرف آگئی اور اب بچے اس سے خاصے دور تھے۔ میں نے مچھلی نیچے کی اور ریچھنی نے جھپٹ کر اسے کانٹے سے نکال لیا۔

اس دوران میں باجا نے تقریباً دس فٹ کی دوری سے جال بچوں پر پھینکا اور وہ جال تلے آگئے۔ اب باجا اس کی ڈوری کھینچ رہا تھا تاکہ جال ان کے گرد کس جائے۔ یہ نہایت خطرناک مرحلہ تھا۔ بچے مشکل دیکھ کر اپنی ماں کو پکارتے اور وہ آجاتی تو ہم مشکل میں پڑ سکتے تھے میں نے چلا کر جیمس سے کہا۔ ''کشتی آہستہ رفتار سے آگے بڑھاؤ۔''

کشتی کا انجن اسٹارٹ تھا جیمس نے بہت ہلکی رفتار سے اسے آگے بڑھایا۔ باجا مہارت سے جال سمیٹ رہا تھا اس کی کوشش تھی کہ بچے جال میں اس طرح آجائیں کہ انہیں کوئی نقصان نہ ہو۔ ابھی تک انہوں نے گھبرا کر ماں کو نہیں پکارا تھا۔ لیکن جیسے ہی باجا نے ڈوری کھینچ کر انہیں جال میں جکڑا انہوں نے چلانا شروع کردیا۔ میں ریچھنی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ ٹونا کھانے میں مگن تھی اور اس نے بچوں کی ابتدائی چیخ و پکار پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس دوران میں جیمس کشتی آگے نکال لے گیا تھا اور جیسے ہی ریچھنی کی نظر جال میں جکڑے اپنے بچوں پر گئی۔ وہ مچھلی کھاتے ہوئے ان کی طرف بڑھی۔ اس رفتار نے مجھے حیران کردیا تھا۔ اگر وہ بچوں تک پہنچ جاتی تو ہم ناکام ہوجاتے۔ اگرچہ وہ انہیں جال سے نہیں نکال سکتی تھی لیکن وہ انہیں پکڑ لیتی تو ہمارا مقصد فوت ہوجاتا۔ میں نے چلا کر جیمس سے رفتار تیز کرنے کو کہا۔ جیمس نے رفتار بڑھائی تو جال میں بندھے بچے بھی کھنچے چلے آنے لگے۔ ریچھنی نے واضح محسوس کرلیا کہ اس کے بچے مشکل میں ہیں۔ مگر وہ ان کی طرف آتے ہوئے مچھلی بھی نہیں چھوڑنا چاہتی تھی اس نے ابھی نصف ہی کھائی تھی۔ ہاتھ میں مچھلی لے کر تیرنا آسان نہیں تھا۔ پھر اس نے یہ ترکیب کی کہ مچھلی منہ سے دبالی اور ہاتھوں پیروں کی مدد سے بچوں کی طرف آئی۔ اب وہ ان سے کچھ ہی دور تھی۔ جیمس رفتار بڑھا رہا تھا لیکن وزن سے پوری طرح لدی کشتی اتنی جلدی رفتار نہیں پکڑتی ہے۔

''باجا جال کھینچو۔'' میں نے کہا اور خود بھی اس کی مدد کے لیے آگیا ہم دونوں مل کر جال کی ڈوری کھینچنے لگے۔ ریچھنی ہاتھ پاؤں مارتی بچوں کی طرف آرہی تھی اور عین اس وقت جب اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر بچوں کو جھپٹنے کی کوشش کی تو ہم نے جال کھینچ لیا تھا شاید ایک فٹ کی دوری سے بچے اس کے ہاتھ آنے سے رہ گئے۔ اس دوران میں کشتی کی رفتار بھی خاصی تیز ہوگئی تھی۔ یہ شاید دس ناٹ فی گھنٹا سے اوپر جاچکی تھی لیکن ریچھنی بھی تقریباً اسی رفتار سے تیر رہی تھی۔ اب بچے جال میں لپٹے تقریباً کشتی کے پاس آگئے تھے۔ لیکن کشتی کے انجن کے پنکھوں سے ان کو بچانے کے لیے ہم زیادہ نزدیک لانے سے گریز کر رہے تھے۔ ریچھنی کی طرف سے مطمئن ہوکر میں پائلٹ روم کی طرف آیا۔ میٹر بتا رہا تھا کہ کشتی بارہ ناٹ فی گھنٹے کی رفتار سے چل رہی ہے۔ اس رفتار پر ریچھنی کشتی کے پیچھے تو آرہی تھی لیکن وہ اسے پکڑ نہیں سکتی تھی۔

''یہی رفتار رکھو۔'' میں نے جیمس سے کہا اور واپس پچھلے حصے میں آیا۔ باجا ڈوری سنبھالے ہوئے تھا۔ اس نے کہا۔

''ان کو کشتی پر اُٹھانا یا کسی طریقے سے ہوا میں لٹکانا ہوگا ورنہ جال کی پتلی ڈوریاں پانی کے دباؤ سے ان کی کھال میں اُتر جائیں گی۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے فشنگ راڈ اسٹینڈ پر نصب کی۔ پھر ڈوری اس سے منسلک کی۔ جب ڈوری کو کھینچا تو جال ریچھ کے بچوں سمیت پانی سے اوپر اُٹھ گیا اور بچے اب ہوا میں معلق تھے۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ''یہ خود کو جال سے نکال نہیں سکتے ہیں؟''

''مشکل ہے میں نے جال کو پوری طرح کس دیا ہے۔'' باجا نے کہا۔ ''اسے کاٹے بغیر ان کو نہیں نکال سکتے ہیں۔''

یہ ہم نے سوچا نہیں تھا کہ بچوں کو نکالیں گے کس طرح، لیکن یہ بعد کی بات تھی فی الحال تو میرا پلان کامیاب رہا تھا۔ اب ہمیں ریچھنی کا ردِعمل دیکھنا تھا۔ وہ پوری رفتار سے کشتی کے پیچھے تیر رہی تھی۔ ٹونا کھا کر یقیناً اسے توانائی ملی تھی اور اب وہ طاقت ور لگ رہی تھی۔ لیکن جلد اس نے محسوس... کرلیا کہ اس طرح وہ اپنے بچوں تک نہیں پہنچ سکے گی۔ دوسرے اسے بھوک نے ستانا شروع کردیا تھا وہ تیرنے کے دوران مچھلی منہ سے پکڑ تو سکتی تھی لیکن اسے کھا نہیں سکتی تھی۔ اس لیے تقریباً بیس منٹ بعد اس نے رفتار کم کردی اور مچھلی کھانے لگی۔ رفتار کم ہونے سے وہ پیچھے رہ گئی تھی۔ میں نے جیمس سے رفتار کم کرنے کو کہا۔ ریچھنی کوئی سو گز پیچھے تھی۔ کھانے کے دوران اس نے تیرنا ترک نہیں کیا تھا بلکہ اس کے پیر مسلسل چل رہے تھے۔ چند منٹ میں اس نے باقی مچھلی بھی کھا پی کر برابر کردی۔ یہ سات کلوگرام وزنی ٹونا تھی۔

اب وہ پھر پوری رفتار سے تیر رہی تھی اور رفتہ رفتہ کشتی کے پاس آتی جارہی تھی۔ جب وہ تیس گز دور رہ گئی تو ہم نے کشتی کی رفتار دوبارہ بڑھادی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اسے اس سے زیادہ نزدیک آنے دینا خطرناک ہوسکتا ہے۔ اس رفتار نے حیران کیا تھا۔ شاید یہ بچوں کی محبت تھی جو اسے اس کی استعداد سے زیادہ تیزی دکھانے پر مجبور کر رہی تھی۔ بچے اس کی نظروں کے سامنے تھے اور وہ ماں کو دیکھ کر فریاد بھری آوازیں نکال رہے تھے اور ان کی آوازیں ریچھنی کے لیے مہمیز کا کام کر رہی تھیں۔ آدھے گھنٹے میں ہم نے کوئی دس ناٹیکل میل کا سفر کرلیا تھا اور اس رفتار سے ہم چھ گھنٹے میں ٹاسلی لاق پہنچ سکتے تھے۔ لیکن ممکن تھا کہ ریچھنی اس سے پہلے ہی ساحل پاس پا کر از خود اس طرف چلی جاتی۔

ایک گھنٹے بعد اس کی طاقت جواب دینے لگی اور وہ سست ہوگئی۔ میں نے کریٹ سے ایک عدد ٹونا اور نکالی اور اسے ریچھنی کی طرف پھینک دیا۔ وہ جس تیزی سے مچھلی پر لپکی اس سے اندازہ ہوا کہ مسلسل تیراکی نے اس کی بھوک چمکا دی تھی۔ وہ مچھلی کھانے کے لیے رکی تو ہم بھی رک گئے۔ چند منٹ میں اپنا کھانا ختم کرکے اس نے دوبارہ تیراکی شروع کی تو ہم نے بھی کشتی آگے بڑھادی تھی۔ یہ سلسلہ بن گیا۔ ہر گھنٹے بعد اسے بھوک لگ جاتی تھی اور ہمیں ریچھنی کو اپنے پیچھے رکھنے اور اس کی طاقت بحال رکھنے کے لیے ایک ٹونا پیش کرنا پڑتی تھی۔ میں نے ٹونا کے لیے گورنی سے پہلے ہی دل میں معذرت کرلی تھی اور مجھے امید تھی جب اسے پتا چلے گا کہ ہم نے مچھلی سے کیا کام لیا ہے تو وہ بالکل ناراض نہیں ہوگا۔

جب ہم رُکتے اور ریچھنی کو کھانے کو دیتے تو اس وقفے میں بچوں کو پانی میں ڈال دیتے تھے تاکہ ان کے جسموں پر جال کی ڈوری کا دباؤ کچھ دیر کے لیے کم ہو جائے۔ بچوں نے اب فریاد بھری آوازیں نکالنا بند کردی تھیں اور شاید وہ اس سفر سے لطف اندوز ہونے لگے تھے۔ دوسری طرف ریچھنی نے بھی سمجھ لیا تھا کہ ہم اس کے بچوں کو لے کر فرار نہیں ہو رہے ہیں بلکہ اس کی مدد کر رہے ہیں اس لیے وہ ... میں نہیں تھی البتہ جب وہ کھا کر تازہ دم ہوجاتی تو پوری رفتار سے ہمارے پیچھے ضرور آتی تھی۔ سمندری دھارے کے

سکھر صوبہ سندھ کا تیسرا بڑا شہر ہے اور شاید اس کا تیسرا ہونا ہی غضب ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے یہ سکھر بڑا تاریخی شہر ہے۔ اس کی داستان راجا داہر اور محمد بن قاسم سے بھی بہت آگے جاتی ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ آج کا یہ سکھر چار ہزار سال سے زیادہ پرانے موئن جودڑو سے ملتے جلتے شہر کے اوپر آباد ہے۔ اس کی بنیادوں میں ہزاروں سال پرانا ایسا علاقہ مدفون ہے جہاں آکر موئن جودڑو والے پتھر لے جایا کرتے تھے۔ وہی پتھر جن سے وہ اپنے مکان اور اپنے آلات اور اوزار بنایا کرتے تھے۔

یہیں وہ بھکر کا علاقہ تھا جہاں سے گزر کر ہماری تاریخ کے قافلے اندرون سندھ، افغانستان، ایران اور وسطی ایشیا جایا کرتے تھے۔

پاکستان کا نقشہ پھیلا کر دیکھیے تو آپ محسوس کریں گے کہ سکھر عجیب و غریب جگہ واقع ہے۔ صوبہ پنجاب، بلوچستان اور سرحد اس کے قریب ہیں۔ یہاں سے سیدھی سڑک افغانستان کو جاتی ہے۔

سکھر سندھ کا تیسرا بڑا شہر ہے اور سکھر کی خاص بات یہ ہے کہ یہ ایسی جگہ واقع ہے جہاں تین صوبے ملتے ہیں۔ سمجھیے کہ یہ تین صوبوں کا جنکشن ہے۔ آپ کو شاید یہ سن کر تعجب ہو کہ سکھر سے آٹا کوئٹہ جاتا ہے اور وہاں سے افغانستان پہنچایا جاتا ہے۔ افغان تاجر ہمیشہ سکھر آتے رہے ہیں۔ سکھر میں افغانستان کے تاجر کو جتنا کپڑا ادھار پر ملتا ہے شاید ہی کہیں ملتا ہو۔ افغان بیوپاری لاکھوں روپے کا کپڑا لے جاتے ہیں لیکن بہت دیانت دار ہیں کہ پھر وہ پیسے واپس کردیتے ہیں اور کپڑے کی نئی کھیپ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ یہ جو اعتبار آپ تاجر برادری میں سکھر میں دیکھیں گے یہ کہیں اور نظر نہیں آئے گا۔

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خلاف اس کی یہ رفتار حیران کرنے والی تھی۔ قدرت نے واقعی برفانی ریچھ کو بہترین تیراک بنایا ہے۔

چار گھنٹے بعد ہم ٹاسکی لاق سے پچیس نائیل میل کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔ اس دوران میں ہم نے ریچھنی کو اپنی ساری ٹونا مچھلی کھلا دی تھی جس کا مجموعی وزن تقریباً بتیس کلوگرام تھا۔ ریچھنی اب بھوکی نہیں تھی لیکن مسلسل تیراکی نے اسے بُری طرح تھکا دیا تھا اور اب وہ کوشش کے باوجود زیادہ رفتار سے نہیں تیر پا رہی تھی اس لیے ہم نے بھی کشتی کی رفتار کم کر دی اور اب یہ پانچ ناٹ کی رفتار سے چل رہی تھی۔ جیمس شروع میں پُرجوش رہا تھا لیکن اب وہ اس کھیل سے اکتا گیا تھا اور جلد از جلد ٹاسکی لاق پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس نے.... بےزاری سے کہا۔ ''یہ تیز کیوں نہیں تیر رہی ہے کیا اب اسے اپنے بچوں کی فکر نہیں ہے؟''

''اسے فکر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ بہت تھک گئی ہے۔ چار گھنٹے میں چھتر نائیل میل تک تیرنا دنیا کے ماہر ترین تیراک کے بس کی بات نہیں ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے لیکن اس طرح تو ہمیں ٹاسکی لاق پہنچنے میں مزید چار گھنٹے لگ سکتے ہیں جب کہ فاصلہ ایک گھنٹے کا بھی نہیں رہ گیا۔''

میں نے پائلٹ روم میں لگے نقشے پر لوکیشن دیکھی۔ ساحل یہاں سے بارہ میل مغرب میں تھا۔ یہاں چٹانیں بھی کم تھیں اگر ہم کوشش کرتے تو ساحل کی طرف جا سکتے تھے میں نے جیمس سے اس بارے میں بات کی پہلے تو اس نے انکار کر دیا۔ بھرے پاؤڈر کے ساتھ اس قسم کا خطرہ مول لینا مناسب نہیں تھا، مگر میں نے اسے راضی کر لیا۔ دن کی روشنی میں سمندر بالکل واضح نظر آ رہا تھا اور ہمارا کسی زیرآب چٹان سے ٹکرانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے جیمس سے کہا۔ ''پچیس میل دور جانے کے بجائے دس میل اس طرف جانا زیادہ مناسب ہوگا۔''

جیمس مجبوراً مان گیا۔ ''جیسے تمہاری مرضی۔''

اس نے کشتی کا رُخ موڑ کر اسے مغرب کی طرف کر دیا۔ ریچھنی بدستور سست روی سے تیر رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے اپنی بچی کچی توانائی بھی استعمال کر لی ہو۔ اس کا انداز دیکھ کر مجھے ڈر لگ رہا تھا کہیں اس کی ہمت اچانک ہی نہ جواب دے جائے اور وہ ڈوب جائے۔ یہ کامیابی کے بہت نزدیک آ کر ناکام ہو جانے والی بات ہوتی۔ آنے والے ایک گھنٹے میں اس کی رفتار مزید سست ہوئی تھی اور وہ بالکل اس انداز میں تیرنے لگی جس طرح وہ اس وقت تیر رہی تھی جب ہم نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ باجا نے کہا۔ ''ہمیں کچھ کرنا ہوگا ورنہ یہ ڈوب جائے گی اور یہ مرگئی تو اس کے بچے بھی مر جائیں گے۔''

اتنی دیر میں باجا کو بچوں سے اُنسیت ہو گئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم فکر مت کرو میں اسے ڈوبنے نہیں دوں گا۔''

کشتی میں تیل کے کچھ خالی ڈرم بھی رکھے تھے۔ میں نے ایک ڈرم سے رسی مضبوطی سے باندھی اور اسے کشتی سے پیچھے ریچھنی کی طرف پھینک دیا۔ میں چاہتا تھا کہ ریچھنی ڈرم پکڑ لے لیکن پہلے اس نے کوئی توجہ نہیں دی میں نے ڈرم دوبارہ پھینکا۔ اس بار وہ متوجہ ہوئی تھی لیکن اس نے پکڑا نہیں البتہ تیسری کوشش میں اس نے ڈرم پکڑ لیا۔ رسی کا دوسرا سرا کشتی سے باندھ کر میں نے جیمس سے کہا کہ وہ رفتار بتدریج بڑھائے۔ اس نے کشتی کی رفتار بڑھانا شروع کی۔ ریچھنی کو سمندر میں ایک سہارا ملا تو اس نے اسے مضبوطی سے جکڑ لیا تھا اور اب بغیر کسی کوشش کے سفر کر رہی تھی۔ جیمس رفتار بڑھا کر پندرہ ناٹ فی گھنٹے تک لے گیا اور ریچھنی مزے سے ڈرم سے چمٹی رہی۔ اس طرح ہم آدھے گھنٹے سے بھی پہلے گرین لینڈ کے اس ویران ساحل کے پاس پہنچ گئے۔ کھلے سمندر میں ساحل سے کوئی نصف میل کی دوری پر ہم نے پہلے ریچھنی کے بچوں کو جال سے آزاد کیا اور اس کے بعد ڈرم کی رسی کاٹ دی۔ پھر ہم کشتی گھما کر کھلے سمندر کی طرف لے گئے۔

ریچھنی نے ساحل دیکھ لیا تھا وہ اپنے بچوں سمیت اس طرف تیرنے لگی۔ اس روز قدرت اس پر مہربان تھی پہلے ہم نے اسے کھلے سمندر میں دیکھ لیا اور اس کی مدد کر کے اسے ساحل تک لے آئے اور اب وہ ساحل پر پہنچی تو اسے سیل مچھلیوں کی ایک پوری کالونی مل گئی تھی۔ ہم نے دوربین سے دیکھا۔ وہ سیل دیکھ کر تیز رفتاری سے بچوں سمیت ساحل پر پہنچی۔ جہاں سیل اپنے دیرینہ دشمن کو غیر متوقع طور پر سمندر سے برآمد ہوتے دیکھ کر اتنی حیران ہوئیں کہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکی تھیں۔ چالاک ریچھنی نے ساحل پر چڑھتے ہی شکار شروع کر دیا تھا اس نے یکے بعد دیگرے کئی سیل شکار کیں اور جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو وہ دعوت اُڑا رہی تھی اور اس کے بھوکے بچے اس سے چمٹے دودھ پی رہے تھے۔ بالآخر ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے۔

امریکا اور امریکا

الطاف شیخ / ترجمہ: ابراہیم جمالی

آخری حصہ

امریکا مواقع کی سرزمین ہے۔ اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتی ہے۔ لوگ اس کی چکاچوند میں آنکھیں خیرہ کر لیتے ہیں اور یہ تک بھول جاتے ہیں کہ روشنی کے عقب میں اندھیرا بھی ہوتا ہے۔ الطاف شیخ کے سفرناموں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ خود میں معلومات کا خزانہ لیے ہوتے ہیں۔ بہتر تجزیوں سے سجے ہوئے ہوتے ہیں۔ زیرِنظر سفرنامہ بھی انہی خوبیوں سے مزین ہے۔ روشن رخ کے علاوہ اندھیرے گوشے کا نظارہ بھی کرانے والی سفر کہانی ہے۔

سرزمین امریکا کے سفر کی ایک جداگانہ سفر کہانی

ایک طویل عرصے کے بعد انگریزی میں ایک دل پر اثر کرنے والا لیکچر سننے کو ملا تھا۔ میں اس سے اگلے جمعہ کو آیا تو محمد یوسف میرے قریب بیٹھے تھے اور ایک دوسرے شخص نے لیکچر دیا۔ ان کا تعلق مصر سے تھا۔ ان کا وعظ بھی اسلامی معلومات کا خزانہ تھا۔ پھر اس کے بعد ہر مرتبہ کسی نئے نمازی سے دین کی باتیں سننے کا موقع ملا۔ میں سمجھتا تھا کہ امریکا جیسے ملک میں اتنی تعداد میں مسلمان کہاں ہوں گے۔ اگر ہوں گے بھی تو انہیں اتنی فرصت کہاں اور وہ لوگ مصروف ترین مشینی زندگی میں مذہب سے کیا دلچسپی رکھتے ہوں گے۔ لیکن یہ ماضی کی باتیں تھیں۔ اس دور میں یہاں امریکا میں ہمارے نواب اور جاگیردار آتے تھے۔ انہیں واقعی مذہب سے کوئی دلچسپی اور سروکار نہیں تھا۔ انہیں صرف شراب اور عورتوں کی اقسام کی معلومات ہوتی تھی۔ وہ جُوا خانوں میں اپنی دولت لٹا کر وطن واپس جاتے تھے۔ لیکن موجودہ دور میں یہاں کا ماحول خاصا مختلف معلوم ہوا!

میرا خیال یہ تھا کہ ٹی وی اور کمپیوٹر نے انسان کو مذہب سے بیگانہ کر دیا ہے لیکن جہاں ان چیزوں نے معاشرے میں خرابیاں پیدا کی ہیں۔ وہیں اس ذریعے نے لوگوں کو اخلاق

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور ethic سکھایا ہے۔ مذہب کی درست معلومات اور اس پر عمل کرنے کی راہ بھی سجھائی ہے۔

نماز سے قبل ایک شخص نے اُٹھ کر مسجد کے لیے چندہ جمع کیا۔ ہر ایک نے اپنی حیثیت کے مطابق پیش کیا۔ میں نے دیکھا تھا کہ چادر کی جھولی میں ایک، پانچ اور دس ڈالر کے کئی نوٹ موجود تھے۔ چند سو ڈالر کے نوٹ بھی نظر آئے تھے۔ مسجد کمیٹی کے چیئر مین نے یہ خوشخبری سنائی کہ نمازیوں کے چندے سے پانچ لاکھ ڈالر (کم وبیش تین کروڑ روپے) جمع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے مزید بتایا کہ گزشتہ اتوار کو اسی علاقے میں مسجد کے لیے زمین خریدی گئی ہے۔ وہ ایک پُرانا گرجا گھر تھا، جس کے مالک نے اسے مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ پارکنگ کی بھی خاصی کشادہ جگہ ہے۔ یاد رہے کہ امریکا اور دیگر ملکوں میں عیسائیوں کے چرچ (گرجا گھر) لوگوں کی ذاتی ملکیت ہوتے ہیں۔ وہ جب چاہیں اسے فروخت کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ مجھے نیو جرسی میں رہنے کے دوران ہر جمعہ کے دن اس زمین کی خریداری اور اس پر مسجد کی تعمیر کے بارے میں نمازیوں کو آگاہ کیا جاتا تھا۔ مسجد کی تعمیر سے اس کے اردگرد موجود مکانات کی اہمیت میں بھی ایک اضافہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے ہر مسلمان کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنی سابقہ رہائش گاہ کو فروخت کر کے یہاں مکان یا پلاٹ خرید لے۔ تاکہ انہیں نماز پڑھنے میں اور ان کے بچوں کو مسجد میں جا کر دینی تعلیم حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ یہاں رہنے والے آج کے پاکستانی اور ہندوستانی یہی چاہتے ہیں کہ ان کے بچوں کو بچپن ہی سے اپنے دین، دھرم اور کلچر سے آگاہی حاصل ہو، تاکہ وہ بڑے ہو کر یہاں کی خرابیوں سے خود کو محفوظ رکھ سکیں۔

میں ہر جمعہ کی نماز کے بعد مسجد کے نئے امام صاحب سے گفتگو ضرور کرتا اور ان کی تصویر بھی بناتا تھا۔ سب ہی بڑی اپنائیت سے ملے۔ سوائے پہلے دن والے امام محمد یوسف صاحب کے تمام لوگوں نے فوٹو بنانے کی اجازت دی۔ بعد میں وہ بھی آمادہ ہو گئے۔ میں نے ان کا بھی فوٹو بنایا۔ میں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ محمد یوسف صاحب دوسروں کی نسبت قدرے کم آمیز ہیں۔ وہ بلا ضرورت کسی سے بے تکلف نہیں ہوتے تھے۔ ایسا بھی ہرگز نہیں تھا کہ وہ آدم بیزار قسم کے آدمی تھے اور کسی سے بات کرنا گوارہ نہیں کرتے تھے۔ میری ان سے گفتگو ہوئی تھی۔ انہوں نے نہایت قرینے اور نپے تلے انداز میں بات کی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ اب وہ امریکن شہری ہیں۔ ان کی مادری زبان گجراتی تھی اور وہ انڈیا کے صوبے گجرات کے شہر کاٹھیاواڑ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے کئی رشتے دار کراچی میں بھی رہتے ہیں۔

کچھ عرصے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ان کا تعلق یہاں کے FBI ڈپارٹمنٹ سے ہے۔ سو ظاہر ہے ایسے اداروں سے تعلق رکھنے والے کو دوسروں سے میل جول میں محتاط رہنا پڑتا ہے۔ ایک جمعہ کے دن کئی غیر ملکی مسلمانوں کے درمیان گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے گویا ہمیں سمجھانے کی غرض سے کہا کہ اگر کبھی کوئی پولیس مین یا امریکا کے جاسوس ڈپارٹمنٹ کا افسر کسی معاملے میں شک کی بنا پر کچھ سوالات کرے تو اسے ہر بات درست اور سچ بتانی چاہیے۔

”اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی انگریزی کی استعداد کمزور ہے یا آپ سوال کرنے والے افسر کی انگریزی سمجھ نہیں پا رہے تو آپ اپنے کسی دوست یا وکیل کو طلب کر سکتے ہیں۔ اگر آپ وکیل کی فیس افورڈ نہیں کر سکتے تو آپ سرکاری اخراجات پر اپنے لیے وکیل فراہم کرنے کی درخواست کر سکتے ہیں لیکن ہر حالت میں غلط بیانی کرنے یا کوئی بات چھپانے سے گریز کریں۔ کیونکہ سوال جواب کے بعد اکثر لوگ معصوم ثابت ہوتے ہیں لیکن جھوٹ بولنے پر انہیں سزا ہو جاتی ہے۔ کل ہی ایک شخص کو عدالت نے چھ ماہ کے لیے جیل بھجوا دیا ہے۔ گو کہ وہ بے گناہ اور بے قصور تھا لیکن اس نے جھوٹ بول کر اپنا کیس بگاڑ دیا اور اس جرم میں اسے سزا ہو گئی۔“

☆☆☆

جس طرح دوسری جنگِ عظیم کو بیسویں صدی کا اہم واقعہ قرار دیا جا سکتا ہے، اس طرح اکیسویں صدی کا اہم واقعہ (کم از کم اب تک) امریکا کی اہم عمارتوں کا انہدام ہے جو ”ٹوئن ٹاور“ اور ”ورلڈ ٹریڈ سینٹر“ کہلاتی تھیں۔

اس واقعے کے نہ صرف امریکا بلکہ پوری دنیا پر معاشی، نفسیاتی اور سیاسی اثرات مرتب ہوئے۔ اس کے ردِعمل کے طور پر افغانستان اور عراق میں جنگ کا آغاز ہوا اور امریکیوں نے اپنی سیکورٹی کو مزید محفوظ بنانے کے لیے اقدامات کیے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی کل سات عمارتیں تھیں۔ ان میں مذکورہ دو ٹاور بلند ترین تھے۔

ہر ٹاور 110 منزلہ تھا۔ شمالی ٹاور پر کئی بھاری اینٹینا نصب تھے۔ یہ ٹاور 1368 فٹ بلند تھا۔ جنوبی ٹاور کی بالائی منزل پر بالکونی تھی جہاں سے پورے نیویارک کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ 1362 فٹ بلند تھا۔ دونوں ٹاورز کی لمبائی اور چوڑائی یکساں، یعنی 208 فٹ تھی۔

ان کی تعمیر 1973ء میں مکمل ہوئی اور اس وقت یہ دنیا کی بلند ترین عمارتیں تھیں۔ یہ نیویارک کی دوسری بلند ترین عمارت امپائر اسٹیٹ بلڈنگ سے ایک سو فٹ اونچی تھی۔ ٹوئن ٹاورز کی تعمیر سے قبل امپائر اسٹیٹ بلڈنگ نیویارک کی بلند ترین عمارت تھی اور اب دوبارہ اسے سابق ”اعزاز“ مل گیا ہے۔ شکاگو کی Sears بلڈنگ اور ملائیشیا کے پیٹروناس ٹاور کی تعمیر سے قبل نیویارک کی امپائر اسٹیٹ بلڈنگ دنیا کی بلند ترین عمارت کا اعزاز رکھتی تھی۔ اسے دیکھنے کے لیے دنیا بھر کے ٹورسٹ آتے تھے۔ 1969ء میں میرا دوست نور احمد نظامانی مجھے پہلی فرصت میں یہ عمارت دکھانے لے گیا تھا۔ ہم نے بلڈنگ کی ”چوٹی“ پر موجود ایک فوٹو گرافر کو تین ڈالر دے کر فوٹو بنوایا تھا جو آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔

ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے یہ جڑواں ٹاور مختصر مدت تک دنیا کی بلند ترین بلڈنگ کا اعزاز پا سکے تھے۔ 1973ء میں جیسے ہی ان کی تکمیل ہوئی اور افتتاح ہوا۔ فوراً شکاگو کے Sears Twers کے کام کا آغاز ہو گیا۔ جسے بعد میں دنیا کی بلند ترین عمارت تسلیم کیا گیا۔ اس کی بلندی 1450 فٹ یعنی 442 میٹر ہے۔

ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے جڑواں ٹاورز کا ڈیزائن جاپان کے آرکیٹیکٹ انجینئر منورو یاماسا کی نے تیار کیا تھا۔ ایسی عظیم الشان عمارت پر جہاں عام طور پر امریکن فخر کرتے تھے اور اس کی تعمیر مکمل ہونے پر خوشی کا اظہار کیا۔ وہیں بعض دانشوروں نے اس ”شوبازی“ پر کثیر سرمایہ صرف کرنے پر تنقید بھی کی۔ ان میں سے ایک لیوس ممفورڈ بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب The pentagon of power میں اس عمارت کے متعلق خوب جملہ تحریر کیا ہے:

WTC is an example of the purposeless giantism and technological exhibitionism that are now eviscerating the living tissue of every great city

کثیر اخراجات اور انجینئرنگ کی غلطیوں کے باوجود ان ٹاورز کی اپنی ایک شان تھی۔ یہ انہیں نیویارک کی شناخت قرار دیا جاتا تھا۔ ان عمارتوں میں پانچ سو سے زاید کمپنیوں کے دفاتر قائم تھے۔ جہاں پچاس ہزار کے لگ بھگ لوگ کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ روزانہ تقریباً دو لاکھ افراد ان عمارتوں کو دیکھنے اور دیگر امور کے تحت یہاں آتے تھے۔ جنوبی ٹاور کی چوٹی پر آبزرویشن ڈیک اور شمالی ٹاور پر گردش کرنے والا ریسٹورنٹ سیاحوں اور مقامی لوگوں کے لیے انتہائی پُرکشش تھے...... لیکن اب ٹاورز کے انہدام کے بعد دلچسپی کی یہ چیزیں بھی فنا ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی باقی پانچ عمارتیں بھی تباہ ہو گئیں۔ جڑواں بلند و بالا ٹاورز کے زمین بوس ہونے سے دیگر بلڈنگز بھی ان کی زد میں آ گئیں۔ اردگرد کی جو عمارتیں زمین بوس ہونے سے بچ گئی تھیں۔ وہ بھی اس حد تک تباہ ہو چکی تھیں کہ انہیں منہدم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہیں رہا تھا۔ ان سات عمارتوں میں سے ایک میریٹ ہوٹل کی بائیس منزلہ بلڈنگ بھی تھی۔ ایک عمارت امریکا کے کسٹم ادارے کی تھی۔ ایک چھیالیس منزلہ بلڈنگ تھی جس میں دفاتر قائم تھے...... جڑواں ٹاورز نے اسے بھی اپنے ساتھ لے کر ملبے کی صورت دے دی۔ یہ 46 وسیع و عریض شاپنگ مال اور زیر زمین چلنے والی ٹرینوں کا اسٹیشن بھی تھا۔ وہاں سے ٹرینیں نیویارک اور نیو جرسی کے مختلف اسٹیشن کو روانہ ہوتی تھیں۔

ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے زیریں حصے میں سونا محفوظ رکھنے کی ایک ڈپازٹری تھی۔ جہاں امریکا کے مختلف بینکوں کا سونا رکھا جاتا تھا۔ یاد رہے کہ 1993ء میں بھی اس عمارت پر حملہ کیا گیا تھا لیکن اس میں کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

آزادی کا مجسمہ Statue of Liberty نہ صرف نیویارک اور پورے امریکا میں مشہور ہے بلکہ پوری دنیا میں اس کی دھوم ہے۔ یہ مجسمہ ایک تو آزادی اور جمہوریت جیسی مثبت باتوں کی علامت ہے اور دوسرے اپنے بڑے سائز کے حوالے سے شہرت رکھتا ہے۔ اسے آج سے تقریباً 125 برس قبل 1886ء میں تیار کیا گیا اور آج تک دنیا کا سب سے بڑا اور بلند مجسمہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

یہ ایک عورت کا مجسمہ ہے جو ایک ستون پر کھڑی ہے۔ اس کے بلند دائیں ہاتھ میں روشن مشعل اور بائیں ہاتھ میں 24 فٹ لمبی، 13 فٹ چوڑی اور دو فٹ موٹی کتاب نما لوح (Tablet) ہے۔ اس پر امریکا کی آزادی کے اعلان کی تاریخ اور سن، 4 جولائی 1776 رومن اعداد میں تحریر ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجسمے والی خاتون نے گھیر دار چوغا زیب تن کر رکھا ہے جو دیگر چیزوں کی طرح تانبے سے تیار کیا گیا ہے۔ اس کے سر پر تاج ہے جس میں 25 جھروکے سے بنے ہوئے ہیں۔ تاج میں موجود 25 دریچے دنیا میں موجود پچیس دھاتوں لوہا، سونا، چاندی، تانبہ، ایلومنیم وغیرہ کی نشاندہی کرتے ہیں اور بعض لوگوں کے مطابق 25 قیمتی پتھروں روبی، لعل، زمرد، سفائر، عقیق وغیرہ کی نشانی ہے۔ تاج میں موجود سات کرنیں، سات سمندروں کی علامت ہیں۔ یعنی آرکٹک، انٹارکٹک، شمالی اٹلانٹک، جنوبی اٹلانٹک، شمالی پیسفک، جنوبی پیسفک اور بحرِ ہند۔

نیویارک میں بائی روڈ آئیں یا ہوائی اور بحری جہاز کے ذریعے، آپ کو یہ مجسمہ دور ہی سے نظر آجائے گا۔ ظاہر ہے یہ مجسمہ ستون سمیت 305 فٹ بلند ہے۔ یہ سائز ایک مجسمے کے لیے بہت زیادہ ہے۔ اس کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ ایک طویل قامت انسان چھ فٹ کا ہوتا ہے۔ گھر کی بلند ترین چھت بھی بیس فٹ سے زیادہ نہیں ہوسکتی...... اگر آپ نے کراچی کی پچیس منزلہ حبیب بینک کی عمارت دیکھی ہے تو بس یوں سمجھیں کہ مذکورہ آزادی کا مجسمہ تقریباً اسی بلڈنگ جتنا ہی بلند ہے۔ کیونکہ حبیب بینک بلڈنگ اس سے صرف ڈھائی میٹر زیادہ بلند ہے۔ اس بات سے اندازہ کیجیے کہ یہ مجسمہ کس قدر بڑا ہے۔ اور اسے ایسی جگہ رکھا گیا ہے کہ اس کے اردگرد کوئی بلند عمارت موجود نہیں ہے جو اس کے سامنے آڑ بننے کا سبب بنتی۔

یہ مجسمہ نیویارک شہر (مین ہٹن) میں ہوتا تو وہاں کی عمارتیں اس کا نظارہ درہم برہم کر دیتیں، لیکن مجسمہ سمندر میں ایک جزیرے پر ہے جو نیویارک سے زیادہ دور ہے نہ زیادہ قریب، وہ جزیرہ لبرٹی آئی لینڈ کہلاتا ہے جو مین ہٹن کے جنوب میں دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اسی کے قریب ایک اور تاریخی جزیرہ ایلس آئی لینڈ واقع ہے۔ نیویارک آنے والے ٹورسٹ اور مقامی لوگ ان جزیروں کی سیر کرنے اور آزادی کے مجسمے کو قریب سے دیکھنے کے لیے نیویارک اور نیوجرسی سے فیری کے ذریعے آتے ہیں۔

اس مجسمے کو تیار کرنے والے مجسمہ ساز فریڈرک بارتھولڈی کا تعلق فرانس سے تھا۔ یعنی اس مجسمے کو موجودہ شکل بارتھولڈی نے دی۔ مجسمے کو سیدھا اور مضبوط رکھنے کے لیے اندرونی ڈھانچہ فرانس کے مشہور ڈیزائنر انجینئر گستاو ایفل نے تیار کیا۔ اسی نے پیرس کا ''ایفل ٹاور'' تیار کیا تھا۔ ڈھانچے پر پیتل کا جو کام ہوا ہے اور آزادی کے مجسمے والی مشعل بردار عورت کے نین نقش کو موجودہ شکل بارتھولڈی نے دی۔

اس مجسمے کی تیاری کے وقت بارتھولڈی کے سامنے ماڈل کون تھی؟

اس کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی والدہ کو سامنے بٹھا کر مجسمے پر کام کرتا تھا۔ بوڑھی ہونے کے سبب اس کی والدہ تھک جاتی تھی۔ پھر اس نے اپنی مسٹریس جینی ایلی کو ماڈل بنایا۔ اس کے ساتھ آخر کار بارتھولڈی کی شادی بھی ہوئی۔ جینی سے اس کی ملاقات امریکا کی ریاست رہوڈی جزیرے کے شہر نیو پورٹ میں 1871ء میں ہوئی، جب وہ فرانس سے پہلی مرتبہ سیر و تفریح کے لیے امریکا آیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ بارتھولڈی نے پہلے مصر والوں کو 1865ء میں سوئیز کینال پر اس مجسمے کو تیار کرنے کی پیشکش کی تھی لیکن مصر کے لیے اس قدر کثیر سرمائے کی فراہمی ممکن نہیں تھی۔ پھر امریکا اور فرانس کے سامنے یہ منصوبہ پیش کیا گیا۔ فرانس کو یہ بات پسند آئی کہ دوستی کے حوالے سے یہ ایک بہترین یادگار ثابت ہوگا۔ سو یہ آزادی کا مجسمہ فرانس کی جانب سے امریکا کے لیے بین الاقوامی آزادی کا تحفہ ہے!

فرانس اور امریکا کو اس مجسمے پر فخر ہے کہ ان کے ہاں انسانوں کی سیاسی آزادی اور جمہوریت کا درجہ بلند ہے۔ اس مجسمے کو سیاسی آزادی اور جمہوریت کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ملکوں اور لوگوں کی آزادی کے دعوے داران ممالک کو ڈوب مرنا چاہیے۔ جن دنوں بارتھولڈی ہتھوڑی اور تیشے سے اس انصاف، آزادی اور جمہوریت کی دیوی کو تراش رہا تھا۔ اس کے خدوخال واضح کر رہا تھا۔ انہی ایام 1881ء میں فرانس نے بندوقوں اور بھالوں سے لیس ہو کر تیونیشیا پر قبضہ کر لیا تھا اور وہاں کے عوام سے ان کی آزادی چھین لی۔ 1882ء میں برطانیہ نے مصر پر حملہ کر کے اسے اپنا غلام بنا لیا۔ ہند، سندھ جیسے کئی ملک پہلے ہی ان کے قبضے میں تھے۔ وہ وہاں کے لوگوں کی آزادی کے حوالے سے کوئی بات تک سننے کے روادار نہ تھے...... اس سے محض 15 برس قبل، 1857ء میں برصغیر کے لوگوں نے آزادی کے لیے کچھ جدوجہد کی تو ان پر انگریزوں نے وہ مظالم ڈھائے کہ آئندہ سو برس تک اپنا قبضہ جاری رکھا۔ ہمارے بعض مفکر انگریزوں کی خوشامد کرتے رہے کہ وہی اس سرزمین کے اصل سرکار ہیں...... ہم نے آزادی کی بات کر کے غلطی کی۔

بہرحال فرانس کی خواہش تھی کہ امریکا کو آزادی ملنے کے سو سال مکمل ہونے پر یہ تحفہ پیش کیا جائے۔ یاد رہے کہ امریکا پر انگلینڈ اور یورپ کے مختلف ملکوں کی حکومتوں کا قبضہ تھا۔ ان ملکوں کے لوگ امریکا میں آ کر سیٹل ہو گئے تھے اور اب وہ ان سے جان چھڑانے کے چکر میں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جو لوگ امریکا آ گئے ہیں، ان کے لیے امریکا ہی اپنا ملک ہونا چاہیے۔ ان میں انگریز، ڈچ، پرتگالی، اسپینی اور افریقی سیاہ فام، سب شامل تھے۔ وہ اس سرزمین پر اپنی حکومت قائم کرنے کے خواہشمند تھے۔ سو آخر کار آپس میں لڑ جھگڑ کر اور اپنی ہی حکومتوں سے جنگیں لڑ کر انہوں نے اپنے آپ کو آزاد کرا لیا۔ یہ اعلان 4 جولائی 1776ء کو امریکا کے شہر فلاڈیلفیا میں کیا گیا جسے ''امریکن ڈکلریشن آف انڈیپینڈنس'' کہا جاتا ہے ہر سال 4 جولائی کو امریکا میں عام تعطیل ہوتی ہے اور اس دن کو امریکن یومِ آزادی کے طور پر مناتے ہیں۔

1876ء میں امریکن اپنی آزادی کا صد سالہ جشن منا رہے تھے اور فرانس والوں کی خواہش تھی کہ امریکی عوام کو اس اہم موقع پر ''مجسمہ'' آزادی تحفتاً پیش کیا جائے۔ لیکن کوشش کے باوجود مجسمہ ''وقت'' پر مکمل نہ ہوسکا۔ بہرحال اس کی تکمیل اور اسے نیویارک لا کر اسمبل کر کے فکس کرنے میں مزید دس سال لگ گئے۔ یہ مجسمہ 1884ء میں فرانس میں تکمیل کو پہنچا۔ پھر فرانس کے فوجی جہاز isere میں اٹلانٹک سمندر عبور کر کے اسے جون 1885ء میں نیویارک کی بندرگاہ پر لایا گیا۔ اسے لبرٹی جزیرے پر فکس کرنے میں مزید ایک سال لگ گیا۔ کیونکہ جس ستون پر مجسمے کو رکھا گیا ہے۔ وہ بھی تقریباً مجسمے جتنا ہی بلند ہے۔ ایک سول انجینئر اس کی بلندی کا اندازہ اس بات سے بخوبی کر سکتا ہے کہ اس کی تیاری میں 27 ہزار ٹن کنکریٹ استعمال ہوا۔ بہرحال اس مجسمے کو مکمل طور پر install کر کے اس کی رونمائی کا جشن 28 اکتوبر 1886ء کو منایا گیا۔ اس وقت امریکا کے صدر گروور کلیولینڈ تھے۔

اس مجسمے کی تیاری میں 31 ٹن تانبا 125 ٹن لوہا اور پیتل استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی اندر لوہا اور بیرونی تہ تین سوت تانبے کی ہے۔ اس طرح اس مجسمے کا مجموعی وزن (ستون کے بغیر) 225 ٹن ہے۔ مجسمے کے مختلف اعضاء کا ناپ کچھ اس طرح ہے...... اس سے آپ مجسمے کے وزن اور جسامت کا اندازہ کر سکتے ہیں اور یہ بھی کہ کس قدر بھاری بھرکم اور بلند و بالا چیز تیار کر کے ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل کی گئی۔

مجسمے کے ناک کی لمبائی ساڑھے چار فٹ ہے۔

ایک کان سے دوسرے کان تک، دس فٹ۔

شہادت کی انگلی کی لمبائی آٹھ فٹ...... یعنی انسانی قد سے بھی زیادہ لمبی! درمیانی انگلی مزید ایک فٹ لمبی ہے۔ بازو 42 فٹ لمبے اور ان کی موٹائی 12 فٹ، ناخن کا سائز، 13 انچ لمبے اور 11 انچ چوڑے، ایک ناخن کا وزن ڈیڑھ کلو۔

مجسمے کے سر پر موجود تاج تک پہنچنے کے لیے 354 سیڑھیاں ہیں اور یہ مجموعی طور پر بائیس منزلہ ہے۔

☆☆☆

اس مجسمے کو دیکھنے والے اکثر یہ بحث کرتے ہیں کہ اس نے جو آہنی چوغا پہنا ہوا ہے، اگر اس کی جگہ کپڑے کا لباس تیار کیا جائے تو اس میں کتنا کپڑا صرف ہوگا؟ اس بات کا جواب ایک ٹیلر ماسٹر نے یہاں کے میگزین کے ذریعے اس طرح دیا ہے۔

''اس مجسمے کی لمبائی 111 فٹ، چھاتی 35 فٹ، شانے 90 فٹ ہیں۔ اس حساب سے مجسمے کا Surface Area بارہ سو مربع گز ہے۔ یہ مجسمہ، یعنی آزادی کی علامت والی خاتون کسی چست قمیص یا شرٹ کی بجائے ایک گھیر دار اور ڈھیلے ڈھالے چوغے میں ملبوس ہے۔ اس لیے اس مجسمے کے لیے ایسا ہی لباس تیار کرنے کے لیے کم از کم چار ہزار مربع گز کپڑا درکار ہوگا......''

دوسرا یہ سوال زیرِ بحث رہتا ہے کہ فرانس میں اتنے بڑے یعنی 151 فٹ لمبی عورت کے مجسمے کو تیار کرنے کے بعد اسے امریکا لا کر 154 فٹ بلند ستون پر کس طرح رکھا گیا ہے؟

دراصل اس مجسمے کو ایک حصے کے بجائے 350 ٹکڑوں میں تیار کیا گیا تھا۔ اسے بحری جہاز کے ذریعے فرانس سے امریکا لانے کے لیے ان 350 حصوں کو 214 کریٹوں میں بند کیا گیا تھا۔ پھر انہیں نیویارک لا کر نٹ بولٹ، Rivets اور ویلڈنگ کے ذریعے جوڑا گیا۔ اس کام میں چار مہینے لگ گئے تھے۔

ابراہام لنکن اور جان ایف کینیڈی امریکا کے صدر گزرے ہیں۔ عوام انہیں بہت پسند کرتے تھے۔ اتفاق سے دونوں کو قتل کیا گیا۔ ان دونوں کی زندگی اور موت میں کئی باتیں مطابقت رکھتی ہیں جو ہم کالج کے زمانے سے مختلف اخبارات میں پڑھتے رہے ہیں۔ نوجوان نسل کی دلچسپی کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے ان میں سے چند باتیں یہاں تحریر کرتا ہوں۔

ابراہام لنکن 1846ء میں کانگریس کے لیے منتخب ہوئے اور جان ایف کینیڈی 1946ء میں منتخب ہوئے۔

ابراہام لنکن 1860ء میں امریکا کے صدر بنے اور جان ایف کینیڈی 1960ء میں دونوں صدور کو جمعہ کے دن گولی مار کر قتل کیا گیا۔

دونوں کو گولی سر میں لگی۔

لنکن کی سیکریٹری کا نام کینیڈی تھا..... اور کینیڈی کی سیکریٹری کا نام لنکن تھا۔

دونوں صدور کے قاتلوں کا تعلق جنوبی ریاست سے تھا۔

دونوں صدور کی موت کے بعد جو صدر بنے ان کا تعلق جنوبی ریاست سے تھا اور دونوں کا نام جانسن تھا۔

اینڈریو جانسن، لنکن کی جگہ صدر بنے، وہ 1808ء میں پیدا ہوئے تھے۔

لنڈن جانسن، کینیڈی کی جگہ صدر بنے، وہ 1908ء میں پیدا ہوئے تھے۔

لنکن کے قاتل جان وائیکس بوتھ کی پیدائش کا سال 1839ء ہے۔

کینیڈی کا قاتل لی ہاروے اوسوالڈ 1939ء میں پیدا ہوا تھا۔

دونوں قاتل اپنی ذات کے بجائے نام سے جانے جاتے ہیں اور دونوں کے نام میں پندرہ حروف ہیں۔

لنکن کو جس تھیٹر میں قتل کیا گیا، اس کا نام ''فورڈ'' تھا۔

کینیڈی کو جس کار میں قتل کیا گیا، اس کا نام ''لنکن'' تھا جسے ''فورڈ'' کمپنی نے تیار کیا تھا۔

دونوں صدور کے قاتلوں ''بوتھ'' اور ''اوسوالڈ'' کو عدالت میں مقدمہ چلنے کے دوران قتل کیا گیا اور اصلی قاتلوں کا پتا نہیں چل سکا تھا۔

قتل سے ایک ہفتہ قبل صدر لنکن، میری لینڈ کے شہر ''منرو'' میں تھے۔

کینیڈی قتل سے ایک ہفتہ قبل فلم ایکٹریس مارلن ''منرو'' کے ساتھ تھے۔

لنکن کو تھیٹر میں گولی مار کر قاتل ایک گودام میں جا چھپا تھا۔

کینیڈی پر قاتل نے ایک گودام سے گولی چلائی تھی اور وہ ایک قریبی تھیٹر میں جا چھپا تھا۔

☆☆☆

امریکا میں مقیم برصغیر کے لوگوں کی دلچسپی کے لیے مفت تقسیم ہونے والے اخباروں میں سب سے ضخیم ''اردو ٹائمز'' ہے میگزین سمیت اس اخبار کے 54 صفحات ہوتے ہیں۔

''اردو ٹائمز'' امریکا سے شائع ہونے والا اوّلین اور سب سے زیادہ پڑھا جانے والا اردو اخبار ہے۔ اس اخبار کی مسلسل اشاعت کو 25 برس ہو چکے ہیں اور رواں سال میں اس کی سلور جوبلی منائی گئی ہے۔ یہ اخبار پاکستان کے جنگ گروپ کا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا ایڈیٹوریل صفحہ ہو بہو جنگ کے انداز میں شائع ہوتا ہے اور اس کے پبلشر کا نام خلیل الرحمان ہے۔

''اردو ٹائمز'' بیک وقت امریکا کے چودہ شہروں سے شائع ہوتا ہے، ان شہروں کے نام یہ ہیں..... نیویارک، واشنگٹن، میامی، اٹلانٹا، شکاگو، ہیوسٹن، لاس اینجلس وغیرہ، اخبار کا انتظامی اور مرکزی آفس نیویارک کے علاقے جیمیکا میں ہے۔ اس کے اوّلین اور اندرونی صفحات پر پاکستان اور مقامی خبروں کے ساتھ دنیا کی خبریں ہوتی ہیں۔ دیگر اخبارات کی طرح اس میں بھی اشتہارات کی بھرمار ہے۔ جن سے اخبار کو خاصی آمدنی ہوتی ہے۔ اس کا ادارتی صفحہ ہو بہو جنگ جیسا ہے جس میں کالم اور کالم نویس تک وہی ہیں۔ آج کے اخبار میں عبدالقادر حسن کا کالم ''غیر سیاسی باتیں''، حسن نثار کا ''چوراہا'' منو بھائی کا ''گریبان'' عباس اطہر کا ''کنکریاں''، رابعہ اندر کا ''بازگشت'' ڈاکٹر ظہور اعوان کا کالم ''دل پشوری'' وغیرہ شائع ہوئے ہیں۔

اردو ٹائمز سمیت دیگر اردو اور انگریزی اخبارات میں شائع ہونے والے بعض اشتہارات کو پاکستانی اور انڈین خصوصی توجہ سے پڑھتے ہیں..... وہ اشتہار امریکن امیگریشن سے متعلق ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے اشتہار شائع کرانے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر کے لوگ امریکا اور کینیڈا آنے کے لیے خاصے بے چین ہیں.....

بہرحال انڈین باشندوں کے لیے امریکا کی جانب سے کسی حد تک سہولیات فراہم کی جاتی ہیں اور ان کے لیے ملازمت اور روزگار کے حصول میں کچھ زیادہ رکاوٹیں اور مشکلات نہیں ہوتیں۔

اس قسم کے اشتہارات میں گویا ان پاکستانیوں کو پھانسنے کی کوشش کی جاتی ہے جو یہاں غیر قانونی طور پر رہائش

پذیر ہیں۔ بعض ادارے تو ان کی صحیح طور پر رہنمائی بھی کرتے ہیں کہ ان کا ''کام'' ہو سکے گا یا نہیں..... اور اگر ہو سکتا ہے تو اس میں کس قسم کی قانونی پیچیدگیاں درپیش ہیں..... جنہیں حل کرنا آسان ہے، مشکل ہے یا ناممکن ہے۔ لیکن ایسے اشتہار شائع کرانے والے کچھ وکیل اور ایجنسیاں ایسی بھی ہیں جو لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان سے پیسے بٹورتی ہیں۔ یہ لوگ ہمارے ہاں کے نجومیوں اور جوتشیوں کی طرح اپنے دفاتر پر ''ہر مشکل کا حل'' قسم کا بورڈ آویزاں کر کے بیٹھتے ہیں۔ ٹی وی اور اخبارات میں تواتر کے ساتھ اس قسم کے اشتہار دیے جاتے ہیں۔

''ہر قسم کے قانونی مسئلے کے حل کے لیے ہم سے رجوع کریں..... فلاں ایسوسی ایٹ ایک بااعتماد نام ہے اور اپنی خدمات کے حوالے سے قابلِ فخر شہرت رکھتا ہے..... گرین کارڈ کے حصول، فیملی کی بنیاد پر امیگریشن، سیاسی پناہ، بزنس کلوزنگ، بینک کرپسی، طلاق، رئیل اسٹیٹ کے لیے رابطہ کریں، وغیرہ وغیرہ۔

اس سلسلے میں ایشیائی لوگوں کو لوٹنے والے عموماً اپنے ہی ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اپنی کمپنیوں کو ولایتی رنگ دینے کے لیے امریکن گوروں کو ملازم رکھ لیا ہے اور اسی کو سامنے لایا جاتا ہے۔ کچھ کمپنیاں ''خالص'' گوروں کی بھی ہیں۔ کیونکہ اس ''کاروبار'' میں خاصی آمدنی ہے۔ ہمارے وطن میں جس قدر بے روزگاری اور بدحالی ہوگی، اور ان خوشحال ملکوں میں داخل ہونے کی جس قدر سختیاں ہوں گی..... اس قسم کی کمپنیوں کی آمدنی میں اسی تناسب سے اضافہ ہوتا رہے گا!

مذکورہ کیسوں کے علاوہ یہاں کے بعض وکیل ایسے بھی ہیں جو آپ کی جانب سے بغیر فیس وصول کیے آپ کا کیس لڑنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان کا طریقہ کار یہ ہے کہ کیس جیتنے کی صورت میں ہی کمیشن کے طور پر اپنا معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ علاقائی خبروں اور ملک کے بڑے اخبارات میں بھی اس قسم کے اشتہار شائع ہوتے رہتے ہیں۔

''آپ کو کسی کے کتے نے تو نہیں کاٹا؟ ہم آپ کو ہرجانے کی صورت میں لاکھوں ڈالر دلوا سکتے ہیں۔''

یاد رہے، یہاں کتے پالنے کی اجازت ضرور ہے لیکن اگر کسی کے پالتو کتے نے کسی راہگیر کو کاٹ لیا تو ہرجانے کے طور پر مالک کو بڑی رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ بعض لوگ انشورنس کرا لیتے ہیں یعنی کتا پالنے والے لوگ، اگر اتفاق سے ان کا کتا کسی راہگیر کو کاٹ لے تو ہرجانے کی رقم انشورنس کمپنی ادا کرتی ہے۔

یہاں امریکا میں سڑک پر ہونے والے حادثات کے عوض بھی خاصی رقم ملتی ہے۔ تقریباً پاکستانی ایک کروڑ روپے کے لگ بھگ! پھر ان کاموں کے لیے وکیل تو ہیں ہی، وہ پیشگی فیس لینے کے بجائے کیس لڑتے ہیں اور کیس جیتنے کی صورت میں زخمی ہونے والے شخص کو ملنے والی رقم سے کمیشن وصول کرتے ہیں۔

ایسے وکیلوں کی جانب سے عموماً اشتہار شائع ہوتے رہتے ہیں۔

میں نے ایسے ہی ایک حادثے کے بارے میں سنا تھا جس میں دو کاریں ٹکرا گئی تھیں..... قریب ہی ایک شخص گزر رہا تھا، وہ چلتے چلتے یکا یک گر گیا۔ جسمانی طور پر اسے کوئی خراش بھی نہیں آئی تھی، بلکہ پولیس کا خیال تھا کہ حادثے کے بعد اس شخص نے خود کو گاڑیوں کے قریب گرا دیا تھا۔

بہرحال ایک ہوشیار وکیل نے ذہنی صدمہ پہنچنے کی بنیاد پر اسے انشورنس کمپنی سے ہزاروں ڈالر دلوائے تھے۔ وہ بے روزگار اور غریب شخص تھا۔ ہرجانے کی رقم وصول کرنے کے بعد اسے امریکا میں کوئی مزدوری یا ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ آج وہ شخص سندھ کے بڑے زمینداروں میں شمار ہوتا ہے۔

میں واشنگٹن میں مقیم اپنے ایک دوست نجم میمن سے ملنے اس کے فلیٹ پر جانے کے لیے بلڈنگ کی لفٹ میں سوار ہوا تو اس میں ایک ایسی خاتون بھی موجود تھی جس کے ساتھ ایک کتا تھا۔ میں نے نجم سے کہا۔ ''لفٹ کے بجائے سیڑھیوں سے اوپر چلتے تو بہتر تھا۔''

''کیوں؟''

''لفٹ جیسی محدود اور بند جگہ میں ریچھ جیسے کتے کے ساتھ کھڑے ہونا نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا'' نجم نے کہا۔ ''کتا تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا، بالفرض اس نے تمہیں کاٹ بھی لیا تو فائدے میں تم ہی رہو گے۔''

میں اس کی بات سمجھ گیا تھا۔ کیونکہ ایک دن قبل میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ واشنگٹن میں کتا کسی کو کاٹ لے تو مالک یا انشورنس کمپنی Victim کو ایک لاکھ ڈالر...

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ادا کرے گی۔

ہمارے ہم وطنوں کی شادیوں طلاقوں کے مسائل سے بھی یہاں کے امریکی وکیلوں کی خاصی آمدنی ہوتی ہے۔ ان کے موکل خاص طور پر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو امریکا میں مستقل رہنے کے چکر میں یہاں کی عورتوں کو رقم دے کر باقاعدہ یا محض ''پیپر میرج'' کرتے ہیں۔ اس کام کے لیے یہاں کی عمر رسیدہ اور منشیات کی عادی سیاہ فام عورتیں ہمیشہ تیار رہتی ہیں۔ ان کے علاوہ بے ڈول اور بھدی ہسپانوی عورتیں بھی کافی تعداد میں یہاں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں بات کرتے ہوئے گفتگو کے دوران میں ہمارے ایک جہازی انجینئر دوست نے کہا تھا۔

''پیسا خرچ کرنے کے باوجود ہم پاکستانیوں سے یہی عورتیں شادی کرتی ہیں جو مطلقہ، بیوہ، گھر سے بھاگی ہوئی، شوہر کی ستائی ہوئی اور بچوں سے روٹھی ہوئی خونخوار قسم کی ہیں۔ یہ شادی کے بعد اور طلاق کے وقت بڑے مسائل کھڑے کر دیتی ہیں۔ ان مسائل کو صرف وکیل ہی حل کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے ہیرو کو وکیلوں کی فیس بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔''

امریکا سے شائع ہونے والے اس قسم کے اردو اور انگریزی اخبارات، جنہیں زیادہ تر برصغیر کے لوگ ہی پڑھتے ہیں ان میں ٹیکسی چلانے کے اشتہار بھی کثرت سے شائع ہوتے ہیں، مثلاً

'Master Cabbie Taxi Academy'

ان کا دعویٰ ہے کہ نیویارک میں ڈرائیونگ سکھانے والی وہی ایک قابلِ اعتماد اکیڈمی ہے۔ ایک اور اشتہار نظر سے گزرا تھا۔

''یلو ٹیکسی کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہم آپ کے بہترین معاون و مددگار ثابت ہوں گے۔ اگر آپ انگریزی ٹھیک سے نہیں بول سکتے تو یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

نیویارک، نیوجرسی، واشنگٹن، بالٹیمور، ہیوسٹن جیسے شہروں میں، جہاں پاکستانی زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ وہاں آپ کو کئی پاکستانی اور انڈین ٹیکسی ڈرائیور ملیں گے۔ ویسے بھی یہاں ٹیکسی چلانے کو دلچسپ جاب قرار دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس میں آپ ہی اپنے باس ہوتے ہیں۔ آپ اپنی مرضی کے مطابق ڈیوٹی انجام دے سکتے ہیں یعنی آپ جتنا چاہیں، اتنے وقت تک ٹیکسی چلا سکتے ہیں۔ دن میں چلائیں یا رات میں، یہ آپ کی خواہش اور پسند پر منحصر ہے۔ آپ خاموشی سے ٹیکسی چلائیں یا مسنجر کے ساتھ گپ شپ کرتے رہیں۔ ہر مرتبہ نیا مسافر اور نئی کہانی۔

بہرحال نیویارک واشنگٹن اور بالٹیمور جیسے امریکی شہروں میں پاکستانی ٹیکسی ڈرائیوروں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ بعض لوگ اپنی ٹیکسی چلاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو یومیہ یا ہفتہ وار کرائے پر ٹیکسی حاصل کر کے چلاتے ہیں۔ یہاں قانون خاصا سخت ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہر ڈرائیور کے پاس موبائل فون ضرور ہوتا ہے۔ بعض ٹیکسیوں میں وائرلیس سسٹم نصب ہے۔ لہٰذا بہ وقتِ ضرورت وہ فوراً پولیس سے رابطہ کر لیتے ہیں۔

واشنگٹن، ورجینیا اور سیری لینڈ کی اطراف میں خیر پور سے تعلق رکھنے والا ایک شخص یلو کیب چلاتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تھا۔ ''آپ کی ٹیکسی میں کبھی ایسا مسافر بھی سوار ہوا ہے جس نے منزل پر پہنچ کر کرایہ دیتے ہوئے پھڈا کیا ہو؟''

''ہاں، میری پانچ سالہ ڈرائیوری جاب میں ایک مرتبہ ایسا ضرور ہوا ہے۔'' اس نے بتایا، واشنگٹن کے سمتھ سن سب وے سے دو افراد میری ٹیکسی میں سوار ہوئے تھے۔ وہ ورجینیا کے علاقے آرلنگٹن جانا چاہتے تھے۔ گھر کے سامنے پہنچ کر انہوں نے کہا کرایہ 35 ڈالر بنتا ہے لیکن ہم تمہیں 20 ڈالر دیں گے۔ اگر تم نے 35 ڈالر کے لیے ضد کی تو یہ 20 ڈالر بھی نہیں ملیں گے اور ہم تمہاری پٹائی بھی کر دیں گے۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''میں نے خاموشی سے 20 ڈالر لے لیے۔ جب وہ دونوں اپنے گھر میں داخل ہو گئے تو میں نے فوراً پولیس کو فون کیا۔ پانچ منٹ کے اندر وہاں دو پولیس والے پہنچ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ دو افراد میری ٹیکسی کے ذریعے یہاں پہنچے اور کرائے کے پندرہ ڈالر کم دے گئے ہیں۔ پولیس والوں نے کال بیل بجا کر دونوں کو باہر بلا لیا۔ انہوں نے بدمعاش مسافروں سے کہا کہ انہیں پانچ منٹ دیے جاتے ہیں۔ اس دوران میں وہ مجھے پندرہ ڈالر ادا کر دیں۔ دوسری صورت میں انہیں پولیس اسٹیشن چلنا پڑے گا۔ اس دوران میں پولیس والوں کا افسر بھی وہاں پہنچ گیا جو عموماً اضافی مدد کے لیے پولیس والوں کے پیچھے آتا ہے، اس نے آتے ہی فیصلہ صادر کر دیا کہ اب صرف پندرہ ڈالر سے بات نہیں بنے گی۔ ڈرائیور کو کافی انتظار کرنا پڑا ہے۔ لہٰذا اسے ''ویٹنگ'' کے

پیسے بھی ملنے چاہئیں۔ آخر کار مجھے پندرہ کے بجائے پچیس ڈالر دیے گئے۔''

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں ٹیکسی ڈرائیوروں کو مکمل تحفظ حاصل ہے اور انہیں اس قسم کا کوئی خوف نہیں ہوتا جو ہمارے ہاں عام ہے۔ دوسری بات یہ کہ امریکا کی سڑکیں بہترین ہیں اور ڈرائیونگ میں لطف آتا ہے۔

یہاں کے اخبارات میں ٹریول ایجنٹوں کے بھی کئی اشتہار شائع ہوتے ہیں کیوں کہ امریکا کے شہروں میں رہنے والے لاکھوں پاکستانی، بنگلہ دیشی اور ہندوستانی وغیر چھٹیوں کے دنوں میں اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے ملنے اپنے ملک جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی لوگ حج، عمرے، زیارات اور مذہبی مقامات پر جاتے ہیں۔ کتنے ہی مقامی گورے سیاحت کی غرض سے انڈیا، نیپال اور سری لنکا کا رُخ کرتے ہیں۔ انہیں مناسب قیمت پر ٹکٹ اور بہترین سروس مہیا کرنے کے لیے ہمارے دیسی لوگوں کی کئی ٹریول ایجنسیاں قائم ہیں۔

فوٹو گرافی اور ویڈیو فلمیں بنانے والی کمپنیوں کے بھی کئی اشتہار چھپتے ہیں۔ مثلاً

''بندھن فوٹو اینڈ ویڈیو''

''یو ایس اے کیمرا مین''

''حمزہ ویڈیو اینڈ فوٹو''

''بسم اللہ ویڈیو، فوٹوز.....'' وغیرہ وغیرہ

اس قسم کے اشتہارات میں اکثر دولہا اور دلہن کی تصویر چھاپی جاتی ہے۔ امریکا میں مقیم پاکستانی اپنی پارٹیوں، برتھ ڈے اور شادی وغیرہ کی تقریبات کی ویڈیو ضرور بنواتے ہیں تاکہ اسے اپنے وطن عزیزوں کو بھیج سکیں۔ ان تقریبات سے بھی فوٹو گرافرز اور ان کی کمپنیوں کو خاصی آمدنی حاصل ہوتی ہے۔

جوتشیوں، جادوگروں، پیروں اور جنّات کے عاملوں کے اشتہار بھی خوب چھپتے ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس قسم کے پیروں، عاملوں اور جادوگروں کی تعداد امریکا میں دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔

اس قسم کے اشتہار نہ صرف امریکا میں شائع ہونے والے اردو، گجراتی اور انگریزی کے اخبارات میں شائع ہوتے ہیں بلکہ یہاں سے چلنے والے ''سونی'' اور ''زی'' جیسے ٹی وی چینلز پر بھی دکھائے جاتے ہیں۔

اپنے آپ Claim کرنے والے یہ عامل، جادوگر اور سائیں بابا وغیرہ ہر قسم کی پریشانی دور کرنے کی گارنٹی دیتے ہیں۔ ان اشتہاروں میں تلک لگے ہوئے پنڈتوں اور لمبی داڑھی والے پیر باووں کی تصاویر بھی چھپتی ہیں۔

یہاں کے ٹی وی سے اس قسم کے پنڈتوں، عاملوں اور پیروں کے متعلق چلنے والے اشتہاروں میں ایک یا دو مرد یا عورتیں Lastimony کے طور پر یہ بتاتے ہوئے دکھائی جاتی ہیں کہ ان کے ساتھ فلاں فلاں مسائل تھے اور فلاح مشکل درپیش تھی۔ وہ فلاں بابا کے پاس گئے اور انہوں نے دل کی مراد پوری کر کے خوشیوں سے مالا مال کر دیا۔

یہ جہالت اور شرک کی انتہا ہے اور وہ بھی امریکا جیسے ملک میں! جہاں تعلیم اور میڈیکل سائنس عام ہے۔ لیکن افسوس کہ جنّ بھوت کا اثر زائل کرنے کے لیے کمزور ایمان اور اعتقاد کے لوگ ان عاملوں اور پنڈتوں کے پاس جاتے ہیں۔ اولاد کے حصول کے لیے عورتیں لمبی داڑھی والے ''کرامتی بابا'' کے پاس جاتی ہیں۔

ہمارے ایک دوست ڈاکٹر الطاف میمن نیویارک کی ایک یونیورسٹی کے ''ڈین'' ہیں۔ انہوں نے کہا تھا ''امریکا ایک بہت بڑا ملک ہے۔ یہاں رہنے والے ہمارے ایشیائی کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ ان کے علاوہ مقامی گوروں میں سے بھی اگر ایک فی صد بلکہ ہزار میں ایک بھی بے وقوف اور کم عقل ہو تو ان کی تعداد لاکھوں میں ہو جاتی ہے اور اس قسم کے عامل اور پنڈت امریکا جیسے امیر ملک میں کبھی بھوکے نہیں مر سکتے۔''

اخبار میرے سامنے ہے اور میں اس میں چھپنے والے نصف صفحے کے اشتہار میں سب سے اوپر جلی حروف میں دس ہزار ڈالرز (چھ لاکھ روپے) نقد انعام کا اعلان کیا گیا ہے۔ یہ انعام اس شخص کے لیے ہے جو مشہور جوتشی ''ماسٹر امر'' کے دعوے کو جھوٹا ثابت کر سکے گا۔ یہ جوتشی نیویارک کے علاقے 198-Foot Hill Ave میں رہتا ہے۔ یہ آپ کے درج ذیل مسائل حل کر سکتا ہے۔ اولاد کا نہ ہونا، قرض کی عدم ادائیگی، شادی میں رکاوٹ، مالی نقصان، بے روزگاری، عشق میں ناکامی، دشمن کے جادو کا توڑ، وغیرہ وغیرہ۔

اگر آپ کا کوئی مقدمہ کورٹ میں زیرِ سماعت ہے اور آپ اس کا فیصلہ قبل از وقت معلوم کرنا چاہتے ہیں تو اس سلسلے میں بھی ماسٹر امر سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ کسی ڈاکٹر اور دوا سے فائدہ نہیں ہو رہا تو تب بھی ماسٹر اور جوتشی سے رابطہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا جاسکتا ہے۔

حیرت کی بات ہے، امریکا جیسے ملک میں، جہاں سے چاند اور سیاروں پر راکٹ روانہ کیے جارہے ہیں، وہاں اس قسم کے جعل ساز اس قدر عیاشیاں کررہے ہیں! آج کے انٹرنیٹ کے دور میں ہمارے ہاں سندھ کے دیہی علاقوں میں رہنے والے اَن پڑھ اور کم تعلیم یافتہ لوگ بھی خاصے ہوشیار ہوگئے ہیں۔

جادوگروں، عاملوں، جوتشیوں، پنڈتوں اور پیروں، فقیروں کے علاوہ ہمارے دیسی خودساختہ روحانی حکیموں اور خاندانی طبیبوں کے اشتہارات سے بھی یہاں کے اخبارات بھرے ہوتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اب مریض صرف امریکا میں رہ گئے ہیں کیونکہ وہ تمام حکیم، طبیب اپنے آبائی وطن کے شہر دہلی، لکھنؤ، اجمیر، کلکتہ، سکھر، ملتان اور حیدرآباد کو چھوڑ کر یہاں نیویارک، نیوآرلینس، فلاڈلفیا، بوسٹن، لاس اینجلس، شکاگو اور انا پولس میں آنکلے ہیں۔ اس قسم کے اشتہارات سے یہ اندازہ ہوتا ہے گویا برصغیر سے امریکا آنے والے تقریباً تمام لوگ ذہنی اور جنسی بیماریوں میں مبتلا تھے۔ جن کا علاج کرنے کے لیے بڑی بڑی مونچھوں والا ڈاکٹر راؤ بھی یہاں آپہنچا ہے۔ اس کا دعوٰی ہے کہ ان کی چالیس نسلوں سے حکمت پر دسترس ہے۔ اس کے اشتہار میں لکھا ہوتا ہے۔

''ہمارے پاس جنسی امراض کا شرطیہ علاج ہوتا ہے، ہمارے وسیع تجربے اور ہمارے پاس موجود چالیس ہزار سے زائد جڑی بوٹیوں کے نسخوں سے فائدہ حاصل کریں۔''

اخبار کے چوتھائی صفحے پر ایک اور مستقل اشتہار شائع ہوتا رہتا ہے جو کسی انصار الرحمٰن نامی شخص کی جانب سے ہوتا ہے۔ وہ خود کو پاکستان، امریکا اور کینیڈا کا روحانی معالج قرار دیتا ہے۔ اس کے اشتہار میں لکھا ہوتا ہے۔

''تمام بیماریوں کے روحانی علاج کے لیے انصار الرحمٰن آپ کے پاس نیویارک، مشی گن اور کیلی فورنیا میں پہنچ رہے ہیں۔ ملاقات کے خواہش مند حضرات موبائل فون پر پیشگی وقت لے لیں۔''

اشتہار میں اس کا موبائل نمبر بھی درج ہوتا ہے۔

سکھر کے عرفان جمانی اور میں ڈاکٹر منور عباسی سے ملنے بالٹیمور (میری لینڈ) گئے تھے۔ ڈاکٹر منور عباسی کی بیگم، بچوں سمیت پاکستان گئی ہوئی تھیں۔ لہٰذا قریبی شہر انا پولس سے آنے والے مصطفیٰ پلھ اور پی ٹی وی کے مشہور آرٹسٹ نسیم، رات منور کے ہاں رک گئے تھے۔ صبح سب سے پہلے میری آنکھ کھلی تھی۔ میں اخبار کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس دوران میں مصطفیٰ چائے کی ٹرے اُٹھائے میرے سامنے آبیٹھا۔

''کیا کوئی خاص خبر چھپی ہے؟'' مصطفیٰ نے مجھے انہماک سے اخبار پڑھتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں، کوئی خاص خبر تو نہیں ......'' میں نے جواب دیا۔ ''فلوریڈا ریاست کی کاؤنٹی پام بیچ میں ایک شخص کو لوٹا گیا ہے۔ میں وہ خبر پڑھ رہا تھا۔''

''ضرور گوئٹے مالا سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کو لوٹا گیا ہوگا۔'' مصطفیٰ نے فوراً کہا۔

''ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ شخص گوئٹے مالا سے تعلق رکھتا ہے؟ آپ نے تو اخبار بھی نہیں دیکھا۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''امریکا کی جنوبی ریاست فلوریڈا میں سینٹرل امریکا کے قریبی غریب ملکوں سے تعلق رکھنے والے کئی لوگ غیر قانونی طور پر رہتے ہیں جو مزدوری کرتے ہیں۔'' مصطفیٰ نے بتایا۔ ''ان میں زیادہ تعداد گوئٹے مالا کے باشندوں کی ہے۔ کیوبا، ہانڈرس جیسے ملکوں کے غریب اور بے روزگار لوگوں کی طرح یہ بھی خلیج میکسیکو کشتیوں کے ذریعے پار کرکے رات کی تاریکی میں میامی بیچ پہنچتے ہیں۔ پھر وہ سب سے قریبی کاؤنٹی پام بیچ میں رہائش اختیار کرتے ہیں۔ وہ چوری چھپے کارخانوں اور دکانوں پر کم سے کم اجرت پر کام کرتے ہیں۔ یہاں کے مل مالکان اور سیٹھ بھی خوش ہیں کہ انہیں کم تنخواہ پر فرماں بردار اور محنتی مزدور مل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے یہاں کے مقامی مزدوروں کے دس نخرے برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ وہ میڈیکل اور سوشل سہولت کے علاوہ کم سے کم دوہزار ڈالر ماہانہ طلب کرتے ہیں۔ غیر قانونی طور پر یہاں رہنے والے غیر ملکی خوفزدہ رہتے ہیں کہ کوئی ان کی شکایت نہ کردے، اس طرح انہیں واپس بھیج دیا جائے گا یا جیل میں ڈال دیا جائے گا۔ اس لیے وہ بغیر کسی اضافی سہولت کے نصف اجرت پر کام کرنے پر راضی ہوجاتے ہیں۔ یہ لوگ اس کم اجرت میں بھی خوش ہیں کیونکہ اپنے ملک میں بے روزگاری کے سبب بھوکوں مرنے سے بہرحال یہی بہتر ہے۔

مصطفیٰ نے مزید بتایا۔ ''گزشتہ کئی برسوں سے پام بیچ میں غیر قانونی طور پر رہنے والے ان مزدوروں سے راہ چلتے اور گھروں میں لوٹ مار ہوتی رہتی ہے۔ وہ بے چارے اپنے لٹنے کی فریاد بھی نہیں کرسکتے۔ کیوں کہ ان کے پاس یہاں رہنے کے قانونی دستاویز نہیں ہوتے اور وہ پولیس اور پولیس اسٹیشن سے دور ہی رہتے ہیں۔''

اخبار میں لکھا تھا کہ گوئٹے مالا کے یہ تارکینِ وطن نقدی اور سونے کی زنجیریں اپنے جوتوں اور انڈرویئر میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ یہ لوگ بینکوں پر بھروسا نہیں کرتے۔ کیونکہ بینک میں اکاؤنٹ کھولنے کے لیے امریکی شناختی کارڈ، سوشل کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ پیش کرنا ضروری ہوتا ہے جو ان کے پاس نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بینک انہیں اکاؤنٹ کھولنے کی اجازت دیتا بھی ہے تو یہ لوگ اس میں رقوم جمع کرانے سے عموماً کتراتے ہیں۔ کیونکہ انہیں ہروقت یہ خدشہ رہتا ہے کہ نہ جانے کب وہ چیکنگ کے دوران میں قانون کی گرفت میں آجائیں اور انہیں پکڑ کر جبراً امریکا بدر کردیا جائے۔ اس طرح ان کی ''کمائی'' یہیں بینکوں میں رکھی رہ جائے گی۔

اس واردات میں گوئٹے مالا کے غیر قانونی رہائش پذیر شخص ''ویلاس'' کو لوٹا گیا تھا۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ ایک جنرل اسٹور سے باہر آرہا تھا۔ اس دوران میں ایک غنڈہ اس پر جھپٹا اور اس سے طلائی کنگن چھین کر فرار ہوگیا۔ کنگن کی مالیت 400 ڈالر تھی۔ جاتے جاتے غنڈے نے ''ویلاس'' کو ایک گھونسا بھی جڑ دیا تھا۔ اخبار میں مزید لکھا تھا کہ اس قسم کی وارداتیں عموماً جمعہ کی شام کو ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہاں کے مزدوروں، محنت کشوں اور ملازمت پیشہ افراد کو ہفتے وار اجرت جمعہ کی شام کو ملتی ہے۔ ویلاس نامی 25 سالہ شخص چھ سال قبل امریکا پہنچا تھا اور اس نے ایک زیرِ تعمیر عمارت میں پلمبر کے طور پر کام کی ابتدا کی تھی۔ اس نے اپنے لوٹے جانے کی رپورٹ پولیس کو ضرور کی تھی لیکن پھر خود ہی غائب ہوگیا تھا۔ وہ ضرور اس بات سے خوفزدہ ہوگا کہ مزید پوچھ گچھ کے بعد غیر قانونی طور پر یہاں رہائش کے سبب اسے ہی نہ دھر لیا جائے۔

غلام مصطفیٰ نے مزید بتایا کہ اس قسم کی وارداتوں کا سلسلہ پچھلے دس بارہ سال سے جاری ہے۔ پولیس کوشش کرتی رہتی ہے کہ تارکینِ وطن افراد کا ان پر اعتماد بحال ہوسکے تاکہ وہ اپنے لٹنے کی شکایت ان کے پاس لے آئیں اور وہ مجرموں کو گرفتار کرانے میں ان کی مدد کریں۔ کیوں کہ جرائم کے خاتمے کا صرف یہی واحد راستہ ہے۔ یہاں کی پولیس ان کوششوں میں بھی مصروف ہے کہ فیڈرل حکومت مزید سخت اقدامات کرکے غیر قانونی طور پر امریکا میں داخل ہونے افراد کو روکے۔ یہ کام مقامی پولیس کا نہیں ہے۔ وہ امیگریشن نہیں جو ہر شہری کے پاسپورٹ چیک کرتے رہیں۔ وہ صرف اس وقت حرکت میں آتے ہیں جب کوئی واردات ہوچکی ہوتی ہے اور وہ اسی وقت کچھ کرسکتے ہیں جب کوئی شخص اپنے لٹنے کی فریاد لے کر ان کے پاس آئے گا۔

اخبار کے رپورٹر کے مطابق غیر قانونی تارکینِ وطن کو لوٹنے کی وارداتوں میں کبھی کبھی قانون نافذ کرنے والوں کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔ ایک سال قبل ایک ایسی ہی واردات میں علاقے کا ایک پولیس آفیسر اور کاؤنٹی شیرف کے آفس کا ایک سپاہی ملوث تھا۔ انہوں نے ایک فارم ہاؤس میں کام کرنے والے گوئٹے مالا کے باشندوں کو لوٹا تھا۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق فلوریڈا ریاست کی کاؤنٹی پام بیچ کی آدم شماری بارہ لاکھ ہے۔ اس میں 18 ہزار گوئٹے مالا کے باشندے 8 ہزار ہانڈرس کے شہری، نکاراگوا کے 3 ہزار اور ایلسواڈور کے 3 ہزار افراد شامل ہیں۔ لیکن اخبار کے سروے کے مطابق ان ممالک کے لوگوں کی تعداد بتائے گئے اعداد و شمار سے تین گنا زیادہ ہے۔ چونکہ وہ لوگ امریکا میں غیر قانونی طور پر مقیم ہیں اس لیے وہ ملک کی آدم شماری میں خود کو شمار نہیں کراتے۔

جغرافیہ سے ناواقف قارئین کے لیے میں یہاں سینٹرل امریکا کے ملکوں کے بارے میں چند سطریں لکھنا ضروری سمجھتا ہوں ...... افریقا، ایشیا اور یورپ کی طرح اٹلانٹک سمندر کی دوسری جانب بھی دو براعظم ہیں۔ دنیا کے نصف شمال میں ''شمالی امریکا'' ہے اور دوسرا جنوبی نصف حصے میں ''جنوبی امریکا'' کہلاتا ہے ...... شمالی امریکا میں دو بڑے ملک واقع ہیں۔ ایک کینیڈا اور دوسرا یو ایس اے! جنوبی امریکا میں برازیل، کولمبیا، وینزویلا، ارجنٹائن، پیرو، اور چلی شامل ہیں۔ ان ملکوں میں یورپ، اسپین اور پرتگال کے باشندے سب سے پہلے آئے تھے۔ اس لیے تمام جنوبی امریکا اور اردگرد کے جزیروں پر ہسپانوی اور پرتگالی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہ دونوں زبانیں خاصی ملتی جلتی ہیں۔ بالکل اس طرح جیسے ہمارے ہاں بولی جانے والی زبانیں پنجابی اور سرائیکی خاصی ملتی جلتی ہیں۔

جنوبی امریکا اور شمالی امریکا براعظم الگ تھلگ نہیں ہیں۔ دونوں براعظموں کو زمین کی پتلی پٹی ملاتی ہے جس میں میکسیکو گوئٹے مالا، ہانڈرس، ایلسلوڈور، نکاراگوا، کاسٹاریکا اور پاناما جیسے ملک واقع ہیں۔ ان ملکوں میں پاناما سب سے زیادہ تنگ اراضی پر واقع ہے۔ یہ ملک ایک مقام پر اس قدر تنگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے کہ وہاں زمین کھود کر کینال بنائی گئی ہے۔ جس کے ایک طرف اٹلانٹک سمندر اور دوسری جانب سے پیسفک سمندر ہے۔ کبھی کبھی ہمیں اپنا جہاز نیویارک سے لاس اینجلس لے جانا ہوتا ہے تو ہم پورے جنوبی افریقا کا چکر کاٹنے کے بجائے پاناما کینال سے گزر کر پیسفک سمندر میں پہنچ جاتے تھے۔ پاناما کینال کی وجہ سے ہمارا کافی وقت بچ جاتا ہے، تقریباً دس بارہ دن کی ''بچت'' ہو جاتی ہے اور لاکھوں روپے کی ایندھن کی بچت الگ ہوتی ہے۔ کیونکہ بیس ہزار ٹن کے جہاز میں سفر کے دوران یومیہ کم از کم تیس ٹن ایندھن ضرور صرف ہوتا ہے۔

سینٹرل امریکا اور جنوبی امریکا کے ملکوں کا حال کچھ اچھا نہیں ہے۔ بدامنی، بے روزگاری اور بدحالی کے سبب وہاں کا ہر شخص اپنا ملک چھوڑ کر امریکا اور کینیڈا جانے کا خواہش مند ہے۔ کشتیوں کے ذریعے چوری چھپے آنے والوں سے بعض افراد سمندر ہی میں موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ باقی لوگ امریکا کے ساحل پر قدم رکھتے ہی پولیس اور امیگریشن والوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور کئی برسوں تک جیلوں میں سڑتے رہتے ہیں چند ہی خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جو سمندری لہروں اور پولیس سے بچ کر ہر وقت خوف کی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ لوگ چوری چھپے نہایت کم اجرت پر ملازمت اور مزدوری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ایسے نامساعد حالات میں کچھ رقم بچا کر وہ اپنے بیوی بچوں اور والدین کو بھیجتے ہیں۔ کبھی کبھی لٹیرے ان سے وہ رقم بھی چھین جاتے ہیں یہ بڑی المناک داستان ہے .....اور ایسی ہی، بالکل ملتی جلتی کہانی ہمارے ملک کے لوگوں کی ہے۔ جو غیر قانونی طور پر یورپ، انگلینڈ، عربستان، مسقط، دبئی، کویت جیسے ملکوں کے شہروں میں مقیم ہیں۔

☆☆☆

امریکا میں امن وامان ہے۔ قانون سخت ہے اور اس پر عمل درآمد کرایا جاتا ہے۔ مجرم کی گرفتاری کے لیے حکومت خاصے اخراجات برداشت کرتی ہے اور ایسے انتظامات کرتی ہے کہ مجرم کو سزا ملنا یقینی ہو جائے۔ ملک کی سی آئی ڈی اور انٹیلی جنس جیسے ادارے جرم کی جڑ تک کھود نکالتے ہیں اور مجرموں کو عبرت ناک سزائیں دلوا کر پیغام عام کرتے ہیں تاکہ عام شہری غیر قانونی کام کرنے سے گریز کریں۔ بلکہ اس بارے میں سوچیں بھی نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ امریکا میں جرائم ہوتے ہی نہیں اور وہاں ہر وقت سکون، سکھ اور شانتی کی فضا قائم ہے۔ اس قدر سخت قوانین ہونے کے باوجود امریکا جرائم کے حوالے سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس کا سبب شراب نوشی ہے۔

آج کے ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ یورپین اور امریکن گورے بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شراب جسمانی بیماریوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی بیماریوں کو بھی جنم دیتی ہے۔ سوشل فنڈ پر پلنے والا یہاں کا ایک بے روزگار سیاہ فام خمرے کی بوتل چڑھا کر ہوش وحواس گنوا بیٹھتا ہے تو اسے کسی کی پروا نہیں رہتی۔ جب شراب کی طلب ہوتی ہے تو وہ کسی راہ گیر عورت کا پرس چھینتا ہے، گاڑی کے شیشے توڑ کر اس میں سے چوری کرتا ہے حتیٰ کہ بینک اور پیٹرول پمپ تک کو لوٹنے سے نہیں چوکتا۔ کئی خطرناک پاگل اور جنسی مریض عادت سے مجبور ہو کر یا اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے لوٹ مار کرتے ہیں۔ عورتوں کو اغوا کر کے جنسی تشدد کا نشانہ بناتے ہیں پھر اپنے شکار کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ اسی لیے اس ملک میں امن امان کی صورتِ حال بہتر ہونے اور قوانین سخت ہونے کے باوجود ایک عام شہری، خاص طور پر غیر ملکیوں کو ممکنہ طور پر ہونے والی وارداتوں کے بارے میں قبل از وقت آگاہ کیا جاتا ہے۔ میں اپنے ابتدائی امریکی سفرناموں میں لکھ چکا ہوں کہ جب ہمارا جہاز امریکا کی کسی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتا تھا تو مقامی آفس والے ہمیں خبردار کرتے تھے کہ فلاں فلاں علاقوں میں جانے سے گریز کریں۔ فلاں علاقے میں رات کے وقت تنہا ہرگز نہ جائیں .....اور بعض شہروں میں دن کے وقت بھی تنہا جانے سے منع کیا جاتا تھا۔

وہ 1968ء اور 1969ء کا زمانہ تھا۔ آج چالیس برس بعد بھی لوگوں کو، خاص طور پر خواتین کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ کس قسم کے ''واقعات'' پیش آسکتے ہیں۔ وہ ان کی ہدایات کو ذہن نشین کر کے اپنا تحفظ کر سکیں۔ ویسے بھی ہوشیار رہنے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اس حوالے سے ایک ای میل موصول ہوئی تھی۔

'It Never Hurts To Be Careful In Crezy World We Live In'

یہ ای میل ایک امریکن عورت نے کئی لوگوں کو، خاص طور پر خواتین کو بھیجی ہے۔ تاکہ وہ اس کے تحریر کیے ہوئے درج ذیل دس نکتوں پر غور کریں اور ''ایمرجنسی'' کے موقع پر ان پر عمل کر کے اپنا تحفظ کر سکیں۔

''اگر آپ مرد ہیں .....'' اس نے اپنے خط میں لکھا ہے۔ تو آپ یہ نکتے اپنی بہنوں، اپنی ماں اور اپنے عزیزوں کو پڑھائیں یا پڑھ کر سنائیں۔ تاکہ یہ باتیں وہ ذہن نشین کر لیں۔ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں اس میں پاگلوں اور جنونیوں کی کمی نہیں ہے۔ نقصان اُٹھا کر ہاتھ ملنے سے بہتر ہے کہ محتاط رہا جائے اور اپنے تحفظ کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

1) انسانی جسم کا طاقتور عضو کہنی ہے۔ خود کو بچانے کے لیے اور خود کو کسی کی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے آپ اسے کہنی کی ضرب لگا سکتے ہیں۔ یہ خاصا کارآمد حربہ ہے۔

2) نیو آرلینس کی ایک ٹورسٹ گائیڈ سے معلوم ہوا ہے کہ اگر کوئی لٹیرا آپ سے پرس یا بیگ طلب کرے تو وہ چیز اس کے ہاتھ میں تھمانے کے بجائے ذرا دور پھینک دیں۔ ممکن ہے اس کی دلچسپی کا مرکز آپ نہیں بلکہ آپ کا پرس یا بیگ ہو۔ وہ جیسے ہی پرس وغیرہ کو اُٹھانے کے لیے آگے بڑھے۔ آپ مخالف سمت میں جس قدر تیز دوڑ سکیں، بھاگ کھڑے ہوں۔

3) اگر کوئی آپ کو زبردستی کار کی ڈگی میں ڈال کر لے جا رہا ہو تو آپ ٹھوکریں مار کر عقبی بتیوں کو توڑ دیں اور اس کے خلا سے اپنا بازو نکال کر لہراتے رہیں۔ کار چلانے والا بدمعاش آپ کی اس حرکت کو نہیں دیکھ پائے گا۔ لیکن کار کے پیچھے آنے والا ہر شخص آپ کا لہراتا ہوا ہاتھ ضرور دیکھے گا۔ اس طریقے سے کئی اغوا ہونے والوں کی جان بچی ہے۔

4) عورتوں میں یہ عادت پائی جاتی ہے کہ شاپنگ کے بعد یا اپنے آفس سے لوٹتے وقت کار میں بیٹھ کر کچھ دیر ڈیش بورڈ میں کچھ ٹٹولتی رہتی ہیں، چیک بک نکال کر اس کا جائزہ لیتی ہیں یا سامان کی فہرست بنانے لگتی ہیں ایسا ہرگز مت کیجیے۔ آپ کو اغوا کرنے والے کی نظر آپ پر ہوتی ہے اس کے لیے وہ لمحات بہترین موقع فراہم کرتے ہیں۔ وہ پسنجر سیٹ کی طرف کا دروازہ کھول کر گاڑی میں آسانی سے آسکتا ہے اور گن پوائنٹ پر آپ کو اپنی مرضی کے مطابق کہیں بھی لے جا سکتا ہے۔ اس لیے عقلمندوں کا کہنا ہے کہ کار میں سوار ہوتے ہی اس کے دروازے لاک کر دیے جائیں اور گاڑی کو اسٹارٹ کر کے روانہ ہو جائیں۔

5) اگر کار میں کوئی موجود ہے اور اس نے آپ پر گن تان لی ہے اور وہ آپ کو کہیں چلنے کا حکم دیتا ہے تو آپ انجن بند کر کے ایک جگہ رکے نہ رہیں۔ بلکہ اپنی گاڑی کو مزید تیز رفتار سے چلائیں اور کسی دیوار یا کھمبے وغیرہ سے ٹکرا دیں۔ کار میں موجود ائر بیگز کے سبب آپ کی جان بچ سکتی ہے لیکن عقبی سیٹ پر بیٹھا ہوا اسلحہ بردار شخص خاصا مضروب ہو سکتا ہے۔ اس دوران میں کئی راہگیر آپ کی مدد کو پہنچ جائیں گے۔

یاد رہے امریکا میں تقریباً تمام گاڑیوں میں حفاظتی اٹو بیگز موجود ہوتے ہیں۔ گاڑی کے تصادم ہوتے ہی ان ائر بیگز میں فوراً ہوا بھر جاتی ہے اور فرنٹ سیٹوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے سامنے فوم کی طرح چھا جاتے ہیں۔ بہرحال کار کے ٹکراتے ہی فوراً کار سے نکل جانا چاہیے۔ کار کو نقصان ضرور پہنچے گا جو انشورنس کمپنی ادا کر سکتی ہے۔ بہرحال وہ نقصان برداشت کر لینا چاہیے۔ صرف اپنی جان بچائیے۔ یاد رہے امریکا میں ایسے واقعات عام ہیں جن میں وحشی صفت انسان عورتوں کو اغوا کر کے ان کی آبروریزی کے بعد قتل کر دیتے ہیں۔ پھر ان عورتوں کی لاشیں کسی سڑک کے کنارے یا سنسان مقامات پر پائی جاتی ہیں۔

چند نکتے کار پارکنگ اور گیراج میں کھڑی اپنی گاڑی میں بیٹھنے کے متعلق:

اپنی گاڑی میں سوار ہونے کے وقت ہوشیار رہیے۔ کار میں داخل ہونے سے پہلے اپنے اردگرد نظر دوڑا لیے، کار کے اندر جھانک کر دیکھیے، پسنجر سیٹ اور عقبی سیٹ کے سامنے فرش پر بھی دیکھ لیجیے کہ وہاں کوئی آپ کے انتظار میں چھپا تو نہیں بیٹھا۔

اگر آپ کی گاڑی کے قریب کوئی ٹرالر یا ٹرک کھڑا ہے تو آپ اس سمت سے اپنی گاڑی میں سوار نہ ہوں بلکہ پسنجر سیٹ کی طرف سے گاڑی میں داخل ہوں۔ عورتوں کے شکار عموماً اسی قسم کا حربہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنی بڑی گاڑی (ٹرک یا ٹرالر وغیرہ) کار کے قریب کھڑی کر دیتے ہیں پھر وہ شاپنگ کر کے واپس آتی ہیں تو اس کے ایک ہاتھ میں سامان ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرتی ..... اس دوران میں ٹرک میں سوار شخص اسے پکڑ کر کھینچ لیتا ہے اور کلوروفارم وغیرہ کے ذریعے اسے..... بےہوش کر کے لے جاتا ہے۔

پارکنگ لاٹ میں واپس آتے وقت آپ اپنی گاڑی کی دونوں اطراف میں نظر ضرور ڈالیے۔ اگر وہاں کوئی شخص موجود ہو تو آگے مت بڑھیے، واپس شاپنگ سینٹر میں چلی جائیے اور وہاں سے گارڈ کو اپنے ساتھ لے کر اپنی گاڑی تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آیئے۔

7) اگر کوئی جنونی قاتل آپ کے پیچھے لگا ہوا ہے اور وہ آپ کو قتل کرنا چاہتا ہے، اس کے ہاتھ میں پستول وغیرہ ہے اور آپ اگر اس کی دسترس سے دور ہیں یعنی اس سے کچھ فاصلے پر ہیں تو ہمت مت ہاریے اور آپ سے جس قدر ممکن ہو سکے اس کی مخالف سمت میں بھاگ کھڑی ہوں' دوڑتے ہوئے نشانے کے لیے سو میں چار چانسز ہوتے ہیں کہ اسے گولی لگ جائے اور اگر بدنصیبی سے گولی لگ بھی جائے تو دل جیسے اہم مقام پر گولی لگنے کے چانس بہت ہی کم ہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ بھاگ کر اپنی جان بچایئے اور سیدھا دوڑنے کے بجائے لہرا کے ''زگ زیگ'' کے انداز میں دوڑیں

8) عورت فطرتاً نرم دل اور ہمدرد ہوتی ہے لیکن میرا آپ کے لیے یہی مشورہ ہے کہ کسی اجنبی سے ہرگز ہمدردی نہ کریں، کیونکہ یہی ہمدردی بعض اوقات لٹنے، ریپ اور موت کا سبب بنتی ہے۔ ''ٹیڈی بنڈی'' نامی ایک امریکی جنونی قاتل کا طریقہ واردات یہی تھا۔ وہ عورتوں کی ہمدردی حاصل کر کے ان کے قریب ہو جاتا تھا اور پھر انہیں بے دردی سے قتل کر دیتا تھا۔ وہ سلجھا ہوا اور تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا اور خاصا خوبرو بھی تھا۔ کسی تنہا عورت کو دیکھ کر وہ لنگڑانے لگتا اور اس سے لفٹ لینے کی کوشش کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ عورتوں سے مدد کی درخواست کرتا تھا اور ان کا سہارا لے کر اپنی کار میں سوار ہوتا تھا۔ پھر وہ اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہی اس عورت کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتا تھا اور زبردستی اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اگلے دن اس عورت کے قتل کی خبر اخبارات کی زینت بنتی تھی۔

9) ان عورتوں کے لیے ایک اہم مشورہ جو اپنے گھر میں تنہا رہتی ہیں۔

ایک عورت ہیوسٹن میں تنہا رہتی تھی۔ اس نے بیان دیا کہ رات کے وقت پورچ سے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی تھی۔ پہلے تو اس نے دروازہ کھول کر یہ دیکھنا چاہا کہ کون بچے کو اس کے پورچ میں چھوڑ گیا ہے۔ لیکن اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے پولیس کو فون کرنا مناسب سمجھا۔ پولیس آفیسر نے فون پر اسے خبردار کیا۔

''میڈم! ہمارے آنے تک دروازہ ہرگز مت کھولیے۔''

اس عورت نے بتایا کہ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے روتا ہوا بچہ کمرے کی کھڑکی کے قریب سے گزر کر باہر جا رہا ہے۔

''مجھے خوف محسوس ہوا تھا کہ کہیں معصوم بچہ سڑک پر جا کر کسی گاڑی کے نیچے نہ آ جائے۔ لیکن پولیس مجھے خبردار کرتی رہی کہ میں دروازہ کھولنے سے باز رہوں اور گھر سے باہر ہرگز نہ نکلوں، مجھے بتایا گیا تھا کہ پولیس کی گاڑی جلد ہی میرے گھر پہنچنے والی ہے۔''

پولیس کی گاڑی کا سائرن دور ہی سے سنائی دینے لگا تھا اور یکایک بچے کے رونے کی آواز تھم گئی۔ بعد میں پولیس سے معلوم ہوا کہ کئی عادی قاتل تنہا رہنے والی عورتوں کو گھر سے باہر نکالنے کے لیے روتے ہوئے بچے کا ٹیپ چلاتے ہیں۔ پھر جذبہ ہمدردی سے مغلوب ہو کر جیسے ہی وہ عورت گھر سے باہر نکلتی ہے، خونی کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

امریکن حکومت ہر سال دنیا کے تقریباً پچاس ہزار افراد کو لاٹری کے ذریعے گرین کارڈ جاری کرتی ہے۔ تاکہ وہ لوگ امریکا میں آ کر ملازمت وغیرہ کر سکیں۔ پاکستان سے بھی ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں افراد فارم پُر کرتے ہیں تاکہ ان کا نام لاٹری میں نکل آئے۔ لیکن چند برسوں سے پاکستان میں لاٹری کے ذریعے ویزا نہیں دیے جا رہے ہیں۔ کیونکہ اس لاٹری کی سہولت کو ان ملکوں کے لیے رکھا گیا ہے جہاں کے لوگ امریکا میں کم ہیں۔

لاٹری میں نام نکلنے کے بعد امریکا میں مستقل رہائش کے لیے درخواست دی جا سکتی ہے۔ اپنے ساتھ بیوی، اگر کسی خاتون کے نام لاٹری نکل آئے تو وہ اپنے شوہر اور اکیس سال سے کم عمر بچوں کے لیے PR اپلائی کر سکتی ہیں۔ درخواست کے منظور ہونے پر ان کے پاسپورٹ پر Immigrant Visa کا اسٹیکر لگا دیا جاتا ہے۔ پھر چھ ماہ کے اندر امریکا پہنچ کر اپنے پاسپورٹ پر ''انٹری'' کی مہر لگوانی پڑتی ہے۔ اس کے بعد ڈاک کے ذریعے ان کے دیے گئے ایڈریس پر گرین کارڈ پہنچا دیا جاتا ہے۔

یہاں یہ بھی لکھتا چلوں کہ اس سلسلے میں کئی چکر باز قسم کے لوگ پیسے بٹورنے کے لیے امیدواروں کو سبز باغ دکھاتے ہیں۔ گرین کارڈ لاٹری کے چکر میں کئی شوقین ان چکر بازوں کے ہاتھوں لٹ جاتے ہیں۔ امریکن حکومت جب بھی لاٹری کا اعلان کرتی ہے تو یہ ٹھگ اور چکر باز ایجنٹ اخبار، ٹی وی اور انٹرنیٹ کے ذریعے لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انہیں پچاس، سو یا دو سو ڈالر فیس کی صورت میں

ادا کر کے اپنا فارم پُر کروائیں۔ اس طرح لاٹری میں نام آنے کے چانس بڑھ جائیں گے۔ اصل میں یہ بات درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے ایجنٹ آپ کا فارم تاخیر سے بھیجتے ہیں۔ کئی ٹھگ اپنے اشتہاروں میں یہ بھی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ نہ صرف آپ کا فارم جلد بھیجیں گے بلکہ کامیاب امیدواروں کو امریکا جانے کا ٹکٹ بھی مفت دیں گے۔

امریکن حکومت عوام کو اکثر خبردار کرتی رہتی ہے تاکہ وہ ان چکر باز ایجنٹوں سے محفوظ رہیں اور اپنا پیسا اور چانس نہ گنوائیں۔

گرین کارڈ ملنے کے بعد کوئی بھی غیر ملکی شخص امریکا میں مستقل رہائش اختیار کر سکتا ہے لیکن کسی بھی جرم میں ملوث ہونے پر ان کا گرین کارڈ کینسل ہو سکتا ہے اور انہیں اپنے ملک واپس لوٹنا پڑے گا۔

گرین کارڈ ہولڈر اگر امریکا میں رہنے کے بجائے کسی دوسرے ملک میں جا کر رہائش اختیار کریں تو 365 دن کے اندر ان کی امریکن PR ختم کی جا سکتی ہے یا انکم ٹیکس کی عدم ادائیگی کی صورت میں وہ اپنا PRS یعنی ''پرمنٹ ریزیڈنس اسٹیٹس'' لکھوا سکتے ہیں۔

☆☆☆

دنیا بھر میں مشہور اور ''مطلوب'' گرین کارڈ ''سبز'' رنگ کا نہیں ہے۔

تیسری دنیا کے کسی بھی فرد کو امریکا کا گرین کارڈ ملتا ہے تو وہ خود کو خوش نصیب تصور کرتا ہے۔ یہ گرین کارڈ کیا ہے؟ دراصل یہ امریکا میں مستقل رہائش کا اجازت نامہ ہے جسے ''یونائیٹڈ اسٹیٹس پرمنٹ ریزیڈنٹ کارڈ'' کہا جاتا ہے۔ یہ گویا ایک قسم کے شناختی کارڈ کی سی حیثیت رکھتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا حامل امریکا میں قانونی طور پر رہائش اور وہاں ملازمت کرنے کا حق رکھتا ہے۔ ایسے شخص کو ایل، پی آر یعنی Lawful Permanent Resident کہا جاتا ہے۔ گرین کارڈ کو ماضی میں Aline Registeration رسید کہا جاتا تھا۔ اب صرف ''پرمنٹ ریزیڈنٹ کارڈ'' کہا جاتا ہے اسے فارم i551 بھی کہتے ہیں

اس کارڈ کا نام ''گرین کارڈ'' اس لیے پڑا کہ موجودہ کارڈ سے پہلے جو کارڈ جاری کیا جاتا تھا اس کا رنگ سبز تھا۔ یہ سبز رنگ کا کارڈ دوسری جنگ عظیم کے بعد، یعنی 1946ء میں چھاپا گیا تھا۔ آج کا گرین کارڈ (i-551 فارم) 1977ء کے بعد شروع کیا گیا۔ جو مختلف رنگ کا چھپتا رہا ہے۔ اب تک گو کہ اس فارم کو سبز رنگ کے کاغذ پر نہیں چھاپا گیا لیکن اس فارم اور کارڈ کو ''گرین کارڈ'' ہی کہا جاتا ہے۔ 2006ء سے کارڈ جاری کیے جا رہے ہیں، وہ سفید رنگ کے ہیں۔ البتہ فارم کی پشت پر چھپے ہوئے حروف سبز رنگ کے ضرور ہیں۔ اس کارڈ پر کارڈ کے مالک کا نام تصویر اور دیگر تفصیلات درج ہوتی ہے۔ اس میں کئی پوشیدہ نشانات رکھے گئے ہیں تاکہ اس کی نقل نہ بنائی جا سکے۔ آج کل ہمارے ملک کے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ بھی ماڈرن ٹیکنالوجی کے مطابق Readable بنائے جاتے ہیں۔ جنہیں Scan مشینوں کے ذریعے پڑھا بھی جا سکتا ہے اور ان کے مالک کے بارے میں تحریری معلومات بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔

میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ امریکی قانون کے مطابق امریکا میں جو لوگ گرین کارڈ کے تحت رہائش پذیر ہیں۔ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا پاسپورٹ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیں۔ یہ اس لیے ہے کہ امریکی آئین کے مطابق امریکی شہریوں کو ووٹ کا حق اور دیگر سہولیات دستیاب ہیں۔ لیکن گرین کارڈ کے تحت رہنے والوں کو میسر نہیں ہیں۔ یہ لوگ پاسپورٹ ملنے تک 'Aliens' یعنی ''غیر امریکی'' کہلاتے ہیں۔

نائن الیون کے حادثے سے قبل کبھی کسی سے تعرض نہیں کیا جاتا تھا۔ کسی سے راہ چلتے پوچھ گچھ نہیں ہوتی تھی کہ وہ گرین کارڈ ہولڈر ہے یا پاسپورٹ حاصل کر چکا ہے۔ امریکا میں موجود کئی غیر قانونی طور پر رہائش پذیر افراد بھی بے خوف چلتے پھرتے تھے۔ لیکن اب سختی کے سبب خاصی پوچھ گچھ ہوتی ہے اور غیر قانونی طور پر مقیم افراد کو امریکا سے ڈی پورٹ کر کے واپس بھیجا جا رہا ہے۔ بہرحال ٹورسٹ ویزا پر آنے والے سیاحوں کو بھی چاہیے کہ وہ ہر وقت اپنا پاسپورٹ اپنے ساتھ رکھیں۔ خاص طور پر اس وقت، جب وہ ایک شہر سے دوسرے شہر جا رہے ہوں۔ کیوں کہ ریلوے اسٹیشن اور ائرپورٹ پر اکثر چیکنگ ہوتی رہتی ہے۔

میں اپنے رہائشی شہر نیوجرسی سے واشنگٹن اکثر جاتا رہتا تھا۔ لیکن چار مہینوں کے عرصے میں کہیں بھی مجھ سے پاسپورٹ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا گیا تھا۔ آخری مرتبہ جب میں واشنگٹن جا رہا تھا تو روانہ ہوتے وقت پاسپورٹ میری جیب میں نہیں تھا۔ لیکن چلتے چلتے گویا عادتاً،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاسپورٹ اٹھالیا تھا۔ واشنگٹن سے واپسی پر جب میں ریلوے اسٹیشن پہنچا تو معلوم ہوا کہ ٹرین میں بم کی افواہ کے سبب ہر مسافر کی چیکنگ کی جارہی تھی۔ جن غیر ملکیوں کے پاس پاسپورٹ موجود نہیں تھا انہیں ٹرین میں سوار ہونے سے منع کیا جارہا تھا اور انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے گھروں سے پاسپورٹ منگوالیں اور اپنا پاسپورٹ چیک کرا کر جاسکتے ہیں۔

یہ ان لوگوں کی خوش نصیبی تھی کہ وہ امریکا جیسے ملک میں تھے جہاں بہرحال قانون کی پاسداری کی جاتی ہے۔ اگر سعودی عرب اور کویت جیسے ملکوں میں ہوتے تو وہاں بغیر کسی تاخیر کے انہیں جیل بھیج دیا جاتا۔ ان ممالک میں پولیس نے اندھیر مچا رکھا ہے۔ نہ وکیل سے ملنے کا موقع دیا جاتا ہے اور نہ ہی کورٹ کچہری کا تکلف کیا جاتا ہے۔ گرفت میں آئے ہوئے شخص کو صفائی پیش کرنے کا بھی موقع نہیں دیا جاتا۔ میں اس کی کئی مثالیں اپنے حج کی کتاب ''اے روڈ ٹو مدینہ'' میں لکھ چکا ہوں۔

لہٰذا ہم جیسے غریب ایشیائی ''تھرڈ ورلڈ'' کے لوگوں کو چاہیے کہ پردیس میں بڑی ذمہ داری اور خیال سے رہیں۔ کیوں کہ مشکل وقت میں ہمارے سفارت خانے والے بھی آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔

پہلے گرین کارڈ امریکی ادارہ INS ڈپارٹمنٹ جاری کرتا تھا۔ اس ادارے کا پورا نام Immigration B naturalization Service تھا۔ لیکن اب USCiS نامی ادارہ جاری کرتا ہے۔ یہ ادارہ پہلے BCIS یعنی ''بیورو آف سیٹزن شپ اینڈ امیگریشن سروس'' تھا۔

امریکا میں مقیم وہ غیر ملکی جنہیں اب تک گرین کارڈ نہیں مل سکا اور اس سلسلے میں ان کی درخواست زیرِ غور ہے اور وہ لوگ امریکا میں رہتے ہوئے کوئی ملازمت کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ EAD یعنی employment Authorization Document حاصل کریں۔

ایک غیر ملکی کو تین مراحل سے گزرنے کے بعد گرین کارڈ مل سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ مستقل طور پر امریکا میں رہائش اختیار کرسکتا ہے۔ وہ ملازمت اور بزنس بھی کرسکتا ہے۔ یہ تمام PROCESS مکمل ہونے میں کئی سال لگ سکتے ہیں۔ اس کا دارومدار درخواست کی نوعیت اور ملک پر ہے جس سے درخواست گزار کا تعلق ہے۔

پہلے مرحلے میں USCIS کا ادارہ غیر ملکی درخواست گزار کے قریبی عزیز اور ملازمت دینے والے کی پٹیشن پر غور کرتا ہے اور اسے قبول کرلیا جاتا ہے۔ قریبی عزیزوں سے مراد ہے میاں، بیوی اور ماں، باپ اور بیٹی! مثلاً ایک پاکستانی لڑکی کو امریکی شہریت حاصل ہے تو وہ اپنے ماں باپ کو امریکا میں لانے کے لیے انہیں گرین کارڈ دلواسکتی ہے۔ اگر وہ شادی شدہ ہو تو اپنے شوہر کو گرین کارڈ دلوانے کے لیے متعلقہ ادارے میں پٹیشن درج کراسکتی ہے۔ کوئی امریکن بزنس مین یا کسی کمپنی کا مالک کسی غیر ملکی کو ملازمت دینے کے لیے اس کے لیے گرین کارڈ کا بندوبست کرسکتا ہے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ کمپنی مقرر کیے ہوئے پیمانے سے زیادہ کمارہی ہو اور اس کے مطابق حکومت کو ٹیکس ادا کرتی ہو۔ دوسری اہم بات یہ کہ کمپنی کو ثابت کرنا پڑے گا کہ فلاں فیلڈ کے ماہر کاریگر کی اسے ضرورت ہے۔

بعض صورتوں میں ان غیر ملکیوں کو بھی گرین کارڈ مل جاتا ہے جو امریکا میں اپنی رقم انویسٹ کرتے ہیں دوسرا مرحلہ USCIS کی جانب سے ویزا نمبر ملنے کا ہے جو رشتے داری کی صورت میں تو جلد مل جاتا ہے لیکن دوسری صورت میں کچھ وقت لگتا ہے کیونکہ ہر سال کے لیے مقرر اور محدود ویزا جاری کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف ملکوں کو مختلف درجوں پر رکھا گیا ہے۔ مثلاً آج کل انڈین باشندوں کو ویزا جلد مل جاتا ہے اور پاکستانیوں کو کچھ وقت لگتا ہے۔ اور آخر میں تیسرا مرحلہ ہے۔ اس میں ویزا نمبر ملنے کے بعد درخواست گزار اپنے ملک میں موجود امریکی سفارت خانے میں immegrant ویزا کے لیے اپلائی کرسکتا ہے۔ آج کل وہاں پر امیدوار کو انٹرویو کے لیے بلوایا جاتا ہے۔ پہلے ہمارے ہاں یہ کام کراچی ہی میں ہوجاتا تھا لیکن اب کئی برسوں سے انٹرویو کے لیے اسلام آباد جانا پڑتا ہے اور ویزا کے امیدوار کے لیے میڈیکل ٹیسٹ، خاص طور پر ''HIV'' اور پھیپڑوں کے ایکسرے وغیرہ کرانا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ اپنے حد کے پولیس اسٹیشن سے ''پولیس سرٹیفکیٹ'' اور اگر وہ کسی ملک میں ڈیڑھ سال سے زاید رہا ہے تو وہاں کی بھی پولیس رپورٹ درخواست کے ساتھ طلب کی جاتی ہے۔

یہ ہے ہمارے امریکا یاترا کے تجربے کا نچوڑ جو ہر ایک کے کام آسکتا ہے۔

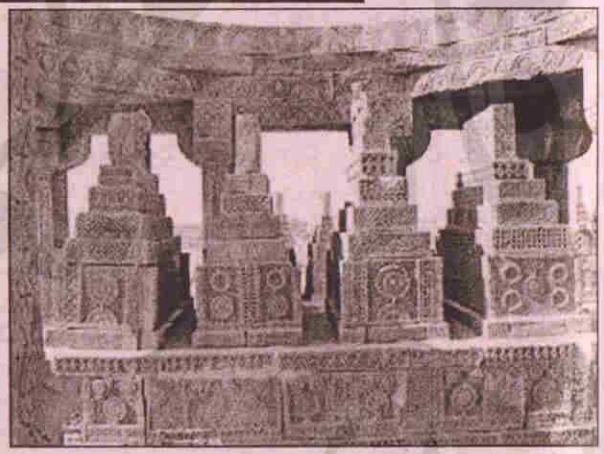

(ختم شد)

سندھ کا ورثہ

مختار آزاد

سندھ کی تہذیب دنیا کی ان چند تہذیبوں میں سے ایک ہے، جو انتہائی قدیم مانی جاتی ہے۔ یہاں کیسے کیسے فنکار ودستکار گزرے، کیسے کیسے فن پارے تخلیق کیے۔ اس پر اب غور نہیں کیا جاتا اور نہ ان کی حفاظت کا کسی کو خیال ہے۔ قبروں کی نقاشی خاص الخاص سندھ کی روایت ہے۔ اس فن کو کس طرح سندھ کے ہنرمندوں نے بامِ عروج پر پہنچایا، اس بارے میں نئی پود کو کچھ نہیں پتا کیونکہ یہ معمولی میناکاری نہیں، فن کا عروج ہے کہ اس کے ذریعے پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔

مختصر مختصری ایک اہم تحریر، بالغ نظر افراد کے لیے

وہ دسمبر کی سرد ترین صبح تھی۔ سورج کی زرد روشنی چہار ...پھیل رہی تھی۔ میری گاڑی نیشنل ہائی وے پر آگے بڑھ رہی ...ی، منزل چوکھنڈی قبرستان تھا۔ کراچی کے ضلع ملیر میں لب ...ک واقع، کئی سو سالہ .... یہ تاریخی قبرستان گزشتہ ایک ماہ سے میری تحقیق کا مرکز تھا۔ ہر روز صبح سویرے وہاں جانا اور شام ڈھلے لوٹنا میرا معمول تھا۔ میں گزشتہ کئی مہینوں سے صوبۂ سندھ کے زیریں اور کوہستانی علاقوں کی خاک چھان رہا تھا۔ چوکھنڈی قبرستان تحقیق کا آخری پڑاؤ تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تحقیق کا موضوع زیریں سندھ اور اس سے متصل کوہستانی علاقے اور کراچی کے قریب واقع ساحلی پٹی کے بلوچستان اضلاع میں موجود سنگ زرد سے بنائی گئی وہ منقش قبریں اور مقابر تھے جو کئی سو سال گزر جانے کے باوجود آج بھی نا صرف اپنے عہد کے اس انوکھے فن اور فنکاروں کی صناع کاری کا منہ بولتا ثبوت ہیں بلکہ اسی انفرادیت کی بنا پر 80ء کی دہائی میں اقوام متحدہ کے ادارہ برائے تعلیم، سائنس و ثقافت 'یونیسکو' نے ٹھٹھہ کے مکلی قبرستان کو اقوامِ متحدہ کے 'عالمی ورثہ' کی فہرست میں شامل کیا تھا۔

مکلی اور چوکھنڈی کا قبرستان اگرچہ عالمی اور ملکی سطح پر اپنی الگ پہچان رکھتا ہے مگر صرف یہ دو مقامات ہی نہیں جو اس حوالے سے سندھ کی نمائندگی کررہے ہیں۔ کراچی سمیت سندھ کے کوہستان اور زیریں علاقوں میں درجنوں ایسے قبرستان موجود ہیں جن میں مقبروں اور قبروں پر کی گئی کندہ کاریاں اور نقوش آج بھی انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ مقابر اور قبریں اگر ایک طرف ہنرمندوں کے ذہن رسا کا منہ بولتا ثبوت ہیں تو دوسری طرف اُس وقت کے سماج میں ستائشِ فن کا بھی پتا دیتے ہیں۔ سنگِ زرد کو کاٹ کر بنائی گئی سلوں پر تراشیدہ نقوش والی قبروں کے یہ منقش قبرستان اپنے عہد کے تعمیراتی ورثۂ فن کے نا صرف اب تک نگہبان ہیں بلکہ صدیوں پر محیط ایک دور کی تاریخ اور اُس فن کی مثال بھی ہیں جو گردشِ وقت کی دھول میں کب کا معدوم ہو چکا ہے..... منقش سنگی قبروں اور مقابر والے یہ قبرستان میری تحقیق کا مرکز تھے اور یہ داستان انہی کا فسانہ حیرت ہے۔

☆☆☆

پاکستان کی جغرافیائی تاریخ اس بات کی غماز ہے کہ یہاں پر حیات کے ابتدائی اَدوار نے ارتقا کی منزلیں طے کی ہیں۔ یہ انہی ارتقائی مراحل کا حصہ ہے کہ اس سرزمین کی ثقافتی جڑیں ہزار ہا سال پہلے گزرے شب و روز سے جُڑی ہوئی ہیں۔ تاریخ کے تناظر میں جائزہ لیں تو ممکن ہے کہ ہزار سال پہلے کسی چیز نے اختراعی عمل کے نتیجے میں جنم لیا ہوگا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قبولِ عام نے اسے صدیوں بعد ہمارے سامنے لوک ثقافت کے روپ میں لا کھڑا کیا ہے۔ یہی حال کچھ ان منقش مقبروں اور قبروں کا بھی ہے جنہیں آج زیریں سندھ اور کوہستانی علاقے میں صدیوں پہلے آ کر ٹھہر جانے والے خانہ بدوش یا نیم خانہ بدوش قبائل کی ثقافتی علامت کے طور پر آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ تہذیب، تمدن اور مجموعی لحاظ سے پورے معاشرے میں ہونے والی کوئی ایک تبدیلی اگر صدیوں تک رُکے بنا ارتقائی عمل کا ساتھ دے تو پھر وہ لوک ثقافت کی نمائندہ بن جاتی ہے۔ یہی بات ان منقش قبرستانوں پر بھی صادق آتی ہے۔

پاکستان کو اس لحاظ سے بھی منفرد مقام حاصل ہے کہ یہاں جنم لینے والی تہذیبوں کے پنپنے میں جو عوامل معاون رہے، وہ تاریخ کے ارتقائی عمل کا بھی بدستور ساتھ دیتے رہے۔ انہی لوک ثقافت کے نمائندہ آثاروں میں سندھ میں پائے جانے والی سنگی منقش قبروں اور مقابر کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔

آج کی سرزمینِ سندھ کی تاریخ جتنی قدیم ہے اتنا ہی اس میں ثقافتی تنوع بھی پایا جاتا ہے۔ فن کی ہمہ گیری اس کی ثقافت میں رَچی بسی ہے۔ موہن جو دڑو سے لے کر محمد بن قاسم سے شروع ہونے والے عہد اسلامی اور پھر اس کے صدیوں بعد تک..... سندھ کی تاریخ میں فن و حرفت کے ایسے نمونے پائے گئے ہیں جسے تہذیب و ثقافت اور تمدنی تاریخ میں خالصتاً سندھ کا ثقافتی ورثہ کہا جا سکتا ہے۔

سندھی ثقافت و حرفت کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں اپنی نوع کے منفرد فنون نے جنم لیا۔ آج بھی دنیا کی ثقافتی تاریخ میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ یہ بات کی دلیل ہے کہ اس سرزمین پر ثقافتی اثرات کی جڑیں نہایت مستحکم تھیں اور جمالیاتی ذوق ان میں اختراع کا سبب بھی تھا۔

سندھ کی ثقافت کے حوالے سے اس بحث کے کئی تاریخی پہلو ہیں جو نہایت تفصیلی تذکرے کے متقاضی ہیں لیکن ہم یہاں جو پہلو سامنے لا رہے ہیں وہ ہے 'سندھ کے قدیم سنگی مقبروں اور قبروں پر کی گئی کندہ کاریاں جن کی تعمیر کے اَدوار تاریخ کی کئی صدیوں پر محیط ہیں۔

منقش سنگی مقبروں اور قبروں کے حوالے سے ٹھٹھہ کے عالمی شہرت یافتہ مکلی قبرستان کی اپنی ہی تاریخ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مکلی بہت بعد کی بات ہے۔ سندھ میں منقش سنگی قبرستانوں کا ارتقا گزشتہ ہزاریے Past Millenium کی اوائل صدیوں سے جا ملتا ہے۔

مکلی کی وجہِ شہرت شاہوں کے مقابر بھی ہیں، جنہیں زرِ کثیر کی لاگت سے بنوایا گیا تھا مگر اس کے برعکس سندھ میں ایسے درجنوں قبرستان موجود ہیں جن کا تعلق نا تو شاہی تدفین سے ملتا ہے اور نا ہی ان کی تاریخ سطوتِ شاہی سے جُڑی ہوئی ہے بلکہ یہ اُن عام لوگوں کے قبرستان ہیں جن کی پہچان قبیلہ

تھے اور وہ تاریخ کے ایک عہد میں نیم خانہ بدوش دنیا میں جی رہے تھے۔ جب پیوندِ خاک ہوئے تو ان کی یادِ باقی رکھنے کے لیے پیچھے رہ جانے والوں نے ان کے وہ سنگی مدفن تعمیر کروائے جو آج بھی دیدنی ہیں۔

آسودۂ خاک اور ان کی یادگار بنوانے والے، دونوں ہی تاریخ کے گمنام باب میں گم ہو چکے ہیں، سنگ تراشوں کے وجود بھی ماضی کا مزار بن کر نگاہوں سے اوجھل ہوئے مگر جو باقی ہے، وہ ہے فن..... صناع کاروں کی صناعی کے نمونے جو دنیا میں بے نظیر ہیں۔

سندھ کے ان باشندوں نے لگ بھگ ایک ہزار سال پہلے مقامی طور پر منقش سنگی قبروں کی صورت میں اس فن کی بنیاد رکھی اور کئی صدیوں تک یہ فن بدستور ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا بامِ عروج کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

کہتے ہیں کہ ایک وقت ایسا تھا کہ جب مرنے والے سے قلبی لگاؤ کے اظہار کے لیے ورثا کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اُس کی قبر نہایت نمایاں انداز میں سنگِ زرد سے بنوائی جائے۔ وہ قبر ایسی ہو کہ جس پر ایک نظر پڑے تو پھر وہیں ٹھہر جائے۔ کہا جاتا ہے کہ جن کی جیب اجازت دیتی تھی وہ قبر کے لیے جودھپور سے بیش قیمت پتھر منگواتے تھے اور جو ذرا کمزور معاشی حیثیت رکھتے تھے وہ کوہستان کے گلابی اور پیلے سنگِ زرد پر ہی اکتفا کرلیا کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ زیریں سندھ میں کئی صدیوں تک یہ فن مقبول رہا۔ جس کی وجہ سے ٹھٹھہ سنگتراشوں کا مرکز بن گیا۔ جہاں بڑی تعداد میں سنگی کندہ کار بسا کرتے تھے اور ممکن ہے کہ اب بھی اُن کی آل اولاد وہیں بس رہی ہو مگر یہ بات یقینی ہے کہ وہ اپنے اجداد کے برعکس کسی اور پیشے میں کھو کر عہدِ رفتہ کی اپنی عظمت کو یقیناً بھلا چکے ہوں گے۔

کہتے ہیں کہ سنگی منقش مقابر اور قبروں کی تعمیر ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ اپنے دور کا وہ فن تھا جو اصول تو نہیں البتہ بہت مہنگا ضرور تھا۔ ایک قبر کی تعمیر پر بھی اس وقت کے ہزاروں روپے خرچ ہو جاتے تھے۔ ویسے کیا عجیب بات ہے بیش قیمت سنگی تراشیدہ قبریں بنوانے والے اپنے پیاروں کی یادگاروں پر تو بھاری خرچ کر گئے مگر عجب اتفاق ہے کہ سندھ میں اُن لوگوں کے شاندار گھر اور محلات کے آثار نہیں ملتے۔ یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اُن کے لیے یہ دنیا واقعتاً ایک سرائے فانی تھی اور وہ اپنے خاک ہو جانے والے وجود کو تا دیر باقی رہنے والی قبروں کی صورت زندہ رکھنے کے قائل تھے۔ انہیں یقیناً اس میں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔

زیریں سندھ اور اس کے خطۂ کوہستان میں ایک دو قبریں ہی نہیں، پورے کے پورے قبرستان ایسے موجود ہیں، جہاں قبروں پر کی گئی کندہ کاری اور اُبھرواں نقش و نگار ایک طرف ہنرمندوں اور فنکاروں کے ذہنی تنوع کا اظہار کرتے ہیں تو دوسری جانب صدیوں پہلے سندھ کی لوک زندگی میں جمالیاتی ذوق کی وسعت کا بھی پتا دیتے ہیں۔ سنگی قبروں پر تراشے گئے حیرت انگیز نمونے جنہیں دیکھ کر قبر اور قبرستان کا احساس کہیں دور چلا جاتا ہے اور جو احساس باقی رہتا ہے، وہ مجبور کرتا ہے کہ گمنام فنکاروں اور صنّاع کاروں کے فن کی ستائش کی جائے۔

سندھ میں سنگی کندہ کاریوں اور ان کا ارتقا کیسے شروع ہوا۔ عملِ ارتقا میں اس نے کون کون سے مدارج طے کیے، یہ موضوع ایک طویل بحث کا متقاضی ہے، جس کا تعلق براہِ راست آثارِ رفتہ سے ہے مگر جو بات طے ہے، وہ سنگی کندہ کاریوں کے نقوش ہیں جو آج بھی اپنی ثقافتی اہمیت اور تنوع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی بنا پر کسی بحث کے متقاضی نہیں۔ سب کچھ کھلے آسمان تلے کھلی آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔

☆☆☆

آٹھویں صدی عیسوی کی اولین دہائیوں میں سندھ پر محمد بن قاسم کی فتح کے ساتھ ہی اس خطے میں اسلام کی برق رفتار اشاعت کا آغاز ہوا۔ جس کے ساتھ ہی اسلامی طریقۂ تدفین نے قبر اور قبرستانوں کو وجود بخشا۔ اس وقت سندھ میں کم و بیش 85 چھوٹے بڑے ایسے قدیم ترین قبرستان موجود ہیں جن میں سنگی کندہ کاریوں سے مزین ہزاروں قبریں موجود ہیں۔

گلابی مائل جودھپوری سنگِ زرد اور مقامی گہرے زرد رتیلے پتھر سے بنی اُبھرواں نقش و نگار والی یہ قبریں کراچی سمیت ٹھٹھہ، دادو، حیدرآباد، میرپور خاص اور سانگھڑ میں اپنے ارتقائی عمل کے شواہد کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ قبریں اور قبرستان، جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بارہویں صدی عیسوی سے اٹھارویں صدی عیسوی کے درمیانی عہد میں وجود میں آئے۔

کراچی کی حدود میں کم و بیش 22 ایسے قبرستان موجود ہیں جن میں مقامی سنگِ زرد سے بنی نقشین قبریں ملتی ہیں۔ سندھ کے نقشین قبرستانوں میں کراچی کے علاوہ ٹھٹھہ میں 42، دادو میں 15، حیدرآباد میں 4، میرپور خاص اور سانگھڑ میں ایک ایک ایسے قبرستان موجود ہیں جن کی ہر قبر فن کا مکمل نادر نمونہ اور اپنے عہد میں لوک فن کا ایک مکمل باب ہے۔

سندھ کے منقش قبرستانوں میں چوکھنڈی، منگھوپیر، میمن جو گوٹھ، درس واریو، حاجی تراب، راج ملک، پیر پٹھو، سوندھا، لاکھو پیر، کھوری، مکلی اور بیلگار کے قبرستان زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی طرح زیریں سندھ اور کراچی سے متصل بلوچستان کے علاقے میں واقع منقش قبرستانوں میں بھوانی، ہندیاں اور خاران کے گنبد قابلِ ذکر ہیں۔

☆☆☆

پہاڑی پتھر کو تراش کر بنائی گئی سنگی منقش قبریں اور مقابر اگرچہ زیریں سندھ اور کراچی سے متصل بلوچستان کے علاقوں بالخصوص لسبیلہ ضلع وغیرہ کی پہچان ہیں، تاہم آج ہم منقش سنگی قبروں کے حوالے سے صرف مکلی اور چوکھنڈی کو ہی پہچانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سنگی قبروں کے ارتقائی سفر کا زمانہ مکلی کے وجود پانے کے اَربوں قریب اور چوکھنڈی کے وجود میں آنے سے بہت پہلے کی بات ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سنگی قبروں کے آغاز کا مرکز زیریں سندھ کے اہم ساحلی اضلاع ملیر اور ٹھٹھہ کو قرار دیا جاتا ہے۔

زیریں سندھ کی پہچان... سنگی قبروں کے ارتقا کا جائزہ لیں تو سب سے قدیم مثال ٹھٹھہ کے علاقے پیر پٹھو میں ملتی ہے۔ پیر پٹھو ٹھٹھہ سے سترہ میل دور جنوب مغرب میں لائم اسٹون کے چٹانی علاقے میں واقع ہے۔ پیر پٹھو نہایت اہم تاریخی آثار کا حامل علاقہ ہے۔ یہاں لگ بھگ چار مربع میل کے علاقے میں بے شمار تاریخی آثار بکھرے ہوئے ہیں۔ اگرچہ آج یہ علاقہ عام لوگوں کے لیے قطعی غیر اہم ہے لیکن مورخین کا خیال ہے کہ کبھی یہ سندھ کی راج دھانی تھا۔ اس رائے سے متفق مورخین کے مطابق یہی وہ علاقہ ہے جسے تاریخ میں دیبل کا نام دیا جاتا ہے۔ وہی دیبل جو کبھی سندھ کی بندرگاہ اور اُس راجا داہر کا پایۂ تخت تھا، جسے عرب سپہ سالار محمد بن قاسم نے شکست دی تھی۔ اگرچہ یہ خیال اپنی جگہ، تاہم حقیقت یہ ہے کہ اب تک دیبل کا حقیقی مقام متنازع ہے اور مورخین کسی ایک مقام پر دیبل کے وجود پر متفق نہیں ہو پائے ہیں۔ قطع نظر اس بحث کے کہ کیا پیر پٹھو ہی تاریخ میں گم شدہ 'دیبل' ہے ایک بات پر سب متفق ہیں اور وہ یہ کہ سندھ میں سنگی قبروں کا آغاز یہیں سے ہوا تھا۔

پیر پٹھو کے قدیم قبرستان سے تین اسکی قبریں ملی ہیں جو پہاڑی پتھر کو کاٹ کر، انہیں ہموار اور چکنا کر کے بنائی گئی تھیں۔ پیر پٹھو میں ملنی والی ان تین قبروں کو ماہرین آثار منقش سنگی قبروں کے ارتقا کی ابتدا قرار دیتے ہیں۔ یہ تینوں قبریں مقامی طور پر ملنے والے پتھر سے تراشیدہ نہیں ہیں۔ ان کی تعمیر میں جو پتھر استعمال کیا گیا ہے، وہ گلابی مائل جودھپوری سنگِ زرد ہے۔

ان قبروں پر مختصر اُ عبارت کندہ ہیں، جن پر کی گئی تحقیق سے اُس عہد کا تعین کیا گیا ہے۔ قبر پر کندہ عبارتوں کے جائزے سے ان کا عہد دسویں سے بارھویں صدی عیسوی کے درمیان کا بنتا ہے۔ اس دور کے بعد جو سنگی قبریں ملتی ہیں وہ پیر پٹھو سے لے کر کراچی اور پھر اس سے آگے بلوچستان کے علاقے ونڈر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ بعد کی صدیوں میں زیریں سندھ اور متصل بلوچستان کے کوہستانی خطے میں سنگی قبروں کا بتدریج تسلسل نظر آتا ہے۔ اگر اب تک دریافت کی گئی سنگی قبر کو جدید سے جدید دور بھی دیں تو کہا جا سکتا ہے کہ زیریں سندھ میں بارھویں صدی عیسوی سے سنگی قبریں ملنا شروع

ہو جاتی ہیں۔

سنگی قبروں کے ماہرانہ تجزیے سے ان کے ارتقائی عمل کے دوران میں پیش آنے والی تبدیلیوں کا بھی پتا چلتا ہے۔

تحقیق کے مطابق ابتدا میں بنائی گئی سنگی قبریں قیمتی گلابی مائل جودھپوری سنگِ زرد کی سِلوں کو تراش کر بنائی گئی تھیں۔ ابتدائی زمانے میں بنائی گئی سنگی قبروں میں کندہ کاریاں بہت ہی کم یا نہ ہونے کے برابر ہیں تاہم بعد کے اَدوار میں دیکھیں تو رفتہ رفتہ ان پر نقش و نگار نظر آنے لگتے ہیں اور پھر خطاطی بھی ان کا حصہ بننے لگی۔

سنگی قبروں اور مقابر کی تعمیر کے عہد درمیان میں جہاں کندہ کاریوں سے آرائش نمایاں نظر آتی ہے وہیں عبارت اور آیاتِ قرآنی کی کندہ کاریاں بھی ملتی ہیں۔ جن میں آرائشی انداز نمایاں نظر آتا ہے، البتہ شروع شروع میں آیاتِ قرآنی کی کندہ کاریاں نہایت سادہ اور کئی جگہوں پر قدیم خط کوفی میں ہیں، جن پر اعراب کا تکلف نہیں ہے۔ البتہ بعد میں کی گئی خطاطی میں کئی ایسے رسم الخط نظر آتے ہیں جو اپنے دور میں آیاتِ قرآنی کی خطاطی میں مروج تھے، مثلاً مکلی میں خط کوفی، ثلث، نستعلیق اور دیگر خط ملتے ہیں۔

منقش سنگی قبرستانوں میں موجود قبروں پر کندہ عبارتوں اور کی گئی خطاطی کے جائزے سے بھی عمل ارتقا کے کئی دلچسپ پہلو سامنے آتے ہیں۔ خطاطی میں استعمال کیے گئے رسم الخط کے تجزیے سے یہ بات بھی معلوم کی جا سکتی ہے کہ زیریں سندھ کا یہ علاقہ کس عہد میں، کس علاقے سے آنے والے حکمرانوں کے زیرِ نگیں رہا تھا۔

تاریخ کے صفحات سے پتا چلتا ہے کہ تا دیر زندہ رہنے کی خواہش نے شاہوں کو آج عجائباتِ عالم میں شمار ہونے والے مقابر کی تعمیر پر اُکسایا لیکن زیریں سندھ اور اس سے متصل بلوچستان کے ساحلی علاقوں میں ملنے والی منقش سنگی قبریں اور ان کا آغاز، شاہوں کا نہیں بلکہ آزاد منش قبائلیوں کے ذوق کا مرہونِ منت ہے، جس نے یہاں کے کئی شاہوں کی توجہ بھی حاصل کی اور وہ بھی سنگِ زرد سے منقش مقبرے اپنے لیے تعمیر کروا گئے۔

ماہرینِ آثاریات کا کہنا ہے کہ ابتدائی اَدوار میں جو سنگی قبریں ملتی ہیں، اس میں گرچہ کندہ کاری بہت کم ہے لیکن اس میں ہنر مند کی فنی لگن اور صاحبِ قبر کے ورثا کا مرنے والے سے قلبی لگاؤ صاف عیاں ہوتا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ سادہ سنگی قبروں پر کندہ کاریاں اُبھرنا شروع ہو جاتی ہیں۔ شروع شروع میں قبر پر تراشیدہ گل بوٹے بہت بڑے سائز کے نظر آتے ہیں لیکن پھر وہ آہستہ آہستہ چھوٹے ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ شروع شروع میں نقش و نگار کی ترتیب اور ان

جامِ جہالت

آج اپنی بات کا آغاز حلوہ پوری سے کرتے ہیں۔ اس کا خیال مجھے کچھ یوں آیا کہ یورپ سے اردو سیکھنے کے لیے آئے ہوئے ایک گورے طالب علم نے دورانِ گفتگو مجھ سے پوچھا۔ ''تیرتھ رام فیروز پوری تو ناول نگار تھے، یہ حلوہ پوری کون صاحب ہیں؟'' میں نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی اور کہا۔ ''آپ کو یہ پوچھنے کی ضرورت کیوں پڑی۔'' بولے۔ ''میں جب سے لاہور آیا ہوں، تیرتھ رام فیروز پوری کا نام میں نے کسی سے نہیں سنا، البتہ بیشتر لوگوں کی زبان سے حلوہ پوری کا ذکر اکثر سنتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''حلوہ پوری سے ملنا چاہتے ہو؟'' بولے۔ ''کیوں نہیں ان کا ذکر اتنی دفعہ سنا ہے کہ ان سے ملنے کا اشتیاق بے حد بڑھ گیا ہے۔'' میں نے فوراً ملازم کو حلوہ پوری اور کسی کا ایک جگ لانے کے لیے کہا جب اس طالب علم نے دسترخوان پر یہ چیزیں سجی دیکھیں اور پوچھنے پر اسے پتا چلا کہ حلوہ پوری کسی شخصیت کا نام نہیں، لاہوریوں کی مرغوب ڈش کا نام ہے تو وہ بہت ہنسا، اس نے کسی کے بارے میں پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''اسے کسی کہتے ہیں لیکن میرے یورالوجسٹ دوست پروفیسر ڈاکٹر سجاد حسین نے اسے ''جامِ جہالت'' کا نام دے رکھا ہے۔'' موصوف نے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟'' میں نے کہا۔ ''اس نام کی معنویت کا اندازہ تمہیں تین چار گلاس پینے سے ہو گا۔'' چنانچہ اس نے حلوہ پوری کھائی، چار جامِ جہالت اپنے اندر انڈیلے اور دسترخوان پر ہی سو گیا دو دن بعد سو کر اٹھا تو نہ وہ تیرتھ رام فیروز پوری کی بات کرتا تھا اور نہ پاکستان کے بارے میں کوئی سوال کرتا تھا، اب وہ لاہوریوں کی طرح حلوہ پوری کھاتا اور جامِ جہالت پیتا ہے اور سوتا ہے۔

(''ہنسنا رونا منع ہے'' عطاء الحق قاسمی کی کتاب سے اقتباس۔ ولید بلال کی عرق ریزی)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی موزونیت کا بہت زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا تھا لیکن عملِ ارتقا کے نتیجے میں ان کی ترتیب بہتر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

سنگی قبرستانوں کو عام طور پر 'چوکھنڈی ٹائپ' کہا جاتا ہے۔ ماہرین اس بات کو غلط قرار دیتے ہیں تاہم وہ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ لیئر کا وہ علاقہ جہاں چوکھنڈی واقع ہے، یہ سنگی کندہ کاریوں کے ارتقائی سفر کا اہم حصہ ہے۔ کبھی یہ خطہ سنگی قبروں پر کندہ کاریوں کا مرکز رہا ہے۔

معروف ماہرِ آثاریات ڈاکٹر کلیم لاشاری کے مطابق ''سنگی کندہ کاریوں کے حوالے سے ہم کراچی کو اس کا مرکز قرار دے سکتے ہیں۔'' 'ماہرین یہ دلچسپ حقیقت بھی بیان کرتے ہیں کہ زیریں سندھ کی منقش سنگی قبروں پر کی گئی کندہ کاریوں میں وہ اثرات بھی نظر آتے ہیں جو باہر سے آنے والے ستھین، پارتھین، ارغون، ترک اور مغل باشندوں کے مقامی قبائل سے تعلقات استوار ہونے کے باعث وجود میں آئے تھے۔

زیریں سندھ اور بلوچستان کی ساحلی پٹی میں پائی گئی منقش سنگی قبروں کا وجود بلوچ قبائل سے جوڑا جاتا ہے۔ زیریں سندھ کی سنگی قبروں کے ارتقا کو خانہ بدوشوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ وہ خانہ بدوش تھے جو سیکڑوں سال پہلے زیریں سندھ اور بلوچستان کی متصل ساحلی پٹی میں سرگرداں رہتے تھے۔ انہیں قبائل سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ قبائل جو ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے بھی تھے اور جنگ میں کام آجانے والوں کو تادیر وجود بخشنے کے لیے ان کے اعزاز میں بھاری خرچ کر کے سنگی قبریں تیار کرواتے تھے۔

بلوچ قبائل کی سندھ میں آمد بہت پرانی ہے۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے بلوچستان سے کم و بیش تین بڑے ریلے آہستہ آہستہ اس خطے میں پہنچے اور یہاں پر انہوں نے اپنا اثر و رسوخ چھوڑا۔ بلوچ قبائل کی زیریں سندھ میں مسلسل آباد کاری کے اثرات مقامی سماج پر بھی پڑے۔ سنگی قبروں کے آغاز کا سلسلہ انہی قبائل سے جوڑا جاتا ہے۔ سنگی قبریں بنوانے والے اہم ترین اسپانسر بلوچ ہیں جن کے مقامی قبائل سے میل جول کے باعث مقامی باشندوں بالخصوص جوکھیہ اور بُرفت قبائل نے بہت خوبصورت منقش سنگی قبریں بنوائیں۔

قبائلیوں کی بنوائی گئی سنگی قبروں کی کندہ کاریوں میں عبارت یا خطاطی نہ ہونے کے برابر ہے۔ سنگی قبروں پر کندہ کاری کی یہ صورتِ حال سترھویں صدی کے آخر تک برقرار رہی تاہم اس دوران کہیں کہیں پر سنگی قبر کے سرہانے کلمۂ طیبہ کندہ نظر آنے لگا۔ اٹھارویں صدی میں جا کے کہیں کہیں پر کچھ اور مختصر عبارت بھی نظر آتی ہے۔

سنگی قبریں بنوانے والے قبائلیوں کی زندگیوں میں مذہب کا بہت زیادہ عمل دخل نہیں تھا اور نہ ہی وہ شہری تمدن کے زیرِ اثر تھے۔ اُن کی اپنی روایات، رسوم اور قدریں تھیں جو اُن کی قبروں پر بھی نظر آتی ہیں۔ صاحبِ قبر کے ایصالِ ثواب کے لیے اُن کے ہاں قبروں پر آیاتِ قرآنی کی کندہ کاریوں کا بالعموم رواج ہمیشہ مفقود نظر آیا۔ آپ مکلی قبرستان کو دیکھ لیں۔ وہاں تعمیر کردہ سنگی مقابر اور قبریں زیادہ تر اُن لوگوں کی ہیں جو اپنے عہد کے فنِ تعمیر میں خاصے آگے تھے یا پھر ان کا تمدن شہری اثرات کا حامل تھا۔ شاید اسی لیے مکلی میں قبر پر قرآنی آیات کی کندہ کاری بذاتِ خود ایک بہت بڑا تزئینی حصہ ہے۔

مکلی قبرستان میں توجہ کا ارتکاز خطاطی پر ہے جبکہ چوکھنڈی سمیت دیگر قبرستانوں میں تعمیر کردہ سنگی قبروں کا مکلی سے موازنہ کریں تو اُس عہد میں جب مکلی میں تعمیرات کا سلسلہ جاری تھا، اُس وقت چوکھنڈی سمیت دیگر قبرستانوں میں بنائی گئی قبروں پر آرائش اور کندہ کاریوں کا محور اقلیدسی نمونے تھے۔ مکلی کے برعکس یہاں ہمیں ابتدا کی کئی صدیوں بعد تک خطاطی نظر نہیں آتی۔ البتہ کچھ قبروں کے سرہانے صاحبِ قبر کے نام اور سن ضرور لکھے ہوئے ملتے ہیں لیکن ان کا رسم الخط خوبصورت، نفیس اور پختہ نہیں ہیں۔ جہاں تک خطاطی کا سوال ہے، وہ یہاں مفقود ہے۔ خطاطی، پڑھے لکھے لوگوں کا صنفِ اظہار اور شہری تمدن کا اقرار تھا لیکن قبائلیوں کی زندگی شہری رہن سہن کے اثرات سے بہت دور تھی۔ ان کے یہاں قبر پر مذہبی کلمات کی کندہ کاریوں اور بخشش کے مابین تعلق نظر نہیں آتا۔ اُن کے ہاں قبر پر کی گئی آرائش میں جذبہ، توانائی، حمیت اور طاقت کا اظہار مقصود تھا۔ اس کے برعکس مکلی کو دیکھیں تو جس پس منظر میں وہاں خطاطی اور نفیس رسم الخط میں عبارت کی کندہ کاری کو فروغ ملا اس کا مضبوط تمدنی پس منظر بھی تھا۔

مکلی میں کی گئی خطاطی metropolition culture ہے جو مشرقِ وسطیٰ، وسط ایشیا اور پھر دلی سے تعلق

رکھتا ہے۔ اس کے برعکس زیریں سندھ کے یہ علاقے شہری مرکز سے کٹے ہوئے تھے۔ یہ نیم خانہ بدوش لوگ تھے جن کا شہری طرزِ زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اُن کا اٹھنا بیٹھنا شہری اثرات کے برعکس صدیوں کے روایتی اثر میں تھا۔ نہ تو وہ کسی دربار سے وابستہ تھے۔ نہ وہاں پر کوئی قاضی القضاۃ بیٹھتا ہے۔ نہ ان کے یہاں کوئی مفتی تھا۔ یہ تو بس اپنے حساب سے تشکیل دیے گئے زندگی کے اُن اصولوں پر چل رہے تھے جس میں اخلاقی اور روایتی اقدار سماج کا محور تھے۔ ان کی تمام اقدار و رسومات 'بہادری' کے محور پر گردش کرتے تھے۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ سترھویں صدی کے اواخر میں عبارت کی کندہ کاری کے حوالے سے صورتِ حال میں بدلاؤ آنے لگا تھا۔ سترھویں صدی میں آ کے ہمیں زیریں سندھ کے قبرستانوں کی سنگی قبروں پر عمدہ خطِ نستعلیق لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اساتذۂ فن جو مکلی میں بھی کام کر رہے تھے اور دوسرے قبرستانوں میں بھی۔ ان کا خط عمدہ تھا اور وہ اس عہد میں زیادہ تر خطِ نستعلیق پر کام کر رہے تھے۔ مثلاً استاد عنایت اللہ، جن کا نام چوکھنڈی کی پہچان مرکزی مقبرے کی ایک قبر پر بطور 'کاری گر' خطِ نستعلیق میں نہایت عمدگی سے کندہ ہے۔ یہ وہی استاد ہیں 1038-39 سن ہجری میں، مکلی میں بھی قبروں کی کندہ کاری کر رہے ہیں اور چوکھنڈی میں بھی۔ تو جب انہوں نے مقبرے کی تکمیل پر بطور یادگار ایک جگہ پتھر پر اپنا نام کندہ کیا تو وہ خط بہت ہی نفیس نستعلیق میں تھا۔

اگر ہم سندھ میں منقش سنگی قبروں کا تاریخی جائزہ لیں تو یہ تین حصوں میں منقسم نظر آتا ہے۔

ارتقا، جو بارہویں عیسوی سے شروع ہوا۔ کلاسیکی عہد، جب چودھویں سے سترھویں عیسوی میں یہ اپنے بامِ عروج پر تھا۔ عہدِ زوال، جو سترھویں صدی عیسوی کی آخری دہائیوں سے اٹھارویں صدی پر مشتمل ہے۔

اس فن پر عہدِ زوال کی مثال پیش کرنے کے لیے کوہستان کے علاقے کیرتھر نیشنل پارک میں واقع تو نگ قبرستان کی مثال پیش کی جاتی ہے۔

تو نگ کا منقش قبرستان اس فن کے آخری عہد میں تعمیر کردہ قبروں پر مشتمل ہے۔ تو نگ کے منقش قبرستان کا عہد سترھویں صدی کے نصف اور اٹھارہویں صدی عیسوی پر مشتمل ہے۔ اس ڈیڑھ صدی میں اس فن نے کئی رنگ بدلے، اقدار بدلیں اور بالآخر زوال اس کا مقدر بن گیا۔

اس دور میں منقش قبروں سے صاحبانِ قبور اور ان کے ورثا کو امتیاز بخشنے کی خاطر قبروں کی اونچائی پر توجہ دی جانے لگی تھی۔ قبر کے گرد اوپر تلے کئی پلیٹ فارم بنائے جانے لگے تھے۔ نقوش کا حجم بڑھنے لگا تھا۔ سنگ تراشی کے نمونے بے ہنگم انداز میں بڑے بڑے تراشے جانے لگے۔

یہ وہ دور تھا جب قبر بنوانے والوں کے لیے اظہار بلندی میں مضمر تھا۔ مثال کے طور پر تو نگ کے قبرستان میں جو اونچائی کے لحاظ سب سے نمایاں قبریں نظر آتی ہیں ان میں ایک 'باپڑو' کی ہے جو وہاں کے بااثر، صاحبِ ثروت اور طاقتور قبیلے کے فرد تھے۔ باپڑو کی لحد پر تعمیر کردہ تعویذ کے تین چیمبرز بنائے گئے تھے۔ یہ یہاں کی سب سے اونچی قبر ہے۔ قبر کے تعویذ پر سرہانے کی جانب سب سے اوپر پگڑی تراشی گئی ہے جو نہایت بے ڈھب حجم میں بنائی گئی لیکن بنوانے والوں کو نہ تو نفاست سے مطلب تھا، نہ ہی وہ اسے فنکارانہ انداز میں دیکھ رہے تھے بلکہ اُن کا مطمحِ نظر اس کی اونچائی اور بڑا سائز تھا، جو اسے اردگرد کی قبروں سے ممتاز بناتا ہو۔

اس مثال سے پتا چلتا ہے کہ آخری عہد میں اظہار نفاست، ذوقِ فن اور ستائشِ فن کے بجائے صرف 'اونچائی' تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اس سے قبل بلوچ یا قبائلی سنگی منقش قبروں کے اظہار میں کلاسیکی انداز اور توازن نظر آتا تھا، جیسا کہ چوکھنڈی کے کلاسیکی اندازِ تعمیر میں ہے، لیکن اس دور میں وہ رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا تھا۔

اسلام میں اس طرح کے مقابر اور قبریں تعمیر کرنے کی شرعی طور پر گنجائش نہیں ہے۔ اُس عہد میں بھی اس طرح کے مقابر تعمیر کروانے والوں کو بھی وقت کے علما کی مخالفت اور تنقید کا سامنا رہا۔ اپنے عہد کے مشہور عالم دین محمد ہاشم ٹھٹوی نے بھی سنگی منقش قبروں کی تعمیر کے خلاف فتاویٰ جاری کیے تھے لیکن اس فن کا زوال فتاویٰ نہیں بلکہ تمدنی اثرات کو قرار دیا جاتا ہے۔

یہاں ایک قصہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

گیارھویں صدی ہجری کی اولین دہائیوں میں ایک صاحبِ فن سنگتراش تھے جن کا نام عنایت اللہ تھا اور فن پر دسترس کے باعث اُستاد کہلاتے تھے۔ یہ وہی اُستاد ہیں جن کا ہم کچھ دیر پہلے تذکرہ کر چکے ہیں۔ چوکھنڈی قبرستان کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مرکزی مقبرے پر اس طرح کھڑا ہوا جائے کہ آپ کی نظریں سامنے سے گزرنے والی نیشنل ہائی وے پر ہوں تو اُلٹے ہاتھ پر کئی سو گز آگے دور ایک ہموار میدان نظر آئے گا۔ اس میدان میں چند ایک قبریں موجود ہیں۔ یہ قبریں کسی بھی لحاظ سے جاذبِ نظر نہیں ہیں۔ ان قبروں سے خاصا دور ایک ہموار میدان ہے۔ اس کے بیچوں بیچ، زمین سے بہت کم اونچی مگر سادہ سی ایک سنگی قبر واقع ہے۔ قبر کے اردگرد میدان میں سات پتھر گڑے ہوئے ہیں، جن میں بظاہر کوئی ترتیب یا توازن نظر نہیں آتا۔ کہتے ہیں کہ یہ قبر اُستاد عنایت اللہ کی ہے اور جو سات پتھر زمین میں گاڑے گئے ہیں، ان کی داستان بھی بیک وقت افسوس اور حیرت پر مشتمل ہے۔

کہتے ہیں کہ اُستاد اُن دنوں چوکھنڈی میں اپنے فن کا جادو جگا رہے تھے۔ ایک روز وہ اس میدان سے گزر رہے تھے کہ ایک شخص ان پر حملہ آور ہوا اور اس نے اُستاد کو کافر قرار دیتے ہوئے ان پر تیز دھار آلے سے جاں لیوا حملہ کیا۔ حملہ اچانک ہوا تھا، وہ وار کھا کر بھاگے۔ حملہ آور بھی ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ بھاگتے گئے اور وار کھاتے ہوئے سات جگہ گرے۔ ساتویں بار جب وہ اٹھ کر بھاگے تو جس جگہ گرے، وہیں قاتل نے ان کا کام تمام کر دیا۔ بعد میں اُستاد کے شاگردوں نے بھی اس مقام پر اُن کی قبر تعمیر کی، جہاں انہوں نے آخری سانس لی تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے نشانی کے طور پر ہر اُس جگہ زمین پر ایک ایک پتھر گاڑ دیا جہاں پر حملے کے بعد گرتے گئے تھے۔

قاتل کون تھا، اُس کی قبر کہاں ہے...... تاریخ اس بارے میں خاموش ہے لیکن اُستاد اور اُن کا فن آج بھی زندہ ہے۔ قبر آج بھی موجود ہے۔ شدت پسندی فن کو ناپید نہ کر سکی۔

☆☆☆

ماہرینِ بشریات کا کہنا ہے کہ جس عہد میں اس فن کے زوال کی ابتدا ہوئی وہ سندھ پر کلہوڑہ دورِ حکمرانی تھا۔ کلہوڑوں نے اپنی صوبائی سیاست کے استحکام، ریاست کے فروغ اور حاکمیت .... کے لیے قبائلیوں میں نفوذ کا فیصلہ کیا۔ رفتہ رفتہ یہ قبائلی ان کی حاکمیت کے زیرِ اثر آنے لگے۔ یوں آزاد منش قبائل اُس وقت کے کثیر الثقافتی تنوع کے زیرِ اثر آتے چلے گئے۔ یوں ان کی وہ انفرادیت ختم ہونے لگی جو ان کا طرۂ امتیاز تھی۔

بلوچ قبائل کی ساحلی پٹی پر کئی چھوٹی چھوٹی قبائلی ریاستیں تھیں۔ یہ ان کی پہچان تھیں جو رفتہ رفتہ کلہوڑوں کی بڑی ریاست میں ضم ہونے لگیں۔ حاکموں نے اپنے ریاستی اور سیاسی مفادات کے حصول کے لیے ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے کے خلاف کھڑا کر دیا۔ مثال کے طور پر یہاں کے بڑے قبیلے جوکھیہ اور کلمتی کو کلہوڑوں نے کوہستان کے بُرفت قبیلے کے خلاف استعمال کیا۔ اس طرح وہ چھوٹے چھوٹے قبائل جو اپنے مخصوص انداز سے زندگی جی رہے تھے، بڑے دھارے میں شامل ہو کر آہستہ آہستہ اپنی ثقافت، اظہار کے طریقوں اور روایت سے دور ہوتے چلے گئے۔ دوسروں کا تمدنی اثر ان پر اثر انداز ہوتا جا رہا تھا۔ ثقافتی انداز بدلے تو اظہار کے لیے منقش سنگی قبروں کی طرف سے بھی توجہ ہٹنے لگی۔

کلہوڑوں کے چلے جانے کے بعد تالپر آئے اور پھر انگریز...... مگر زیریں سندھ کی منقش قبروں کے وارثوں کی زندگی میں تمدن کی جو نئی شہری لہر آئی تھی، وہ کم ہونے کے بجائے بدستور آگے بڑھتی چلی گئی۔

کراچی کا گرد و نواح تاریخ میں اس فن کا محور تھا لیکن اُنیسویں صدی میں جیسے جیسے کراچی ترقی کرتا چلا گیا، یہ فن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ یوں سترھویں صدی کے دوسرے نصف سے اٹھارویں صدی کے آخر تک ...... یہ زوال کا وہ عرصہ ہے جو اس فن پر آیا۔ قبائل جُوں جُوں شہری ثقافتی اور تمدنی اثرات قبول کرتے گئے، اُن کی روایتیں کمزور پڑتی گئیں۔

اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف کے شروع میں جب انگریز نے کراچی پر قبضہ مستحکم کر لیا تو اس نے زیریں سندھ اور کوہستانی علاقوں کی جانب پیش قدمی کی۔ وہ کراچی سے نکل کر زیریں سندھ کے کوہستانی علاقوں تک پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک نئی تہذیب کے اثرات بھی وہاں پہنچے۔ انگریز کی عملداری وہاں پر قائم ہوئی تو پرانے طور طریقے بدلے۔ انگریز عملدار نے بچے کھچے قبائلیوں پر تسلط پایا، اُن کے روایتی طور طریقوں کو جھٹلا کر بند کر دیا۔ یوں غیر اعلانیہ پابندی اور غیر محسوسانہ انداز میں در آنے والی جدید ترقی کی لہر نے روایت پر ایسا شب خون مارا جس میں نہ تو لہو کی ایک بوند بہی اور نہ ہی کہیں پر مرحوم روایت کی قبر موجود ہے۔ یوں منقش قبروں کے ورثا کی انفرادیت، روایتی اقدار اور ثقافتی پہچان بھی دھندلاتی چلی گئی، حتیٰ کہ انیسویں صدی کے اوائل میں یہ فن اور فنکار، دونوں ہی رفتہ رفتہ ناپید ہو گئے۔

☆☆☆

سندھ کے ان منقش سنگی قبرستان کو دیکھ کر قبرستان کا تاثر نہیں ابھرتا بلکہ خیال آتا ہے کہ کھلے آسمان تلے Open Art-gallery یا ایک ایسا عجائب خانہ قائم ہے جس میں سنگِ زرد پر فن کے نمونے شائقین کے ذوقِ جمال کو آزما رہے ہیں۔ ان قبرستانوں کی خاص بات کندہ کاریوں کے وہ سیکڑوں نمونے ہیں جو دیدہ زیب اور جاذبِ نظر ہونے کے علاوہ ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔ ان میں اقلیدس (جیومیٹری) کا استعمال نظر آتا ہے تو ذہنی تخلیق بھی نمایاں ہے جو اس وقت کی دستکاریوں سے بھی متاثر نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر بعض ایسی قبریں ہیں جن کے چاروں طرف سندھ کی روایتی بان کی چارپائی کے پائے تراشے گئے ہیں جن سے لحد کے اطراف چارپائی کی موجودگی کا تاثر ابھرتا ہے۔ یہی نہیں، اس طرح کے روایتی زیورات کندہ ہیں جو اُس وقت کی خواتین میں مقبول تھے اور پھر بعد از مرگ اُن کی قبر کی زینت بنے۔

چوکھنڈی سمیت تمام منقش قبروں کی ایک اہم انفرادیت یہ ہے کہ پتھر سے تراشی گئی قبریں صرف قبریں ہی نہیں بلکہ کتبے کے بغیر بھی یہ پتا چل سکتا ہے کہ کون سی قبر عورت کی ہے، کون سی مرد کی اور کس میں کم عمر بچہ یا بچی دفن ہے۔ یہ بات قبر کے سرہانے اور ان کے اوپر تراشے گئے نمونوں سے پتا چلتی ہے۔

عورتوں کی قبروں کے سرہانے وہ زیور تراشے گئے ہیں جو گلے، کان، ناک میں پہنتے ہیں جیسے لونگ، ہنسلی، کڑے وغیرہ۔ پائنتی کی جانب پازیب وغیرہ تراشی گئی ہیں۔ بچوں کی قبروں پر پرندے اور کھلونے کندہ ہیں۔ مردوں کی قبریں بہادری سے عبارت نقوش سے مرصع ہیں۔ مرد اور بہادری کو تیر، تلوار اور خنجر کی تصاویر سے اُجاگر کیا گیا ہے۔

برصغیر میں سندھ سے متصل آج کے بھارتی علاقوں کی روایتی سنگ تراشی کی تاریخ میں جھانکیں تو سندھ کے ہمسائے گجرات اور خود تھر کے بعض صدیوں پرانے جین مندروں پر سنگی کندہ کاریاں ملتی ہیں جو اس بات کو تقویت فراہم کرتی ہیں کہ سندھ میں سنگ تراشنے والوں کا ابتدائی طور پر تعلق ہندو مت سے رہا ہوگا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر یہ بات بھی حقیقت ہے کہ ارتقائی عمل کے سفر میں ایک وقت ایسا آیا کہ جب یہ خالص مقامی ہنرمندوں کا فن بن گیا تھا، جسے بعض ماہرینِ آثارِ قدیمہ اب 'سندھی اسلامی آرٹ' بھی کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر سمہ خاندان کے آخری سے پہلے حکمران جام نظام الدین عرف جام تندو کے مقبرے کو ماہرینِ آثارِ قدیمہ سندھی اسلامی فنِ تعمیر کے دور سے یاد کرتے ہیں۔

اسی طرح مکلی میں چودھویں صدی کے اوائل تعمیر کردہ مقبروں پر نہایت ہی عمدہ اور اعلیٰ خط میں عربی میں لکھی گئی آیات اور شجرۂ نسب یا کتبے اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس فن کی ابتدا میں ضرور غیر مسلم ہنرمند شامل ہوں گے مگر بعد کے ادوار میں اس نے خالصتاً مقامی اور اسلامی فن کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔

☆☆☆

زیریں سندھ میں منتشر طور پر پائی گئی منقش سنگی قبروں کو بنوانے والوں نے اپنے ذوقِ جمال کی تسکین قبروں پر دلکش اور طرح طرح کے سنگی نمونوں میں تلاش کی۔ سنگی قبروں کا شجرۂ نسب نیم خانہ بدوش زندگی بسر کرنے والے قبائل سے جوڑا جاتا ہے۔ خانہ بدوش زندگی، جس میں ٹھہراؤ صرف موت کے باعث ہی ممکن ہوتا ہے۔ موت، جسے خانہ بدوش قبائل شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دیدہ زیب مقامِ یادگار میں بدل دینے کی خواہش رکھتے تھے۔

سندھ کے درجنوں تاریخی قبرستانوں میں موجود سنگِ زرد سے تراشیدہ کندہ کاریوں کے یہ وہ سیکڑوں نمونے ہیں جو دلکشی میں اگر اپنی مثال آپ ہیں تو مماثلت میں ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔ پتھر کے ایک ٹکڑے پر ایک سے زائد نمونے تراشیدہ ہیں۔ ان میں اگر اقلیدس کا استعمال نظر آتا ہے تو ذہنی تخلیق بھی نمایاں ہے۔ فنکارانہ ہاتھوں کی مشاقی نظر آتی ہے تو نمایاں آخری آرام گاہ کی خواہش بھی جھلکتی ہے۔ سنگِ زرد پر جہاں مختلف اشکال کے نمونے ابھارے گئے وہیں نقوش میں صاحبانِ قبر کے مراتب اور ان کی پہچان بھی پوشیدہ ہے۔ قرآنی آیات تراشی گئیں تو تہنیتی القابات بھی کندہ کیے گئے حتیٰ کہ شجرۂ نسب تک کندہ ملتے ہیں۔ ایک قبر پر درجنوں نمونے کندہ ہیں تو ایک مقبرہ سیکڑوں نقوش سے مرصع مجموعۂ فن ہے۔

☆☆☆

ٹھٹھہ میں واقع مکلی قبرستان سندھ کا ایک ایسا تاریخی قبرستان ہے جسے دنیا کا سب سے بڑا قبرستان بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں پر چودھویں تا اٹھارویں صدی کے وسط تک تاریخ کے چار ایسے دورِ حکمرانی کے آثار ملتے ہیں جنہوں نے اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے ثقافتی پس منظر کے زیرِ اثر سنگی قبروں کو نیا انداز بخشا۔ ہر حکمران کا عہدِ حکمرانی، اُن کے بنوائے گئے مقابر اور قبروں کے اندازِ تعمیر سے جھلکتا ہے۔ کوہستانی قبائیلوں نے اپنی مقامی ثقافت کے زیرِ اثر جو منقش سنگی قبریں بنوائی تھیں، اِن مختلف اَدوارِ حکمرانی میں حکومت کرنے والے شاہوں نے اپنی تعمیر کردہ یادگاروں اور قبروں کی بیرونی آرائش کے روایتی انداز میں مزید جدت، نفاست و دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہاں آیاتِ قرآنی کی خطاطی، محرابوں اور جھروکوں سے مقابر اور قبروں کو نئی جاذبیت عطا کرنے کی طرف پہل کی گئی۔ یہ انداز سندھ میں روایتی سنگی قبروں کے ارتقائی عمل میں ایک نیا موڑ تھا۔

ایک اندازے کے مطابق مکلی میں دس لاکھ سے زائد افراد مدفون ہیں۔ یہاں 35 تاریخی آثار بیان کیے جاتے ہیں، تاہم سنگی کندہ کاریوں سے مزین مقابر اور قبروں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ جن قبروں پر سنگی کندہ کاریاں کی گئی ہیں ان میں انفرادی قبریں اور مقابر، دونوں شامل ہیں، تاہم یہاں کی جانے والی سنگی کندہ کاریوں میں تنوع کم ملتا ہے۔ تعبیرات میں ایک نمونے کو متعدد بار ایک ہی انداز سے دہرایا گیا ہے، جبکہ چوکھنڈی سمیت کوہستانی خطے میں پائی گئی سنگی قبروں کے نمونوں میں اس حد تک تنوع ہے کہ ایک قبر پر درجن بھر سے زائد مختلف نمونے کندہ کیے گئے ہیں اور ایک نمونے کو ایک سے زائد بار دُہرانے سے بڑی حد تک احتراز برتا گیا ہے۔

☆☆☆

آسودۂ خاک شاہوں کے نشانِ تاریخ کے صفحات پر ہی نہیں، قبرستانوں پر بھی اپنے اَن مٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک راجا سندھ کا بھی تھا۔ مکلی میں تعمیر کردہ جس کے مقبرے کو برِ صغیر کی تعمیراتی تاریخ میں 'سندھی اسلامی فنِ تعمیر' کا بے مثل نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ راجا تھا جام نظام الدین عرف جام نِندو اور گزشتہ برس مقبرے کی تعمیر کو پانچ سو برس پورے ہوئے ہیں۔

ماہرینِ آثاریات کا خیال ہے کہ مکلی میں مکمل طور پر پتھر سے تیار کردہ مقابر کی تاریخ کا سفر 1509 عیسوی میں تکمیل پانے والے جام نندو کے مقبرے سے ہوتا ہے۔ یہ مقبرہ، مکلی قبرستان کے انتہائی شمال میں واقع ہے۔ مکلی کے نقشین سنگی مقابر میں سب سے جاذبِ نظر مقبرہ یہی ہے۔

جام نندو کے مقبرے پر ان گنت نمونہ فن موجود ہیں تاہم حیرت انگیز طور پر قبر سنگی نقش و نگاری سے بالکل خالی اور سپاٹ ہے۔ جام نظام الدین سندھ پر سمہ خاندان کے آخری سے پہلے فرمانروا تھے۔ ٹھٹھہ ان کا پایۂ تخت تھا اور مکلی کا یہ قبرستان ان کی آخری آرام گاہ۔ جام نندو کی وفات کا سال 1508 اور مقبرے کی تکمیل کا سال 1509 مذکور ملتا ہے۔ مقبرے کی تکمیل کا سال بہ زبانِ عربی شمالی دیوار پر ایک کتبے پر یوں کندہ ہے:

''السلطان العاظم والخاقان العادل، الاکرام ناصر الحق والدنیا والدین ابوالفتح سلطان فیروز شاہ تاریخ 951 ھجری'' المطابق 1509ء۔

یہ مقبرہ جودھپوری گلابی مائل سنگِ زرد سے تعمیر کردہ ہے۔ بے گنبد اور دائرہ کی شکل میں کھلی چھت کا یہ مقبرہ صرف مکلی ہی نہیں پورے پاکستان میں اپنی نوعیت کا منفرد ثقافتی شاہکار خیال کیا جاتا ہے۔ یہ مقبرہ طرزِ تعمیر کے حوالے سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

جام نظام الدین عرف جام نندو کا تعلق سمہ قوم سے تھا۔ سمہ خاندان نے لگ بھگ دو سو برس تک سندھ پر حکمرانی کی ہے۔ اس دور کو تاریخ میں سمہ دورِ حکومت کہا جاتا ہے۔ یہ دور 1335ء سے 1520ء پر محیط تھا۔ جام نظام نے 1460ء سے اپنی وفات 1508ء تک، اڑتالیس برس حکومت کی۔ بعد ازاں، دو بار مختصر مدت کے لیے ناصر الدین فیروز تخت نشیں ہوا لیکن جام کے بعد زوالِ سمہ حکومت کا مقدر بنا اور 1520ء میں ارغونوں کے ہاتھوں سندھی حکمرانوں کا دورِ اختتام کو پہنچا۔

سمہ بھی ہندو راجاؤں کے غلام تھے۔ سندھ کی قدیم ترین تاریخ چچ نامہ کا مصنف لکھتا ہے:

''راجا چچ کے زمانے میں سمہ قوم کو زمہ کپڑے پہننے اور سروں پر مخمل اوڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے بجائے وہ نیچے اوپر کالی گدڑی پہنتے تھے۔ کھردری چادر کاندھوں پر ڈالتے تھے۔ سر اور پیر کو برہنہ رکھتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی نرم کپڑا پہن لیتا تو اس پر جرمانہ کیا جاتا تھا۔ گھر سے باہر نکلتے وقت پہچان کے لیے وہ اپنے ساتھ کتے لے کر نکلتے اور ان کے سربراہ کو بھی گھوڑے پر سوار ہونے کی اجازت نہیں تھی۔''

کہا جاتا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے میں سمہ نے راجا چچ کے بیٹے راجا داہر کے بجائے عربوں کا ساتھ دیا اور اسلام قبول کرلیا۔ عربوں کے بعد جب سومرہ دور بھی اختتام کو پہنچا تو سمہ قوم نے سر اٹھایا اور سندھ پر قبضہ کر کے ٹھٹھہ کو اپنا دارالحکومت

بنالیا۔ یہ 1335ء کی بات ہے۔ سمہ دور کا پہلا حاکم جامؔ بھم بینہ کا بیٹا فیروز الدین شاہ عرف جام جُونا تھا۔ سمہ قوم کا تعلق ٹھٹھہ کے قریب واقع گاؤں سرسوئی سے تھا۔ گاؤں کے آثار آج بھی ٹھٹھہ سے کچھ فاصلے پر واقع ایک ٹیلے پر پائے جاتے ہیں۔

تعبیرات کے حوالے سے سمہ دور کی یادگاریں تاریخی و ثقافتی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان میں جام نندو کا مقبرہ صرف سمہ دور ہی نہیں، بعد کے تمام اَدوار کی تعبیرات، جن میں عرب، ایرانی، ترک اور مغلیہ اندازِ تعمیر شامل ہے، کی عمارتوں میں سب سے ممتاز ہے۔

ممتاز ماہر آثارِ قدیمہ ڈاکٹر احمد حسن دانی (مرحوم) کا بیان ہے:

''سمہ دور میں، سندھ میں ایسے تعمیراتی انداز کا ارتقا ہوا جسے ہم 'سندھی اسلامی فنِ تعمیر' کہہ سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے اب تک اس تعمیراتی ورثے کی صحیح اہمیت اجاگر کرنے کے لیے کسی بھی قسم کے تجزیے کا فقدان ہے۔''

معروف ماہر آثارِ قدیمہ ڈاکٹر کلیم لاشاری کے مطابق ''سندھ میں سنگی قبروں کا ارتقا بارھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے، تاہم جام نندو کا مقبرہ اس ارتقائی عمل کا بے مثال شاہکار ہے۔''

'پاکستان میں تہذیب کا ارتقا' کے مصنف سبطِ حسن کے مطابق:

''مکلی کے پتھر کے مقابر میں جام نندو کا مقبرہ سب سے ممتاز ہے۔ اس مقبرے کی دیواروں پر جو شجری نقوش ابھارے گئے ہیں وہ سندھ، راجپوتانہ اور گجرات کے فنِ سنگ تراشی کی پرانی روایات کے بہترین نمونے ہیں۔ پاکستان میں فنِ تعمیر کی مقامی اور اسلامی روایتوں کے امتزاج کی شاید سب سے ابتدائی مگر نہایت کامیاب کوشش جام نندو کا مقبرہ ہے۔''

کراچی سے لگ بھگ سو کلومیٹر کی مسافت پر واقع مکلی قبرستان مائی مکلی نامی دین دار خاتون کے نام سے موسوم ہے۔ جس کی قبر جام نندو کے مقبرے کے سامنے صرف چند گز کے فاصلے پر یہاں کی سب سے قدیم مسجد کی محراب تلے موجود ہے، تاہم محققین کا اس سے اتفاق نہیں۔

مقبرہ چوکور شکل میں تعمیر کیا گیا تھا۔ چہار اطراف کی چوڑائی اور اونچائی، ہر جانب سے 37 فٹ ہے۔ مشرقی سمت جالی دار کھڑکی ہے۔ مغرب کی جانب بیرونی سمت پر دروازہ اور اندر سے عین وسط میں چھ فٹ اونچی محراب ہے۔ شمال اور جنوب کی جانب دروازے ہیں۔ شمالی دروازہ اب پاٹ دیا گیا ہے۔ جنوبی دروازے اور دیوار کے درمیان تنگ سی راہ گزر ہے، جہاں سے سیڑھیوں کے راستے بے گنبد مقبرے کی درمیان سے کھلی چھت اور مغربی سمت تعمیر کردہ جھروکے تک پہنچا جاسکتا ہے۔ سیڑھیوں کے قدمچے بھی دلکش نقوش سے مرصع ہیں۔

مقبرہ جودھپوری سنگِ زرد سے تعمیر کردہ ہے۔ پتھروں کو مربع شکل میں تراش کر بڑی اینٹوں کی شکل دی گئی۔ جسے فنِ تعمیر کی اصطلاح میں 'برک اسٹون' کہا جاتا ہے۔ بے گنبد اور دائرہ کی شکل میں کھلی چھت کا یہ مقبرہ پاکستان میں اپنی نوعیت کا منفرد ثقافتی شاہکار خیال کیا جاتا ہے۔

مقبرے کی عمارت پر اندر اور باہر کی سمت کندہ کاریوں کے سیکڑوں نمونے ہیں جو دلکشی میں اگر اپنی مثال آپ ہیں تو مماثلت میں ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔ پتھر کے ایک ٹکڑے پر ایک سے زائد نمونے تراشیدہ ہیں۔ ان میں اگر اقلیدسی نمونوں کا استعمال نظر آتا ہے تو ذہنی تخلیق بھی نمایاں ہے۔ فنکارانہ ہاتھوں کی مشاقی نظر آتی ہے تو نمایاں آخری آرام گاہ کی خواہش بھی جھلکتی ہے۔ قبر سادہ ہے مگر مقبرہ سیکڑوں نقوش سے مرصع مجموعۂ فن ہے۔ نقش گری کے ہر پہلو میں جمالیاتی ذوق غالب ہے۔

مقبرے کی تعمیر کے روایتی انداز میں جدت، نفاست اور دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ماہرین کے مطابق یہ اندازِ تعمیر سندھ میں روایتی سنگی قبروں کے ارتقائی عمل میں ایک نیا موڑ تھا۔ خطِ نسخ اور نستعلیق میں خطاطی اور محراب اسلامی فنِ تعمیرات کی عکاس ہیں تو گجراتی شاہی محلات کے طرزِ تعمیر سا انداز لیے جھروکے بھی ہیں۔ جن پر جین اور ہندو مت کے قدیم اُدوار کے مندروں میں استعمال ہونے والے سنگی نمونوں کا حسین امتزاج بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

چینی، ہتھوڑی، بے نشاں فنکاروں کے ہاتھوں اور تخلیقی ذہن نے صدیوں پہلے بے نشاں ہوجانے والے راجا جام نندو کو یوں دوام بخشا کہ اب ان کی آخری آرام گاہ صرف قدیم آرٹ کا نادر نمونہ ہی نہیں، سندھ کا عظیم ثقافتی ورثہ بھی بن چکی ہے۔ ہنرمندی کا شاہکار تعمیراتی ورثہ سندھ کے عظیم ثقافتی پس منظر کی داستان سناتا ہے خاموشی کی زبان میں۔

جام نندو کے مقبرے سے جنوب کی سمت چلیں تو کچھ فاصلے پر ان کے سپہ سالار اور لے پالک فرزند مبارک خان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

المعروف دولہا دریا خان کا مقبرہ واقع ہے۔ منقش سنگی چار دیواری میں، عین محراب کے سامنے دولہا دریا خان، ان کے اہلِ خانہ اور دیگر رفقا کی قبریں موجود ہیں۔ یہ قبریں سہ دور کا روایتی اندازِ تعمیر لیے ہوئے ہیں مگر ان میں جام نظام کے مقبرے جیسی نفیس ترین اور متنوع کندہ کاریاں بہت کم نظر آتی ہیں۔ البتہ جو کندہ کاریاں ہیں وہ سہ عہد کے انداز کو عیاں کرتی ہیں۔ دولہا دریا خان کے مقبرے کا سنِ تعمیر 1509 عیسوی بیان کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

سہ کے بعد ارغون دور آتا ہے۔

سندھ پر ارغون دورِ حکومت 1520 سے 1555 عیسوی پر محیط تھا۔ ارغون دور میں قبر کے سرہانے اور پائنتی کی جانب پتھر کی اونچی اونچی تختیاں نصب ہیں۔ سرہانے موجود تختیوں پر قرآنی آیات کی خطاطی اور پائنتی میں مرحوم کا حسب نسب اور بعض قبروں پر صاحبِ قبر کا کتبہ بھی تحریر ملتا ہے۔

اس کے بعد 1555 سے 1565 عیسوی پر محیط مختصر دورِ ترخان ہے۔ اس دور کے مقابر میں مرزا عیسیٰ خان ترخان اول، مرزا عیسیٰ خان ثانی، مرزا جانی بیگ اور دیگر کے مقابر ملتے ہیں۔ ترخان دور کے مقابر میں سنگِ زرد کی منقش چار دیواری، ستونوں پر ایستادہ چھتر، بعض جگہوں پر پتھر کو تراش کر بنائی گئی آرائشی اُبھرواں تصاویر، سنگی سلوں پر آیاتِ قرآنی کی خطاطی، اسلامی طرزِ تعمیر کی عکاس محرابیں، گجراتی فنِ تعمیر کا انداز لیے منقش آرائشی جھروکے اور تراشیدہ سنگی جالیاں نمایاں ہیں۔ قبر کی سنگی سلوں پر سنگتراشی کے ذریعے کندہ خطاطی تمام مقابر اور قبروں پر یکساں انداز لیے ہوئے ہے۔ بیرونِ سندھ سے درآمد شدہ زرد پہاڑی پتھر کی سلوں سے تعمیر کردہ ترخان دور کے سنگی مقابر اور قبروں پر کندہ کاریاں نمایاں طور پر ملتی ہیں لیکن نمونوں میں متنوع بہت حد تک مفقود نظر آتا ہے۔ کم و بیش ایک ہی انداز کے نمونے متعدد بار دُہرائے گئے ہیں۔

ترخان دور کے سنگی مقابر میں سب سے نمایاں اور پُرجلال مقبرہ عیسیٰ خان ترخان ثانی کا ہے۔ وسیع و عریض قطعۂ زمین کے اطراف جودھپوری سنگِ زرد کی منقش اونچی چار دیواری ہے جس میں اسی سنگِ زرد سے بنے کئی فٹ بلند پلیٹ فارم پر ستون دار مقبرہ واقع ہے۔ مقبرے کا سالِ تکمیل 1644 عیسوی مذکور ہے۔ مقبرے کے سادہ مرکزی گنبد کے علاوہ متعدد چھوٹے چھوٹے گنبد ہیں جن پر اندر کی جانب اُبھرواں سنگی نقوش ملتے ہیں۔

مقبرے کے ستونوں، دیواروں اور محرابوں پر کی گئی سنگی کندہ کاریوں میں تنوع کے بجائے یکسانیت کو دی گئی ترجیح واضح طور پر نظر آتی ہے۔ چھت پر بھی بیل بوٹے اقلیدسی انداز میں اُبھارے گئے ہیں مگر ان میں بھی تنوع بڑی حد تک ناپید ہے۔ البتہ قبر پر خطاطی کا وہی انداز ہے جو مکلی میں اُس عہد کی دیگر قبروں پر پایا جاتا ہے۔ ستونوں پر ایستادہ محراب دار اور اُبھرواں سنگی نقوش والا یہ مقبرہ جاذبِ نظر ہے۔ یہ مقبرہ اس بات کی بھی غمازی کرتا ہے کہ یہاں سندھ کے اندر قبروں پر پائی جانے والی روایتی سنگی کندہ کاریوں کے نمونوں کو دُہرانے کے بجائے فنِ تعمیر میں موزونیت، جدیدیت اور نمونوں کے مابین توازن قائم کرنے پر زیادہ توجہ مرکوز کی گئی تھی۔

آخر میں مغل فرماں رواؤں کے دور کے مقابر اور قبریں ہیں۔ یہ دور 1739 عیسوی تک پر محیط ہے۔ ان میں ایک حدِ فاصل یہ ہے کہ سہ، ارغون اور ترخان دور میں سنگی قبریں اور مقابر ملتے ہیں جبکہ مغل دور میں مقبرے کی تعمیر چھپائی اور پختہ سرخ اینٹوں سے وسط ایشیائی انداز میں کی گئی ہے۔ سنگی کندہ کاریوں کے بجائے کاشی گری غالب نظر آتی ہے۔ البتہ قبریں ... پھر بھی سنگِ زرد سے تیار کی گئی ہیں اور آیاتِ قرآنی کی خطاطی سے ان کی تزئین کی گئی ہے۔

مکلی میں ارغون، ترخان اور مغل عہد کی قبریں اور مقابر جس نوع کی خطاطی، سنگی نمونوں، محرابوں، جھروکوں اور ستونوں سے آراستہ ہیں، انہیں سنگی کندہ کاریوں کے عہدِ جدید سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مکلی کے مقابر میں کہیں کہیں سندھ کے خطۂ کوہستان کی نقشین سنگی قبروں پر کندہ اقلیدسی نمونے بھی ملتے ہیں تو وسط ایشیائی انداز میں چوکور پلیٹ فارم پر گولائی کی شکل میں تعمیر مقبرے اور اونچے گنبد بھی ہیں۔ اسلامی فنِ تعمیرات کی عکاس محرابیں ہیں تو گجراتی طرزِ تعمیر کا امتزاج لیے جھروکے بھی ہیں۔ جین پر جین اور ہندومت کے قدیم اُدوار کی مذہبی تعمیرات میں استعمال ہونے والے سنگ تراشی کے نمونوں کا حسین امتزاج نمایاں نظر آتا ہے۔

☆☆☆

خیال کیا جاتا ہے کہ کم و بیش ایک ہزار سال پہلے سندھ میں جس طرز کی نقشین سنگی قبروں کی ابتدا ہوئی تھی۔ اُن میں ابتدائی طور پر قبائلی انداز فن نمایاں طور پر موجود تھا۔ آہستہ آہستہ عمل ارتقا کی بدولت ان میں جدت آتی چلی گئی اور پھر قبروں پر مختصر عبارتیں اور کتبے بھی ملنے لگے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سنگی کندہ کاریوں میں بھی واضح تبدیلیاں آتی چلی گئیں۔ آہستہ آہستہ تراشیدہ نمونوں میں یکسانیت دکھائی دینے لگی۔ اساتذہ کے فن میں ٹھہراؤ آنے لگا اور منقش سنگی قبریں بنوانے والوں میں برتری کا معیار بدلتا چلا گیا۔ نمایاں ہونے کا احساس قبروں پر کندہ نمونوں کی متنوع تعداد اور باریک ترین نفیس کندہ کاریوں کے بجائے قبروں کی بلندی سے کیا جانے لگا جس سے کلاسیکی اندازِ فن میں نمایاں بے ڈھب اسلوب فروغ پانے لگا۔ یہی وہ عہد ہے جب سندھ میں قبروں پر سنگی کندہ کاری کا مقبول ترین فن اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہا تھا۔

سندھ کے خطۂ کوہستان اور اس کے زیرِ اثر علاقوں میں سنگی قبروں کے رجحان کی ابتدا اور اسے ملنے والا عروج، آزاد منش قبائل سے تعلق رکھنے والوں کا اپنے پیاروں کو تادیر یاد رکھنے یا ابدی آرام گاہ کو مرکزِ نگاہ بنانے کے جذبے کے تحت ہوا تھا یہ بات الگ، حقیقت یہ ہے کہ طویل ارتقائی عمل نے سنگی کندہ کاریوں سے مزین قبروں اور مقبروں کو عہدِ گم گشتہ کی لوک روایات کی زندہ مثال بنا دیا ہے۔

سطوتِ شاہی کے عکاس تاج، پگڑیاں، تیر کمان، تلوار، بھالے، خنجر، توڑے دار بندوق، شکار اور جنگی مہم سے واپسی کے مناظر، آراستہ و پیراستہ گھوڑے اور مکمل فوجی لباس میں ملبوس گھڑ سوار، نفاست سے آراستہ صنفِ نازک کے زیورات، روایتی سندھی پلنگ سے مشابہ قبروں کے چبوترے جن کے چہار اطراف پلنگ کے پائے تراشے گئے، سندھی رسم الخط میں کندہ عبارتیں، عربی رسم الخط میں سنگ پاروں پر کی گئی نہایت نفیس خطاطی اور ذہنی اختراع سے تراشے گئے بے تحاشا سنگی نقش و نگار۔۔۔ یہ سب ایک ایسے عہد کی داستان ہے جس سے صدیوں پہلے ایک نئی لوک ریت کی داغ بیل پڑی۔

سندھ کی ان نقشین سنگی قبروں پر ابھارے گئے نقوش آج بھی روایتی پارچہ بافی، مٹی کے ظروف، مقامی زیورات، اور فنِ چوب کاری پر ملتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جن فنکاروں نے یہ نقوش تراشے وہ مقامی روایتی نقش و نگار سے آگاہ اور ان کی دیدہ زیبی سے متاثر تھے۔ ان منقش سنگی قبروں کی شکل میں قبائل کی لوک ریت نے جہاں مقامی تشخص کو پروان چڑھایا، وہیں بیرونی اثرات کو بھی قبول کیا، مگر وقت کی گردش میں اس فن کو زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ زوال جو عروج میں پوشیدہ مقام آخر ہے۔

فن پر زوال آیا تو فنکار بھی نہ رہے۔ خیال ہے کہ اب اس نوع کے سنگ تراش کہیں نہیں ملتے، البتہ ان کا فن زندہ ہے چاہے وہ چوکھنڈی ہو یا مکلی، تو نگ ہو یا راج مُلک کا قبرستان..... فن کے وجود میں فنکار کی روح بھی منتظر ستائش نظر آتی ہے۔ قبرستان جس کی خاک میں انسانی وجود گمنام ٹھہرے مگر فن زندہ ہے پتھر کی سلوں پر نقش گری کی صورت۔ کہیں کہیں فنکار بھی موجود ہے قبر کے سرہانے کندہ اپنے ناموں کے ساتھ۔

سورج ڈھلنے پر تارکی ہر چیز کو اپنی دبیز چادر میں چھپا لیتی ہے مگر روشن صبح کی کرنوں میں فن ہو یا فنکار، دونوں زمانے پر عیاں ہو کر ہی رہتے ہیں، سادہ سے پتھروں کو تراش کر انہیں لوک ثقافت کی پہچان اور فن کی خاموش زبان بخشنے والے تو تاریخ میں کھو گئے مگر ان کی ہنرمندی کے شاہکار یہ نمونے آج پاکستان اور سندھ کے عظیم ثقافتی پس منظر کی داستان سناتے ہیں خاموشی کی زبان میں۔ قبروں پر کی گئی یہ نادر سنگی کندہ کاریاں، جنہیں فن سنگ تراشی میں اختراعی اور منفرد قرار دیا جاتا ہے۔ انہیں دیکھنے کے لیے آج بھی لوگ دور دور سے یہاں آتے ہیں اور انہیں تخلیق کرنے والوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

سنگِ زرد کی پہاڑی سے کاٹے گئے پتھر کی سلوں پر کی گئی کندہ کاری سے مرصع یہ شاہکار قبریں سیکڑوں سال پہلے کے سندھ کی لوک زندگی میں فن اور فن کاروں کی پذیرائی کے ساتھ آخری آرام گاہوں کو مرکزِ نگاہ بنانے کی خواہش کا اظہار بھی ہیں۔ سرزمینِ سندھ پر فن اور لوک ثقافت کے ان صدیوں پرانے آثاروں کے تخلیق کاروں کے وجود پیوندِ خاک ہوئے۔ خاک بھی بے نشاں ہوئی مگر ان کے ہاتھوں تراشے گئے صناعی کے یہ نمونے آج بھی زندہ و جاوید ہیں۔ بے زباں پتھر پر بے مثل فن کو ثبت کر کے گمنام تخلیق کاروں نے بے جان نمونوں کو ایسی زباں عطا کی، جس میں فن کار کا فن بولتا ہے۔ چھینی، ہتھوڑی، فنکار کے ہاتھ اور تخلیقی ذہن نے صدیوں پہلے بے نشاں ہو جانے والے صاحبانِ اختیار و زر کو اس طرح دوام بخشا کہ اب ان کی آخری آرام گاہیں صرف قدیم آرٹ کا نادر نمونہ ہی نہیں بلکہ پاکستان اور سندھ کا نادر ثقافتی ورثہ بن چکی ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط 56

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ..... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے تاکہ میں بھی اپنے بھائیوں کی طرح آرمی جوائن کرسکوں جبکہ میں آرمی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ میرے انکار کو انہوں نے انا کا مسئلہ بنالیا۔ اس دور میں میرے لیے واحد اچھی یادسویرا ہے جو میرے دل کا حصہ تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کے لیے ماں جی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا وہ میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے دل سے نکل آیا۔ یہاں سے زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ تعلیم مکمل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرکے میں نے کاروبار شروع کیا۔ سفیر، مونا اور ندیم جیسے دوست ملے اور زندگی ایک ڈھب سے گزرنے لگی لیکن ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے ایک معمولی سے حادثے نے میری زندگی کا رُخ بدل دیا۔ نادر علی کا اپنے اوباش دوستوں سمیت ہم سے ٹکراؤ ہوگیا تھا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ دشمنی اور دربدری کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے لوگ میرے دشمن ہورہے تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست بھی تھے۔ راجا عمر دراز جیسا ذہین اور بااثر میرا مہربان بن گیا تھا اور اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار کرکے دور تک چلی گئی تھیں۔ میں قسمت کے ہاتھ میں کھلونا بن گیا اور قسمت مجھے کسی منہ زور سمندری لہر کی طرح اپنے دوش پر لیے پھرتی رہی۔ میں دوبارہ اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہوگیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرونِ ملک کی طرف بڑھ رہا تھا کہ فتح خان نے دوبارہ مجھے گھیرنے کی کوشش کی۔ اس نے مجھے بے ہوش کردیا۔ جب آنکھ کھلی تو میں اپنے آبائی گھر میں تھا۔ میری بھانجی ثمی اپنے ددھیال جارہی تھی کہ اس کی کار پر فائرنگ ہوئی۔ فائرنگ سے اس کا منگیتر بُری طرح زخمی ہوگیا۔ میں جیپ لے کر نکل پڑا۔ میں اسلام آباد آگیا۔ عبداللہ نے بتایا کہ شہلا رضوی کی گیلری سے کوئی کود رہا تھا جسے اندر والوں نے پکڑلیا۔ مجھے شک ہوا کہ وہ بیتو ہے۔ میں شہلا رضوی کے بنگلے میں داخل ہوگیا۔ بیتو وہاں موجود تھا۔ فتح خان کو بے ہوش کرکے میں ساتھ لے آیا۔ اسے اور بیتو کو عبداللہ کے حوالے کیا اور اسپتال کے لیے نکل پڑا۔ عتیق کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک لمبے بالوں والا شخص عتیق کے آکسیجن ماسک کو کھول رہا ہے۔ میں نے للکارا تو وہ کھڑکی سے کود کر بھاگا۔ اس کے پیچھے میں بھی کود گیا مگر وہ نہ ملا پھر میں اپنی کار میں بیٹھا ہی تھا کہ پیچھے سے گردن پر پستول کی نال آ لگی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، وہی شخص تھا جس کے تعاقب میں، میں کھڑکی سے کودا تھا۔ وہ مجھے گرفتار کرکے مرشد کے پاس لے گیا۔ کئی دن کے بعد میں اس کی قید سے فرار ہوا۔ میرے ساتھ زرین نامی وہ مظلوم لڑکی بھی تھی جس کی نگرانی میں مجھے رکھا گیا تھا۔ راجا صاحب کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ زرین کا علاج کرایا پھر ایک روز ہم سب عتیق کو اسپتال سے لانے پہنچے تا کہ اس کا علاج حکیم قاؤس سے کراسکیں۔ جب اسے لے کر آرہے تھے تو راستے میں دشمنوں نے اسے اغوا کرلیا۔ اسے فتح خان کے عوض رہا کرایا۔ حکیم قاؤس اس کا علاج کرنے لگا۔ زرین نے فرمائش کردی کہ میں یہاں بند رہ کر خود کو قیدی محسوس کررہی ہوں۔ میں اسے لے کر سیر کے لیے نکلا تھا کہ دشمنوں نے گھیرلیا۔ ان سے بچتے بچاتے ہم نکلے تو راستہ بھٹک کر ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جو سری وغیرہ کی طرف جاتا تھا۔ ہماری گاڑی بھی خراب ہوگئی۔ ایک ڈاکٹر نے آبادی تک پہنچانے کا وعدہ کرلیا۔ ہم اس کے ساتھ اس کے بنگلے پر پہنچے تو احساس ہوا کہ ہم قید ہوچکے ہیں۔ زرین کی طبیعت بھی خراب ہوگئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر نے ہم پر ایک خطرناک وائرس کا تجربہ کیا ہے۔ زرین جانبر نہ ہوسکی۔ ڈاکٹر کی آواز مائیک سے آرہی تھی کہ اب تمہارا نمبر ہے۔ تبھی ڈیوڈ شا آگیا۔ وہ ڈاکٹر کا فنانسر تھا۔ اس نے مجھے رہا کرالیا اور کہا کہ اگر تم مجھے پُراسرار وادی تک پہنچا دو تو میں مرشد سے بھی گلوخلاصی کرادوں گا۔ اس نے مرشد کو بلایا۔ وہ شا کے کہنے پر مفاہمت پر آمادہ ہوگیا مگر اس کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ اس کے جانے کے بعد شا نے مجھے اپنے ایک آدمی کے ساتھ کردیا کہ وہ مجھے شہر چھوڑ آئے مگر راستے میں ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے کودا۔ وہ پستول سے فائر کرتا کہ ایک ہیولا سا لپکا۔ وہ ایک کتا تھا جس نے مارشل کے پستول والے ہاتھ پر منہ مارا تھا۔ براؤن نامی وہ کتا مونا کا تھا۔ سفیر وغیرہ اس کی مدد سے مجھ تک پہنچے تھے۔ ان کی مدد سے میں شہر آگیا۔ وہ سب ایران کے راستے پاکستان پہنچے تھے، پہلے ہم اس بنگلے میں پہنچے جہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے پھر اسلحہ وغیرہ پہنچانے کا انتظام کیا اور مونا وسادھنا کو عبداللہ والے بنگلے پر پہنچانے کا انتظام کیا پھر شہلا کی تلاش میں نکلے۔ اس نے بتایا کہ اس سے ہوٹل میں آکر ملوں۔ میں اس سے ملنے پہنچا تھا، بائیک کھڑی کررہا تھا کہ نال کی چبھن محسوس ہوئی اور آواز آئی ''اِدھر سے چلو اس سے پہلے کہ یہ چل جائے۔'' یہ آواز فتح خان کی تھی۔ وہ مجھے نزدیکی پارک میں لایا اور بولا کہ میں دشمنی ختم کررہا ہوں۔ تمہیں ایمن کو پاکستان بلانا ہوگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ایمن کو قبضے میں کرکے اس کے باپ سے ہیروں کے متعلق معلومات چاہتا ہے۔ میں گھر آیا تو پتا چلا کہ میرے دوست شہلا کو اغوا کرلائے ہیں۔ تبھی مجھے عبداللہ کے ذریعے معلوم ہوا کہ راجا صاحب نے مجھے پنڈی محل میں بلایا ہے۔ میں ہیلی کاپٹر سے وہاں پہنچا تو پتا چلا کہ راجا صاحب کو کینسر ہوگیا ہے۔ وہ پھر بھی پُراسرار وادی کی طرف جانا چاہتے تھے۔ جب میں انڈیا میں تھا تو وہ ایک بار جانے کی کوشش کرچکے تھے، راستے میں انہیں ڈیوڈ شا بھی ملا تھا مگر برف والے نے انہیں واپس کردیا کہ ہاتھ والے کو لے کر آؤ۔ میں عمر دراز سے مل کر کمرے میں لوٹا تو رات کے وقت ایک خوبصورت ملازمہ نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کردیا بعد میں پتا چلا کہ وہ اپنی بہن کی موت کا انتقام لینے آئی تھی۔ اسلام آباد واپس آیا تو فتح خان کا آدمی جو قید میں تھا، اسے شہلا نے قتل کردیا۔ ہم نے وسیم اور سعدیہ کی شادی کرادی اور واپس آرہے تھے کہ ایک لڑکی کو اغوا کرنے والے نظر آئے۔ ہم نے ان کے قبضے سے لڑکی کو برآمد کیا۔ گھر آئے تو رات کے وقت کچھ لوگ نظر آئے جو کتوں کو بو سنگھا کرلاتے نظر آئے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمایئے

کتا کس کی بو محسوس کرکے مکان کی طرف بھونک رہا تھا؟ اس سوال کا جواب بجلی کی طرح میرے ذہن میں چمکا تھا۔ اسے شہلا کی بو مل رہی تھی کیونکہ اسے سونگھایا جانے والا بلاؤز شہلا کا تھا اور وہ یقیناً فتح خان کے آدمی تھے۔ اس نے وہی حربہ استعمال کیا تھا جو ہم اور میرے ساتھیوں نے میری تلاش کے لیے استعمال کیا تھا اور کامیاب رہے تھے۔ اس آدمی نے فوراً کتے کے منہ پر چمڑے کا ایک منہ بند چڑھا دیا۔ وہ کوں کوں تو کرسکتا تھا لیکن بھونک نہیں سکتا تھا۔ غالباً وہ ہمیں بے خبر رکھنا چاہتے تھے۔ ان کو علم نہیں تھا کہ میں چھت سے انہیں دیکھ رہا تھا کیونکہ مکان کے اطراف میں تیز روشنی کے بلب روشن تھے لیکن چھت تاریکی میں تھی۔ بلب اس طرح لگے تھے کہ ان کی روشنی چھت کی طرف نہیں آتی تھی۔

کتے کا منہ بند کرکے انہوں نے ہتھیار نکال لیے تھے ایک کے پاس ہلکی مشین گن نظر آرہی تھی اور دوسرے کے پاس چھوٹی شاٹ گن تھی اور دونوں نہایت مہلک ہتھیار تھے۔ ان کے ارادے کھل کر سامنے آگئے تھے میں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر موبائل نکال کر ایاز کا نمبر ملایا۔ اس نے کچھ دیر بعد کال ریسیو کی۔ میں نے پوچھا۔

''کہاں ہو تم کام ہوگیا؟''

''ہاں ہم اسے ڈال کر ابھی نکلے ہیں۔'' اس نے کہا وہ میرے لہجے سے سمجھ گیا۔ ''کوئی چکر ہے؟''

''ہاں یہاں دو مصیبتیں اور نازل ہوگئی ہیں اور لگ رہا ہے اس کے بھائی بندے ہیں جسے تم ڈال کر آرہے ہو۔ وہ ایک عدد کتے کے ساتھ آئے ہیں جس نے شہلا کی بو پالی ہے۔ فی الحال وہ مکان میں گھسنے کی تیاری کررہے ہیں۔''

''ہم آرہے ہیں۔''

''جلد از جلد آجاؤ۔'' میں نے کہا اور فون بند کرکے اس کی بیل آف کردی، مکان آگے پیچھے سے محفوظ تھا اور وہ توڑ پھوڑ کیے بغیر راستہ نہیں بنا سکتے تھے۔ اوپر آنے والا فولادی دروازہ بھی مکان کے ٹنکی ٹاور میں تھا اور اسے اندر سے بند کیا جاتا تو کوئی اس طرف سے بھی نہیں آسکتا تھا۔ لیکن ان کے پاس خطرناک ہتھیار تھے وہ فائر کرکے کوئی بھی لاک توڑ سکتے تھے۔ میں مستقل ان کی نگرانی کررہا تھا اور مجھے خدشہ تھا کہ وہ کہیں کال کرکے اس بات کی اطلاع نہ کردیں۔ ان کو کرنا تو یہی چاہیے تھا کہ فتح خان یا کسی دوسرے ساتھی کو اس مشکوک مکان کے بارے میں اطلاع دیتے اور مزید ساتھی آنے پر آرام سے ہمارے ٹھکانے کو گھیر لیتے لیکن انہوں نے خود ہی چڑھائی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ گاڑی انہوں نے سڑک کے ساتھ چھوڑ دی تھی اور وہ کتے کے ساتھ کچے میں اتر آئے اور مکان کے بائیں پہلو کی طرف آئے میں اسی طرف منڈیر کے ساتھ دبکا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس طرف کیوں آئے تھے ان کو آگے یا پیچھے کی طرف آنا چاہیے تھا؟ مجھے ان میں سے ایک کی آواز سنائی دی۔

''اندر کیسے جائے گا؟''

دوسرے نے اس کے باپ کی دماغی حالت پر شبہ ظاہر کیا۔ ''پاگل کا بچہ اوپر چڑھ کر جائے گا یہ رسی کس لیے لایا ہے؟''

وہ بندوبست کرکے آئے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کسی قسم کا ہنگامہ ہو اور ہمیں یہاں سے بھاگنا پڑے۔ دوسرے میں مزید قتل وغارت گری کے موڈ میں نہیں تھا آج ویسے ہی چار افراد ہمارے ہاتھوں یا ہماری وجہ سے دنیا سے رخصت ہوچکے تھے اس لیے میں نے خاموش اور پُرامن حکمت عملی تیار کی اور ان میں سے پہلے کا انتظار کرنے لگا۔ باتوں سے وہ احمق لگ رہے تھے لیکن اپنے کام میں ماہر تھے۔ ان میں سے کسی نے سخت پلاسٹک کا بنا ہک جس سے رسی بندھی تھی گھما کر دیوار پر پھینکا اور وہ آکر منڈیر پر اٹک گیا۔ پلاسٹک کا ہونے کی وجہ سے ہک ہلکا بھی تھا اور آواز بھی زیادہ نہیں آئی تھی۔ رسی تنی اور ہک فکس ہوگیا۔ ان میں سے کوئی اوپر آرہا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر اس کا انتظار کرنے لگا یہ مشکل سے چار فٹ اونچی تھی۔

میں ہک کے بالکل پاس تھا۔ اوپر آنے والا تیز تیز سانس لے رہا تھا اور اس کی سانس نے میری رہنمائی کی۔ جیسے ہی وہ منڈیر سے نمودار ہوا میں نے کھڑے ہوکر ایک ہاتھ سے اسے گردن سے پکڑ کر آگے کھینچا اور دوسرے ہاتھ میں دبا پستول اس کی کن پٹی پر آزمایا۔ اسے آواز نکالنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ وہ جھول گیا اور اس سے پہلے کہ اس کی واپسی کا سفر شروع کرتا میں نے اسے چھت پر کھینچ لیا۔ وار نہایت سخت تھا اس لیے وہ سو فیصد بے ہوش ہوچکا تھا۔ اس کی ہلکی مشین گن اس کے شانے سے بندھی تھی اس لیے گرنے سے محفوظ رہی ورنہ اس کی آواز سن کر نیچے والا ہوشیار ہوجاتا۔ میں نے اسے ایک طرف لٹایا۔ اس کی مشین گن ٹنکی ٹاور کے اوپر رکھ دی۔ اب کوئی اسے آسانی سے تلاش نہیں کرسکتا تھا اور پھر منڈیر سے ہاتھ نکال کر ہش ہش کی آواز کے ساتھ دوسرے کو اوپر آنے کا اشارہ کیا۔

''خانہ خراب۔'' نیچے والے نے دبی زبان میں کہا۔ ''پہلے دیکھو اُدھر کوئی ہے تو نہیں۔''

میں نے دوبارہ ہاتھ اور زبان سے وہی اشارہ کیا۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا ورنہ فوراً پکڑا جاتا۔ بے ہوش ہونے والے کے پاس سے نسوار کی تیز بو آرہی تھی اسی وجہ سے ذرا کھانسی چڑھ کر اس کا سانس بے قابو ہوگیا تھا۔ رسی تنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو میں چوکس ہوگیا۔ دوسرا ابھی اوپر آرہا تھا۔ لیکن وہ زیادہ ہوشیار ثابت ہوا تھا۔ منڈیر کے پاس آکر اس نے بے ہوش نوجوان کو آواز دی۔ ''قسم خان .....اوہ خانہ خراب کدھر ہے۔''

قسم خان بے ہوش پڑا تھا اور اس کی بات کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ میں جواب بھی نہیں دے سکتا تھا اور وہ منڈیر کے دوسری طرف اور کسی قدر نیچے تھا میں اسے اوپر نہیں کھینچ سکتا تھا۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ اوپر آکر جھانکے تو میں اس کے ساتھ وہی سلوک کروں جو قسم خان کے ساتھ کیا تھا۔ مگر باس ہونے کی وجہ سے وہ قسم خان کے مقابلے میں زیادہ عقل رکھتا تھا یا شاید اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا کہ اوپر کچھ ہو چکا ہے اس لیے وہ منڈیر تک آنے سے ہچکچا رہا تھا۔ وہ دبی آواز میں قسم خان کو آواز دیتا رہا اور جب جواب نہیں ملا تو اس کا شبہ یقین میں بدل گیا تھا اور شاید اس نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ آواز سے ایسا لگ رہا تھا وہ واپس... جارہا ہے۔

لیکن اس سے پہلے میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر رسی ذرا اوپر کھینچی اور ہک نکال کر چھوڑ دیا۔ مکان سطح زمین سے کوئی پانچ فٹ بلند تھا۔ پھر اس کی پہلی منزل کی چھت بارہ فٹ سے زیادہ اونچی تھی اور اوپر چار فٹ کی منڈیر تھی یعنی وہ کم سے کم بیس فٹ کی بلندی سے گرا تھا۔ اس نے ایک دبی چیخ ماری اور گرنے کے بعد دوسری چیخ ذرا اونچی آواز میں ماری تھی۔ میں نیچے کی طرف بھاگا۔ نیچے جاتے ہوئے میں نے ٹنکی ٹاور کا دروازہ اندر سے بند کر دیا تاکہ قسم خان ہوش میں بھی آجائے تب بھی مکان کے اندر نہ آسکے۔ مکان سے باہر نکل کر کونے سے جھانکا تو وہ مجھے زمین پر پڑا کراہتا دکھائی دیا۔ اس کی ایک ٹانگ یقیناً ٹوٹ گئی تھی کیونکہ وہ کھڑا ہونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور دبی زبان میں مجھے بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ کتا اس کے پاس شرافت سے خاموش کھڑا تھا۔ اس کی شرافت کی وجہ اس کے منہ پر چڑھا چمڑے کا خول تھا۔ میں نے دیوار کی آڑ سے اسے للکارا۔

''خبردار.....ہلنا مت.....اپنی گن ایک طرف پھینک دو میں تین تک گنوں گا اور پھر تمہارے ساتھی کی طرح تمہیں بھی گولی مار دوں گا۔''

''میں گن پھینکتا ہے۔'' اس نے بوکھلا کر کہا اور جلدی [illegible] کتا اس کے بالکل پاس [illegible] کے پاس کوئی اور ہتھیار

ہے یا نہیں۔ مکان کا پہلو ہونے کی وجہ سے یہاں اتنی روشنی بھی نہیں تھی۔ میں نے پستول والا ہاتھ سیدھا کیا اور محتاط انداز میں آگے بڑھا۔ میری توجہ کتے کی طرف نہیں تھی کیونکہ اس نے میری آواز سن کر بھی کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا اس کا مطلب تھا وہ صرف سونگھنے والا کتا تھا حملہ کرنے اور لڑنے والا نہیں تھا۔ لیکن میری یہ خوش فہمی فوراً ہی دور ہوگئی۔ فتح خان کا ساتھی مکاری میں اس سے کم نہیں تھا اس نے چپکے سے کتے کے منہ پر چڑھا چمڑے کا خول اُتار دیا تھا۔ اچانک اس نے چلّا کر کہا۔

''بش دیکھ لے۔''

اس پر بش بالکل صدر بش کی طرح غراتا ہوا میری طرف لپکا۔ میں کوئی دس قدم کے فاصلے پر تھا۔ وہ اتنی تیزی سے آیا کہ مجھے گولی چلانے کا موقع ہی نہیں ملا اور اس نے دور سے چھلانگ لگائی، وہ میرے سینے سے ٹکرایا اور مجھے لیتا ہوا نیچے گرا بلکہ میں گرا وہ تو میرے اوپر تھا۔ اس کے بھیانک جبڑے میری گردن دبوچنے کے لیے بے تاب تھے۔ لیکن اس سے پہلے وہ میری گردن دبوچتا میں نے اضطراری طور پر اس کی گردن دبوچ لی۔ پستول میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ مجھے اعتراف ہے اور میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ مجھے دنیا میں کسی جاندار سے اتنا خوف نہیں آتا جتنا کتے سے آتا ہے۔ اس کی جگہ کوئی انسان مجھ پر حملہ کرتا تو میں نہایت آسانی سے اسے قابو کر چکا ہوتا۔ کتا زیادہ بڑا نہیں تھا اور شاید یہ گرے ہاؤنڈ کی کوئی نسل تھا لیکن وہ طاقت ور بہت تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ کسی طرح مجھے کاٹ لے اور اس کے پنجے میرے سینے کو کھرچنے کی کوشش کر رہے تھے اگر میں نے مضبوط پیراشوٹ اور فوم کی بنی جیکٹ نہ پہن رکھی ہوتی تو اس کے پنجے یقیناً میرا سینہ اُدھیڑ کر رکھ دیتے۔ میرا آزاد ہاتھ زمین پر پستول ٹٹول رہا تھا پستول تو نہیں ملا لیکن ایک بڑا اور مناسب قسم کا پتھر ہاتھ آگیا اور میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پوری قوت سے کتے کے سر پر مارا۔ اس کی بھیانک جارحانہ غراہٹیں اچانک ہی فریادی کوں کوں میں بدل گئیں اور میں نے اسے اس کے مالک کی طرف اچھال دیا۔ کتا بروقت اس پر گرا کیونکہ اس نے رینگ رینگ کر شاٹ گن تک رسائی حاصل کر لی تھی۔

دماغ پر ضرب نے کتے کے حواس خمسہ اور سوچنے کی صلاحیت کو متاثر کیا تھا اس لیے اس نے زخمی پر گرتے ہی منہ مارا اور اس کا بازو پکڑ لیا۔ اس پر وہ چلّایا۔ ''اوہ خانہ خراب یہ

میں ہے۔''

لیکن خانہ خراب کے حواس درست ہوتے تو وہ اسے کاٹتا ہی کیوں؟ کتے نے اسے پہچاننے سے انکار کرتے ہوئے باقاعدہ بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔ میں اُٹھ کر اپنا پستول تلاش کر رہا تھا جو بالآخر دیوار کے ساتھ پڑا مل گیا۔ میں نے پستول ملتے ہی سب سے پہلے کتے کا کام تمام کیا۔ سائلنسر کی وجہ سے بس ہلکی سی ٹھک کی آواز آئی اور کتا بے جان ہو کر اپنے مالک پر لڑھک گیا۔ میں نے اس کے سر میں گولی ماری تھی۔ وہ فوراً مر گیا تھا۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

''اب حرکت مت کرنا ورنہ تمہیں بھی کتے کی طرح جہنم رسید کر دوں گا۔''

اس نے کتے کے انجام سے سبق حاصل کیا اور بالکل ساکت ہوگیا۔ میں نے اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس ..... نہ تو کوئی ہتھیار تھا اور نہ ہی کوئی اور چیز تھی صرف گاڑی کی چابیاں نکلی تھیں۔ مجھے تعجب ہوا۔ ''تمہارے پاس موبائل فون نہیں ہے؟''

''وہ گاڑی میں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''خانہ خراب کا بیل بجتا ہے اسے بند نہیں کیا جاسکتا۔''

نہایت سنگین ماحول میں بھی مجھے ہنسی آگئی۔ وہ خراب موبائل لیے گھوم رہا تھا اور اسی وجہ سے بروقت فتح خان کو اطلاع نہیں کر سکا۔ میں نے کہا۔ ''فتح خان کے پاس کیا صرف تم جیسے احمق رہ گئے ہیں کام لینے کے لیے؟''

اس نے بُرا منایا۔ ''ہم احمق نہیں ہے فتح خان کا کزن ہے۔''

اس کا انداز ایسا تھا جیسے فتح خان کا کزن ہونے کی حیثیت سے اس کا احمق ہونا ممکن نہیں ہے۔ ایاز اور بیتو ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ میں نے اس کی شاٹ گن اُٹھائی اور اسے کھڑے ہونے کو کہا۔ وہ بولا۔ ''ہمارا ٹانگ ٹوٹ گیا ہے۔''

''تب زمین پر رینگ کر چلو۔'' میں نے حکم دیا۔ ''اگر اپنے کتے کی طرح مرنا نہیں چاہتے ہو۔''

بادل نخواستہ وہ کوشش کر کے کھڑا ہوگیا۔ نیچے گرتے ہوئے اس کے بائیں پاؤں میں چوٹ آئی تھی۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر آگے بڑھنے لگا۔ مکان کے سامنے لا کر میں نے اسے رُکنے کا حکم دیا اور اسے نظروں میں رکھتے ہوئے اس کی گاڑی کی تلاشی لی۔ اندر ایک عدد رائفل مزید تھی اس کے علاوہ ڈیش بورڈ پر ایک موبائل موجود تھا میں نے موبائل

اعتراف

ایک بدمزاج افسر نے قدرے معذرت خواہانہ لہجے میں اپنے ماتحت سے کہا۔

''حامد میاں! میں اکثر بلاوجہ تمہیں ڈانٹتا رہتا ہوں مگر جواب میں تم ہمیشہ مسکرا کر معذرت کر لیتے ہو یا اپنی کوئی ایسی غلطی تسلیم کر لیتے ہو جو تم نے کی نہیں ہوتی۔ آج میں یہ بات سمجھنے پر مجبور ہوگیا ہوں کہ مجھے ایسا رویہ نہیں اپنانا چاہیے۔''

باس کی بات سن کر حامد میاں کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ جلدی سے بولے۔ ''سر! میرے والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ حسن سلوک سے کمینے سے کمینہ انسان بھی موم ہو جاتا ہے، واقعی انہوں نے سچ کہا تھا۔''

کمینے سے امید خان کی بزلہ سنجی

جیب میں رکھ لیا یقیناً اس میں مجھے کام کی کئی چیزیں ملتیں۔ رائفل کو میں نے نہیں چھیڑا تھا۔ زخمی مکان کے سامنے کیاری سے ٹکا بیٹھا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''شہباز خان۔'' اس نے جواب دیا تو میں حیران ہوا۔ وہ میرا ہم نام تھا۔ وہ فتح خان کا کزن تھا اور شاید اسی وجہ سے فتح خان اکثر مجھے شہباز خان کہہ جاتا تھا جس سے میں چڑتا تھا۔

''شہباز خان تھوڑی ہمت کرو اور اندر چلو۔'' میں نے کہا۔ اسی لمحے دور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکیں اور وہ بہت تیزی سے ہماری طرف آرہی تھی۔ ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لیے میں گیٹ کے پلر کی آڑ میں ہوگیا۔ لیکن وہ ایاز کی جیپ ثابت ہوئی تھی۔ ایاز اور بیتو باہر آئے۔ انہوں نے شہباز خان کا معائنہ کیا اور بیتو بولا۔ ''شوبی بھائی نہ جانے کیوں یہ ہم کو فتح خان جیسا منحوس لگ رہا ہے؟''

''کیونکہ یہ فتح خان کا کزن ہے۔'' میں نے انکشاف کیا اور تعارف کرایا۔ ''جناب شہباز خان.....مکان میں گھسنے کی کوشش میں ایک ٹانگ تڑوا بیٹھے ہیں۔ ایسا ہی ایک دوسرا نمونہ اوپر بے ہوش پڑا ہے۔''

اس تعارف پر شہباز خان خون کے گھونٹ پی کر خاموش تھا۔ ہم اسے اندر لائے اور فی الحال ڈرائنگ روم والے حصے میں بٹھایا۔ بیتو کو اس کی نگرانی پر لگا کر میں اور ایاز اوپر سے بے ہوش قسم خان کو لائے۔ اسے بھی ڈرائنگ روم میں ڈال کر میں نے ایاز سے کہا کہ ان کی گاڑی آس پاس کسی ایسی جگہ چھوڑ دے جہاں سے وہ فوری طور پر کسی کی نظر میں نہ آئے۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ لوگ کس طرح ہمارا سراغ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگانے یہاں تک آئے ہیں۔ کتے کا سن کر وہ فکر مند ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔

"کیا آپ کو یقین ہے صرف یہی لوگ ہیں؟"

"یہ تو ابھی تفتیش کریں گے تو پتا چل جائے گا۔ اس کتے کا بھی بندوبست کرنا ہے بلکہ ایسا کرتے ہیں اسے گاڑی میں ہی ڈال دیتے ہیں۔"

"میں یہ کام کر لیتا ہوں آپ ان دونوں سے پوچھ گچھ کریں۔" اس نے کہا اور باہر چلا گیا۔ میں ڈرائنگ روم والے حصے میں آیا جہاں شہباز خان اپنے سوج جانے والے پاؤں کا معائنہ کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہارے ساتھ اور کتنے لوگ ہیں؟"

"بس ہم دو ہی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "فتح خان نے ہمیں ایک عورت کو تلاش کرنے کا کام دیا تھا۔"

"تم کتے کی مدد سے اسے تلاش کر رہے تھے۔ اس عورت کا ایڈریس کہاں سے آیا؟"

"فتح خان نے دیا تھا۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"کتا کس کا ہے؟"

"قسم خان کا۔" وہ بولا۔ "فتح خان نے ہم سے کہا کتے کی مدد سے ایک عورت کو تلاش کرنا ہے۔ روز کے دو ہزار روپے دے گا اور اگر عورت مل گیا تو ایک لاکھ روپے دے گا۔"

اس کی بات سے ظاہر تھا کہ وہ فتح خان کے خاص آدمی نہیں تھے بلکہ معاوضے پر اس کے لیے کام کر رہے تھے۔ "کب سے تلاش کر رہے ہو؟"

"دو دن سے۔" اس نے جواب دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ تعاون کر رہا تھا اور اس نے ابھی تک جھوٹ بولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ فتح خان نے تمہارے پیچھے اپنے آدمی لگا دیے ہوں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اسے ضرورت نہیں ہے وہ ہم پر اعتماد کرتا ہے۔"

فتح خان اپنے باپ پر اعتبار کرنے والا شخص نہیں تھا' لیکن اس کا کزن اس پر یقین رکھتا تھا۔ میں نے بیتو سے کہا۔ "تم چھت پر جاؤ اور آس پاس نظر رکھو۔"

اگرچہ کیمرے لگے تھے' لیکن وہ صرف سامنے اور عقب کا منظر دکھاتے تھے۔ بیتو کے جانے کے بعد میں نے شہباز خان سے اگلا سوال کیا۔ "فتح خان کہاں ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" اس نے جواب دیا۔ "دو دن پہلے اس نے مجھے فون کیا تھا اور کام کے لیے ایک ہوٹل بلایا۔" اس نے ایک جگہ کا نام لیا جہاں ماضی میں افغان مہاجرین بستے تھے اب یہ بستی ختم کی جا چکی تھی۔ اس کی جگہ پکی آبادی بن گئی تھی جس میں زیادہ تر جرائم پیشہ رہتے تھے۔ شہباز خان اور اس کا ساتھی قسم خان اسی بستی میں رہائش پذیر تھے اور فتح خان نے اسی بستی کے ہوٹل میں ان سے ملاقات کی تھی۔ اس نے ان کو کام سونپا اور پیشگی دس ہزار روپے دیے تھے۔ اس نے کہا تھا وہ پانچ دن میں عورت کو تلاش کر لیں تو وہ انہیں ایک لاکھ روپے دے گا اور اگر وہ ناکام رہے تو پھر کسی اور سے یہ کام لے گا۔ اسے قسم خان کے کتے کے بارے میں معلوم تھا اس نے شہلا کا استعمال شدہ بلاؤز ان کے حوالے کیا تھا۔ تاکہ کتے کو سونگھا کر اس کی مدد سے شہلا کو تلاش کر سکیں۔

میرا اندازہ درست نکلا تھا فتح خان سکون سے بیٹھنے والی چیز نہیں تھا۔ وہ مجھے تلاش کر رہا تھا۔ فتح خان نہایت مستقل مزاج آدمی تھا اور جس کام کے پیچھے پڑ جائے وہ کر کے رہتا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ میری مدد سے برٹ شا سے ہیرے نکلوا سکتا ہے۔ کیونکہ میں برٹ شا کی بیٹی ایمن شا کو پاکستان بلوا سکتا تھا اور مجھے اس کام پر آمادہ کرنے کے لیے وہ میرے کسی ساتھی کو قابو کرنے کی فکر میں تھا' اس کی وجہ سے میں نے مونا اور سعدیہ کو عبیداللہ والی کوٹھی میں رکھنا مناسب سمجھا تھا وہ وہاں زیادہ محفوظ تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"اگر تم اس عورت کو تلاش کر لیتے تو فتح خان کو اطلاع کس طرح دیتے؟"

"اس کا نمبر میرے پاس ہے۔" شہباز خان نے نمبر بتایا۔ میں نے اس کے موبائل میں بتایا ہوا نمبر دیکھا وہ ایک کے نام سے محفوظ تھا۔ یعنی شہباز خان نے فتح خان کا نام نہیں لکھا تھا۔ میں نے اسی موبائل سے فتح خان کا نمبر ملایا۔ اس نے دوسری بیل پر کال ریسیو کی اور غنودہ آواز میں بولا۔ "شہباز خانا کیا بات ہے؟"

"فتح خان اس عورت کا سراغ مل گیا ہے۔" میں نے کہا تو اس کی نیند اڑ گئی تھی میری آواز شہباز خان سے بالکل مختلف ہے اور فتح خان اسے اچھی طرح پہچانتا ہے اس نے بے یقینی سے کہا۔

"شہباز تم... شہباز خان کہاں ہے؟"

"وہ میرے پاس ہے۔" میں نے کہا۔ "فتح خان تم اپنے وعدے پر قائم نہیں رہے۔"

"کون سے وعدے پر؟"

"یہی کہ تمہاری طرف سے دشمنی ختم ہو گئی ہے۔"

"میں قائم ہوں۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ "میرے آدمی تمہیں نہیں بلکہ شہلا کو تلاش کر رہے تھے۔"

"بکواس مت کرو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ شہلا میرے پاس ہے اور شہلا تمہارے لیے بیکار چیز ہے' تم اور تمہارے ساتھی اسے اچھی طرح استعمال کر چکے ہیں۔ بہرحال تمہاری نیت کی خرابی کی سزا قدرت نے تمہیں پہلے ہی دے دی ہے۔ تمہارا جو آدمی میرے پاس قید تھا اسے میں نے شہلا کے ساتھ رکھا تھا اور اس نے اپنی ذہنی گندگی کر شہلا کو اتنا مشتعل کیا کہ اس نے تمہارے آدمی کا گلا دبا دیا۔ اس کی لاش تمہیں جلد مل جائے گی۔"

یہ سن کر فتح خان کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "شہباز خان یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔"

"یہ میں نے نہیں شہلا نے اچھا نہیں کیا ہے اور میں بھی اب اچھا نہیں کروں گا۔ فتح خان میں نے تمہیں بہت نظر انداز کر دیا اسی وجہ سے تمہارے حوصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔"

وہ فکر مند ہو گیا۔ "کیا کرو گے تم؟"

"تمہارے ان ساتھیوں کو ان کے اسلحے اور گاڑی سمیت پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ میرا خیال ہے ان پر دہشت گردی کے حوالے سے مقدمہ بنے گا اور ممکن ہے کوئی خفیہ ایجنسی انہیں اپنی تحویل میں لے کر تفتیش شروع کر دے، تم جانتے ہو وہ ایسی تفتیش کریں گے کہ ان کو چھٹی کے دودھ سمیت سب یاد آ جائے گا۔"

یہ سن کر فتح خان کے حواس ٹھکانے پر آ گئے اور اس نے فوراً مفاہمانہ لہجہ اختیار کیا۔ "شہباز خان یہ ہماری آپس کی بات ہے۔ پولیس تک لے جانے میں تمہیں بھی نقصان ہوگا۔"

"میں تم سے اتنا تنگ آ گیا ہوں کہ پولیس کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔" میں نے کہا اور موبائل بند کر دیا۔ احتیاطاً میں نے اس کی بھی سم نکال لی تھی۔ میں نے شہباز خان کی طرف دیکھا۔ "تم نے سن لیا ہوگا فتح خان کو تمہاری بھی پروا نہیں۔"

اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "ہم اس کے لیے کام کرتا ہے اگر ہم کامیاب ہو جاتا تو ایک لاکھ ملتا' اب پکڑا گیا ہے تو اس کا ذمہ نہیں ہے۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا وہ سچ مچ اس کا کزن تھا۔ اسے گالیاں دینے کے بجائے اس کی حمایت کر رہا تھا۔ "تم نے میرا ارادہ بھی سن لیا ہوگا۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

وہ چالاک تھا اس نے فوراً نقطہ اٹھایا۔ "اس صورت میں ہم پولیس کو اس جگہ کے بارے میں بتا دے گا۔"

"اگر چھوڑا تو فتح خان کو بتا دو گے۔ اور اس ٹھکانے کی کوئی بات نہیں ہے ایسے کئی ٹھکانے ہمارے پاس ہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "تم اپنی خیر مناؤ' تمہیں اسلحے سمیت پولیس کے حوالے کیا تو وہ تم پر کس قسم کے کیس بنائے گی تم جانتے ہو؟"

اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ "کوئی اور راستہ نہیں ہے؟"

"ہے اگر تم مجھے فتح خان کے بارے میں کوئی ایسی بات بتاؤ جو میرے کام آ سکے تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا' دوسری صورت میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

اس دوران میں قسم خان کسمسانے لگا تھا۔ ایاز واپس آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں گاڑی پاس ہی گھنی جھاڑیوں میں چھوڑ آیا ہوں۔"

میں اتنی دیر میں سوچ چکا تھا فی الحال ان کو اپنے پاس رکھنا تھا۔ میں نے ایاز سے کہا۔ "ان دونوں کو شہلا والے کمرے میں قید کرنا ہے۔"

"شہلا کہاں جائے گی؟"

"اسے شاہین والے کمرے میں منتقل کر دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

ایاز ہچکچایا۔ "کیا یہ ٹھیک ہوگا؟ اس کمرے کو باہر سے بند نہیں کیا جا سکتا۔"

"ہم نگرانی کرتے رہیں گے۔ ان لوگوں کا کوئی بندوبست ہو جائے تو شہلا کو پھر واپس اسی کمرے میں بند کر دیں گے۔"

ایاز مطمئن نہیں تھا لیکن پھر اس نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے شاہین کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے اندر سے سہمے لہجے میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

"شاہین میں ہوں۔" میں نے نرمی سے کہا تو اس نے دروازہ کھول دیا اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے معذرت کی۔ "تمہیں پریشان کیا لیکن تمہارے کمرے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک خاتون رہے گی۔ اصل میں کچھ لوگ اور آ گئے ہیں اور جگہ کم پڑ گئی ہے۔''

''کوئی بات نہیں ویسے یہ آپ کا گھر ہے۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''آپ پوچھ کر مجھے شرمندہ مت کریں۔''

''تمہارا شکریہ بابا'' میں نے کہا اور شہلا والے کمرے میں آیا۔ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ شاید اس نے بھی باہر ہونے والی سرگرمیوں کو سن لیا تھا۔

''کیا بات ہے کوئی مسئلہ ہوا ہے؟''

''فتح خان کے دو گرگے تمہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آ گئے اور پکڑے گئے۔''

''مجھے تلاش کرتے ہوئے؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''انہیں کیسے پتا کہ میں یہاں ہوں؟''

''ان کے پاس تمہارا استعمال شدہ بلاؤز تھا اور وہ ایک کتے کو سونگھا کر اس کی رہنمائی میں یہاں تک آئے ہیں۔''

وہ پریشان ہو گئی۔ ''صرف وہی نہیں ہوں گے بلکہ ان کے پیچھے فتح خان کے اور آدمی بھی ہوں گے۔''

''اس کا امکان ہے اور میرے ساتھی اس کا جائزہ لے رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''فی الحال میں تمہیں دوسرے کمرے میں لے جانے آیا ہوں۔''

''کیوں؟''

''یہاں فتح خان کے آدمیوں کو رکھنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اپنا بستر اٹھاؤ اور چلو یہاں سے۔''

وہ بادل ناخواستہ میرے ساتھ دوسرے کمرے میں آئی۔ شاہین کو دیکھ کر اس نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا۔ ''کیا یہ بھی قیدی ہے؟''

''نہیں ورنہ میں اسے تمہارے کمرے میں لاتا۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''ویسے اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

میں باہر آیا۔ بیتو اور ایاز قسم خان اور شہباز خان کو شہلا والے کمرے میں لا رہے تھے۔ قسم خان ہوش میں آ گیا تھا اور دکھی نظر آ رہا تھا۔ شاید اسے اپنے مرحوم کتے کا پتا چل گیا تھا۔ شہباز خان کی حالت بہتر تھی۔ اس کی ٹانگ ٹوٹی نہیں تھی کیونکہ وہ لنگڑا کر سہی لیکن اپنے پیروں پر چل رہا تھا۔ ان دونوں کو کمرے میں بند کر کے ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ بیتو نے بتایا کہ اس نے نائٹ ویژن دوربین سے چاروں طرف دیکھا ہے لیکن اسے نہ تو کوئی گاڑی نظر آئی ہے اور نہ ہی کوئی آدمی گھر سے باہر دکھائی دیا تھا۔ میں نے بیتو سے کہا۔ ''تم سو جاؤ میں اور ایاز باری باری جاگتے رہیں گے۔''

''نہیں آپ سو جاؤ میں اور ایاز بھائی باری باری جاگے گا۔'' اس نے انکار کر دیا۔ انہوں نے اصرار کیا تو میں مان گیا۔ ویسے بھی گزشتہ دو راتوں سے میں ٹھیک طرح سے نہیں سویا تھا۔ میں نے ڈرائنگ روم میں اپنا بستر لگایا۔ رات خاصی ہو گئی تھی اور میں تھک گیا تھا اس لیے لیٹتے ہی سو گیا۔ کوئی دو گھنٹے بعد ہی بیتو نے بدحواسی میں مجھے جگا دیا۔

''شوبی اٹھ جاؤ باہر کچھ لوگ ہے۔''

میں اٹھ گیا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''باہر دو گاڑی آ کر رکا ہے اور اس سے لوگ اتر کر مکان کے گرد گھیرا ڈال رہا ہے۔ ایاز بھائی اوپر ہے۔''

میں اسے نیچے رکنے کا کہہ کر جوتے اور جیکٹ پہنے اور چھت پر آیا۔ ایاز نائٹ ویژن استعمال کر رہا تھا اور اسی وجہ سے وہ لوگ نظر میں آ گئے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''دو گاڑیوں میں کم سے کم ایک درجن افراد ہیں اور سب مسلح ہیں۔''

میں فکر مند ہو گیا۔ فتح خان کے آدمی پکڑنے کے باوجود میں نے سستی دکھائی تھی۔ حالانکہ اسی وقت ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ بہر حال اب تو تاخیر ہو گئی تھی۔ اگر یہ فتح خان کے آدمی تھے تو امکان تھا کہ وہ خود بھی ساتھ ہو گا اور اس کے ہوتے ہوئے بچ نکلنے کا امکان کم تھا۔ میں نے ایاز سے کہا۔ ''نیچے جا کر اسلحے میں سے سائلنسر والی دو مارر رائفلیں نکال لاؤ۔''

وہ نیچے چلا گیا۔ میں نے اس سے دوربین لے لی تھی اور ساتھ ہی موبائل نکال لیا۔ میں نے دوربین سے آنے والوں کا معائنہ کیا۔ وہ پانچ اطراف میں تھے اور ہر جگہ کم سے کم دو افراد تھے۔ نائٹ ویژن میں ان کے پاس موجود خود کار اسلحہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سب محاورے کے مطابق دانتوں تک مسلح تھے۔ سامنے والی طرف دو جگہوں پر پانچ افراد تھے۔ دو، دو دائیں اور بائیں تھے جبکہ تین افراد پیچھے کی طرف تھے۔ گاڑیاں جو ڈبل کیبن والی پک اپ تھیں دائیں اور عقبی سمت میں کھڑی کی تھیں۔ مجھے ان کے عزائم میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ میں نے عبداللہ کو کال کی۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے اور وہ یقیناً سو رہا تھا۔ تیسری بیل پر اس نے کال ریسیو کی۔

''عبداللہ ایمرجنسی ہے۔'' میں نے بلا تمہید کہا۔ ''ایک

درجن مسلح ترین افراد نے ہمارے ٹھکانے کو گھیر لیا ہے اور امکان ہے وہ فتح خان کے آدمی ہیں۔ وہ دو گاڑیوں میں آئے ہیں اور اس وقت مکان کے چاروں طرف موجود ہیں۔''

عبداللہ نے سیکنڈ میں صورتِ حال کو سمجھ لیا تھا اس نے کہا۔ ''میں بیس منٹ میں آ رہا ہوں اس وقت تک آپ تصادم ٹالنے کی کوشش کریں یا حملے کی صورت میں مدافعت کریں۔''

میں نے موبائل رکھ کر دوربین سے ایک بار پھر ان لوگوں کا جائزہ لیا۔ وہ فی الحال آگے نہیں آ رہے تھے شاید انہیں کسی اشارے کا انتظار تھا۔ سردی شدت کی تھی اور کسی قدر دھند بھی تھی اس لیے مجھے اطمینان تھا وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے جبکہ میں انہیں واضح دیکھ سکتا تھا۔ ان میں سے کسی نے نائٹ ویژن عینک نہیں لی تھی ورنہ مجھے نظر آ جاتا۔ وسیم جو اسلحہ لایا تھا اس میں جدید ترین دور مار سائلنسر لگی رائفلیں بھی تھیں۔ ان کی مار ہزار گز سے زیادہ تھی لیکن ان کے فائر کی آواز چند گز سے زیادہ دور نہیں جاتی تھی۔ ان پر نائٹ ویژن دوربین نصب تھی۔ ایاز رائفلوں سمیت لوٹ آیا وہ اپنا موبائل اور ہینڈ فری بھی لے آیا تھا۔ میں نے فوری طور پر کانفرنس کال ملائی۔ اب ہم سب ایک دوسرے سے رابطے میں تھے۔ بیتو اور ایاز کے ساتھ عبداللہ بھی اس کانفرنس کال میں شامل تھا۔ میں نے رائفل چیک کرتے ہوئے ایاز سے پوچھا۔

''بیتو کہاں ہے اس کی ضرورت بھی ہے؟''

''میں اسے نیچے چھوڑ آیا ہوں آپ کہتے ہیں تو لے آتا ہوں۔''

بیتو کی واقعی ضرورت تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ شہلا جس کمرے میں تھی وہ باہر سے بند نہیں ہو سکتا تھا اور اسے احساس ہو جاتا کہ باہر کوئی نگرانی نہیں کر رہا ہے تو وہ فرار ہونے کی کوشش بھی کر سکتی تھی۔ میں نے مسئلے کا حل سوچا اور بیتو سے کہا۔ ''شہلا کو آدمیوں والے کمرے میں ڈال کر اوپر آ جاؤ یہاں تمہاری ضرورت ہے۔''

عبداللہ روانہ ہوتے ہوئے ہمارے گفتگو سن رہا تھا میں نے اپنے آدمیوں کو احکامات دیتے سنا۔ بیتو شہلا کو دوسرے کمرے میں بند کر کے اوپر آ گیا تھا۔ وہ شہلا کی بدزبانی پر خفا تھا اور اسے دبے لفظوں میں بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''شوبی ہم نے آج اتنا گندہ زبان والا عورت نہیں دیکھا ہے۔''

''ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔'' ایاز بولا۔

''فکر نہ کرو برخوردار میر۔ ساتھ رہو گے تو یقیناً شہلا سے بھی آگے کی کوئی چیز دیکھ لو گے۔''

ہم مزے سے خوش گپیاں کر رہے تھے لیکن ساتھ ہی چاروں طرف دشمن پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے اور ہماری گفتگو کانفرنس کال کے ذریعے جاری تھی۔ دشمن ہمیں گھیر چکے تھے لیکن خوش قسمتی سے ابھی تک انہوں نے حملہ نہیں کیا تھا ورنہ ہم مشکل میں پڑ جاتے۔ بے شک ہم مورچہ بند اور دفاعی نقطہ نظر سے بہتر پوزیشن میں تھے لیکن درجن بھر مسلح افراد کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ بے شک ہم تین تھے اور ان کو اتنی آسانی سے اندر آنے نہیں دیتے۔ لیکن ایک بار لڑائی چھڑ جائے تو اس میں کون جیتا رہے گا اور کون مارا جائے گا یہ کہنا مشکل ہے۔ بیتو نے پوچھا۔ ''شوبی کیا کرنا ہے؟''

''اگر یہ حملہ کریں تو سامنے موجود ہر فرد کو اُڑا دینا۔'' میں نے کہا۔ ''اگر ان کو موقع مل گیا تو یہ ہمیں نہیں بخشیں گے لیکن صرف روکنا ہو تو زخمی کرنے پر اکتفا کرنا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے جناب!'' ایاز نے تائید کی۔ ''ان کے عزائم قاتلانہ لگ رہے ہیں۔''

میں سامنے والے حصے میں آ گیا اور بیتو عقب میں چلا گیا۔ ایاز باری باری دائیں اور بائیں نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ فتح خان نے اس جگہ کو کیسے تلاش کر لیا۔ کیا اس کے پاس کوئی دوسرا کتا بھی تھا جو شہلا کی بو پر اسے یہاں تک لے آیا ہو لیکن ان لوگوں کے ساتھ کسی کتے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اگر انہوں نے کسی اور طریقے سے اس جگہ کا پتا چلایا تھا تو فی الحال وہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ ممکن شہباز اور قسم خان کو علم نہ ہو اور فتح خان کا کوئی آدمی ان کی نگرانی کر رہا ہو۔ عبداللہ کو کال کیے ہوئے پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''تم کہاں ہو؟''

''ہم راستے میں ہیں دس سے بارہ منٹ لگیں گے۔'' اس نے بتایا۔ ''گھیرنے والوں نے کوئی حرکت کی ہے؟''

''ان کی طرف سے ابھی تک کوئی سرگرمی دیکھنے میں نہیں آئی ہے۔'' میں نے کہا اور اسی لمحے سامنے والی سمت سے دو افراد مکان کی طرف بڑھے۔ میں نے تیزی سے رائفل سنبھال لی۔ ''وہ حرکت میں آ گئے ہیں۔''

''آپ ان کو روکیں۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''ان کا نزدیک آنا خطرناک ہو سکتا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عبداللہ درست کہہ رہا تھا، وہ پاس آجاتے تو ان کو دور کرنا یا روکنا مشکل ہو جاتا۔ میں نے سب سے آگے آنے والے شخص کے پاؤں کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ رائفل سے ہلکی سی آواز نکلی اور وہ شخص گر گیا۔ اس کا ساتھی پلٹ کر واپس بھاگا لیکن میں نے اسے بھی مار گرایا۔ اسے بھی ران میں گولی لگی تھی۔ اب وہ زمین پر پڑے کراہ رہے تھے۔ انہوں نے زخمی ہونے کے باوجود اپنی آواز بلند نہیں کی تھی۔ صرف وہی نہیں بلکہ ان کے ساتھیوں نے چاروں طرف سے مکان پر ہلہ بول دیا تھا۔ کیونکہ اسی لمحے بیتو اور ایاز کی طرف سے بھی کارروائی ہوئی تھی اور اس بار گولیاں کھانے والے چیخے چلائے تھے ان میں سے ایک کی چیخ میں موت کا کرب رچا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی چاروں طرف سے مکان پر گولیوں کا مینہ برسنے لگا تھا۔ کم سے کم نصف درجن خود کار ہتھیار آگ برسا رہے تھے۔ ہم نیچے ہو گئے تھے اور گولیاں آکر منڈیر کا پلاسٹر اڑا رہی تھیں۔ میں نے ایاز سے پوچھا۔

''میں نے ایک کو مار گرایا ہے۔ اس کے گھٹنے میں گولی لگی ہے۔''

''ہم نے ایک کا سر اُڑا دیا ہے۔'' بیتو بولا۔

''بلا وجہ مارنے سے گریز کرو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

حملہ آور بوکھلا کر پورا میگزین خالی کرنے پر تل گئے تھے اور جیسے ہی سامنے موجود واحد فرد کی رائفل کا میگزین خالی ہوا میں نے منڈیر سے اُٹھ کر اس کا نشانہ لیا۔ وہ میگزین بدل رہا تھا۔ عجلت میں گولی اس کے پیٹ کے نچلے حصے میں لگی تھی اور وہ بنا آواز نکالے منہ کے بل گر گیا۔ اس دوران میں ایاز نے بھی مزید ایک اور دشمن کو نشانہ بنایا تھا۔ عبداللہ نے مار دھاڑ کی آوازیں سن لی تھیں اس نے کہا۔

''ہم کالونی کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ آپ سب ٹھیک ہیں؟''

''ہم ٹھیک ہیں لیکن دشمن کے کوئی چھ افراد ناکارہ ہو گئے ہیں ایک مارا گیا ہے۔ تمہارے ساتھ کتنے آدمی آرہے ہیں؟''

''میرے ساتھ پانچ آدمی ہیں۔''

ایاز پیچھے کا حصہ کور کر رہا تھا اچانک وہ چلایا۔ ''شہباز ..... ہوشیار وہ راکٹ مار رہے ہیں۔''

یہ سنتے ہی میں اور بیتو غیر ارادی طور پر نیچے گر گئے تھے۔ ایاز نے بھی پیچھے کی طرف چھلانگ لگائی اور چھت کے وسط میں آگرا۔ اسی لمحے دھماکا ہوا اور میں نے مکان کے عقبی حصے میں آگ کے ساتھ گرد و غبار کا فوارہ بلند ہوتے دیکھا۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ قیدیوں اور شاہین کے ساتھ ہمارا سارا اسلحہ اور گولہ بارود بھی اسی حصے میں تھا۔ وہ نشانہ بری جاتا تو اس مکان کی جگہ صرف ایک گڑھا رہ جاتا اور ہمارے پرزے بھی نہ ملتے۔ چند لمحے کے لیے چھت بُری طرح لرزتی رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ اب تب میں گر جائے گی لیکن خیریت رہی۔ راکٹ نے نہ تو چھت گرائی اور نہ ہی گولہ بارود کو نقصان ہوا تھا۔ لیکن ایک اور راکٹ آکر لگتا تو یقیناً مکان ملبے کا ڈھیر بن جاتا۔ میں نے چلّا کر ایاز اور بیتو کی خیریت پوچھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔''

''ہم بھی ٹھیک ہے۔'' بیتو بولا۔

''ان کو شوٹ کر دو۔'' میں نے کہا اور رینگتا ہوا عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ منڈیر اُڑ گئی تھی اور اب کھڑے ہونے کا مطلب فوت ہونا تھا کیونکہ فائر مستقل آرہا تھا۔ فضا میں ابھی تک گرد و غبار تھا لیکن نائٹ ویژن کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ گرد اور دھند کے پار بھی دکھائی دیتا ہے کیونکہ انفرا ریڈ کی لہریں دھند اور غبار سے بھی گزر جاتی ہیں۔ عقب میں موجود گاڑی کے عقب میں دشمن کے کم سے کم دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک راکٹ لانچر نما چیز اُٹھائے ہوئے تھا اور اس میں دوسرا راکٹ فٹ کر رہا تھا۔ وہ اپنا کام تقریباً مکمل کر چکا تھا اور اسے مہلت دینا خود کشی بھی ہو سکتی تھی اس لیے میں نے اس کے سینے کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ اب یہ قسمت تھی جس نے ہمارا ساتھ دیا۔ گولی اتفاق سے راکٹ پر جا لگی اور جو راکٹ مکان پر فائر کیا جانے والا تھا وہ لانچر میں ہی پھٹ گیا۔ تیز روشنی ہوئی تو میں نے جلدی سے دوربین آنکھ سے ہٹا لی کیونکہ انفرا ریڈ معمولی روشنی کو بھی تیز چمک کے ساتھ دکھاتی۔ سامنے آگ کا گولہ نمودار ہوا جس میں انسانی جسموں اور گاڑی کے ٹکڑے بھی شامل تھے۔

عبداللہ مسلسل ہماری خیریت پوچھ رہا تھا۔ میں جھنجلا گیا۔ ''ہم ٹھیک ہیں یار تم اپنی توجہ یہاں پہنچنے پر لگاؤ۔ ابھی ان سے پیچھا چھڑا کر ہمیں یہاں سے نکلنا بھی ہے۔''

''ہم پہنچ رہے ہیں۔'' عبداللہ نے کہا۔

گاڑی کے عقب میں موجود افراد میں کوئی بچا بھی تھا تو اس قابل نہیں تھا کہ کچھ کر سکے۔ سامنے والوں کا بھی صفایا ہو گیا تھا۔ البتہ دائیں بائیں سے فائرنگ جاری تھی۔ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حیران تھا کہ فتح خان کیا چاہتا تھا کیا وہ مجھے ختم کرنا چاہتا تھا جو اس نے اس لاؤ لشکر اور تباہ کن ہتھیاروں کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ صرف تین افراد ہونے کے باوجود ہم ان پر حاوی آ گئے تھے۔ ایاز اور بیتو اب دائیں اور بائیں والوں کے خلاف جوابی کارروائی کر رہے تھے۔ ایک اور شخص مارا گیا تھا۔ میں نے حساب لگایا۔ دشمن کے کم سے کم پانچ مارے جا چکے تھے اور چار زخمی تھے اور اب چار یا پانچ باقی تھے۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ ''سامنے اور عقب میں کوئی دشمن باقی نہیں رہا۔ صرف دائیں بائیں ہیں۔''

''میں سمجھ گیا۔'' اس نے کہا اور اپنے آدمیوں کو ہدایت دینے لگا۔

حملہ آور اپنے ساتھیوں کا حشر دیکھ کر پاگل ہو گئے تھے اور مسلسل فائرنگ کر رہے تھے۔ اسی دوران میں عبداللہ پہنچ گیا۔ دونوں گاڑیاں لائٹ بجھا کر آئی تھیں اور اچانک حملہ آوروں کے سر پر پہنچیں تو انہیں بھاگنے کا مدافعت کا موقع نہیں ملا تھا۔ عبداللہ اور اس کے آدمیوں نے باقی بچ جانے والوں کو مار گرایا۔ فائرنگ کا ایک تیز لیکن مختصر دور چلا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ عبداللہ نے موبائل پر کہا۔ ''میدان صاف کر دیا ہے جناب!''

''آس پاس دیکھو کوئی بچا ہوا نہ ہو اور اگر کوئی زندہ مل جائے تو اسے مار نا مت۔'' میں نے نیچے کا رُخ کرتے ہوئے کہا۔ ایاز پہلے ہی نیچے آ گیا تھا۔ لاؤنج تک کا حصہ ملبے کا ڈھیر بن گیا تھا اور عقبی دیواریں گر چکی تھیں۔ اگر مکان پلرز اور بیم والا نہ ہوتا تو شاید پورا ہی بیٹھ جاتا۔ سب سے بُرا حشر اس کمرے کا تھا جس میں فتح خان کے دو آدمی تھے اور دونوں مارے جا چکے تھے۔ شہباز خان کا سر ایک بڑے بلاک تلے آ کر کچل گیا تھا۔ میں نے شاہین اور شہلا والے کمرے کا دروازہ کھولا میرا خیال تھا کہ مجھے ان کی بھی لاشیں دیکھنے کو ملیں گی لیکن حیرت انگیز طور پر کمرے کو نقصان ہونے کے باوجود وہ ٹھیک تھیں البتہ ان کے حواس گم تھے۔ شاہین کمرے کے کونے میں دبکی ہوئی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ شہلا نے البتہ خود کو کسی قدر سنبھال رکھا تھا۔ اس نے پوچھا۔

''سب کیا ہے؟''

''فتح خان کے آدمیوں نے حملہ کیا ہے۔'' میں نے جواب دیا اور شاہین کو بازو سے پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے شہلا سے کہا۔ ''یہاں سے نکلو جلدی۔''

ہمارا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔ شاہین کسی معمول کی طرح کھڑی ہو گئی۔ اس کے حواس ابھی تک گم تھے۔ ظاہر ہے وہ ایک عام سی گھریلو لڑکی تھی جس نے آج سے پہلے ایسے مار ماری کے حالات کہاں دیکھے تھے۔ شہلا کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی ہیل والی جوتی پہن لی تھی کیونکہ یہاں اس کی اور کوئی جوتی یا چپل نہیں تھی۔ باہر عبداللہ اور اس کے ساتھی آ گئے تھے اور وہ ایاز اور بیتو کے ساتھ مل کر اسلحہ اور دوسرا سامان نکال رہے تھے۔ میں نے ہر وہ جگہ صاف کرنا شروع کر دی جہاں ہماری انگلیوں کے نشانات ہو سکتے تھے۔ لیکن ایسی جگہیں بہت زیادہ تھیں۔ عبداللہ میرے پاس آیا اس نے کہا۔

''آپ زحمت نہ کریں ہمارے جانے کے بعد یہاں کچھ باقی نہیں رہے گا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے دو سلینڈر نما چیزیں دکھائیں۔ یہ آگ لگانے والے بم ہیں ان میں ٹائم سیٹ کر کے یہاں ڈال جائیں گے۔''

اگرچہ کسی کا مکان تباہ ہو جاتا اور وہ بے چارہ پولیس کے چکر میں آ جاتا لیکن مجبوری تھی ہماری بچت اسی میں تھی میں نے سر ہلایا۔ ''کوئی زندہ ملا؟''

''دو افراد ہاتھ لگے ہیں لیکن دونوں زخمی ہیں۔ زخم خطرناک نہیں ہیں۔ گیارہ بندے مارے گئے ہیں۔''

گویا دس پندرہ منٹ میں تیرہ افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ قتل و غارت گری مجھے کبھی پسند نہیں رہی ہے اور میری کوشش ہوتی ہے کہ کسی کو انتہائی ناگزیر ہونے کی صورت میں ماروں۔ آج ایسے ہی حالات تھے اگر ہم انہیں نہ مارتے تو وہ ہمیں ختم کر دیتے۔ وہ اسی نیت سے آئے تھے اس کے باوجود میں دل پر بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ اسلحے والے بکس ایاز کی جیپ میں بار کر دیے گئے جبکہ میں شہلا، شاہین اور بیتو کے ہمراہ اپنی جیپ میں آ گیا۔ عبداللہ کے آدمی پہلے ہی تیار تھے۔ وہ اندر بم لگا کر آئے اور ہم فوری روانہ ہو گئے۔ لیکن عبداللہ نے مین روڈ کی طرف جانے سے گریز کیا تھا۔ اس طرف پولیس سے ٹکراؤ کا امکان تھا۔

فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں یقیناً دور تک گئی تھیں۔ اس صورت میں جلد یا بدیر پولیس کی آمد لازمی تھی۔ اس سے پہلے ہمارا اس جگہ سے دور نکل جانا ضروری تھا۔ ابھی ہم مکان سے کچھ دور گئے تھے کہ اس میں لگائے بم پھٹ گئے آواز نہیں آئی تھی لیکن آگ نمودار ہوئی اور دیکھتے ہی

دیکھتے پورے مکان کو لپیٹ میں لے لیا۔ عبداللہ اس کچے راستے سے واقف تھا پندرہ بیس منٹ بعد ہم ایک سڑک پر تھے۔ ہمارے پاس ابھی دو ٹھکانے تھے۔ ایک مکان اور ایک فلیٹ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کس طرف کا رُخ کیا جائے۔ بے اچانک موبائل نے وائبریٹ کی میں نے نکال کر دیکھا عبداللہ کال کر رہا تھا۔

''جناب آپ کا کیا ارادہ ہے؟''

میں نے اسے دوسرے دو ٹھکانوں کے بارے میں بتایا یا تو اس نے کہا۔ ''اگر آپ میری بات مانیں تو میں نے ایک اچھا ٹھکانہ بنا لیا ہے جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کوئی نہیں جانتا۔''

''کہاں ہے؟''

مری جانے والی متبادل نئی ہائی وے پر ہے۔ میں نے اسے اسی لیے حاصل کیا ہے۔ چھوٹی لیکن تمام سہولتوں کے ساتھ جگہ ہے۔''

''ٹھیک ہے فی الحال تو وہیں چلتے ہیں بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔'' میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ ویسے بھی اس وقت مجھے اپنا ذہن خالی اور بے سمت محسوس ہو رہا تھا۔ عبداللہ سے بات کر کے میں ڈرائیونگ کرنے لگا۔ بیتو نے میری کیفیت محسوس کر لی تھی اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''شوبی آپ پریشان مت ہوئے وہ سب ہمارے دشمن تھے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''میں سمجھتا ہوں لیکن وہ انسان بھی تھے اور مجھے انسانی زندگی کی حرمت سکھائی گئی ہے۔ مجھے کبھی کسی کو مار کر اچھا محسوس نہیں ہوتا ہے چاہے وہ میرا جانی دشمن کیوں نہ ہو اور مجھے قتل کرنے کیوں نہ آیا ہو۔''

''کیونکہ آپ اچھا آدمی ہے لیکن اچھا آدمی کسی بُرے آدمی کو مارے تو یہ اچھا بات ہوتا ہے۔''

''ہاں ہوتا تو ٹھیک ہے.....'' میں کہتے کہتے رک گیا۔ شاہین اور شہلا پیچھے خاموش بیٹھی تھیں۔ وہ دونوں عام سے کپڑوں میں تھیں کیونکہ حملے کے وقت سو رہی تھیں۔ جیپ میں ہیٹر تھا اس وجہ سے اندر فضا گرم تھی جبکہ باہر درجۂ حرارت نقطۂ انجماد کے آس پاس تھا۔ عبداللہ والی گاڑی سب سے آگے تھی اس کے پیچھے ایاز کی جیپ تھی، پھر عبداللہ کے آدمیوں کی گاڑی تھی اور سب سے پیچھے میں تھا۔ راستے میں عبداللہ کے آدمیوں والی گاڑی اس کچی کوٹھی کی طرف مڑ گئی۔ ان کا کام ختم ہو گیا تھا اس لیے وہ چلے گئے اور ہم نے اپنا سفر جاری رکھا تھا۔

ٹول پلازہ سے گزر کر ہم مری جانے والی نئی شاہراہ پر آئے۔ یہ ایکسپریس وے تھا اور اچھی چوڑی سڑک تھی۔ یہاں دھند کم تھی اور کہیں کہیں برف کے آثار نظر آ رہے تھے۔ یہاں باقاعدہ برف باری تو کم ہوتی تھی لیکن گرنے والی اوس برف کی طرح جم جاتی ہے۔ کوئی بیس منٹ بعد عبداللہ رک گیا۔ میں حیران ہوا تھا کیونکہ آس پاس کوئی کوٹھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ دائیں طرف کھائی تھی اور اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا احاطہ اور پھر کمرا نما بنا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن یہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ ہم سب یہاں رہ سکتے۔ احاطہ بڑا تھا مگر کھلی جگہ میں رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ عبداللہ نے گاڑی کنارے لگائی تھی تاکہ ٹریفک میں خلل نہ ہو۔ وہ نیچے اُترا تو میں بھی نیچے اُتر آیا۔ البتہ بیتو کو گاڑی میں رکنے کو کہا۔ شہلا پر نظر رکھنا ضروری تھا وہ شاطر عورت اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر فرار ہو سکتی تھی۔ اس دوران میں عبداللہ احاطے کا گیٹ کھول رہا تھا اور اس نے مجھ سے کہا۔

''جناب اپنی اور ایاز کی گاڑیاں اندر لے آئیں۔''

احاطے میں اتنی جگہ تھی کہ دونوں گاڑیاں آرام سے اندر آ گئیں۔ احاطے کے سامنے ترچھی اور نیچی چھت والا ایک ہی کمرا تھا اس کے وسط میں دروازہ تھا اور دروازے کے دونوں طرف مختصر لیکن جدید انداز کی کھڑکیاں تھیں۔ احاطہ کوئی تیس فٹ چوڑا اور اتنا ہی لمبا تھا۔ جبکہ کمرے کی چوڑائی بیس فٹ تھی۔ کھلی فضا میں سردی شدت کی تھی۔ عبداللہ نے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ لاؤنج نکلا تھا اور اس سے سیڑھیاں نیچے کی طرف جا رہی تھیں۔ بیتو شاہین اور شہلا کو لے کر اندر آیا تو خوش ہو گیا۔ ''یہ تو ویسا مکان ہے جیسا اُدھر انڈیا میں بھی پہاڑوں میں ہوتا ہے اوپر سے نیچے جاتا ہے۔''

عبداللہ مسکرایا۔ ''تم نے ٹھیک پہنچانا۔ نیچے اس کی دو منزلیں اور ایک چھوٹا سا باغ بھی ہے۔ داخلے کا راستہ یہی ہے۔''

لاؤنج میں معمولی سا فرنیچر تھا اور احاطے سمیت اس جگہ کا کل رقبہ چھ سات مرلے سے زیادہ نہیں تھا۔ گزوں میں ڈیڑھ پونے دو سو گز سمجھ لیں۔ البتہ تعمیر میں اعلیٰ درجے کا ماربل استعمال ہوا تھا۔ یہ لینٹر کی بنی کوٹھی تھی سیڑھیوں کی ریلنگ شاندار پالش شدہ لکڑی کی تھی۔ عبداللہ ہمیں نیچے لایا۔ پہلے فلور پر کل چار کمرے تھے۔ دو بیڈ روم، ایک نشست گاہ اور ایک دیگر کاموں کے لیے مخصوص تھا۔ اس سے نیچے بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تین کمرے تھے۔ کچن اسی حصے میں تھا اور سامنے چھوٹا سا باغ تھا۔ یہاں سے ایک کچا راستہ نیچے وادی کی طرف جاتا تھا اور یہاں اچھی خاصی آبادی تھی۔ مکانات دور دور بنے تھے لیکن پوری ڈھلان ان مکانوں سے آباد تھی۔ کیونکہ یہاں بجلی تھی اس لیے وادی برقی روشنیوں سے تاروں بھری رات کا منظر پیش کررہی تھی۔

کسی شوقین نے یہ گھر بنوایا تھا۔ اسے ڈھلان کے ساتھ یہ جگہ مل گئی تھی اور اس نے اُلٹی ترتیب سے کئی منزلہ گھر بنایا۔ اس میں داخلے کا راستہ سب سے اوپر والی منزل میں تھا۔

بیڈروم پوری طرح فرنش تھے اور نشست گاہ میں فرش پر دبیز قالین کے ساتھ ایک شاہانہ صوفہ سیٹ تھا لیکن یہ باقاعدہ فرنش نہیں تھا۔ مخصوص مقاصد والا کمرا بالکل خالی تھا اور فرش بھی ننگا تھا۔ پکڑے جانے والے حملہ آوروں کو یہیں لایا گیا تھا۔ ان میں سے ایک کو بازو میں گولی لگی تھی اور دوسری کی پنڈلی پنکچر تھی لیکن گولیاں نکل گئی تھیں اس لیے زخموں پر پٹیاں باندھنے کے بعد ان کی حالت بہتر لگ رہی تھی۔ میں نے پہلی بار دیکھا تھا اور میں چونک گیا کیونکہ وہ خدوخال سے مقامی لوگ لگ رہے تھے۔ یعنی اس نسل کے لوگ جو مارگلہ اور مری کے پہاڑوں میں آباد ہیں۔ وہ خوف زدہ نہیں تھے اور خاص طور سے مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

فی الحال کچھ دوسرے کام نمٹانے تھے اس لیے ان سے پوچھ گچھ کا ارادہ ملتوی کرکے ان کو اس خالی کمرے میں دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کردیا گیا۔ جبکہ شہلا اور شاہین کو ایک بیڈروم میں بھیج دیا۔ شاہین کا ہینڈ کیری بیتو لے آیا تھا۔ وہ اپنا حلیہ درست کرنے میں لگ گئی کیونکہ دھماکے کے بعد وہ مٹی مٹی ہوگئی تھی۔ جب تک عبداللہ مجھے کوٹھی دکھا رہا تھا اس دوران میں بیتو، ایاز اور عبداللہ کا ایک آدمی جو اس کی جیپ میں تھا ہمارا سامان اور اسلحہ و گولہ بارود نیچے لے آئے تھے۔ یہ سب سے نیچے والے حصے میں ایک کمرے میں رکھ کر اسے مقفل کر دیا گیا تھا۔ یہاں ایک فرنش بیڈروم تھا لیکن باقی دو کمرے خالی تھے۔ ان میں سوائے وال ٹو وال قالین کے اور کچھ نہیں تھا۔ البتہ دیوار گیر الماریاں اور ریکس ہر کمرے میں موجود تھے اور ان کی وجہ سے ہمیں سامان رکھنے میں آسانی ہوئی تھی۔ کھلا ہوا اضافی اسلحہ الماریوں میں رکھ دیا تھا اور گولہ بارود بکسوں میں ہی تھا۔ لائنوں میں یخ بستہ پانی آرہا تھا اس لیے سب نے منہ ہاتھ دھونے پر اکتفا کیا کیونکہ گرد و غبار سے سب کی حالت خراب ہورہی تھی۔ میرے کپڑے گندے ہو گئے تھے۔ انہیں بدلنا تھا۔

کچن میں فریج تھا اور اس میں کھانے پینے کی خاصی اشیا تھیں۔ پکانے کا سامان بھی تھا۔ یہاں گیس نہیں تھی اس لیے سلینڈر تھے۔ برتن اور دوسرا سامان بھی تھا۔ یعنی ہمیں کوئی مشکل نہیں ہوتی اس گھر میں سہولت کی ہر چیز موجود تھی۔ اوپر لاؤنج میں پانی کی ٹنکی کے ساتھ لکڑیوں سے گرم ہونے والا گیزر موجود تھا۔ عبداللہ کا آدمی اسے چلانا جانتا تھا۔ وہ گیزر میں آگ لگانے چلا گیا۔ عبداللہ نے کہا۔ ”یہ جگہ محفوظ ہے آپ یہاں آرام سے ان سے تفتیش کرسکتے ہیں اور سہولتیں بھی ساری ہیں۔ میں صابر کو یہاں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ یہ گھر کے کام بھی کرلیتا ہے اور آپ نے باہر سے کچھ منگوانا ہو تو یہ جاکر لے آئے گا۔“

”یہ ٹھیک رہے گا فی الحال ہمارا یہاں سے نکلنا ٹھیک نہیں ہوگا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وسیم یا سفیر کو تو نہیں بتایا۔“

”نہیں میں نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“ عبداللہ نے سر ہلایا۔ ”موبائل مت استعمال کیجیے گا میرا اندازہ ہے یہ مصیبت اسی وجہ سے نازل ہوئی ہے۔ آپ سب اپنے رابطے والی سیمیں بدل دیں۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ عبداللہ کوٹھی کی چابیوں کا ایک سیٹ مجھے دے کر رخصت ہوگیا۔ صبح کے آثار نمودار ہورہے تھے۔ میں نے شہلا اور شاہین والے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ شاہین جاگ رہی تھی اس نے دروازہ کھولا۔ وہ ابھی تک خوف زدہ تھی لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ نہانے کا موقع نہیں تھا کیونکہ ابھی تک لائنوں میں گرم پانی نہیں آیا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لیے تھے اور بال بنا رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ”فکر مت کرو اب ہم محفوظ ہیں۔“

”وہاں کیا ہوا تھا۔ استاد فانا کے آدمی تھے؟“

”نہیں یہ ہمارے دشمن ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔ صبح ہونے والی ہے اور ہم سب ایک بڑے مرحلے سے گزر کر آئے ہیں۔ یہاں کچن موجود ہے اگر تم ہمارے لیے کوئی چائے کافی تیار کردو تو...“

”آپ درخواست کیوں کررہے ہیں؟“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”آپ مجھے حکم دے سکتے ہیں۔“

میں نے نرمی سے کہا۔ ”بی بی تم مہمان ہو اور مہمان کو حکم نہیں دیتے۔“

وہ اندر سے سوئیٹر پہن کر آگئی۔ ”آپ میرے لیے اتنا کررہے ہیں تو کیا میں یہ معمولی سا کام نہیں کرسکتی؟ مجھے کچن دکھایے۔“

میں اسے نیچے کچن میں لایا۔ بیتو اور ایاز دوسرے بیڈروم میں ڈیرا جما چکے تھے۔ صابر نے گیزر چلا دیا تھا اور اب لائنوں میں کسی قدر گرم پانی آنے لگا اس لیے بیتو نہانے گھس گیا تھا۔ خود رات کی مارا ماری کی وجہ سے میری حالت بھی خستہ ہورہی تھی۔ شاہین نے کچن کا چارج سنبھال لیا اور سب سے پہلے چیزوں کی تلاش شروع کی۔ سردی کم کرنے کے لیے اس نے چولہے جلا لیے تھے۔ چائے، کافی، چینی، خشک دودھ اور پیک کریم کے ڈبے سب وہاں موجود تھے۔ اس نے فریج سے ڈبل روٹی اور انڈے نکالے اور مجھ سے پوچھ کر انڈے فرائی کرنے لگی۔ ساتھ ہی اس نے سلائس ٹوسٹر میں سینکنے کے لیے رکھ دیے۔ وہ تیزی سے اور سلیقے سے کام کرنی والی لڑکی تھی۔ اس کے اعصاب یقیناً مضبوط تھے۔ ورنہ گزشتہ رات اس کا باپ مارا گیا پھر اس نے اپنے گھر کے سامنے قتل و غارت گری دیکھی۔ اس کے بعد ہمارے ٹھکانے پر ہونے والا معرکہ بھگتا۔ جس وقت میں ناشتا کررہا تھا تو مشرق کی جانب سے سورج طلوع ہورہا تھا۔ یہ مکان مشرق کے رُخ پر تھا اور صبح کی روشنی اس کے تمام حصوں تک آتی تھی۔ شاہین نے کام کرتے کرتے مجھ سے کہا۔

”ایک سوال کروں؟ اگر آپ بُرا نہ مانیں؟“

”کرو۔“

”یہ عورت کون ہے؟ کل رات سے میں اس کے ساتھ ہوں اور اس نے مجھ سے اتنی بیہودہ باتیں کی ہیں کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔“

”وہ ہے ہی ایسی عورت، یوں سمجھ لو کہ وہ میرے پاس قید ہے اور میری جان کی دشمن ہے لیکن میں اسے بھی کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں عورتوں کا احترام کرتا ہوں۔ بہرحال اگر تمہیں اس کی وجہ سے مشکل ہورہی ہے تو میں تمہیں کسی اور کمرے میں منتقل کردیتا ہوں۔ وہاں تو مجبوری تھی لیکن یہاں کئی کمرے ہیں۔“

شاہین نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”میں آپ کی شکر گزار ہوں کیونکہ وہ اس وقت جس طرح سورہی ہے اس کے ساتھ کمرے میں رہنا مجھے عذاب لگ رہا تھا۔“

شاہین نے واضح نہیں بتایا تھا لیکن میں سمجھ گیا۔ شہلا کو لباس اُتار کر سونے کی عادت تھی۔ اس کی فطرت شاہین سے بالکل الگ تھی۔ میں ناشتا کرکے اوپر آیا اور شہلا والا بیڈروم باہر سے بند کردیا۔ یہاں سردی کی وجہ سے ہر کمرے کے آتش دان میں لکڑیاں چن دی گئی تھیں اور بیتو نے اپنے بیڈروم والے آتش دان میں آگ بھی لگا دی تھی۔ وہ اور ایاز ناشتا کرنے چلے گئے اور میں نے اپنے بیگ سے ایک پینٹ اور ہائی نیک جرسی نکالتے ہوئے واش روم کا رُخ کیا۔ رات مجھ پر مٹی کی خاصی موٹی تہ جم گئی تھی۔ نہا کر وہ تہ اُتاری اور کپڑے بدل کر باہر آیا۔ بیتو کھا پی کر سو رہا تھا۔ ایاز بھی ساری رات کا جاگا ہوا تھا میں نے اسے سونے کو کہا۔ وہ مان نہیں رہا تھا اس لیے مجھے حکم دینا پڑا تھا۔ ”میں کچھ دیر سو چکا ہوں اس لیے ابھی جاگ سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم سو جاؤ میں چند گھنٹے بعد تمہیں جگا دوں گا۔“

”جیسا آپ کا حکم جناب!“ ایاز نے کہا اور سونے کے لیے چلا گیا۔

شاہین کو کچن کے ساتھ والا بیڈروم کھول دیا تھا۔ وہ بھی فرنش تھا۔ کیونکہ دن نکل آیا تھا اور اب سردی میں وہ شدت نہیں تھی اس لیے شاہین نے آتش دان جلانے سے منع کر دیا۔ میں نے باغ میں جھانکا۔ رات بھر گرنے والی اوس جو برف کے کرسٹل میں بدل گئی تھی اب پگھل رہی تھی۔ سبزہ مرجھایا ہوا تھا اور سامنے وادی سے دھند اُٹھ رہی تھی۔ شہلا کی طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ وہ کمرے سے نہیں نکل سکتی تھی۔ صابر اوپر لاؤنج میں تھا۔ میں نے اسے بلایا۔ میرا ارادہ پکڑے جانے والے افراد سے تفتیش کا تھا۔ نہ جانے کیوں میرے ذہن میں وہ دونوں کھٹک رہے تھے۔ میں اور صابر کمرے میں داخل ہوئے تو وہ دیوار سے لگے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے تاثرات بدل گئے تھے اور وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ایک کو گریبان سے پکڑ کر اُٹھایا اور غرا کر پوچھا۔

”کیا میری صورت تمہیں اپنے مبینہ باپ جیسی نظر آتی ہے۔“

”شہباز ملک۔“ اس نے بے خوفی سے مخصوص پوٹھوہاری لہجے میں کہا۔ ”تمہارے دن پورے ہوگئے ہیں اب تم بچ کے نہیں۔“

”اچھا کیا حضرت عزرائیل نے تمہیں اپنا ایجنٹ مقرر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر دیا ہے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا اور اچانک گھما کر اسے ایک طرف دیوار پر دے مارا۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی تھی اور وہ پٹ سے مردہ چھپکلی کی طرح زمین پر گرا۔ وہ اچھے وزن کا جوان تھا اگر اسے میری نیت کا اندازہ ہوتا تو میں اتنی آسانی سے دیوار پر نہیں مار سکتا تھا وہ کچھ نہ کچھ مزاحمت ضرور کرتا۔ کچھ دیر تک تو وہ ساکت رہا جیسے بے ہوش ہو گیا ہو۔ اس کے زخمی بازو پر بھی چوٹ آئی تھی۔ لیکن وہ مکر کیے پڑا تھا جیسے ہی میں اس کے پاس آیا اس نے میرے پاؤں پر لات ماری۔ یہ کمزور سا وار تھا میں ہلکا سا لڑکھڑایا اور پھر اسے سر کے لمبے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور گھما کر دوسری دیوار پر دے مارا۔ اس نے چلا کر کہا۔ ''ہائے ماں جی۔''

جس کے پاؤں پر گولی لگی تھی وہ خوف زدہ تھا لیکن اس نے بھی مجھے خبردار کرنا ضروری سمجھا۔ ''تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔''

میں نے اس کے زخمی پاؤں پر پیر رکھا تو وہ بلبلا گیا تھا۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم لوگوں نے غالباً ہمارے ساتھ بہت اچھا کیا ہے۔ راکٹ اور دوسرا گولہ بارود تم لوگ اچھا کرنے کے لیے لائے تھے۔''

''اوئے..... ہائے .... میں مرا۔'' وہ رونے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''مجھے چھوڑ دے۔''

لیکن میں نے دباؤ برقرار رکھا۔ ''تمہیں کس نے بھیجا ہے؟''

''فتح خان نے۔'' اس نے بلبلانا چھوڑ کر پھرتی سے جواب دیا۔ میں نے جوتے کا دباؤ بڑھایا تو وہ پھر سے بلبلانے لگا۔ ''اوئے میں سچ کہہ رہا ہوں.... چھوڑ مجھے۔''

''بکواس مت کرو اگر تمہیں فتح خان نے بھیجا ہوتا تو تم اتنی آسانی سے اس کا نام نہ لیتے۔ تم فتح خان کے آدمی نہیں لگتے ہو۔''

''ہم فتح خان کے آدمی ہیں۔'' اس نے سخت اذیت میں ہونے کے باوجود پوری ڈھٹائی سے کہا۔

میں نے لمبے بالوں والے کو اٹھایا۔ وہ اس بار سچ مچ نیم بے ہوش ہو گیا تھا اور کھڑا ہونے پر جھول رہا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ ''اے.... ہوش میں آؤ..... تمہیں کس نے بھیجا ہے۔''

وہ جھولتے ہوئے بولا۔ ''مر.....''

''جمیل۔'' نیچے پڑا شخص چلایا۔ ''اپنی زبان بند رکھ۔ اب وہ اپنی زبان بند رکھتے تب بھی میرا مقصد حل ہو گیا تھا۔ جمیل نے بے خودی میں راز تقریباً اگل دیا تھا۔ میں نے مر کے ساتھ شد لگایا تو جواب مل گیا تھا۔ وہ مرشد کے لوگ تھے۔ اب ان کا رویہ سمجھ میں آنے والا تھا۔ صرف مرشد میرا ایسا دشمن تھا جو مجھے ہر قیمت پر مروا دینا چاہتا تھا۔ اس نے ان لوگوں کو بھیجا تھا جو اس کی عقیدت میں کفر سے گزر گئے تھے اور نعوذ باللہ اسے خدا سے بڑھ کر درجہ دیتے تھے۔ میں نے جمیل کو چھوڑ دیا۔ وہ نیچے گر پڑا۔ نیچے پڑا شخص اب خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اسے معلوم تھا کہ اب میں اس کی طرف آؤں گا۔ میں اس کے پاس بیٹھا۔

''تمہیں اس نام نہاد پیر نے بھیجا ہے۔ جس کے کارناموں پر ابلیس بھی شرما جائے۔''

مرشد کے حضور اس گستاخی پر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے ضبط کر کے کہا۔ ''میں کسی مرشد کو نہیں جانتا ہم فتح خان کے آدمی ہیں۔''

''گویا اگر میں تمہارے سامنے مرشد کو ذلیل اور کمینہ وغیرہ کہوں تو تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

اس کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا لیکن اس نے ڈھٹائی کا دامن ابھی بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ ''مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''اور اگر میں اسے سور، کتا اور کسی غلیظ نسل کا جانور قرار دوں تو....''

اس بار اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور اس نے چلا کر کہا۔ ''بکواس بند کر حرامی....''

میں نے اس کا سر دیوار سے مارا تو اس کی زبان رُک گئی تھی۔ ''مرشد کے ناجائز پلے.... تو کھل گیا نا.... اب دیکھ تیرے ساتھ کیا ہوتا ہے؟''

وہ چکرا گیا تھا اس کے باوجود اس نے حقارت سے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ ''کیا کر لو گے.... زیادہ سے زیادہ جان لے لو گے.... مرشد بادشاہ پر ایسی سو جانیں قربان ہیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''شاید تمہارے علم میں ہو کچھ عرصے پہلے مرشد کے کچھ آدمی جو کہیں ایک مشن پر گئے تھے اس حال میں واپس آئے تھے کہ وہ بہرے اور اندھے ہو چکے تھے۔ انہیں میں نے ہی اندھا بہرہ کیا تھا۔ اب یہی کام تم لوگوں کے ساتھ کروں گا اور اس میں اشیا جوڑنے والے سلوشن کی صرف ایک ٹیوب خرچ ہو گی۔''

وہ خوف زدہ ہو گیا۔ ''بکواس کرتے ہو تم۔''

''اچھا جب میں یہ کام کروں تب تم خود کو سمجھاتے رہنا کہ میں بکواس کر رہا ہوں۔ اسی طرح اندھے اور بہرے ہو جانا۔ میرا خیال ہے جن لوگوں کے ساتھ میں نے پہلے یہ سلوک کیا تھا مرشد نے ان کو مروا دیا ہو گا۔ اس کا پلا ہونے کی وجہ سے تمہیں اس بات کا علم ہو گا۔''

اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ میری بات درست تھی۔ مرشد روگ پالنے والے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ میں نے پھر کہا۔ ''سنو میں نے جو کہا ہے میں وہ بھی کر سکتا ہوں میں تمہیں قتل بھی کر سکتا ہوں۔ تمہاری لاشیں کسی نامعلوم قبر میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گی اور اس نام نہاد پیر کیا کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ تم لوگ کہاں گئے ہے مگر میں تمہیں چھوڑ بھی سکتا ہوں لیکن ایک معمولی شرط ہے؟''

''کیسی شرط؟''

''میں مرشد کے جرائم کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''مرشد بادشاہ مجرم نہیں ہے۔'' اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

''یعنی تمہارے خیال میں دوسروں کو قتل کرانا، عورتوں اور لڑکیوں کو اغوا کرنا، دوسروں کا مال و دولت لوٹ لینا ثواب کے کام ہیں؟'' میں نے طنز کیا۔ ''کیا مرشد کے اشارے پر اس کے تم جیسے کتے یہ سب نہیں کرتے؟''

اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ یہ سب کرتا رہا تھا۔ جمیل اب کسی قدر ہوش میں آ گیا تھا اور مرشد کا نام سن کر اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''بکواس کر رہا ہے ہم فتح خان کے آدمی ہیں۔''

اس پر اس کے ساتھی نے روانی اور سلاست سے اس کے گھر کی خواتین سے اپنی ناجائز رشتے داریوں کا انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ مرشد کا نام اس نے لیا تھا۔ جمیل چکرا گیا کیونکہ اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ اس کی زبان سے مرشد کا نام نکلا تھا۔ لیکن اس کے ساتھی نے اتنے پُرزور انداز میں کہا کہ اسے یقین آ گیا۔ یوں اس نے اپنی گردن بچالی حالانکہ اقرار اسی نے کیا تھا۔ جمیل نے صرف ''مر'' کہا تھا۔ جمیل نے کمزور لہجے میں کہا۔

''بکواس نہ کرمیں نے کوئی نام نہیں لیا ہے۔''

''نام تو لیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم دونوں کی عافیت اسی میں ہے کہ مرشد کے جرائم کے بارے میں بتاؤ جو اس نے تم لوگوں کے توسط سے کرائے ہیں۔''

اس پر دونوں کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ میں نے زخمی پاؤں والے کی طرف دیکھا۔ ''اپنے ساتھی کو بتا دینا کہ انکار کے صورت میں تم دونوں کے ساتھ کیا کروں گا؟''

میں باہر آیا تو سخت تشویش زدہ تھا۔ مرشد بہ ظاہر کہیں آس پاس نہیں تھا لیکن اس نے میرا سراغ لگا لیا تھا۔ پہلے میں حملہ آوروں کو فتح خان کا ساتھی سمجھا تھا۔ اس کے دو آدمی پہلے ہی میرے پاس تھے اس لیے میں سمجھا کہ ان کی مدد سے اس نے ہمارے ٹھکانے کا سراغ لگا لیا ہے لیکن مرشد کے آدمی وہاں کس طرح پہنچے؟ قیدیوں والے کمرے کا دروازہ باہر سے بند ہوتا تھا اور اندر سے اسے کوئی رستم زمان ہی توڑ سکتا تھا ان دونوں کے بس کی بات نہیں تھی اس لیے میں بے فکر تھا۔ میں نیچے باغ میں آیا۔ اس وقت تک دھوپ پھیل چکی تھی اور اس کی ہلکی کرنیں اچھی لگ رہی تھیں۔ اس کے باوجود سردی ایسی تھی کہ مجھے اپنی جیکٹ کی زپ بند کرنا پڑی۔

واقعات کی رفتار میں نہایت تیزی آ گئی تھی۔ مرشد کے آدمی جس طرح ہمارے محفوظ ٹھکانے تک آ پہنچے تھے اس سے مجھے یہ جگہ بھی غیر محفوظ لگنے لگی تھی۔ میں اُن وجوہات پر غور کرنے لگا جس کی وجہ سے مرشد کی رسائی ہمارے ٹھکانے تک ہوئی تھی۔ مجھے عبداللہ کی بات درست لگی تھی۔ مرشد نے موبائل کالز کی مدد سے اس جگہ کا سراغ لگایا تھا لیکن کون سی موبائل کالز کی مدد سے؟ کیونکہ میرے پاس جو ہم تھیں ان میں سے کسی سے بھی مرشد کو یا اس کے کسی آدمی کو کال نہیں کی تھی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں فتح خان کا نمبر تو مرشد کے علم میں نہیں تھا اور وہ اس کی نگرانی کروا رہا ہو گا۔ وہ حکومت میں شامل تھا اور خود بھی نہایت طاقت ور شخص تھا۔ وہ کسی موبائل نمبر کو آبزرویشن پر رکھوا سکتا تھا۔ جیسے جیسے میں اس بات پر غور کرتا رہا مجھے یہی بات قرین قیاس لگی تھی۔ فتح خان کے موبائل کی مدد سے مرشد نے میرا سراغ لگایا اور اس نے فوری طور پر اپنا قاتل دستہ روانہ کر دیا تھا۔ وہ لوگ جس انداز سے آئے تھے اور ان کے پاس جو ہتھیار تھے ان کا ایک یہی مقصد ہو سکتا تھا۔ میں اوپر آیا اور صابر سے کہا۔

''ہوشیار رہنا میں باہر جا رہا ہوں۔''

''آپ بے فکر رہیں صاحب جی۔'' اس نے جواب دیا۔

میں اوپر آیا اور جیپ نکالی۔ اس کی عقبی ونڈ شیلڈ میں گولی کا سوراخ تھا جس پر ایاز نے اسٹیکر لگا کر فی الحال سوراخ چھپا دیا تھا۔ میں نے جیپ باہر نکالی تو صابر نے گیٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اندر سے بند کر دیا۔ احاطے کی دیوار کوئی آٹھ فٹ اونچی تھی یعنی اس میں موجود گاڑیاں باہر سے نظر نہیں آ سکتی تھیں۔ میں اسلام آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ سر پر اونی ٹوپی اور آنکھوں پر بڑے سائز کا سن گلاس لینے کے بعد میری صورت خاصی حد تک غیر نمایاں ہو گئی تھی اور جب تک کوئی مجھے غور سے نہیں دیکھتا وہ مجھے شہباز ملک کی حیثیت سے نہیں پہچان سکتا تھا۔ میں فیض آباد تک آیا یہاں آٹو پارٹس کی ایک مارکیٹ تھی لیکن صبح دس بجے کچھ نہیں کھلا تھا۔ البتہ ایک پی سی او کھلا ہل گیا۔ وہاں ایک بیزار بڑے میاں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔ میں نے کال ملانے کو کہا تو انہوں نے مزید بے زاری سے کیبن کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے انہیں نمبر بتایا اور کیبن میں آ گیا۔ انہوں نے نمبر ملا کر مجھے ریسیو اٹھانے کا اشارہ کیا اور دوبارہ اخبار سنبھال لیا۔ فتح خان نے فوراً کال ریسیو کی۔

"کون ہے؟"

"میں بات کر رہا ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "نام مت لینا۔"

"تم۔" اس نے بے یقینی سے کہا اور پھر بولا۔ "شہباز میں نے دشمنی ختم کرنے کا سوچا تھا لیکن تم نے اسے بڑھا دیا۔ میرے چچا کے بیٹے کی لاش مل گئی ہے۔"

"میں نے اسی کے بارے میں بتانے کے لیے خطرہ مول لے کر کال کی ہے۔ یہ سب مرشد کا حرامی پن ہے۔ اس نے شاید تمہارا موبائل فون آبزرویشن پر رکھوایا ہے۔ کیونکہ جیسے ہی میں نے تمہارے آدمی کے موبائل سے تمہیں کال کی، اس کے کچھ دیر بعد ہی مرشد کے کتے آن پہنچے تھے۔ تمہیں مکان کی حالت کا پتا ہے؟"

"نہیں۔" فتح خان کا لہجہ دھیما پڑ گیا تھا۔

"انہوں نے راکٹ مارا تھا۔ شہباز خان اور تم خان راکٹ حملے میں مارے گئے ہیں میں نے انہیں صرف قید رکھا تھا اور تم جانتے ہو میں بلاوجہ کسی کی جان لینے کا قائل نہیں ہوں چاہے وہ میرا بدترین دشمن ہی کیوں نہ ہو۔"

"تم سچ کہہ رہے ہو؟" اس کے لہجے میں شک تھا۔

"ہاں میں زیادہ لمبی بات نہیں کر سکتا کیونکہ یہ نمبر غیر محفوظ ہے۔" میں نے کہا۔ "تم ای میل کر سکتے ہو؟"

"ہاں مجھ کو کمپیوٹر اور انٹرنیٹ استعمال کرنا آتا ہے۔"

"میں تمہارے اس نمبر پر اپنا ای میل ایس ایم ایس کر رہا ہوں۔ مجھے کوئی محفوظ نمبر ای میل کر دو پھر میں تم سے بات کروں گا اور اس نمبر کو ترک کر دو بلکہ وہ ٹھکانہ بھی چھوڑ دو جہاں ہو ورنہ مرشد کے گرگے وہاں بھی آ جائیں گے بلکہ ممکن ہے اب تک روانہ ہو چکے ہوں۔"

میری بات فتح خان کی سمجھ میں آ گئی۔ خطرہ بھانپنے کے معاملے میں وہ بہت تیز آدمی تھا۔ اس نے عجلت میں لائن کاٹ دی۔ بڑے میاں بے خبر اخبار میں کھوئے ہوئے تھے۔ میں نے کال چارج کا پوچھا تو انہوں نے فون دیکھ کر بادل نہ خواستہ مجھے رقم بتائی اور میں ادائیگی کر کے باہر آیا۔ میں نے شہباز خان والی ہم لگا کر فتح خان کو اپنا ای میل ایس ایم ایس کیا اور پھر اس ہم کو توڑ کر پھینک دیا۔ اس کے بعد راستے میں آنے والے پہلے فقیر کو شہباز خان مرحوم کا موبائل تھما دیا۔ مغفرت کی دعا کی درخواست پر فقیر بھونچکا رہ گیا تھا کسی نے اسے بھیک میں موبائل نہیں دیا تھا۔ میں آگے بڑھ گیا۔ ایک کیفے میں بیٹھ کر وقت گزاری کی اور پھر آٹو پارٹس کی مارکیٹ پہنچا وہاں دکانیں کھلنا شروع ہو گئی تھیں میں نے ایک دکاندار سے جیپ کی عقبی ونڈ شیلڈ مانگی۔ اس کے پاس نہیں تھی۔ لیکن اس کا بھائی اسی کا کام کرتا تھا اور اس نے ابھی تک دکان نہیں کھولی تھی۔ اس نے بھائی کو کال کی۔

"اوئے دکان تے آ اتھے گاہک آ گئے ہیں تے توں ابھی تک بے بے کی بغل میں گھسا اے۔"

یقیناً بے بے سے مراد اس کی بیوی ہو گی۔ اس نے فون بند کر کے کہا۔ "وہ ابھی آدھے گھنٹے میں آ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں جیپ چھوڑے جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ جیپ میں کچھ نہیں تھا۔ میں نے چابی اس کے حوالے کر دی۔ "میں ایک گھنٹے بعد آؤں تو شیشہ بدل چکا ہو۔"

"آپ بے فکر رہو صاحب!" اس نے جواب دیا۔

"یہ خیال رکھنا جیپ کی کوئی چیز بھی تبدیل نہ ہو۔" میں نے لہجہ بدل کر کہا۔ "اس کا شیشہ گولی سے خراب ہوا ہے۔"

اس کا رنگ بدلا تھا۔ "صاحب آپ بے فکر ہو کر جاؤ ہم یہاں مارکیٹ میں بیٹھے ہیں۔"

"تب بیٹھے رہنے والے کام کرنا۔" میں نے اسے خبردار کیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ ایک رکشہ روک کر میں نے اسے موبائل مارکیٹ چلنے کو کہا۔ دس منٹ بعد میں موبائل مارکیٹ میں تھا۔ مارکیٹ کھل رہی تھی۔ ایک بڑی شاپ میں آیا اور ایسا موبائل مانگا جس سے انٹرنیٹ بھی آسانی سے استعمال کیا جا سکے۔ بڑا کسٹمر پا کر دکاندار کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ اس نے مستعدی سے کہا۔ "میرے پاس ایپل کے

کچھ آئی فون آئے ہیں۔ کہیں تو وہ دکھاؤں۔"

"دکھاؤ لیکن خیال رہے زیادہ مہنگے نہ ہوں۔"

"مہنگے تو ہیں لیکن آپ ان کی کارکردگی دیکھیں۔" اس نے ایک آئی فون نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ "اس میں انٹرنیٹ آن ہے آپ استعمال کر کے دیکھ سکتے ہیں۔"

میں نے اپنا ای میل کھولا تو اس میں فتح خان کی طرف سے ای میل موجود تھی۔ مجھے حیرت ہوئی اس نے بڑی تیزی دکھائی تھی۔ میں نے نمبر نوٹ کیا۔ یہ استعمال شدہ آئی فون تھا لیکن اس کی کارکردگی واقعی بہت اچھی تھی۔ میں نے دکاندار سے کہا۔ "کیا قیمت ہے اس کی۔"

"اگر آپ نیا لیں تو بیالیس ہزار کا ہے اور اگر یہ لینا چاہیں تو میں پینتیس میں دے دوں گا۔ صرف سات مہینے استعمال ہوا ہے۔"

کسی قدر بحث کے بعد وہ بتیس میں مان گیا۔ اس نے مجھے آئی فون کی تمام چیزیں اور باکس بھی ساتھ دیا۔ میں نے اسی سے ایک نئی ہم لی اور اسی وقت بیلنس ڈال کر انٹرنیٹ آن کرنے کا پروسیس بھی کر لیا۔ مجھے بتایا گیا کہ چند گھنٹے بعد میں انٹرنیٹ استعمال کر سکوں گا۔ میں نے سب سے پہلے عبداللہ کو کال کی۔ "عبداللہ یہ میرا نیا نمبر ہے اسے محفوظ کر لو۔ وسیم اور سفیر سے کہو کہ اب تک استعمال میں جو سمیں تھیں ان کو پھینک دیں اور نئی سمیں لگا کر مجھے اطلاع دیں۔"

"ٹھیک ہے جناب ابو لیے میں نے ان کو بتا دیا ہے اور وہ آنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔"

"یار ان سے کہو ابھی وہیں رکیں اور مجھ سے رابطہ کریں۔" میں نے کہا اور کال کاٹ کر ہم بدلی اور اپنے پاس موجود ایک اور نئی ہم لگا کر فتح خان کا نمبر ملایا۔ اس نے کال ریسیو کرنے کے بجائے کاٹ دی تھی۔ میں نے دوبارہ کوشش نہیں کی اور ٹیکسی پکڑ کر واپس آٹو پارٹس مارکیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ دکان والے کا بھائی بیوی کی بغل سے نکل کر آ گیا تھا اور اس وقت جیپ کا شیشہ بدل رہا تھا۔ اس نے دس منٹ میں کام نمٹا لیا۔ میں نے اصلی شیشہ لگانے کو کہا تھا۔ میں نے چیک کیا اس نے اصلی ہی لگایا تھا۔ اسے ادائیگی کر کے میں وہاں سے روانہ ہوا اور موبائل سے ہینڈ فری لگا کر ایک بار پھر فتح خان کا نمبر ڈائل کیا اس بار اس نے کال ریسیو کر لی۔

"میں بات کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں مصروف تھا۔" اس نے میری آواز پہچان لی تھی۔ "یہ نمبر محفوظ ہے۔"

"فتح خان مرشد نہ صرف مجھے ختم کرنے پر تُل گیا ہے بلکہ وہ اب تمہارے خلاف بھی پوری طرح حرکت میں آ چکا ہے۔"

"یہ تو تم کہہ رہا ہے۔" اس کا لہجہ سرد ہو گیا۔ "کیا ثبوت ہے کہ شہباز خان کو مرشد کے آدمیوں نے مارا ہے؟"

"فتح خان مجھے تمہاری عقل پر ترس آ رہا ہے۔ بہرحال اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ وہ راکٹ حملے میں مارے گئے ہیں۔ اگر مجھے ان کو مارنا ہوتا تو میں اس مکان میں راکٹ سے مارتا جہاں میں موجود تھا اس کام کے لیے دو گولیوں کی ضرورت پڑتی جو کافی تعداد میں موجود ہیں۔ دوسرے میرے پاس مرشد کے دو آدمی ہیں جو اس واقعے میں زندہ بچ گئے تھے اور میں انہیں ساتھ لے کر وہاں سے نکلا ہوں۔ انہوں نے پہلے تمہارا نام لیا کہ وہ تمہارے آدمی ہیں لیکن مجھے شک تھا۔ مجھے کوئی ایسی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ تم مجھے اس طرح قتل کرنے کے لیے لاؤ لشکر بھیجو۔ ان کا انداز بھی مختلف تھا۔ اس لیے مجھے شبہ تھا کہ وہ بکواس کر رہے ہیں۔ جب میں نے ذرا دوسرے طریقے سے پوچھا تو انہوں نے اقرار کر لیا۔"

"مرشد کو کیسے پتا چلا کہ تم وہاں موجود ہو اور اس نے اپنے آدمی روانہ کر دیے؟"

میں نے جواب دیا۔ "یہ سب تم سے موبائل پر بات کرنے کے بعد ہوا اور اسی سے مجھے یقین ہے کہ مرشد اصل میں تمہارے نمبر کی نگرانی کرا رہا ہے اور ممکن ہے کال ٹیپ بھی کر رہا ہو۔ وہ بااثر آدمی ہے اس کے لیے یہ کام ناممکن نہیں ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہا ہے۔" فتح خان کے لہجے میں غصہ آ گیا۔ "اگر یہ بات سچ ہے تو ہم مرشد کو چھوڑے گا نہیں۔"

میں ہنسا۔ "ابھی وہ وقت دور ہے۔ فی الحال تو ہم اپنی جان بچاتے پھر رہے ہیں۔ میں بہت خوش قسمت ہوں، جو کل کے حملے میں مجھے یا میرے کسی ساتھی کو نقصان نہیں ہوا۔"

"اور شہلا۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ "وہ بھی بچ گیا؟"

"اتفاق سے.... ورنہ وہ برابر والے کمرے میں تھی اور اس کمرے کو بھی نقصان ہوا ہے۔" میں نے کہا اس وقت میں بھارہ کہو سے ذرا پیچھے تھا میں نے مزید آگے جانے کے بجائے گاڑی سڑک سے کچے میں اُتار کر روک دی۔ فتح خان بھی کم شاطر نہیں تھا۔ ممکن ہے اس کے پاس بھی کوئی ایسی چیز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو جس سے وہ میرے موبائل کی لوکیشن جان جاتا۔'' ویسے اب تمہیں شہلا سے کیا مطلب ہے جو تم اسے اس کی استعمال شدہ بلاؤز کی مدد سے تلاش کرا رہے تھے؟''

''میں اصل میں تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''مجھے تم سے کام ہے۔''

''فتح خان میرا خیال ہے میں نے بات کلیئر کر دی ہے اب بھی تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو تم جو چاہے سمجھتے رہو اور ہاں اب تمہاری طرف سے مجھے یا میرے ساتھیوں کو چھیڑنے کی کوئی کوشش کی گئی تو میں اسے تمہاری طرف سے اعلان جنگ سمجھوں گا۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔ ''فی الحال میری ساری توجہ مرشد کی طرف ہے۔ بہتر ہو گا تم درمیان میں پنگا کرنے سے گریز کرو۔''

اس سے پہلے وہ کچھ کہتا میں نے موبائل آف کر کے اس سے سم نکال کر دوسری لگا لی۔ اس سم کا نمبر وسیم، سفیر اور عبداللہ کے پاس تھا۔ آئی فون والی سم کو میں نے بالکل الگ رکھنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ میں اس کی مدد سے انٹرنیٹ سے منسلک رہنا چاہتا تھا۔ میں روانہ ہو گیا کیونکہ مجھے نکلے ہوئے کئی گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ راستے میں ایک مناسب نظر آنے والی بیکری سے میں نے سینڈوچز، چھوٹے پیزے، رول اور اسی نوعیت کی دوسری چیزیں لیں جن سے آسانی سے پیٹ بھرا جا سکتا تھا اور یہ معیاری بھی ہوتی تھیں۔ ان کے ساتھ کولڈ ڈرنکس، ڈبل روٹی، انڈے، مکھن اور دودھ کے ڈبے لیے۔ یہ چیزیں ناشتے کے علاوہ ہنگامی مواقع پر کام آتیں جب کھانے کے لیے باہر جانے یا کچھ لانے کا موقع نہ ہوتا۔

جب میں واپس پہنچا تو سب جاگ چکے تھے اور میری فکر میں تھے۔ میں جیپ سے اُترا تو بیتو نکل آیا۔ اس نے کہا۔ ''شوبی آپ کہاں چلا گیا تھا بتائے بغیر ہم سب پریشان ہو گیا تھا؟''

''کام سے گیا تھا یار.... یہ سامان اندر لے جاؤ۔''

بیتو کھانے پینے کی چیزیں دیکھ کر خوش نظر آنے لگا یقیناً دوپہر میں انڈا ڈبل روٹی کھانے کے خیال سے اس کی روح فنا ہو رہی تھی۔ میں نے صابر سے حالات پوچھے تو اس نے کہا۔ ''وہ دونوں شور کر رہے تھے پھر ایاز صاحب نے اندر جا کر ان کو تسلی دی تو چپ ہوئے۔''

''ان کو اسی طرح پڑے رہنے دو، کھانا پانی کچھ نہیں دینا ہے۔'' میں نے ہدایت کی۔ عام طور سے میں کسی کے ساتھ سخت سلوک نہیں کرتا ہوں لیکن ان جاہل لوگوں سے مجھے سخت نفرت محسوس ہو رہی تھی جو مرشد جیسے شیطان کے حکم کی تعمیل کار ثواب سمجھ کر کرتے ہیں۔ چاہے انہیں کسی عورت کو اُٹھا کر لانا پڑے یا کسی بے گناہ کو قتل کرنا پڑے۔ وہ کسی رحم و رعایت کے مستحق نہیں تھے۔ میں نیچے آیا تو ایاز اور شاہین کچن میں موجود تھے۔ شاہین برتن دھو رہی تھی اور ایاز کچن میں میز پر بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا جیسے وہ مجھے دیکھ کر جھینپ گئے ہوں۔ لیکن میں نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

''واہ کافی پی جا رہی ہے اکیلے اکیلے۔'' میں نے کرسی سنبھالتے ہوئے کہا تو شاہین پھر جھینپ گئی اور جلدی سے بولی۔

''انہوں نے کہا تو میں نے بنا دی آپ کہیں تو آپ کے لیے بھی بنا دوں۔''

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔''

شاہین کافی بنانے لگی۔ ایاز نے پوچھا۔ ''آپ کہاں چلے گئے تھے؟''

میں نے پہلے تو اسے مختصراً مرشد کے آدمیوں کے اقبالِ جرم کے بارے میں بتایا۔ پھر فتح خان سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔ ''میرا اندازہ درست نکلا تھا یہ فتح خان کے آدمی نہیں ہیں اور فتح خان اپنے کزن کی موت کا ذمے دار مجھے سمجھ رہا تھا۔ بہرحال میں نے بات کلیئر کر دی ہے۔''

''تو مرشد موبائل کی مدد سے ہمارا سراغ لگا رہا ہے؟'' ایاز سوچ کر بولا۔ ''اس صورت میں ہمیں بہت محتاط ہو جانا چاہیے۔''

''ہمیں اپنی تمام سمیں نئی لگانی ہیں۔''

''میری پرانی لگی ہے۔'' اس نے موبائل نکالا اور سم نکال کر اسے توڑ دیا اور پھر دوسری سم لگائی جو اس نے ابھی تک استعمال نہیں کی تھی۔ میں اسے آئی فون دکھا رہا کہ بیتو آ گیا اس نے خوش ہو کر کہا۔

''شوبی میرے لیے لایا ہے؟''

''ہاں تم لے لو۔'' میں نے اسے دیدیا۔ ''اچھا کھلونا ہے۔ لیکن اس سے کہیں کال مت کرنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے سعادت مندی سے کہا اور آئی فون لے کر چلا گیا۔ اسے موبائل کا شوق تھا اور یہ شوق کال کرنے کا نہیں بلکہ موبائل میں موجود دوسری تفریحی سہولیات کا تھا۔ کھانے کا سامان کچن میں آ گیا تھا۔ شاہین اسے مائکروویو میں گرم کرنے لگی۔ میں نے کافی کے ساتھ سینڈوچز اور پیزا لیا۔ کھانے کے بعد میں اوپر آیا۔ شہلا کمرے

میں قید تھی اور کسی قدر بیزار لگ رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''شہباز خدا کے لیے یا تو مجھے جانے دو یا مار دو، میں اس قید سے تنگ آ گئی ہوں۔''

''واقعی؟'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تمہیں قید تنگ کر رہی ہے یا میرا اور میرے آدمیوں کا شریفانہ رویہ تنگ کر رہا ہے۔''

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''تم غلط سمجھ رہے ہو۔''

''اب میں تم کو صحیح طرح سے سمجھا ہوں غلط تو پہلے سمجھا تھا۔'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال تمہارے کردار سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ مجھے وہ بریف کیس چاہیے جو پروفیسر کے بینک لاکر میں ہے۔ اس کے بغیر تمہیں چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''میں کہہ چکی ہوں، اسے صرف میں ہی نکال سکتی ہوں۔''

''یہ خوش فہمی ہے تمہاری کیونکہ میں کچھ مسائل میں گھرا ہوں۔ مجھے ذرا ان سے فارغ ہو جانے دو اس کے بعد میں بینک لاکر تک رسائی کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکال لوں گا۔ لیکن اس صورت میں، میں تمہیں رہا نہیں کروں گا بلکہ دوبارہ فتح خان کے حوالے کر دوں گا۔''

شہلا اگر ڈری تھی تب بھی اس نے ظاہر نہیں کیا تھا۔ بہرحال فتح خان اور اس کے آدمی اس کے لیے کوئی خوشگوار یادیں تھے انہوں نے اسے جانور کی طرح استعمال کیا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے کہا۔ ''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اگر میں تمہیں اپنا منصوبہ بتا دوں تو تم لاکر کی باقی چیزوں سے کوئی سروکار نہیں رکھو گے۔''

اگرچہ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر مجھے لاکر تک رسائی کا موقع ملا تو میں بریف کیس حاصل کرنے کے ساتھ لاکر میں موجود پروفیسر کا بلیک میلنگ کا تمام اسٹف ضائع کر دوں گا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ شہلا بھی اس اسٹف کے چکر میں ہے اور اگر میں نے اسے اپنے اصل عزائم سے آگاہ کر دیا تو وہ مجھ سے تعاون سے انکار کر دے گی۔ اس لیے میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ''کیوں نہیں، میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں مجھے صرف بریف کیس سے مطلب ہے۔''

شہلا نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، میں تمہاری زبان پر اعتبار کر رہی ہوں لیکن مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دو۔''

''یہاں اس کمرے میں بیٹھ کر تم آرام سے سوچ سکتی ہو لیکن خیال رہے کہ یہ مدت اتنی طویل نہ ہو کہ تمہاری وفات کا وقت آ جائے، تم جانتی ہو میرے پیچھے مرشد اور فتح خان جیسے دشمن لگے ہوئے ہیں ورکل رات تم بھی مرتے مرتے بچی ہو۔''

''مجھے بس کل تک کی مہلت دو۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے سوچ لو، لیکن میری بات یاد رکھنا تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور میں بھی تمہیں زیادہ دیر اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ و... اگر میں تمہیں اپنے پاس نہیں رکھ سکا تو آزاد کرنے کا خطرہ مول لینے کے بجائے فتح خان کے حوالے کر دوں گا اور اس کے پاس تمہارا کم سے کم مصرف تو ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے بھرائے لہجے میں کہا۔

''فتح خان بہت ذلیل اور گھٹیا آدمی ہے۔ اس نے اور اس کے کتوں نے میرے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا ہے۔''

''اگر تم چاہتی ہو کہ تمہارے ساتھ اس سلوک کا اعادہ نہ ہو تو مجھ سے تعاون کرو ورنہ....'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور اس کے کمرے سے نکل آیا۔ میں رات کو صرف دو گھنٹے سویا تھا پھر بہت زیادہ بھاگ دوڑ اور قتل و غارت گری نے مجھے ذہنی اور جسمانی طور پر تھکا دیا تھا میں نے بہتر سمجھا کہ کچھ دیر کے لیے سو جاؤں۔ ایاز اور بیتو نیچے کچن کھانے میں مصروف تھے۔ صابر کو کھانا اوپر ہی دے دیا تھا۔ میں آ کر لیٹا ہی تھا کہ سفیر کی کال آ گئی۔ وہ برہم تھا میری آواز سنتے ہی چلانے لگا۔

''شہباز تو واجب القتل ہو گیا ہے تو نے رات کو بتایا کیوں نہیں؟''

''تو تُو کیا کرتا توپ لے کر آ جاتا؟'' میں نے کہا۔

''وہی کرتا جو عبداللہ نے کیا۔ ویسے اصل کام ہم کر چکے تھے۔ اس لیے تیرا یاد سم کا آنا بیکار تھا۔''

''تو کم سے کم بتا تو سکتا تھا۔'' وہ ابھی تک برہم تھا۔

''ضرورت ہوتی تو ضرور بتاتا، بلاوجہ تم دونوں کو پریشان کرنے کا فائدہ نہیں تھا۔ وہ ٹھکانا تو تباہ ہو گیا لیکن اب ہم پہلے سے بہتر جگہ پر ہیں اور مرشد کے دو آدمی بھی ہاتھ لگے ہیں۔''

سفیر نے روانی سے مرشد کی شان میں قصیدہ گوئی کی جو قطعی ناقابلِ بیان ہے۔ لگتا تھا مونا اس کے آس پاس نہیں ہے ورنہ اس زبان و بیان پر اس کا بیویانہ لیکچر شروع ہو جاتا۔ میں نے اسے مختصراً صبح سے اب تک ہونے والی پیش رفت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

..... کے بارے میں بتایا۔ سفیر اور وسیم نے اپنے موبائلز کی ہم بدل لی تھیں۔ میں نے اس سے کہا۔ ''یار میں نے شہلا کا قصہ نمٹانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

سفیر غالباً اُچھل پڑا تھا۔ ''کیا کرے گا اس کا مرڈر.....؟ پیار سے یا ہتھیار سے؟''

''بکواس نہ کر..... ویسے کرنا تو یہی چاہیے لیکن میں اب پہلے بریف کیس والا معاملہ نمٹا دینا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد میری بلا سے یہ جہنم جائے۔ میں اب اپنی ساری توجہ مرشد اور فتح خان پر لگانا چاہتا ہوں۔ خاص طور سے مرشد آپے سے باہر ہوگیا ہے اسے کوئی جھٹکا پہنچانا ضروری ہے۔''

''تیری فتح خان سے کیا بات ہوئی ہے؟''

''میں نے اسے بتایا ہے کہ حملہ مرشد کے آدمیوں نے کیا ہے اور ان کی طرف سے مارے جانے والے راکٹ نے شہباز خان اور قسم خان کی جان لی ہے۔ لگ تو ایسا رہا ہے کہ بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے اور اب اس کی آتش فشانی کا رُخ مرشد کی طرف ہوگا۔''

''وہ مرشد کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا.....'' سفیر نے کہا۔ ''خیر اسے مارگولی یہ بتا کہ شہلا کے ساتھ کیا کرنا ہے؟''

''میں نے اسے کل تک کی مہلت دی ہے۔ اس کے بعد میں اسے ایک طرف کر کے خود اس بینک لاکر تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور اس صورت میں شہلا کو فتح خان کے حوالے کردوں گا۔''

''کیا یہ مناسب ہوگا؟''

''اس جیسی عورت کے لیے تو بالکل مناسب ہوگا'' ..... میں نے کہا۔ ''اچھا اب میں سونے والا ہوں۔ مہربانی کر کے چار گھنٹے سے پہلے کوئی تنگ نہ کرے اور وسیم کو بھی حالات سے آگاہ کردینا۔''

''میں اور وسیم تیرے پاس آرہے ہیں۔''

''نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''ابھی تم وہیں ٹھہرو۔''

''اس معاملے میں تیری نہیں سنی.....'' سفیر نے کہا۔ ''اور سنا ہے کوئی نئی مظلومہ ہاتھ آئی ہے اسے بھی تو دیکھنا ہے۔''

''اچھا بھائی دیکھ لے..... لیکن وہ بے چاری سچ مچ مظلوم ہے۔ کل رات اس کا باپ مارا گیا۔''

''ہاں یار تو ہم بھی تعزیت ہی کریں گے۔'' سفیر نے کہا اور کال کاٹ دی مجھے معلوم تھا کہ وہ رکے گا نہیں۔ میں نے فون بند کردیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ دماغ کسی قدر منتشر تھا اس لیے سونے میں کچھ وقت لگا۔ میں شام تک سوتا رہا سورج غروب ہونے کے بعد بیتو مجھے اُٹھانے آگیا۔

''شوبی اُٹھ جاؤ کب تک سوتا رہے گا۔''

میں نے انگڑائی لی۔ ''ٹائم کیا ہوا ہے؟''

''چھ بج رہا ہے۔'' اس نے اطلاع دی۔ ''سفیر اور وسیم بھائی بھی آگیا ہے۔''

میں نے اُٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ باہر آیا تو سردی کی شدت میں نمایاں اضافہ محسوس ہوا تھا۔ وسیم، سفیر اور ایاز نیچے لاؤنج میں موجود تھے۔ شاہین حسبِ معمول کچن میں تھی اور اس نے یہ کام ذمے داری سمجھ کر سنبھال لیا تھا۔ میں اندر آیا تو اس نے چائے کا پوچھا۔ ''آپ کے لیے بناؤں؟''

''ہاں بنادو لیکن شاہین یہ تمہاری ذمے داری نہیں ہے۔''

''میں یہاں رہ رہی ہوں اور اپنی خوشی سے کر رہی ہوں۔'' اس نے پانی رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگوں نے مجھے ان بدمعاشوں سے بچایا، میرے بابا کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ یہ مجھ پر آپ کا احسان ہے۔''

''لیکن اس کا مطلب یہ نہیں..... کہ تم ہمارے لیے ہمہ وقت کچن میں موجود رہو۔''

وہ مسکرائی۔ ''اتفاق سے آپ جب بھی آئے تو میں یہاں پائی گئی لیکن میں تو زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں رہی ہوں۔''

اس نے چائے کا کپ میرے سامنے رکھا تو میں نے کہا۔ ''تم بھی بیٹھو، مجھے تم سے معلوم کرنا ہے تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

اس نے شاید اس بارے میں نہیں سوچا تھا کیونکہ جب میں نے پوچھا تو اس کا چہرہ یک دم بجھ گیا تھا۔ اس نے بے دلی سے کہا۔ ''سچی بات ہے کہ مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کہاں جاؤں۔ یہ میں نے جس اسکول پرنسپل کی بات کی تھی جہاں میں پڑھاتی ہوں۔ اب میں سوچتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ وہ بھی مجھے پناہ نہیں دے سکتی ہیں۔''

''مجھے پہلے بھی یہ ممکن نہیں لگ رہا تھا کیونکہ آج کل لوگ کسی بھی مشکل میں پڑنے کو تیار نہیں ہوتے'' میں نے سر ہلایا۔ ''تمہارا ہمارے بارے میں کیا خیال ہے؟''

وہ گڑبڑائی۔ ''جی کیا مطلب؟''

''مطلب ہم کیسے لوگ ہیں کیا تمہیں ہم سے کوئی خوف محسوس ہوا؟''

''بالکل بھی نہیں۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔ ''آپ سب بہت اچھے ہیں۔ آپ، بیتو بھائی اور ایاز۔''

میں نے نوٹ کیا کہ اس نے بیتو کو تو بھائی کہا تھا لیکن ایاز کو نہیں حالانکہ ایاز عمر میں بیتو سے کہیں بڑا تھا۔ ''اگر تمہیں کچھ وقت یہاں گزارنا پڑے تو میرا خیال ہے تمہیں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ تم آرام سے اپنے آنے والے کل کے بارے میں سوچو اور جو فیصلہ کرو مجھے بتا دو۔ میں اور میرے ساتھی تمہاری جو مدد کرسکیں ہم ضرور کریں گے۔''

''میں اس مدد کے لیے آپ کی شکر گزار ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''تم نے محسوس کرلیا ہوگا کہ ہم عام انسان نہیں ہیں۔ ہمیں خاص حالات درپیش ہیں۔ بہت سارے لوگ ہمارے دشمن ہیں اور وہ ہمارے ساتھ کیا کرسکتے ہیں اس کا ایک نمونہ تم کل رات دیکھ چکی ہو۔ یعنی ہمارے ساتھ رہنا زندگی کا رِسک بھی ہے۔''

''میں جان چکی ہوں لیکن میرے پاس آپ لوگوں کے ساتھ رہنے کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں.....'' اس نے افسردگی سے کہا۔ ''میرا یہاں کوئی نہیں ہے۔ پتا نہیں بابا کی تدفین کس طرح ہوئی ہوگی؟''

''تم فکر مت کرو ابھی لوگ اتنے بے مروت بھی نہیں ہوئے ہیں کہ ایک شخص کی تدفین بھی نہ کرسکیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

وہ پُرامید نظر آنے لگی۔ ''آپ معلوم کرسکتے ہیں، شاید میں آخری بار بابا کو دیکھ سکوں۔''

میں نے ندیم کو کال کی۔ وہ میری آواز نہیں پہچان سکا اور کچھ اور سمجھا تھا۔ ''اوہ بھائی کیوں تنگ کر رہے ہو مجھے تمہارا کیس نہیں لینا۔''

''میرا کیس تو تمہارا باپ بھی لے گا۔'' میں نے آواز بدل کر کہا۔

''تو انہی کے پاس چلے جاؤ میں قبرستان اور قبر کا پتا سمجھا دیتا ہوں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''ان کے پاس تو تمہیں لے جا کر گاڑوں گا۔'' اس بار میں نے اصل آواز میں کہا تو ندیم نے پہچان لیا۔

''ابے او گورکن کی اولاد۔'' وہ چلّانے لگا۔ ''میرے بیوی بچوں کے دشمن تیری وجہ سے وہ جلد بیوہ اور یتیم ہو جائیں گے۔''

''انشاءاللہ..... میرا مطلب ہے کہ اللہ نے چاہا تو نہیں چاہا تو نہیں ہوں گے۔ یہ بتا کچھ ہوا ہے۔''

''یہ پوچھ کہ کیا نہیں ہوا۔'' اس نے بھنّائے لہجے میں کہا۔ ''تم لوگ پتا نہیں کیا کرتے پھر رہے ہو پولیس رات کو جی ٹی روڈ پر تباہ ہونے والے مکان کے کیس میں تیرا نام آگیا ہے اور وہاں ملنے والی لاشیں بھی تیرے کھاتے میں ڈال دی گئی ہیں۔''

میں چونکا تھا۔ ''پولیس کو کس نے بتایا؟''

''بتایا؟..... ارے بھائی پولیس مرشد کے اشاروں پر ناچ رہی ہے اور اسی نے یہ کام کرایا ہے۔ گواہ بھی ملے ہیں جنہوں نے تجھے اس مکان میں دیکھا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یہ ایک کیس اور میرے گلے... پڑ گیا ہے۔''

''بیٹے یہ زیادہ خطرناک ہے کیونکہ معاملہ انسداد دہشت گردی کی عدالت تک جائے گا۔ تیرے چھ میں سے چار کیس تو میں نے ختم کرا دیے ہیں۔ راجا صاحب نے بھی مدد کی ہے۔ لیکن تجھ پر تھانے میں مار پیٹ اور پولیس والوں پر قاتلانہ حملے کا کیس موجود ہے۔ وہ بھی کسی طرح ختم ہو جاتے لیکن یہ نیا معاملہ بڑا خطرناک ہے۔''

''چل اسے بھی دیکھ لیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''اب تو اپنی بات کر تیرے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

''کیا بات کروں کل شام میرے دفتر میں مرشد کے کتے آئے تھے انہوں نے مجھے تو کچھ نہیں کہا لیکن دفتر کا بیڑا غرق کردیا اور میرے چپڑاسی کا بازو توڑ کر چلے گئے۔''

میں پریشان ہوگیا تھا کیونکہ مجھے پہلے ہی خدشہ تھا کہ مرشد اب مجھے ہر زاویے سے گھیرنے کی کوشش کرے گا اور میرا اندیشہ درست نکلا تھا۔ ''تجھے کیسے پتا چلا کہ مرشد کے آدمی ہیں؟''

''ایک تو ان کے چہروں پر مرشد جیسی نحوست تھی اور دوسرے انہوں نے خود بتایا۔'' اس نے کہا۔ ''ان کے سرغنہ نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے تمہارے کیس سے دست برداری اختیار نہیں کی تو مجھے زندگی سے دست بردار ہونا پڑے گا۔''

''ندیم تُو ان کی بات مان لے۔'' میں نے کہا۔

''بکواس نہ کر وہ تو میں تجھ پر بھڑاس نکال رہا تھا۔ میں نے بھی مرشد کی ایسی کم تیسی نہ کردی تو میرا نام ندیم نہیں میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

..... ٹی وی والوں اور اخباری نمائندوں کو بلا لیا تھا اور دفتر پر حملے کو سرکاری غنڈہ گردی ظاہر کیا ہے۔ میں نے بار کونسل میں بھی رپورٹ کر دی ہے، تو جانتا ہے آج کل حکومت اور وکیلوں کی ٹسل چل رہی ہے۔ میں نے مرشد کا نام نہیں لیا ہے، میرے دفتر میں خفیہ کیمرا لگا ہے اس نے آنے والوں کی تصاویر اُتاری ہیں۔ یہ فوٹیج بھی ٹی وی والوں کو دے دی ہیں۔"

"یہ تُو نے اچھا کیا کہ مرشد کا نام نہیں لیا۔ لیکن میں پوری سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ مرشد ان دنوں فرعون بنا ہوا ہے۔ کل رات کا واقعہ اس کی طرف سے مجھے ختم کرنے کی کوشش تھی لیکن میری قسمت اچھی تھی اسی کے ساتھی مارے گئے اور ہم بچ نکلے۔"

"کب تک بچتے رہو گے؟" ندیم نے سرد آہ بھری۔

"جب تک اللہ چاہے گا۔ میرا مشورہ مان لے عارضی طور پر ..... میرے کیسز سے دست بردار ہو جا کیونکہ اب میں نے معاملہ عدالت سے باہر نمٹانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"تیرا ارادہ کیا ہے؟"

"تجھے بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے اسے ٹال دیا۔ "ابھی تجھ سے ایک کام ہے۔ کل رات ایک اور جگہ بھی کچھ لوگ مارے گئے ہیں، وہاں گھر سے ایک بزرگ آدمی کی لاش بھی ملی ہوگی۔"

"ہاں میں نے شاید ٹی وی میں دیکھا ہے۔"

"معلوم کرو کہ اس بزرگ کی تدفین کون کر رہا ہے اور کب کر رہا ہے؟"

"معلوم ہو جائے گا، لیکن اس قسم کے کام عام طور سے مخیر حضرات ہی کرتے ہیں۔"

"وہ لاوارث نہیں ہے، اسکول ہیڈ ماسٹر ہے اور محلے میں اس کا ذاتی مکان ہے میرا خیال ہے یہ کام اس کے ساتھی اور محلے والے مل کر انجام دیں گے۔ لیکن مجھے معلوم کر کے بتا۔"

"ٹھیک ہے تُو کہتا ہے تو معلوم کر لیتا ہوں۔" اس نے کہا۔

بیوی بچوں کا حال احوال معلوم کر کے میں نے موبائل بند کیا۔ شاہین رو رہی تھی۔ میں اسے تسلی دینا چاہتا تھا لیکن مجھے خواتین کو تسلی دینے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس لیے میں نے ایک گلاس پانی اس کے سامنے رکھ دیا۔ اسے پی کر اس نے آنسو صاف کیے۔ "کاش میں آخری بار بابا کو دیکھ سکتی۔"

"یہ ممکن تو ہے لیکن اس کا امکان ہے کہ استاد فانا کے بچے کھچے آدمی انتقام کے چکر میں وہاں موجود ہوں گے اور تمہارے لیے خطرہ ہوگا۔"

وہ چپ ہو گئی لیکن پھر اس نے سر ہلایا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں میرا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"تم اپنے بابا کا زندگی والا چہرہ یاد رکھو، کیا فائدہ اُن کو کفن میں لپٹے دیکھنے کا۔ ان کے لیے دعا کرو۔"

اس نے چہرہ صاف کیا۔ "میں مسلسل اُن کے لیے دعا کر رہی ہوں۔"

مجھے خیال آیا کہ اگر میں اسے عبداللہ والی کوٹھی پر بھجوا دوں ..... تو وہ اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے تک وہاں رہ سکتی تھی۔ ممکن ہے عبداللہ اس کے لیے کسی ملازمت کا بندوبست کر دیتا۔ میں نے شاہین سے کہا۔ "میرے دو ساتھیوں کی بیویاں بھی ہیں اور وہ ایک جگہ رہتی ہیں۔ یہاں تم اکیلی لڑکی ہو اگر تم چاہو تو میں تمہیں ان کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ وہاں تمہیں تنہائی کا احساس بھی نہیں ہوگا اور وہ جگہ محفوظ بھی ہے۔"

"اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو مجھے وہاں جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔" شاہین نے کہا پھر اس نے کسی قدر تجسس سے پوچھا۔ "یہ لوگ آپ کے دشمن کیوں ہیں؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے یوں سمجھ لو کہ میرے دشمن فرعون صفت ہیں اور میں ان کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"آج کل ہر طرف ایسے ہی فرعون ہیں۔" اس نے تلخی سے کہا۔ "جن کا مطالبہ یہی ہوتا ہے کہ سامنے والا ان کے سامنے جھک جائے اور ان کی ہر جائز اور ناجائز بات مانتا جائے ورنہ وہ اس سے جینے کا حق بھی چھین لیں گے۔"

"اس کی وجہ ہے لوگوں نے اپنے حق کے لیے ڈٹ جانا چھوڑ دیا ہے اور ہر فرعون کے سامنے جھک جاتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جب تک ان فرعونوں کے سامنے کوئی کھڑا نہیں ہوگا یہ اسی طرح دوسروں کا جینا حرام کر کے رکھیں گے۔"

"میں نے یہی کیا ہے اور یہی میرا قصور ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر تم تیار ہو تو میں ابھی تمہیں بھجوا دیتا ہوں۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے کہا اور چائے کے برتن دھونے کے لیے سنک میں رکھنے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ یہاں سے جانے پر دل سے آمادہ نہیں تھی لیکن وہ یہ

بات ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں نے باغ میں آتے ہوئے عبداللہ کو کال کی اور اسے شاہین کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا۔ "جناب میں خود آپ سے یہی کہنا چاہ رہا تھا کسی غیر متعلقہ فرد کا وہاں رہنا درست نہیں ہے۔ میں ابھی آدمی بھیج رہا ہوں آپ شاہین کو اس کے ساتھ روانہ کر دیجئے گا۔"

"ٹھیک ہے تم اپنا آدمی بھجوا دو۔" میں نے کہا۔ "عبداللہ تم میرے وکیل ندیم کے بارے میں جانتے ہو؟"

"بہت اچھی طرح جناب، ایک بار ان سے ملاقات بھی ہوئی ہے۔ آپ کے کیسز کے سلسلے میں اور راجا صاحب کی خواہش تھی کہ وہ یہاں ان کے قانونی معاملات دیکھیں لیکن ندیم صاحب نے اپنی مصروفیات کی وجہ سے معذرت... کر لی تھی۔"

ان باتوں کا مجھے علم نہیں تھا۔ "یار کل ندیم کے دفتر پر حملہ ہوا ہے اور مرشد کے آدمیوں نے وہاں غنڈہ گردی کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے گھر دفتر اور آنے جانے کے لیے حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔"

"ہو جائے گا۔" اس نے کہا۔ "میرے آدمی براہِ راست تو ان کی حفاظت نہیں کریں گے لیکن وہ دور سے ان پر نظر رکھیں گے اور دفتر کے لیے میں ایک اچھی سیکورٹی ایجنسی کے گارڈ بھجوا دیتا ہوں۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" میں نے کہا۔

ندیم سے ہونے والی گفتگو نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ مرشد ایک بار پھر مجھ سے متعلقہ افراد کو چھیڑ رہا تھا۔ میں نے حویلی کال کی۔ ماں جی اور بابا سے بات ہوئی۔ میں نے بابا کو بتایا کہ آج کل بہت محتاط رہیں۔ پھر میں نے رفیق بھائی کے گھر کال کر کے آپا اور شمی سے بات کی۔ شمی بہت خوش تھی کیونکہ عتیق تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ سردی کی شدت کی وجہ سے ایک بار پھر دھند چھا رہی تھی۔ میں اندر آیا تو وسیم، سفیر اور ایاز آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔ ایاز اپنی ابتدائی ججھک پر قابو پا کر پوری طرح ہمارے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ بیتو ایک طرف آئی فون لیے بیٹھا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "شوبی یہ تو بہت مزے کا ہے۔"

"اس میں انٹرنیٹ بھی ہے تمہیں استعمال کرنا سکھاتا ہوں۔" میں نے اس سے آئی فون لیا اور اسے انٹرنیٹ استعمال کرنے کے طریقے سکھانے لگا۔ بیتو کی تعلیم زیادہ نہیں تھی لیکن بنیادی طور پر وہ بہت ذہین لڑکا تھا تب ہی تو اس نے بہت تیزی سے خود کو شہری ماحول میں ڈھال لیا تھا۔ آدھے گھنٹے میں وہ انٹرنیٹ استعمال کرنا سیکھ چکا تھا حالانکہ کسی کمپیوٹر کے مقابلے میں آئی فون میں انٹرنیٹ ذرا مشکل ہوتا ہے۔

"شہباز ان دونوں نمونوں کا کیا کرنا ہے؟" سفیر نے پوچھا تو میں ان کے پاس آ بیٹھا۔ اس کا اشارہ مرشد کے آدمیوں کی طرف تھا۔

"انہیں مرشد کے خلاف استعمال کرنا ہے۔"

ایاز نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ مرشد کو نعوذ باللہ خدا کے درجے پر رکھتے ہیں وہ کسی صورت اس کے خلاف ہمارا ساتھ نہیں دیں گے۔"

"ایسا نہیں ہے یار، مرشد کو قریب سے جاننے والے جانتے ہیں وہ انسان تو کیا شیطان کہلانے کا مستحق بھی نہیں ..... ابھی یہ صرف بڑکیں مار رہے ہیں ذرا ان کو زخمی حالت میں بھوک پیاس کی مار سہنے دو اس کے بعد دیکھنا۔"

وہ سب جاننے کے لیے بے چین تھے کہ آج میں نے کیا کیا۔ میں سفیر کو مختصراً بتا چکا تھا۔ اس لیے اب ذرا تفصیل سے انہیں بتایا پھر شہلا کے بارے میں اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ "میں جلد از جلد اس سے چھٹکارا پانا چاہتا ہوں۔"

"ہاں بھیا۔" سفیر نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "کہیں ہمیشہ کے لیے گلے نہ پڑ جائے، کتنے سکون سے یہاں رہ رہی ہے۔"

"رات کو کپڑے اُتار کر سوتی ہے۔" وسیم نے کہا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" میں نے پوچھا تو وسیم جھینپ گیا۔

"ایک رات اس کے کمرے میں گیا تھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ اتنی دلیر عورت ہے کسی کی قید میں اس طرح سارے کپڑے اُتار کر سو سکتی ہے۔"

ایاز مسکرانے لگا۔ "میں نے دیکھا تھا وسیم صاحب یوں کمرے سے باہر آئے جیسے انہوں نے اندر کوئی شیر دیکھ لیا ہو۔"

وسیم ہنسا۔ "ایسی عورت کو آدم خور شیرنی ہی سمجھو۔"

ایاز نے کچھ دیر بعد کہا۔ "شہباز صاحب آپ نے مرشد کو جواب دینے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"سچی بات ہے کہ ابھی کچھ نہیں سوچا....." میں نے جواب دیا۔ "ویسے بھی میں پہلے بریف کیس حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اگر آپ کہیں تو میں مرشد پر کام کروں۔ وہ اور اس کے آدمی مجھے نہیں جانتے۔"

"کیا کام کرو گے؟" وسیم نے پوچھا۔

"آغاز ان دونوں سے کروں گا اور ان سے جو معلومات ملے گی اس کی روشنی میں آگے دیکھوں گا۔" اس نے اپنی حکمتِ عملی بیان کی۔

"ایاز ٹھیک کہہ رہا ہے۔" سفیر نے اس کی تائید کی۔ "اب ہم پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہیں اس لیے ہم سب کو ایک ہی کام کرنے کے بجائے الگ الگ ٹاسک بانٹ لینے چاہییں۔"

"ٹھیک ہے ایاز یہ کام تمہارے سپرد ہے۔ تم بیتو کو اپنے ساتھ رکھو، میں وسیم اور سفیر مل کر شہلا والا معاملہ دیکھتے ہیں۔"

"بس تو پھر ابھی دیکھتے ہیں۔" ایاز کھڑا ہوگیا۔ "ویسے بھی ہاتھ پاؤں چلانے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"ہمارا بھی۔" بیتو نے موبائل رکھ دیا اور ایاز کے ساتھ چلا گیا۔

کچھ دیر میں عبداللہ کا آدمی آگیا تھا۔ میں نے شاہین کو اس کے ساتھ روانہ کر دیا۔ وہ کچھ ہچکچائی تھی لیکن پھر میرے کہنے پر چلی گئی۔ ابھی اسے ہمارے پاس آئے پورا ایک دن بھی نہیں ہوا تھا لیکن وہ ہم پر اعتماد کرنے لگی تھی۔ یہ اعتماد ہی تھا ورنہ وہ میرے کہنے پر ایک اجنبی کے ساتھ جانے پر آمادہ نہ ہوتی۔ بیتو اور ایاز مرشد کے آدمیوں کے ساتھ مصروف تھے اور بعض اوقات ان کی مصروفیت کی آوازیں کمرے سے باہر بھی سنائی دیتی تھیں۔ میں نے سفیر سے کہا۔

"چل یار کہیں سے کھانے کو کچھ لے آتے ہیں۔"

وسیم نے فریاد کی۔ "میں نے کیا قصور کیا ہے؟"

"یار کسی کو تو یہاں ہونا چاہیے۔"

"ایاز ہے، بیتو ہے اور صابر بھی ہے۔"

"صابر سو رہا ہے۔" سفیر نے اسے آگاہ کیا۔ "وہ کل رات سے جاگا ہوا تھا۔"

"شہلا کی نگرانی بھی ضروری ہے اگرچہ وہ کمرے میں بند ہے لیکن اس جیسی عورت سے کچھ بعید نہیں..... وہ فرار کی کوشش کر سکتی ہے۔ میں نے اسے کل تک مہلت دی ہے۔"

مجبوراً وسیم رکنے کو تیار ہوگیا تھا۔ میں اور سفیر باہر نکلے۔ احتیاطاً ہم نے کچھ اسلحہ رکھ لیا تھا کیونکہ اب دشمن سے واسطہ معمول کی بات بن چکی تھی۔ بلکہ اب دشمنوں سے سامنا نہ ہو تو حیرت ہوتی تھی۔ دشمن نہ ملتے تو دشمن جیسے کچھ لوگ مل جاتے تھے جیسا کہ شاہین کے کیس میں ہوا تھا۔ بہر حال شدت کی سردی اور ہلکی سی دھند میں امکان کم تھا کہ ہمارا دشمنوں سے واسطہ پڑتا۔ ہم اسلام آباد کی طرف روانہ ہوگئے۔

میں نے سفیر سے پوچھا۔

"کل کیا رہا؟"

وہ خوش نظر آنے لگا۔ "میرے رک جانے سے مونا خوش تھی، واقعی یاران عورتوں کو ہماری توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ سعدیہ تو دیکھنے والی ہو رہی تھی۔ تو نے بہت نیکی کا کام کیا ہے۔"

"بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔"

"کب؟" سفیر ہنسا۔ "ہمیں آئے ہوئے دس دن بھی نہیں ہوئے ہیں۔"

ہم اسلام آباد پہنچے تو مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ اس بینک کا معائنہ کر لیا جائے، جہاں پروفیسر نفیس کا لاکر موجود تھا۔ یہ بینک اسلام آباد میں ہی تھا۔ میں نے سفیر سے کہا تو وہ مان گیا اور مجھے خبردار کیا۔ "لیکن صرف معائنہ کرنا ہے کوئی پنگا نہیں لینا۔"

"میں پنگا نہیں لیتا ہوں پنگا خود مجھے لیتا ہے۔" میں نے گاڑی کا رُخ بینک کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ یہ ایک کمرشل ایریا تھا لیکن رات ہوتے ہی محاورے کے مطابق یہاں الو بولنے لگتے تھے۔ اسلام آباد میں ہی سرِ شام سب بند ہو جانے کا رواج ہے۔ سردیوں میں اور بھی جلدی سب بند ہو جاتا ہے۔ ایسا کچھ یہاں بھی تھا۔ اس بینک کے ساتھ اے ٹی ایم بھی تھا۔ اس زمانے میں اے ٹی ایم بینک کی عمارت سے باہر ہوتے تھے یا اگر عمارت میں ہوتے تھے تب بھی ان کا مشین والا حصہ باہر ہوتا تھا۔ یہ بھی کچھ اسی قسم کا اے ٹی ایم تھا۔ میں نے سفیر سے کہا۔

"میں رقم نکالنے کے لیے جا رہا ہوں تم ذرا اندر سے جائزہ لیتے رہو۔" میں کہتے ہوئے اُترا اور اے ٹی ایم کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک گارڈ بینک کے بند دروازے کے سامنے موجود تھا۔ میں نے مشین میں کارڈ ڈالا اور رقم نکالنے لگا۔ مجھے رقم کی ضرورت نہیں تھی میں صرف بینک کی عمارت کو پاس سے دیکھنا چاہتا تھا۔ رقم نکال کر میں نے گارڈ سے ہاتھ ملا کر کہا۔

"اگر اے ٹی ایم کے ساتھ مسئلہ ہو جائے تو آدمی کس سے بات کرے؟"

"کیسا مسئلہ صاحب؟"

"جیسے رقم نہ نکلے تو؟"

"اُدھر بینک میں ایک رات کا آدمی ہوتا ہے وہ مسئلہ دیکھتا ہے۔" اس نے بتایا۔ "کیا آپ کو کوئی مسئلہ ہے؟"

"نہیں لیکن ہو بھی سکتا ہے میں یہاں پاس رہتا ہوں اس لیے اکثر اس اے ٹی ایم سے رقم نکلواتا ہوں۔" میں نے کہا اور جانے کے لیے مڑا تھا کہ ایک بڑی کار آکر ہماری جیپ کے پیچھے رکی۔ خوش قسمتی سے میں بینک کے سامنے رکھے ایک بڑے آرائشی گملے کے پیچھے تھا جس میں بڑا سا پودا لگا تھا۔ کیونکہ کار سے اُترنے والا شخص فاضلی تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید آج کسی دشمن سے سامنا نہ ہو لیکن میری قسمت میں لکھا تھا میں جہاں جاؤں وہاں اپنی جان کے کسی نہ کسی گاہک کو سامنے پاؤں۔ اسے دیکھ کر پہلا خیال یہی آیا کہ وہ ہمارا تعاقب کرتا ہوا یہاں آیا ہے۔ لیکن اس نے خود اس اندیشے کی تردید کر دی۔ اس نے کار کے اندر کسی سے کہا۔

"ٹھیک ہے حرامزادی پہلے تیرا معاوضہ تیرے منہ پر مارتا ہوں۔"

فاضلی کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ سخت مشتعل ہے اُس نے دھڑ سے دروازہ بند کیا اور اے ٹی ایم کی طرف آیا۔ وہ گملے کے ایک طرف سے گزرا اور میں دوسری طرف سے سڑک کی طرف آیا۔ میں نے کار سے چہرہ مخالف سمت میں رکھا تھا۔ ممکن ہے وہاں بھی میرا کوئی چہرہ شناس ہو۔ جو نظر بھی قیامت کی رکھتا ہو۔ اتنی کم روشنی اور دھند میں بھی مجھے پہنچان جائے۔ حالانکہ کار کے شیشے بھی تاریک تھے۔ یہ بڑی سائز کی لیکن پُرانے ماڈل کی کار تھی۔ میں جیپ میں گھسا اور سفیر سے کہا۔ "تو نے دیکھا اس حرامی کو؟"

بند شیشوں کے پیچھے اسے فاضلی کی آواز نہیں آئی تھی۔ میں نے اسے فاضلی کے بارے میں بتایا تو وہ فکرمند ہو گیا۔ "شہباز یہاں سے نکل، اس سے پہلے یہ بھی تجھے دیکھ لے۔"

"اتنی جلدی کیا ہے یار!" میں نے جیپ اسٹارٹ کی۔ "جب ایک دشمن سامنے آ ہی گیا ہے تو ذرا دیکھتے ہیں یہ کر کیا رہا ہے۔ کار میں کوئی خاتون ہے جس کی ولدیت پر فاضلی نے شک کیا ہے اور اس کا معاوضہ پیشگی دینے کا اعلان کیا ہے غالباً اسی لیے وہ اے ٹی ایم کی طرف گیا ہے۔"

فاضلی کی بات سے یہ تو ظاہر تھا کہ اس کی کار میں کوئی کال گرل قسم کی چیز تھی لیکن وہ اسے کہاں لے جا رہا تھا اور کس کے لیے لے جا رہا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ فاضلی میرے سامنے تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اسے اُٹھا لوں۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ فاضلی عجلت میں واپس آیا۔ وہ کار میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا اس کا مطلب تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی اور تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی کار آگے بڑھ گئی تھی۔ جب وہ اتنی آگے نکل گئی کہ اس کی عقبی سرخ روشنیاں بھی مدھم پڑ گئی تھیں تو میں نے جیپ آگے بڑھا دی۔ دھند کی وجہ سے کار بہ مشکل ہی نظر آ رہی تھی۔ سفیر مجھ سے متفق نہیں تھا۔ اس نے کہا۔

"دیکھ بھائی یہ حرامی پہلے بھی تیرے ساتھ یہ کھیل کھیل چکا ہے۔ جب تیرے ساتھ..... مرحومہ زرین تھی۔ مجھے لگ رہا ہے یہ اب بھی اسی طرح تجھے پیچھے لگا کر لے جا رہا ہے۔"

سفیر کی بات قابلِ غور تھی لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ اس بار معاملہ مختلف ہے۔ "نہیں یار وہ چکر دوسرا تھا۔ پھر وہ میری پوری طرح نگرانی کر رہے تھے اور میری بدقسمتی کہ ان سے بچنے کے چکر میں ڈاکٹر توفیق جیسے ننگِ انسانیت کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔"

"وہ بھائی یہ بھی اس کی کوئی چال ہو سکتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم پھنس جائیں اور واپسی کا راستہ بھی باقی نہ رہے۔"

"یار حوصلہ رکھ..... دشمن اتنا خطرناک یا عقل مند نہیں ہوتا ہے جتنا ہم اسے سمجھ لیتے ہیں۔" میں نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

سفیر بھنّا گیا تھا۔ "لیکن دشمن کو بے وقوف یا کم تر سمجھنا بھی بے وقوفی ہوتی ہے۔"

"تو اسلحہ تیار کر تا کہ ضرورت پڑے تو ہم فوری طور پر استعمال کر سکیں۔" میں نے اپنا پستول چیک کیا۔ عقبی نشست کے نیچے پائیدان میں کپڑے میں لپٹی دو چھوٹی خود کار رائفلیں تھیں۔ یہ سنگل موڈ پر فائر کرنے کے ساتھ ساتھ تین گولیوں کا برسٹ بھی مارتی تھیں۔ سفیر نے سمجھ لیا کہ میں فیصلہ کر چکا ہوں اور ابھی اس کی بات نہیں سنوں گا۔ بادلِ نہ خواستہ اس نے رائفل نکالی۔ پستول اس کے پاس پہلے بھی تھا۔ فاضلی والی کار ہم سے کوئی سو گز آگے جا رہی تھی۔ اسلام آباد کی سڑکوں پر روشنیاں تیز تھیں اگر میں جیپ کی ہیڈ لائٹس بند کر دیتا تب بھی امکان تھا کہ وہ جیپ دیکھ لیتے اور اس صورت میں مشکوک ہو جاتے کیونکہ رات اور دھند میں کوئی ہیڈ لائٹ بند کر کے ڈرائیو نہیں کرتا..... اس لیے روشن ہیڈ لائٹ رکھنا میری مجبوری تھی۔ کچھ دیر میں کار اسلام آباد کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک کم آباد سیکٹر کی طرف مڑ گئی۔ یہاں سرکاری افسران، سیاست دانوں، ججوں اور میڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد کو پلاٹ الاٹ کیے گئے تھے۔ اس وقت یہاں آبادی کم تھی۔ سڑکیں پختہ تھیں لیکن اسٹریٹ لائٹس کم تھیں۔ کوٹھیاں دور دور بنی تھیں۔ میں نے جیپ کی رفتار سست کر دی اور متوازی سڑکوں سے گزرنے لگا۔ یعنی دوسری سڑک سے کار پر نظر رکھنے لگا۔ سفیر نے خبردار کیا۔

''آگے کہیں راستہ بند ہو گیا تو یہ نکل جائیں گے۔''

''اس علاقے میں کہیں ڈیڈ اینڈ نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ فاضلی والی کار برابر والی سڑک سے گزر رہی تھی اس کی روشنیاں میری رہنمائی کر رہی تھیں۔ پھر ایک کوٹھی کے عقب سے گزر کر میں آگے نکلا تو خلافِ توقع کار نظر نہیں آئی اور نہ اس طرف روشنیاں دکھائی دیں۔

''میرا خیال ہے وہ اس کوٹھی میں چلی گئی۔'' سفیر نے اس کوٹھی کی طرف اشارہ کیا جس کا منہ دوسری سڑک کی طرف تھا اور پشت اس سڑک کی طرف تھی جس پر ہم تھے۔ درمیان میں ایک پلاٹ بھی تھا۔ سفیر ٹھیک کہہ رہا تھا کیونکہ اس کوٹھی سے آگے وہ کار نہیں آئی تھی واپسی کی سڑک دور تک صاف نظر آ رہی تھی اگر وہ پلٹ جاتی تب بھی دکھائی دیتی۔ میں نے اس سے کہا۔

''چیک کرنا ہوگا۔''

''کیسے کرو گے۔'' سفیر نے کوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کی ساخت دیکھ رہے ہو ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی قلعہ ہو۔''

واقعی کوٹھی کی ساخت قلعہ نما تھی۔ اس کی چار دیواری دس بارہ فٹ اونچی تھی اور پھر اس پر تین فٹ کی دوہری خار دار تار لگی تھی۔ دس دس فٹ کے فاصلے سے پول تھے جن پر تیز روشنی والے بلب روشن تھے۔ ان سے احاطہ اور اس کے باہر کا حصہ یکساں طور پر روشن ہو رہے تھے۔ یہ انتظامات ظاہر کر رہے تھے کہ کوٹھی میں کوئی اہم شخصیت ہے۔ میرے اور سفیر کے ذہن میں ایک ہی نام آیا تھا میں نے کہا۔

''کہیں یہاں...''

''مرشد تو نہیں ہے؟'' سفیر نے بات مکمل کی۔

لیکن میں نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ ''مرشد قلعہ نما مرشد ہاؤس میں زیادہ محفوظ ہے۔ اسے یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''ضرورت تو ہے بھائی۔'' سفیر کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

''فاضلی ضرورت کا سامان لے کر آیا ہے۔''

''مرشد کو عورتوں کی کمی تو نہیں ہے۔''

''بھائی کس دنیا میں ہو، جو شخص ایک عورت پر گزارا کرنا نہیں جانتا ہو اس کا گزارا ساری دنیا کی عورتوں سے بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ بات عمل کی نہیں نیت کی ہے۔ اب یہ ہر شخص کی استعداد پر ہے کہ وہ آوارگی میں کہاں تک جا سکتا ہے۔'' سفیر نے بات کی اور پتے کی، کی۔ واقعی مرشد جیسے لوگوں کی ہوس کی کوئی حد نہیں ہوتی..... ان کو ساری دنیا کی دولت اور آسائشیں بھی مطمئن نہیں کر سکیں... یہی معاملہ صنفِ نازک کے سلسلے میں تھا میں نے کہا۔ ''اس کا پتا چل جائے گا۔''

''وہ کیسے؟''

''ابھی بتاتا ہوں۔'' میں نے موبائل نکالتے ہوئے کہا اور عبداللہ سے رابطہ کیا۔ ''عبداللہ شہباز بات کر رہا ہوں۔''

''جناب حکم فرمائیں۔'' اس نے میرے لہجے سے اندازہ کر لیا تھا۔

''ایک کوٹھی ہے۔'' میں نے کہا اور عبداللہ کو اس کا ممکنہ پتا سمجھایا۔ ''میں چاہتا ہوں اس کی مکمل نگرانی کی جائے اور اس سے جو شخص نکلے اس کا تعاقب کیا جائے۔''

''میں سمجھ گیا جناب!'' اس نے کہا۔ ''کیا آپ خود وہاں موجود ہیں؟''

''ہاں میں یہیں ہوں۔''

''بس تو میں آ رہا ہوں۔''

میں نے کال کاٹ کر وسیم کو کال کی اور اسے صورتِ حال کے بارے میں بتایا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں مرشد یا اس کے کسی اہم آدمی کا ٹھکانہ معلوم ہو گیا ہے۔''

''مرشد کا تو مشکل ہے۔'' وسیم نے کہا اس معاملے میں وہ میرا ہم خیال تھا۔ ''لیکن یہ ممکن ہے نادر یا مرشد کے خاندان کا کوئی اہم فرد ہو۔''

''واقعی ایسا بالکل ممکن ہے۔ کم از کم کوٹھی کے حفاظتی انتظامات سے لگ رہا ہے کہ اس میں کوئی اہم شخصیت ہے۔''

''شہباز صاحب پاکستان واپسی کے بعد سے میں غور کرتا رہا ہوں کہ ہمیں دشمن کو کس طرح اس حد تک مجبور کر دینا چاہیے کہ وہ امن کی طرف آنے پر راضی ہو جائے۔ میں نے ایک پلان بنایا ہے۔ ہمیں دشمن کے خلاف الل ٹپ کام کرنے کے بجائے ایک باقاعدہ پلان کے تحت کام کرنا چاہیے۔ ہمیں تربیت یافتہ افراد اور جدید آلات کی مدد سے ایک مرکزی

کمانڈ سینٹر بنانا چاہیے۔ آپ آتے ہیں تو اس پر بات کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے ہم آتے ہیں تو اس پر بات کرتے ہیں۔''

عبداللہ اپنے آدمیوں اور ضروری سامان کے ساتھ آدھے گھنٹے میں آ گیا تھا۔ میں نے اسے کوٹھی دکھائی اور تمام معلومات فراہم کیں۔ فاضلی کے بارے میں سن کر وہ پُرجوش ہو گیا تھا۔ ''کیوں نہ فاضلی کو اُٹھا لیا جائے؟''

''یہ کام بھی کیا جا سکتا ہے بہ شرط کہ اسے اُٹھانے میں کوئی ہنگامہ نہ ہو۔'' میں نے کہا۔

''نہیں ہوگا۔'' عبداللہ نے یقین سے کہا۔ ''شہباز صاحب اس معاملے میں مجھے وسیم صاحب کی مدد درکار ہے، وہ بہت تجربے کار آدمی ہیں، انہوں نے کل بھی مجھے بہت کچھ بتایا ہے۔''

''ہاں ایک زمانے میں اس کا گروپ تھا جس میں بہترین لڑکے تھے۔ وہ سب میری وجہ سے ختم ہو گیا اور اب وہ اکیلا میرا ساتھ دے رہا ہے۔''

''ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''لیکن اب میرے لیے دوسری چیزوں کے ساتھ اپنے آدمیوں کو دیکھنا مشکل ہو رہا ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں تم پر واقعی بوجھ ہے۔ تم ہر طرح کے انتظامات بھی دیکھتے ہو اور پھر تمہیں اپنے آدمیوں کو بھی استعمال کرنا پڑتا ہے جبکہ یہ فل ٹائم کام ہے۔''

''بس تو آپ وسیم صاحب سے درخواست کریں کہ وہ یہ کام سنبھال لیں اور میرے پاس .... موجود تمام آدمی ان کے انڈر رہوں گے۔ وہ تجربے کار آدمی ہیں ایک باقاعدہ سیٹ اپ بھی بنا سکتے ہیں جس کی وجہ سے کارروائیوں میں آسانی... ہو گی۔''

مجھے حیرت ہوئی تھی ابھی چند لمحے پہلے وسیم نے مجھ سے یہ بات کی تھی اور اب عبداللہ بھی یہی کہہ رہا تھا۔ ''میں اسے کہتا ہوں مجھے یقین ہے وہ خوشی سے راضی ہو جائے گا۔''

عبداللہ نے دبی زبان میں کہا۔ ''لیکن آپ یا کوئی اور یہ نہ سمجھے کہ میں اپنی ذمے داریوں سے جان چھڑا رہا ہوں۔ آپ حکم دیں تو میں سب کرنے کو تیار ہوں۔''

میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ ''عبداللہ ایسی کوئی بات نہیں ہے تم میرے لیے وسیم اور سفیر کی طرح ہو۔ ہم سب ایک جان ہیں کوئی کسی سے الگ نہیں ہے اگر تم یہ بات مجھ سے کہنے کے بجائے وسیم سے کہتے تو وہ بہ خوشی تمہاری بات مان لیتا اور تمہیں سن کر حیرت ہوگی ابھی تمہارے آنے سے پہلے وسیم سے میری بات ہوئی ہے تو اس نے بھی یہی بات کی ہے۔''

عبداللہ خوش ہو گیا۔ ''مجھے یقین ہے اب کام بہت بہتر انداز میں ہو گا کیونکہ وسیم صاحب اس فیلڈ کے ماہر ہیں۔ میرے پاس موجود ہر فرد اور تمام وسائل ان کے لیے حاضر ہیں۔''

میں نے عبداللہ کو کوٹھی دکھائی۔ ''اس کی نگرانی اس طرح کرنی ہے کہ اندر موجود افراد کو شک نہ ہو۔''

''میرے آدمی یہ کام کر لیں گے۔'' عبداللہ نے کہا۔ اس کے ساتھ تین آدمی آئے تھے اور ان میں سے دو کے پاس بائیک تھی۔ یعنی ان کو کسی کا تعاقب کرنا پڑتا تو یہ اس کے لیے بائیک تھیں۔ میں اور سفیر واپس روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک ریسٹوران سے کھانا پیک کروایا۔ بیتو کو مدِنظر رکھتے ہوئے کچھ باربی کیو لیا اور آدھے گھنٹے بعد اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ دوپہر کا کھانا کھائے دیر ہو چکی تھی اور سب کا بھوک سے بُرا حال تھا اس لیے سب نے پہلے کھانا کھایا۔ بیتو جاگ کر شہلا کو بھی کھانا دے آیا تھا۔ وہ کئی بار کھانے کے لیے شور کر چکی تھی اور اس نے ڈبل روٹی جیسی کوئی چیز کھانے سے انکار کر دیا تھا۔

کھانے کے بعد میں نے وسیم کو عبداللہ کی درخواست کے بارے میں بتایا تو وہ خوش ہو گیا۔ ''میں بھی کچھ کرنا چاہ رہا ہوں مجھے بیٹھے بیٹھے زنگ لگ رہا ہے۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب مجھے پُرانے روپ میں آ جانا چاہیے اسی طرح میں درست طور پر آپ کے کام آ سکوں گا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ اب ہمیں کام بانٹ لینے چاہییں اس طرح ہم تمام سمتوں پر توجہ دے سکیں گے۔''

''میں نے عبداللہ کا کام دیکھا ہے وہ محنتی اور مخلص ہے لیکن اسے لڑنے والے لوگوں سے کام لینا نہیں آتا ہے اور نہ وہ ان کی تربیت کر سکتا ہے۔''

''اسی وجہ سے اس نے تم سے کہا ہے۔ اب یہ اتفاق ہے کہ تم نے ذرا دیر پہلے ہی مجھ سے اس بارے میں بات کی تھی۔'' میں نے کہا۔

''اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب اپنے کاز کے لیے سوچ رہے ہیں اور جب سب مخلص ہوں تو سب کے ذہن میں ایک ہی بات آتی ہے۔ سب سے پہلے ہمیں ایک کمانڈ سینٹر بنانا... ہوگا۔''

''میرا خیال ہے تم اس بارے میں عبداللہ سے بات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرواس نے اپنے تمام آدمی اور وسائل تمہارے ماتحتی میں دینے کو کہا ہے۔'' میں نے کہا اور وسیم کو اس کوٹھی کے بارے میں بتایا جس میں فاضلی کسی کال گرل کو لے کر گیا تھا۔ ''تم سب سے پہلے یہ جاننے کی کوشش کرو کہ کوٹھی میں کون ہے؟ جب یہ معلوم ہو جائے تو ہم اپنا اگلا لائحہ عمل طے کر سکتے ہیں۔''

''میں ابھی سے اس کام کو دیکھتا ہوں۔'' وسیم نے سر ہلایا۔ ''میں نے مرشد جیسے دشمن سے نمٹنے کے لیے جو پلان بنایا ہے اس میں سب سے پہلے تربیت یافتہ افراد کا ایک گروپ تیار کرنا ہے جو لڑنے اور مرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ ان کی مدد سے دشمن کے اہم افراد اور ٹھکانوں کا پتا چلانا اور ان کو تباہ کرنا شامل ہے۔ یہ تمام کام ایک کمانڈ سینٹر کے تحت ہوں گے۔ اس طرح ہم مرشد جیسے بڑے دشمن کے گرد گھیرا تنگ کرتے جائیں گے اور بالآخر اس سے چھٹکارا پالیں یا کسی طرح سے اسے مجبور کر دیں۔''

''پلان اچھا ہے اب اس پر عمل کرنا ہوگا۔'' سفیر بولا۔

''میں عمل کے لیے تیار ہوں۔'' وسیم کھڑا ہو گیا۔

''بس تو تم روانہ ہو جاؤ۔'' میں نے کہا پھر اسے جیپ کی چابی اور اسے بی ایم کارڈ دے دیا۔

وسیم روانہ ہو گیا۔ میرے ساتھی خود حرکت میں آ رہے تھے اور انہوں نے ایک ایک کر کے ذمے داریاں لینا شروع کر دی تھیں۔ میں اکیلا عبداللہ کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اتنے سارے کام نہیں نمٹا سکتا تھا۔ اب رفتہ رفتہ کاموں میں آسانی آ رہی تھی کیونکہ سب نے ذمے داریاں بانٹ لی تھیں۔ ایاز اور بیتو نے مرشد کے آدمیوں سے تفتیش کی تھی اور مجھے اس کے نتائج بتانے کے لیے بے چین تھے۔ ایاز نے کہا۔

''جناب یہ بہت ڈھیٹ لوگ ہیں لیکن جمیل نے ایک کام کی بات اگلی ہے۔ پچھلے دنوں ایک معروف صحافی خاتون راحیلہ کا مرڈر ہوا تھا۔ پولیس نے تفتیش کے بعد اس کے شوہر کو گرفتار کر لیا اور اس پر ابھی کیس چل رہا ہے لیکن جمیل کا کہنا ہے کہ جس دن راحیلہ کی لاش ملی اس سے ایک دن پہلے وہ مرشد ہاؤس میں دکھائی دی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق راحیلہ کو کئی افراد نے زیادتی کا نشانہ بنایا تھا اور پھر بے رحمی سے گلا دبا کر قتل کر دیا تھا۔ کیونکہ معاملہ ایک صحافی خاتون کا تھا اس لیے آئی جی نے ایک خصوصی تفتیشی ٹیم تشکیل دی اور اس نے شواہد کی بنیاد پر اس کے شوہر اختر ملک کو گرفتار کر لیا۔ لیکن اس کا کہنا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔''

یہ کام کی بات تھی اور اسے مرشد کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا۔ میں نے غور کیا اور ایاز سے پوچھا۔ ''کیا اختر ملک نے اپنی بیوی کے حوالے سے مرشد کا نام لیا ہے؟''

''نہیں اس نے مرشد کا نام نہیں لیا۔۔۔ لیکن اس نے اقبال جرم سے انکار کرتے ہوئے پولیس کو بیان دیا کہ وہ اپنی بیوی کے قاتلوں سے لاعلم ہے۔''

''راحیلہ کس نوعیت کی صحافی تھی؟''

''وہ تجزیاتی صحافت کرتی تھی اور ان دنوں ایک چینل سے سیاسی ایشوز پر پروگرام لے کر آ رہی تھی۔''

میں نے سفیر کی طرف دیکھا۔ ''یار تیری ایک گرل فرینڈ تھی جو کسی اخبار میں کام کرتی تھی۔ لیکن جب مونا نے دھمکی دی تو تو نے مجبوراً اس سے دوستی ترک کر دی تھی۔''

سفیر نے دانت نکالے۔ ''کیا یاد دلا دیا۔ اس وقت آتش جوان تھا۔''

''ہاں اب نہ آتش ہے اور نہ جوان ہے۔'' میں نے تائید کی تو سفیر نے مجھے گھورا لیکن کچھ کہنے سے گریز کرتے ہوئے بولا۔

''اب اگر میں نے اس سے رابطہ کیا تو بہت برا سلوک کرے گی۔''

''تو نے بھی اس سے اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ مونا سے پہلے اسے دو سال تک لارے دیتا رہا۔۔۔ اور پھر اچانک ٹاٹا کہہ دیا۔'' میں نے کہہ دیا۔ ''لیکن میرے یار وہ مرد ہی کیا جو ایک عورت کو جو پہلے بھی رام تھی دوبارہ رام نہ کر سکے۔''

''اچھا کوشش کروں گا لیکن اس سے کام کیا ہے؟'' سفیر نے بادل نخواستہ کہا۔

''اس سے معلوم کرو کہ یہ راحیلہ والی اسٹوری کیا ہے؟ مرشد کے خلاف کوئی نقطہ نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ممکن ہے ہمارے ہاتھ کوئی ایسی چیز آ جائے جس سے مرشد پر دباؤ ڈالا جا سکے۔''

''ٹھیک ہے صبح کچھ سابقہ یاروں سے رابطہ کر کے اس کا نمبر لینے کی کوشش کرتا ہوں۔'' سفیر نے جماہی لی اور اٹھ گیا۔ ''مجھے تو نیند آ رہی ہے۔''

میں نے کھینچ کر اسے بٹھا لیا۔ ''بیٹے تو بھول رہا ہے مونا یہاں نہیں ہے۔''

''تب ہی تو سونے کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔ ''ویسے بہانہ تب بھی نیند کا کرتا۔''

اس کے جانے کے بعد ایاز بولا۔ ''شہباز صاحب مجھے لگ رہا ہے یہ دونوں مرشد کے آدمیوں میں خاص مقام رکھتے ہیں اور بہت کچھ جانتے ہیں۔ ان کے کچھ کس بل نکل گئے ہیں لیکن ابھی بہت سارے بل باقی ہیں۔''

''وہ بھی نکالنے کی کوشش کرو، اس معاملے میں تم لوگوں کو فری ہینڈ ہے۔ یہ لوگ پیشہ ور قاتلوں سے بھی بدتر ہیں، کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔'' میں نے کہا اور بیتو کی طرف دیکھا۔ ''یار کوئی چائے پانی ملے گا۔''

''کیوں نہیں ملے گا باس۔'' بیتو نے مستعدی سے کہا۔ ''آپ بولو چائے پیو گے یا کافی.... ایاز بھائی دونوں بہت اچھا بناتا ہے۔''

''لیکن مجھے تو تمہارے ہاتھ کی بنی چائے چاہیے۔'' میں اس کی شرارت پر مسکرایا۔ ''سنا ہے تم بھی اچھا بنانے لگے ہو۔ اگر نہیں بناتے ہو تو پریکٹس ہو جائے گی اور جب شادی کرو گے تو کام آئے گی۔''

شادی کے نام پر وہ جھینپ گیا اور جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''نا بابا یہ سفیر اور وسیم کا دیکھ اب ہم نے سوچا ہے اتنی جلدی شادی نہیں کرے گا۔''

''منے تمہاری شادی اتنی جلدی ہو گی بھی نہیں۔'' ایاز نے اسے تسلی دی۔ ''ہمارے حساب سے اس میں بہت وقت ہے۔ ہمارے ہاں جب تک آدمی کے سر میں سفید بال نہ آ جائیں تو اس کی شادی نہیں ہوتی۔''

''اچھا۔'' بیتو تشویش زدہ ہو گیا تھا۔ ''ہماری طرف تو ایسا نہیں ہوتا..... میرے قبیلے میں تو لوگوں کے بال بھی جلدی سفید نہیں ہوتے ہیں۔''

''سفید تو ہمارے بھی جلدی نہیں ہوتے ہیں لیکن ہم چائے اور کافی زیادہ پی کر سفید کر لیتے ہیں۔''

بیتو چونکا۔ ''چائے کافی پینے سے بال سفید ہو جاتا ہے۔''

''اس سے تو بچوں کے بال بھی سفید ہو جاتے ہیں۔ میں تمہیں پندرہ سولہ سال کے بچے دکھاؤں گا۔'' ایاز نے یقین دلایا تو بیتو پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔

''ہم ابھی چائے بنا کر لاتا ہے۔'' وہ جانے لگا اور جاتے ہوئے رک گیا اس نے زیادہ مشکوک لہجے میں پوچھا۔ ''کہیں آپ مجھ سے چائے بنوانے کے لیے تو ایسا نہیں کہہ رہا ہے۔''

''نہیں منے، یہ سچ ہے سائنسی تحقیق ہے۔'' ایاز نے کہا۔ ''چائے اور کافی سے دماغ میں خشکی ہوتی ہے اور اسی خشکی کی وجہ سے بال سفید ہو جاتے ہیں۔''

بیتو مطمئن ہو کر چلا گیا تو میں ہنسا۔ ''یہ کون سی سائنسی تحقیق ہے؟''

ایاز ہنسنے لگا۔ ''کوئی نہ کوئی تو ہو گی اور نہ بھی ہوئی تو چائے تو مل جائے گی۔''

بیتو چائے بنا لایا جس میں کسی شاعر کی محبوبہ کے لبوں والی تمام خصوصیات تھیں یعنی گرم تھی اور میٹھی تھی۔ ہونٹوں سے چپکنے والی تھی۔ میں نے پہلے گھونٹ کے بعد رکھ دی۔ بیتو بولا۔ ''کیا ہوا کیا اچھا نہیں بنا ہے۔''

''بنی تو اچھی ہے لیکن اللہ کے بندے تم نے چینی کیا ہول سیل میں ڈالی ہے اتنی شکر تو میں سارے مہینے میں نہیں پیتا ہوں۔''

''ہم تو ہمیشہ اتنی چینی ڈالتا ہے، اچھا آپ کے لیے دوبارہ نکال لاتا ہے۔'' وہ میرا کپ اٹھا کر لے گیا اور ایک منٹ بعد دوسرا کپ لا دیا۔ اس میں چینی اعتدال میں تھی۔ اب بیتو کو فکر تھی کہ اگر وہ دن میں چھ سات بار چائے پیے تو اس کے بال کتنے عرصے میں سفید ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اس نے سوالات شروع کر دیے تھے۔ ایاز نے کہا۔

''اتنی جلدی تو نہیں ہوں گے لیکن وقت سے پہلے ضرور ہو جائیں گے، یہ بتاؤ کہ تمہارے قبیلے میں مردوں کے بال کس عمر میں سفید ہونا شروع ہوتے ہیں؟''

''چالیس کے بعد۔''

ایاز نے چائے ختم کر کے کپ میز پر رکھا اور بولا۔ ''بس تو تمہارے اڑتیس یا انتالیس برس کی عمر میں سفید ہو جائیں گے۔''

بیتو اچھل پڑا۔ ''چائے کافی پینے سے بس اتنا فرق پڑے گا؟''

''ہاں تم اور کیا سمجھتے ہو کہ کل پرسوں تک بال سفید ہو جائیں گے۔''

''لیکن آپ تو بول رہا تھا کہ بچوں کے بال بھی سفید ہو جاتے ہیں۔''

''وہ تو لو کل بچے ہوتے ہیں اور پیدا ہوتے ہی دودھ کی جگہ چائے پینا شروع کر دیتے ہیں۔'' ایاز بولا۔ ''بہرحال تم فکر نہ کرو تمہاری شادی ضرور ہو گی۔''

''لیکن اس کی ہونے والی دلہن کہاں ہے؟'' میں نے شرارت سے کہا۔ بیتو ہم سے عمر میں چھوٹا تھا اس لیے اس ....

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے چارے کی شامت آئی رہتی تھی۔ پہلے وسیم اسے تنگ کرتا تھا اور اب ایاز بھی شامل ہو گیا تھا لیکن یہ پیار محبت والی چھیڑ چھاڑ تھی اس کی دل آزاری کا تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ اپنے پیاروں اور زمین سے بچھڑا ہوا شخص تھا اس لیے سب ہی اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔

''کہیں بھی ہوا سے لے آئیں گے۔'' ایاز نے سینے پر ہاتھ مارا۔ وہ کامی سے واقف تھا اس لیے شرارت سے مسکرایا۔ ''چاہے اس کے لیے چین کیوں نہ جانا پڑے۔''

بیتو جلدی سے کھڑا ہو گیا اور کپ سمیٹنے لگا۔ ''اچھا شوبی ہم کو اب نیند آ رہا ہے کل ملے گا۔'' وہ کپ لے کر رخصت ہو گیا۔

''یار یہ بہت پیارا انسان ہے۔'' میں نے ایاز سے کہا۔ ''مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح محسوس ہوتا ہے۔''

''شہباز صاحب یہ میرے لیے بھی چھوٹے بھائی کی طرح ہے۔'' وہ بولا۔ ''میں اس کا بڑے بھائی کی طرح ہی خیال رکھوں گا۔ ویسے ایک بات میرے ذہن میں آ رہی ہے۔ ہم چین کی حکومت کے راز اسے واپس پہنچانے کے لیے کوشش کر رہے ہیں اور اگر ہم بریف کیس حاصل کر کے چینی حکومت کے حوالے کر دیں۔ تو کیا ہم ان سے کامی کا مطالبہ نہیں کر سکتے ہیں؟''

''کر تو سکتے ہیں لیکن یار وہ جیتی جاگتی لڑکی ہے کوئی کھلونا نہیں ہے جسے ہم لے کر بیتو کو دے دیں۔ وہ چین جیسے ترقی یافتہ ملک میں ہے۔ وہاں تعلیم حاصل کر رہی ہے اور اس نے یقیناً اپنے مستقبل کے بارے میں بھی سوچا ہو گا۔ سفر کی بات اور تھی جب وہ بیتو کے قریب آ گئی تھی لیکن اب ممکن ہے اس کے خیالات بدل گئے ہوں۔ تم سمجھدار آدمی ہو۔ کم عمری کی محبت کسی پُرشور پہاڑی برساتی نالے کی طرح ہوتی ہے۔ بارش ہوتے ہی یوں زور و شور سے بہتا ہے کہ اپنے زور میں سب بہا کر لے جائے گا لیکن جب پانی اُترتا ہے تو یوں خشک ہو جاتا ہے جیسے کبھی بہا ہی نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا کہ بیتو کے لیے مستقبل میں کیا ہے۔ ہاں ہم اس کے لیے کوشش کر سکتے ہیں۔''

ایاز سن رہا تھا پھر اس نے سر ہلایا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''بیتو سترہ سال کا بھی نہیں ہے۔ ابھی اس کی تعلیم حاصل کرنے اور اپنا کیریئر بنانے کی عمر ہے لیکن یہ ہمارے ساتھ دشمنوں سے لڑ رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ حالات بہتر ہوں گے اور جب بھی ایسا ہوا سب سے پہلے بیتو کو پڑھانا ہو گا تاکہ وہ مستقبل میں کسی طرح ہم لوگوں سے پیچھے نہ رہے۔''

ایاز مسکرایا۔ ''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے میں نے اسے پڑھانا شروع کر دیا ہے۔ اس کی انگریزی خاصی حد تک بہتر ہے اب میں اسے اردو اور ریاضی بھی پڑھا رہا ہوں۔ وہ ذہین ہے کوئی چیز بتاؤ تو جلد سیکھ جاتا ہے۔''

مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ ''اچھا میں نے تو کبھی تم دونوں کو کتاب لیے نہیں دیکھا۔''

''کتاب نہیں ہے جناب!'' ایاز بولا۔ ''ابھی تو صرف سادہ کاغذ اور پین کی مدد سے پڑھائی جاری ہے۔''

مجھے خوشی ہوئی تھی کہ میرے ساتھی ایسے حالات میں بھی مثبت سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ باتوں کے دوران ایاز کو خیال آیا اور اس نے کہا۔ ''میں بتانا بھول گیا.... جب آپ نہیں تھے تو شہلا نے آپ کے بارے میں پوچھا تھا۔''

''کیا کہہ رہی تھی؟''

''اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا لیکن وہ آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے میں دیکھ لوں گا۔'' میں نے سر ہلایا۔

رات خاصی ہو گئی تھی۔ بیتو کی طرح ایاز بھی سونے چلا گیا۔ میں نے وسیم سے رابطہ کیا۔ وہ عبداللہ کے آدمیوں کے ساتھیوں کے ساتھ تھا۔ اس نے کہا۔ ''شہباز صاحب میں نے ان کو طریقہ سکھا دیا کہ کس طرح سے نگرانی کرنی ہے اور باہر جانے والوں کا کس طرح تعاقب کرنا ہے۔''

''یہ کام تم ہی کر سکتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''ہمیں ایک سینٹرل کمانڈ کی ضرورت ہے جہاں سے ہونے والی تمام سرگرمیوں کی نگرانی کی جا سکے اور فوری ہدایت دی جا سکے۔ میں نے عبداللہ سے بات کی ہے۔ کل ہم اس سلسلے میں کام کریں گے۔''

''اچھی بات ہے لیکن کوشش کرنا کہ سینٹرل کمانڈ ہمارے عام ٹھکانوں سے ہٹ کر ہو۔''

''میں نے بھی یہی سوچا ہے۔''

''بلکہ کوئی ایسا بندوبست کرو کہ ہمیں کہیں جانا ہو تو ہمیں کوئی مشکل نہ ہو۔'' میں نے کہا اور پھر ایک خیال الہام کی طرح ذہن میں نازل ہوا تھا۔ ''وسیم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ایک بڑے سائز کی وین یا درمیانے سائز کی بس لے کر اس میں اپنا کمانڈ سینٹر بنا لو۔''

''زبردست آئیڈیا ہے اس طرح ہم مسلسل حرکت میں

رہ سکتے ہیں اور اگر دشمن ہمارا ٹھکانا تلاش بھی کر لے تو ہم فوراً وہاں سے روانہ ہو سکتے ہیں۔ میں اس پر کام کرتا ہوں۔''

وسیم سے بات کر کے میں نے ندیم کا نمبر ملایا۔ وہ سونے جا رہا تھا۔ اس نے فریاد کی۔ ''اوہ بھائی اس وقت تو بخش دیا کرو.... تو کیا چاہتا ہے میری بیوی مجھے عاق کر دے۔''

''بکواس کرنے کے بجائے آپ سیدھی طرح سے بتائیں کہ میں نے جو کام دیا تھا وہ کیا یا نہیں؟''

''کر دیا ہے یار! ابھی دو منٹ پہلے رپورٹ ملی ہے۔ اس ہیڈ ماسٹر کی تدفین آج شام کو ہوئی ہے۔ اہلِ محلہ اور اس کے اسکول کے ماتحتوں نے تدفین کا کام کیا ہے۔ اس کا کوئی رشتے دار بھی آ گیا تھا اور اس کے مکان پر اب وہی ہے۔''

''یہاں اس کا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔''

''بیٹی ہے لیکن وہ پُراسرار طور پر غائب ہے۔ اور بھائی ایسے مواقعوں پر رشتے دار پیدا ہو جاتے ہیں۔ سنا ہے ماسٹر کا اچھا خاصا مکان ہے اور ظاہری بات ہے اس کی پنشن اور گریجویٹی بھی تو ہو گی۔ لیکن بائی دی وے اس سارے معاملے سے تمہیں کیا دلچسپی ہے؟''

میں نے ندیم کو مناسب الفاظ میں گزشتہ رات پیش آنے والا واقعہ سنایا۔ ''ندیم اس معاملے کو دیکھو اور اگر وہ شخص کوئی فراڈیا ہے یا نہیں بھی ہے تب بھی مکان اس سے خالی کرا اور اسے اپنی تحویل میں لے لے۔''

تو اس نے سر پیٹ لیا۔ ''بھائی تیرے کیسز کے لیے تو سارے پاکستان کے وکیل بھی نا کافی ہیں۔ تو فی گھنٹے کے حساب سے کیس پیدا کر رہا ہے۔''

''اب میں کیا کروں شامتِ اعمال ہے جہاں جاتا ہوں کوئی نہ کوئی کیس ہو جاتا ہے۔''

''یار ایسا کر سویرا سے شادی کر اور اسے لے کر دنیا کے کسی ایسے نکڑ نکل جا جہاں مرشد نہ اس جیسی کوئی حرام ذات ہو اور وہاں صرف بچوں والے کیس کر.... اگر تو نے ایسا نہ کیا تو میرے بیوی بچے....'' وہ شور کرتا رہ گیا اور میں نے لائن کاٹ دی۔ پھر عبداللہ والی کوٹھی کا نمبر ملایا۔ وہاں منیر نے کال ریسیو کی۔ مجھے پہچان کر بولا۔

''صاحب آپ کیسے ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے یار.... یہ خواتین سو گئی ہیں یا جاگ رہی ہیں؟''

''جاگ رہی ہیں.... سب لاؤنج میں موجود ہیں۔''

ظاہر ہے جب دو خواتین میں تیسری شامل ہو تو ایسی ہی محفل جم سکتی تھی وہ یقیناً شاہین سے اس کے بارے میں سب جاننے کے لیے بے چین ہوں گی۔ میں نے مونا سے بات کرنے کو کہا تو منیر کارڈلیس وہیں لاؤنج میں لے گیا جہاں سے مسلسل ان تینوں کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ منیر نے مونا کو کارڈلیس دیا۔ اس نے پوچھا۔ ''کس کی کال ہے؟''

''شہباز صاحب کی۔''

''شوبی۔'' مونا نے جلدی سے کہا۔ ''کیسے ہو تم؟''

''میں تو ٹھیک ہوں لیکن تم لوگ کیا کر رہی ہو؟ یہ بتاؤ کہ گفتگو کے دوران سانس وغیرہ نہیں لیتی ہو ایک ہی سانس میں بولتی جاتی ہو۔''

وہ ہنسنے لگی۔ ''یہ تو ہم خواتین کی خصوصیت ہوتی ہے۔''

''یہ جو نئی خاتون آئی ہیں یہ کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ہیں اور بہت اچھی ہیں۔'' مونا نے جواب دیا۔ ''اب زیادہ مزہ آئے گا۔''

''مزے بعد میں لینا فی الحال تو تم دونوں کو اسے دلاسہ وغیرہ دینا ہو گا۔ کل رات اس کے باپ کا انتقال ہوا ہے اور آج شام کو اس کی تدفین ہو چکی ہے۔ اسے نہیں معلوم۔''

''اوہ!'' مونا دکھی ہو گئی۔ ''اچھا لو شاہین سے بات کرو۔''

''السلام وعلیکم۔'' اس نے کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' میں نے جواب دیا اور پھر کچھ دیر رک کر کہا۔ ''شاہین تمہارے والد کی تدفین کر دی گئی ہے۔ تدفین اہلِ محلہ اور اسکول کے ساتھیوں نے مل کر کی ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا کوئی رشتے دار بھی آ گیا ہے اور اب مکان پر وہی ہے۔''

''ہمارا یہاں کوئی رشتے دار نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ ''یہ بات میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ یہ کوئی دھوکے باز ہو گا۔ --- یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو کسی اکیلے آدمی کے مرنے پر اس کی جائداد اور دوسری چیزوں پر قابض ہو جاتے ہیں۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے میں نے اپنے وکیل کے سپرد یہ معاملہ کر دیا ہے۔ وہ اس سے مکان خالی کرا لے گا۔ اس لیے تم اس بارے میں فکر مت کرو۔''

''شہباز صاحب میں آپ کی شکر گزار ہوں۔'' اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے روتی آواز میں کہا۔ ''پتا نہیں خدا نے کس نیکی کے صلے میں آپ تک پہنچا دیا۔ ابھی مونا اور سعدیہ سے بات ہوئی ہے تو مجھے صحیح معنوں میں پتا چلا کہ آپ کتنے عظیم انسان ہیں۔''

''یہ دونوں پاگل ہیں ان کی باتوں کا اعتبار مت کرنا۔'' میں نے کہا اور کچھ دیر رسمی گفتگو کے بعد سعدیہ سے بات کی۔ اس کے لہجے کی کھنک اور شوخی بتا رہی تھی کہ وہ کتنی خوش تھی۔ فون بند کر کے میں نے آرام کا سوچا۔ اگرچہ دن میں کئی گھنٹے سویا تھا لیکن جو سکون رات کی بھرپور نیند دیتی ہے اس سے ابھی محروم تھا۔ میں بیڈ روم کی طرف آیا تھا کہ مجھے شہلا کا خیال آیا۔ اس نے مجھ سے بات کرنے کو کہا تھا اور یقیناً اس وقت تک وہ سو گئی ہوگی۔ میں اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جھجکا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا وہ حسبِ معمول کپڑے اُتار کر سو رہی ہوگی۔ میرا اندازہ درست تھا اس کے کپڑے بستر کے آس پاس قالین پر بکھرے ہوئے تھے اور ان میں مخصوص نسوانی ملبوسات بھی تھے۔

وہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرتی تھی یا یہ سب اس کی فطرت میں شامل ہو چکی تھی۔ شکر ہے وہ کمبل میں روپوش تھی کیونکہ اس کمرے میں آتش دان میں لکڑیاں نہیں تھیں اس لیے اسے بغیر آتش دان کے گزارا کرنا پڑ رہا تھا۔ ویسے میں نے محسوس کیا کہ یہ گھر بند ہونے کے بعد اندر سے اتنا سرد نہیں رہتا تھا اور گرم کپڑوں اور کمبل میں آسانی سے گزارا ہو جاتا تھا۔

''شہلا۔'' میں نے اسے آواز دی۔ تیسری آواز پر اس نے کمبل سے چہرہ برآمد کیا۔ اس کی آنکھوں کا خمار بتا رہا تھا کہ وہ گہری نیند سے جاگی تھی۔

''تم اس وقت..... یہاں..... خیریت۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کیا کوئی خیال آ گیا.....''

''بکواس بند کرو۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ تم مجھ سے ملنا چاہتی ہو؟''

وہ جان بوجھ کر بے پروائی سے اُٹھی اور سامنے کے رُخ سے کمبل ڈھلک گیا میں نے دل میں لاحول پڑھی لیکن چہرے سے ایسا کوئی تاثر نہیں دیا جس سے اسے اندازہ ہو کہ مجھے اس کی عریانی نے متاثر کیا ہے یا میں جھینپ گیا ہوں۔

''ہاں میں نے فیصلہ کر لیا ہے اور اسی لیے تم سے ملنا چاہتی تھی۔''

''تم نے تو کل تک مہلت مانگی تھی لیکن تمہارا اطمینان سے سونا بتا رہا ہے کہ تم نے سچ مچ کوئی فیصلہ کر لیا ہے۔''

اس نے میری طرف دیکھا اور کمبل بس اتنا درست کیا کہ اس ہوش ربا خدوخال چھپ گئے۔ ''ہاں میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔''

''اب مجھے اس فیصلے سے آگاہ کر دو تا کہ میں تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکوں۔''

''میں تمہارا ساتھ دوں گی اور میں نے جو پلان بنایا تھا میں وہ تمہارے حوالے کرنے کو تیار ہوگئی ہوں صرف تمہاری زبان پر اعتبار کر کے۔''

''پلان کیا ہے؟''

''وہ میں تمہیں زبانی نہیں بتا سکتی، میں نے سب لکھ کر تصویروں کی مدد سے واضح کر کے ایک جگہ رکھا ہے۔ لیکن یقین کرو اس پر عمل کرنا اتنا آسان ہوگا کہ تم جب دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔''

''پلان کہاں ہے؟''

''ایک محفوظ جگہ ہے، وہاں سے کوئی اسے حاصل نہیں کر سکتا..... اسے لینے کے لیے مجھے ہی جانا ہوگا۔''

''ایسی کون سی جگہ ہے جہاں سے صرف تم ہی کچھ حاصل کر سکتی ہو؟''

''میرا ایک خفیہ ٹھکانا ہے۔ اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا..... میں نے کاغذات اور دوسری چیزیں وہیں رکھی ہیں۔ میں نے اندر داخل ہونے اور حفاظت کا نظام ایسا رکھا ہے کہ صرف میں ہی اندر جا سکتی ہوں۔''

اس کی بات پر میں مسکرایا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، یہ بات سن کر میں تمہیں جانے دوں گا؟''

''مجھے معلوم ہے تم کسی صورت مجھ پر اعتماد نہیں کرو گے لیکن میں پھر بھی تم پر اعتماد کر رہی ہوں۔'' اس نے جتانے والے انداز میں کہا۔

''تم اس کے لیے مجبور ہو۔''

وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ''شہباز ملک مجھے اتنا بھی مجبور مت سمجھو بہت سارے مواقع ایسے آئے تھے جب میں فائدہ اُٹھا سکتی تھی لیکن میں نے نہیں اُٹھایا۔ خاص طور سے جب مکان پر حملہ ہوا تھا میں وہاں سے فرار ہو سکتی تھی۔''

''اس صورت میں تمہارا یہ خوب صورت جسم مردہ خانے میں پڑا ہوتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وہاں ہر طرف موت تھی اور فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔''

''یہ تو تقدیر کی بات ہے لیکن میں کوشش تو ضرور کرتی۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔ ''لیکن میں نے تم سے

تعاون کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''اس صورت میں تمہیں میری طرف سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی، لیکن اگر تم نے دھوکا کیا تو خود بھگتو گی۔'' میں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''سو جاؤ اور دیکھو کل کا دن تمہارے لیے کیا لے کر آتا ہے۔''

''شب بہ خیر۔'' اس نے تو بہ شکن انگڑائی لی اور دوبارہ کمبل میں روپوش ہوگئی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو اپنے حسن و جمال کی قوتِ تسخیر ہر مرد پر آزماتی ہیں، وہ عادت سے مجبور ہوتی ہیں۔ میں کمرے میں آیا تو دونوں بیڈ زایاز اور بیتو کے قبضے میں تھے مجبوراً میں نیچے اس بیڈ روم میں آیا جہاں کل رات شاہین رکی تھی۔ اس نے بیڈ اور کمرے کی صفائی کر دی تھی۔ ورنہ اوپر والے بیڈ روم مٹی زدہ ہو رہے تھے۔ یہاں کمبل بھی تھا۔ میں جوتے اور جیکٹ اُتار کر لیٹ گیا۔ اس بار نیند کی دیوی فوراً ہی میربان ہوگئی تھی۔ آنکھ کھلی تو کھڑکی سے تیز دھوپ اندر آ رہی تھی۔ یہ کمرا مشرق میں سورج نکلنے کے رُخ پر تھا۔ کچھ کرنیں شرارت سے میرے چہرے کو سہلا رہی تھیں۔ میں کچھ دیر ان سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر اُٹھ گیا۔

منہ ہاتھ دھو کر باہر آیا تو بیتو کچن میں ناشتا تیار کرنے میں مصروف تھا۔ جب گھر میں کوئی عورت نہیں ہوتی تھی تو وہ گھڑ ہیبیوں کی طرح کچن سنبھال لیتا تھا۔ وہ ڈبل روٹی سینک رہا تھا اور ایک برتن میں انڈے اُبل رہے تھے۔ ایاز جاگ گیا تھا اور اپنی جیپ کی سیدھ میں لگا ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ہمارے پاس بس ایک ہی گاڑی تھی۔ مجھے ایک گاڑی اور درکار تھی۔ عبداللہ والی کوٹھی میں دو عدد گاڑیاں موجود تھیں۔ میں نے اسے کال کی۔

''یار کوئی چھوٹی گاڑی بھیج دو۔ کوئی کار ہو تو بہتر ہے لیکن ریس میں ٹھیک ہو۔''

''میں ابھی بھیجتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اگر کہیں تو بائیک بھی بھیج دوں اس سے ایک آدمی کو آنے جانے میں آسانی رہتی ہے۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے بائیک بھی بھیج دو۔''

بات کر کے میں کچن میں میز پر آ بیٹھا جہاں بیتو ناشتا لگا رہا تھا۔ سفید سور ہا تھا۔ میں نے ناشتا شروع کر دیا اور بیتو سے کہا۔ ''شہلا کو بھی دے آؤ۔''

وہ ایک پلیٹ میں چند توس اور ایک اُبلا ہوا انڈا رکھ کر لے گیا۔ کافی کا پانی چولہے پر اُبل رہا تھا۔ جب تک میں نے ناشتا کیا کافی تیار ہوگئی تھی۔ اپنا اور شہلا کا کافی مگ لے کر میں اس کے کمرے میں آیا۔ وہ جاگے میں آ چکی تھی اور سکون سے ناشتا کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے تمہیں کپڑے اُتار کر سونے کی عادت ہے لیکن کم سے کم انہیں اس طرح پھیلایا تو مت کرو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اور میرے ساتھی کس فطرت کے لوگ ہیں ہمیں یہ سب اچھا نہیں لگتا ہے۔''

''میں جانتی ہوں لیکن عادت ہے۔'' وہ لاپروائی سے بولی۔ ''خیر چھوڑو اسے ممکن ہے آج کے بعد تمہیں یہ مسئلہ نہ رہے۔''

وہ سمجھ رہی تھی کہ میں کاغذات حاصل کر کے اسے رہا کر دوں گا۔ لیکن میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میرا اس وقت اسے رہا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا جب تک بریف کیس میرے ہاتھ میں نہیں آ جاتا۔ میرے خیال میں وہ نہایت خطرناک عورت تھی اور اگر میں نے بریف کیس حاصل کیے بغیر اسے آزاد کر دیا تو اس کا امکان تھا کہ وہ کوئی چکر چلا جائے۔ اس کا مبینہ پلان دھوکا بھی ہو سکتا تھا۔ وہ جلدی جلدی کافی پی رہی تھی اور اس کے انداز میں کچھ دیر پہلے والا سکون نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔ ''ہمیں کب جانا ہے؟''

''بس کچھ دیر میں چلتے ہیں۔''

وسیم نے اسے ایک اونی ٹراؤزر اور سیاہ رنگ کی بند گلے کی جرسی لا دی تھی جو موسم کے لحاظ سے موزوں تھی لیکن اسے جسم کو اتنا ڈھانپ کر رکھنے کی عادت نہیں تھی اس لیے وہ اُلجھن محسوس کر رہی تھی۔ اس کی ساڑی تباہ ہونے والے مکان میں رہ گئی تھی۔ مجھے خیال آیا تھا کہ کہیں دشمن پھر کسی کتے کو اس کی ساڑی سونگھا کر ہماری تلاش نہ شروع کر دے لیکن یہ اتفاق تھا کہ فتح خان کے آدمی شہلا کو تلاش کرتے اس کالونی تک آ گئے تھے۔ کتے بہت زیادہ فاصلے سے بو نہیں سونگھ سکتے ہیں اور جو بہت تیز حس شامہ رکھتے ہیں وہ کسی شخص کی گزرنے والی جگہ سے بو محسوس کر لیتے ہیں بہ شرط کہ آدمی پیدل ہو۔ گاڑی میں گزرے گا تو کتے کو راستے سے بو محسوس نہیں ہوگی۔

راولپنڈی اسلام آباد جیسے وسیع علاقے میں کسی کو سونگھنے والے کتے کی مدد سے تلاش کرنا ایسا ہی تھا جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنا۔ یعنی قسمت ساتھ ہو تبھی کامیابی مل سکتی ہے۔ اب اتفاق کی بات ہے کہ میرے سامنے دو کیس آئے اور دونوں میں کتوں کو کامیابی ملی۔ پہلے مونا کے مسٹر براؤن نے مجھے تلاش کر لیا اور پھر فتح خان کے کتے نے شہلا کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تلاش کرلیا۔ میں نے شہلا سے کہا۔

''تمہارا خفیہ ٹھکانا کہاں ہے؟''

''اسلام آباد میں ایک جگہ۔'' وہ بولی۔ ''ویسے یہ کون سی جگہ ہے سردی بتا رہی ہے کہ ہم کسی بلند جگہ پر ہیں۔''

وہ چالاک عورت تھی۔ اگرچہ ہم رات کو آئے تھے اور اسے جیپ میں پیچھے والے حصے میں رکھا تھا اس لیے امکان کم تھا کہ اس نے مکان یا راستہ دیکھا لیکن اس نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ ہم کسی بلند جگہ تھے۔ میں نے تردید یا تصدیق کرنے کے بجائے مبہم انداز میں کہا۔ ''نہیں آج کل سردی بہت شدید ہے۔''

اس نے کافی کا مگ خالی کر کے پلیٹ میں رکھ دیا۔ نازک جسامت سے قطع نظر اس کی خوراک اچھی خاصی تھی۔ اسے جب موقع ملتا وہ ڈٹ کر کھاتی تھی۔ وہ ہلکے جسم کی مالک تھی سوائے کچھ خاص مقامات کے جہاں قدرتی طور پر چربی جمع ہو جاتی ہے۔ ایسا لگتا تھا وہ باقاعدگی سے ورزش کرتی تھی اور ممکن ہے اسے سوئمنگ کا شوق بھی ہو۔ یہی وجہ تھی وہ جسمانی طور پر فٹ اور مضبوط تھی۔ میری بات پر وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''او کے تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں کہ ہم کسی میدانی علاقے میں ہیں۔''

میں باہر آیا سفیر سو رہا تھا۔ ایاز نے جیپ کی صفائی کرلی تھی اور اس کا عقبی حصہ شہلا کو لے جانے کے لیے موزوں تھا۔ یہاں سے وہ راستے میں کود نہیں سکتی تھی اور بند ہونے کی وجہ سے اس کا چیخ چلا کر کسی کو متوجہ کرنا بھی آسان نہیں تھا اس کے باوجود میں نے فیصلہ کیا کہ کوئی خطرہ مول نہیں لوں گا۔ ہمارے پاس پلاسٹک کی بنی جدید ہتھکڑی تھی۔ طے پایا کہ شہلا کے منہ پر ٹیپ لگا کر اسے پشت سے ہتھکڑی لگائی تھی۔ ایک بار لگنے کے بعد اسے کاٹ کر اتارا جا سکتا تھا۔ میں نیچے آیا اور سامان سے ہتھکڑی اور ٹیپ نکال کر شہلا والے کمرے میں آیا۔ وہ ہتھکڑی دیکھ کر بدکی۔ ''اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''ضرورت ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس میں ایک کلپ ڈالا اور پھر اسے پشت کی طرف گھما کر دوسرے ہاتھ کو بھی باندھ دیا۔ کلپ کی ڈوریاں کھینچنے سے وہ پوری طرح کس گئے تھے۔ اب شہلا کسی صورت ان کو نہیں کھول سکتی تھی۔ وہ تلملائی۔ ''تم نہایت گھٹیا آدمی ہو۔''

میں مسکرایا۔ ''تمہارے نزدیک ہر وہ آدمی گھٹیا ہوتا [illegible]

[illegible]

بھی ٹیپ لگا دیا۔ اس نے معمولی سی مزاحمت کی تھی لیکن مجھے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ سہارا دے کر اسے اوپر لایا۔ ایاز نے جیپ کا پچھلا حصہ کھول کر رکھا ہوا تھا۔ اسے اندر دھکیل دیا دروازہ باہر سے بند کر دیا اور ہم دونوں جیپ میں بیٹھے اور صابر نے مین گیٹ کھول دیا۔ وہ بے چارہ ہمارے لیے چوکیدار کا کام کر رہا تھا حالانکہ وہ تربیت یافتہ محافظ تھا۔ شہلا عقب میں سکون سے بیٹھی تھی۔ جیپ کے باہر سے اسے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ سڑک پر آنے کے بعد میں نے وسیم کو کال کی۔

''رات میں کوئی پروگریس ہوئی ہے؟''

''نہیں جناب لیکن میرے آدمی اس عورت کو اٹھانے کی تیاری کر رہے ہیں جو رات یہاں آئی تھی لازمی بات ہے وہ واپس بھی جائے گی۔ ہم تعاقب کر کے اس کا ٹھکانا دیکھ سکتے ہیں اور اس کے بعد اسے اُٹھانا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''

''فاضلی نکلا وہاں سے؟''

''نہیں... لیکن میں نے یا کسی دوسرے نے اب تک فاضلی کو دیکھا نہیں۔''

''وہ کسی قدر طویل قامت ہے گورے رنگ کا اور بھی آنکھوں والا، سر پر کسی قدر لمبے ہلکے بھورے بال ہیں اور چلتے وقت کمر کو ہلاتا ہے جیسے خاص جنس کے لوگ چلتے ہیں۔ بہت ہوشیار اور چوکنا قسم کا شخص ہے اگر اس کا تعاقب کرنا ہو تو بہت ہوشیار رہ کر کرنا۔''

''میں سمجھ گیا، اپنے آدمیوں کو بھی سمجھا دوں گا۔'' وسیم نے کہا۔ ''آپ کیا کر رہے ہیں؟''

''میں شہلا کو لے کر جا رہا ہوں اس نے کہا ہے کہ اس نے بینک میں ڈکیتی مارنے کا مکمل پلان کہیں رکھا ہوا ہے۔''

''آپ بھی ہوشیار رہیے گا یہ عورت بھی کم نہیں ہے۔ یقین کریں اتنے اعتماد والی عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی..... اس کے اعصاب بہت مضبوط ہیں۔''

''ظاہر ہے ایک ہٹے کٹے مرد کو اپنے ہاتھوں سے گلا دبا کر ہلاک کرنے والی کے اعصاب مضبوط تو ہوں گے۔'' میں نے مڑ کر شہلا کی طرف دیکھا۔ وہ میری بات سن رہی تھی لیکن اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ وسیم سے بات کر کے میں نے موبائل میں وہ سم ڈالی جس سے فتح خان سے بات کی تھی۔ اس کا نمبر ملایا اور اس نے کال ریسیو کی۔ ''فتح خان کیا حال ہیں؟''

''اچھا ہی ہے البتہ مرشد کے لیے کل رات اچھا نہیں تھا۔'' فتح خان نے جواب دیا تو اس کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔

''کیا ہوا اس کے ساتھ؟''

''اس کا ادھر رد رات میں ایک فیکٹری ہے کیمیکل کا، کل رات کسی نے چوکیدار کو باندھ کر اسے آگ لگا دیا۔ جب تک فائر بریگیڈ والا آتا پورا فیکٹری جل چکا تھا کیمیکل آگ بھی تیزی سے پکڑتا ہے۔ سنا ہے کوئی دو ارب روپے کا نقصان ہوا ہے۔''

''دو ارب روپے۔'' میں چونکا۔ ''یہ تو بہت بڑا نقصان ہے، مرشد تو پاگل ہو گیا ہوگا۔''

''ہاں.... آگ لگانے والوں نے چوکیدار کو باہر ڈالا تھا وہ بچ گیا تھا لیکن جب پولیس آیا تو اسے فیکٹری سے چوکیدار کا جلا ہوا ڈھانچہ ملا تھا۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''مرشد جیسے فرعون سے اسی قسم کی توقع کی جا سکتی ہے۔ فتح خان اس کا ایسا کون سا دشمن ہے۔''

''تم جانتا ہے مرشد خنزیر کا بچہ ہے ایسے شخص کا نہ جانے کتنا دشمن ہوگا۔'' وہ لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ ''پر یہ والا بڑا خطرناک دشمن ہے ابھی تو آغاز ہے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''فتح خان اس کا مطلب ہے تمہیں میری بات کا یقین آگیا ہے۔''

''اس کو چھوڑو..... شہباز خان دنیا میں میرا سب سے قریبی رشتے دار تھا اس کی موت اس کے قاتل کو سستی نہیں پڑے گی۔''

''فتح خان اگرچہ تم میرے دوست نہیں ہو اور شاید اب دشمن بھی نہیں ہو پھر بھی میں تم سے شہباز خان کی موت کا افسوس کرتا ہوں۔''

''تم کو افسوس کرنے کا ضرورت نہیں ہے۔ افسوس تو مرشد کرے گا۔''

مجھے خیال آیا کہ میں فتح خان سے مرشد کے بارے میں معلومات حاصل کروں کیونکہ وہ اس کے پاس رہا تھا اور اسے بہت اچھی طرح جانتا تھا پھر اس کے بہت سارے ٹھکانے بھی فتح خان کے علم میں تھے۔ لیکن پھر میں نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ بے شک فی الحال فتح خان دشمن نہیں رہا تھا لیکن میں اس پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا امکان تھا کہ ہیروں کی بازیابی کا کیڑا اس کے ذہن سے نکلا نہ ہو اور وہ اب بھی میری اور میرے ساتھیوں کی فکر میں ہو۔ میں نے کچھ دیر میں فون بند کر دیا۔ اس دوران میں ہم اسلام آباد کے پاس پہنچ چکے تھے۔ ایاز نے ایک جگہ جیپ روک لی یہاں سے ایک راستہ راولپنڈی اور دوسرے مضافات کی طرف جاتا تھا اور ایک راستہ اسلام آباد کی طرف جاتا تھا۔ اس نے کہا۔

''اس سے پوچھیں کہاں جانا ہے؟''

میں نے مڑ کر شہلا کے منہ سے ٹیپ اُتار دیا۔ ''اسلام آباد میں کہاں جانا ہے۔''

اس نے جی سیکٹر کے ایک مکان کا پتا بتایا۔ ''یہاں جانا ہے۔ لیکن مکان میں میرے بغیر جانے کی کوشش مت کرنا ورنہ کسی مشکل میں پڑ سکتے ہو۔''

''تم فکر مت کرو۔''

میں نے دوبارہ اس کے منہ پر ٹیپ لگا دیا اور ہم روانہ ہو گئے۔ ایاز نے جان بوجھ کر ان پوش علاقوں سے گزرنے سے گریز کیا جہاں پولیس چیکنگ کے لیے موجود ہوتی ہے اور کسی بھی مشکوک گاڑی کو تلاشی کے لیے روک لیتی ہے۔ ہم تلاشی دینے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ ہمارے پاس ایک عدد مغویہ کے ساتھ مہلک اسلحہ بھی تھا۔ ایاز ذیلی سڑکوں سے گزرتا ہوا جی سیکٹر کی طرف جانے لگا۔ اسلام آباد میں جابجا چھوٹے چھوٹے جنگل لگائے گئے ہیں تاکہ شہر کی آب و ہوا صاف ستھری رہے اور اس کی دل کشی میں بھی اضافہ ہو۔ آبادیوں کے درمیان یہ جنگل ایک طرح سے حد فاصل کا کام بھی کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے مختلف سیکٹرز کی آبادیاں ایک دوسرے سے الگ رہتی ہیں۔

مطلوبہ مکان جی سیکٹر میں ایک ایسے ہی جنگل کے پاس نکلا تھا۔ اتفاق سے اس لائن میں صرف دو مکان تھے اور یہ ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر تھے۔ شہلا کا بتایا ہوا مکان جنگل سے بالکل ملا ہوا تھا اور سڑک کے پار سے جنگل کا آغاز ہو جاتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا کوٹھی نما مکان تھا اور سامنے چھوٹے سے احاطے میں ایک مختصر سا لان اور اس کے ساتھ کار پورچ تھا۔ میں نے نیچے اُتر کر مکان کا معائنہ کیا اس... کے گیٹ پر نیم پلیٹ پر لکھا پتا دیکھا۔ یہ وہی مکان تھا۔ لیکن دیکھنے میں یہ عرصے سے بند اور ویران لگ رہا تھا میں نے اُچک کر فولادی گیٹ سے اندر جھانکا تو پورچ میں فرش مٹی سے اٹا نظر آیا۔ یعنی اس مکان میں کم سے کم دو ہفتے سے کسی نے قدم نہیں رکھا تھا۔ مجھے شک ہوا۔ اگر شہلا نے بینک لاکر تک رسائی کے منصوبے کے کاغذات یہاں رکھے تھے تو اس کا آنا جانا تو ہونا چاہیے تھا۔ میں واپس جیپ میں آیا اور شہلا کے منہ سے ٹیپ اُتار کر کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہم تمہارے بتائے مکان کے سامنے موجود ہیں لیکن یہ تو کئی دنوں سے بند نظر آرہا ہے۔''

اس نے چند گہری سانس لیے۔ ''ہاں میں آخری بار کوئی پندرہ دن پہلے یہاں آئی تھی اور پھر منحوس فتح خان نازل ہوگیا تھا شکر ہے میں نے کاغذات یہاں منتقل کردیے تھے ورنہ وہ دوسری چیزوں کے ساتھ اس کے ہاتھ لگ جاتے۔''

میں نے اس کے الفاظ تولے اگر وہ جھوٹ بھی بول رہی تھی تو بہت صفائی سے بول رہی تھی اس کے لہجے میں کہیں بھی پکڑائی نہیں تھی۔ میں نے گہری سانس لی اور چاقو نکال کر اس کے ہاتھوں کی ہتھکڑی کاٹ دی۔ اس نے جلدی سے اپنی آنکھوں سے ٹیپ اُتارا۔ میں پیچھے ہوا تھا لیکن وہ جان بوجھ کر مجھ سے رگڑ کھا کر جیپ سے نیچے اتری تھی۔ میں نے دل میں اسے سنائیں اور بولا۔ ''کوئی احمقانہ حرکت مت کرنا جس پر پچھتانے کے لیے صرف تمہاری لاش رہ جائے۔''

''مجھے دھمکیاں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے بے زاری سے منہ بنایا اور بولی۔ ''اگر تمہیں کاغذات مل جائیں تو تم میری جان چھوڑ دوگے؟''

''اتنی آسانی سے نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''جب تک میں لاکر تک نہیں پہنچ جاتا اور بریف کیس میرے ہاتھ نہیں آجاتا تمہیں ہمارے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔''

اس کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات نمودار ہوئے اور وہ پھٹ پڑی تھی۔ ''لیکن تمہاری باتوں سے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے تم کاغذات لے کر مجھے چھوڑ دوگے۔''

''یہ تمہاری سمجھ کی غلطی ہے۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔''

''شہباز تم مجھے دھوکا دے رہے ہو۔''

میں مسکرایا۔ ''چلو ایسا ہی سمجھ لو، لیکن کیا تم اس کی مستحق نہیں ہو۔ تم میری دشمن ہو اور دشمن سے آدمی خلوص نہیں برتتا ہے۔ ویسے تم نے سچ مچ مجھے اتنا احمق سمجھا تھا کہ میں کاغذات کا ایک پلندہ لے کر تمہارا شکریہ ادا کروں گا اور تمہیں جانے دوں گا؟''

اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ ''میں تمہیں اندر نہیں لے جاؤں گی۔''

''اگر تم نہ لے جاؤ تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے ہم کسی نہ کسی طرح اندر پہنچ جائیں گے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ ہم سے تعاون کرو۔''

اس نے سوچا اور گہری سانس لے کر سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے لیکن مین گیٹ کی چابی میرے پاس نہیں ہے۔ ہمیں گیٹ پھلانگ کر اندر جانا ہوگا۔''

''مزید اندر جانے کے لیے بھی تو چابیاں درکار ہوں گی۔''

''نہیں اندر کے دروازوں پر فنگر پرنٹ لاک ہیں جب میں اپنے فنگر پرنٹ دوں گی تو لاک کھل جائے گا۔''

''خوب تم نے بڑا جدید سسٹم لگایا ہے۔''

''کرنا پڑا ہے۔'' وہ بولی۔ ''میں گیٹ خود سے نہیں پھلانگ سکتی تم لوگوں کو مدد کرنا ہوگی۔''

''تم فکر مت کرو۔'' میں نے خوشدلی سے کہا۔ ''تمہارا پھول سا بوجھ اُٹھانے کے لیے ہم ہیں۔''

اس نے مجھے گھورا لیکن کچھ کہا نہیں۔ اس دوران میں ایاز نے جیپ اس طرح کھڑی کی کہ گیٹ کا بڑا حصہ اس کے پیچھے چھپ گیا تھا اور کوئی دور سے دیکھتا تو اسے ہم گیٹ پھلانگتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ میں نے آس پاس دیکھا اور جب مجھے کوئی نظر نہیں آیا تو میں گیٹ پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ میں نے ایاز کو باہر ٹھہرنے کو کہا تھا۔ اس نے سہارا دے کر شہلا کو اوپر چڑھایا۔ وہ بُری طرح ڈر رہی تھی اور یوں ڈگمگا رہی تھی جیسے ابھی نیچے گر جائے گی۔ ایاز نے اسے چڑھا تو دیا تھا لیکن اُترنا اسے خود تھا اور اس سے اُترا نہیں جارہا تھا وہ گیٹ کے اوپر بیٹھی ڈگمگا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے بوکھلائے انداز میں کہا۔ ''پلیز مجھے نیچے اُتارو.... میں گر جاؤں گی۔''

''سات فٹ کی بلندی سے گر کر تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''چھلانگ دو۔''

''پلیز۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔ وہ بُری طرح خوف زدہ لگ رہی تھی۔ مجھے ترس آنے لگا اور میں بھول گیا کہ وہ کس قسم کی عورت ہے۔ خوف اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کمر تھامی اور اسے نیچے کھینچا تو وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ تقریباً مجھ پر آگری تھی اور جب تک میں سنبھلتا اس نے ہاتھ مار کر میری جیکٹ کی جیب سے پستول نکال لیا تھا اور پھرتی سے پیچھے ہٹ کر مجھ پر تان لیا۔

''بس شہباز ملک تمہارا کھیل ختم ہوگیا ہے۔''

پستول کی نال میرے سینے کی طرف اٹھی تھی اور شہلا کی انگلی کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔

مزید واقعات اگلے شمارے میں پڑھیے

بیت بازی

قارئین

(نواب حسن نواب، کراچی کا جواب)

سید خضر عباس بخاری.........شجاع آباد

نکالا ہم کو جنت سے فریبِ زندگی دے کر
دیا پھر شوقِ جنت کیوں یہ حیرانی نہیں جاتی

ڈاکٹر اقرا بانو نا گوری.........کراچی

نصیب دیکھیے ساحل پہ ہم پہنچ نہ سکے
خبر پہنچ گئی کشتی کے ڈوب جانے کی

(بشریٰ وحید نیازی، بہاولنگر کا جواب)

فاخرہ ابدالی.........بھمبر کشمیر

دو چار نہیں مجھ کو فقط ایک بتادو
انسان جو اندر سے بھی باہر کی طرح ہو

(مہوش سلیم، ملتان کا جواب)

سعید احمد چاند.........کراچی

یہ بھی اچھا ہوا کہ اسے پا نہ سکے
ہمارا ہوکے بچھڑتا تو قیامت ہوتی

(حبیب شاعر، پنڈی بھٹیاں کا جواب)

طٰہٰ یاسین.........حیدرآباد

ظفر جو لوگ ہوں اونچی اُڑان سے خائف
وہی ہمیشہ پرندوں کے پر کترتے ہیں

یامین اسد.........کراچی

ظلمت کے جنگل میں ہم نے جب رہنے کی ٹھان ہی لی
یادوں کے کچھ جگنو لے کے آئے راہ دکھانے لوگ

(توقیر آفتاب، ساہیوال کا جواب)

پروین صبا.........حافظ آباد

کچھ اس طرح سے جلایا ہے تپتے سورج نے
کہ اب تو چاند کے نیچے بھی پیاس لگتی ہے

شازیہ کمال.........گوجرانوالہ

کہیں آجائے میسر تو مقدر تیرا
ورنہ آسودگی دہر کو نایاب سمجھ

(مہوش رضا، حب بلوچستان کا جواب)

حسنین عباس بلوچ.........ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

وہ بہت رکھتا ہے چاہت کی نمازوں کا حساب
وہ تو اِک سجدہ نہ بخشے جو قضا ہوجائے

(سعید الحسن، گھوٹکی کا جواب)

اختر جوکھیو.........ٹنڈو آدم

لوٹ آئے گا کسی روز وہ آوارہ مزاج
کھولے رکھتے ہیں اسی آس پہ در شام کے بعد

(شگفتہ ملک، راولپنڈی کا جواب)

راجا ثاقب نواز ثاقب.........رتی ٹبی ساہیوال

اس قدر تلخ تھی پینے سے زباں جلتی تھی
زندگی آنکھ کے پانی میں ملالی میں نے

نجمہ شیخ.........چنیوٹ

الوداع ثبت ہوئی تھی جس پر
اب بھی روشن ہے وہ ماتھا کہ نہیں

(فرحانہ احسان، سیالکوٹ کا جواب)

نصرت شاہین.........سرگودھا

ہم کو ڈر ہے کہ نہ بہہ جائیں نشیمن اپنے
ہم کو اس سال بھی برسات سے ڈر لگتا ہے

(نزاکت علی قزلباش، کراچی کا جواب)

حسن علی قزلباش.........کراچی

وہم و گماں کی زد پہ رہی کائناتِ حرف
لیکن میرا سخن کبھی مبہم نہیں پڑا

(سعید احمد چاند، کراچی کا جواب)

اریج گل.........پشاور

وہ ربط دوستی جسے پائندہ کہہ سکیں
ملتی نہیں یہ چیز مگر چاہیے مجھے

نزہت پروین.........شہباز پور

وار اس قدر شدید کہ دشمن ہی کرسکے
چہرہ مگر ضرور کسی آشنا کا تھا

(اکبر بیگ، جرمنی کا جواب)

نصرت جاوید.........اوکاڑہ

اہلِ چمن نے جشنِ بہاراں کے نام پر
وہ داستاں سنائی کہ دامن بھگو دیے

فریحہ ادریس.........لاہور

ایک ایک کرکے خود سے بچھڑنے لگے ہیں ہم
دیکھو تو جاکے قافلہ سالار کون ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نازش فیصل.....ملتان
اس محفل نہ سہی ہجر کا صحرا ہی سہی
خواب و خوشبو کی طرح آؤ بکھر جائیں کہیں
(عقیل الرحمٰن، کھاٹاں کا جواب)

مرزا ناصر بیگ چغتائی.....العین، یو اے ای
اپنے وحشت زدہ کمرے کی اِک الماری میں
تیری تصویر عقیدت سے سجا رکھی ہے

عفت زریں.....کوئٹہ
اس آخری نظر میں عجب درد تھا منیر
جانے کا اس کے رنج مجھے عمر بھر رہا

بے بی ناز.....کراچی
اس قدر ہم نے سہے دنیا کے غم
مسکرا دینے کی عادت ہوگئی

(اطہر علی، دینہ، جہلم کا جواب)

سلیم الزماں.....چنیوٹ
میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں

اختر حسین.....ملتان
میرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

ناصر حسین ناصر.....مظفر گڑھ
میں اس سے ترکِ تعلق نہیں تو کیا کرتا
وہ دور دیس کا باسی تھا کیا وفا کرتا

محمد فہیم.....کراچی
مایوس تمنا جاگ اٹھی انگلیوں کے دیے لو دینے لگے
اس دل کی سوئی بستی میں یہ رات گئے کون آیا ہے

(پرویز مشہد، کراچی کا جواب)

ڈاکٹر اقرا بانو ناگوری.....کراچی
نہ گھبرا اکثر غم سے حصولِ کامیابی مین
چمن میں پھول آنے سے پہلے خار آتے ہیں

(ظہیر حسن، صادق آباد کا جواب)

فہیم الدین عطاری.....میر پور خاص
احترام تمنا یہ احتیاطِ جنوں
کہ تیری بات کروں اور تیرا نام نہ لوں

نظیر الحسنین.....ملتان
یہ لب گلابی اور تمہاری سیاہ آنکھیں
ان کے آگے بھی کیا ہوں گی اماوس کی راتیں

نذر امام.....جہلم
یہ اُڑتی چیلوں کو معلوم ہوگیا کیسے
ہمارے جسم کی خیرات بٹنے والی ہے

ناصرہ خانم.....حب
یہ اور بات کہ خود کو بھلا دیا ہے غیاث
ہم ان کی چاہ میں کیسے بھلا کمی کرتے
(راجا ثاقب نواز ثاقب، ساہیوال کا جواب)

عبدالواحد.....شیخوپورہ
نہ چلا کام محبت کا محبت کے چلائے
چاہوں کس طرح تجھے تو ہی بتا آج مجھے

(نایاب حسن، لاہور کا جواب)

فرح اشرف.....اوچ شریف
حافظ اِک زخم کی صورت ہے بدن میں رونق
مجھ کو بھولی ہوئی ہر بات سے ڈر لگتا ہے

(نصرت جاوید، حافظ آباد کا جواب)

آسیہ ناصر.....وزیر آباد
دھوپ میں پیڑ کا کیا حال ہے احساس نہیں
راہ میں چھاؤں کا ہر شخص تمنائی ہے

بشریٰ بلوچ.....کراچی
دردِ یہ فیصلہ سود و زیاں اور ہی تھا
تشنگی خود کبھی دریا کبھی صحرا چاہے

(آفتاب احمد عباسی، لاڑکانہ کا جواب)

ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی.....برہ زئی
نغمہ جو ہے تو روح میں ہے، نے میں کچھ نہیں
گر تجھ میں کچھ نہیں تو کسی شے میں کچھ نہیں

☆☆☆

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدِ نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

علمی آزمائش - 76

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماھنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماھنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک سطری سرگزشت" کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں اُبھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپردِ ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 دسمبر 2011ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

دادا فوج کے افسر تھے اس لیے والد نے بھی فوج میں ملازمت حاصل کی مگر اس وقت ان کے ملک کا رواج تھا کہ فوجی لوٹ مار کر جو جمع کرتے وہی ان کی تنخواہ ہوتی۔ 21 فروری 1921ء کو اس کے باپ نے اپنے ملک کی کمزور حکومت کو گرا دیا اور اپنے ایک دوست کو وزیراعظم بنا کر خود کمانڈر انچیف بن گیا۔ پھر بادشاہت کا تاج بھی سر پر رکھ لیا۔ مگر جب دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی اور اتحادیوں نے اس کی حکومت پر دباؤ بڑھا دیا تو 16 ستمبر 1941ء کو اس نے تخت سے دستبردار ہو کر اپنی جگہ اسے یعنی بیٹے کو بٹھا دیا۔ بادشاہت حاصل کرنے سے پہلے ہی اس کی شادی مصر کی شہزادی فوزیہ سے ہوئی۔ اس سے ایک بیٹی شہناز ہوئی۔ بادشاہت کے لیے ولی عہد ضروری ہے۔ اس نے فوزیہ کو طلاق دے دی۔ 1950ء میں اس نے ثریا نامی لڑکی سے شادی کی۔ اس سے بھی کوئی اولاد نہ ہوئی تو 1958ء میں اسے بھی طلاق دے دی۔ 21 دسمبر 1959ء کو ایک 22 سالہ لڑکی فرح سے شادی کی جو اس کی بیٹی شہناز کی سہیلی تھی۔ 31 اکتوبر 1960ء کو اس کے بطن سے ایک بیٹا تولد ہوا۔ وہ خوش ہو گیا کہ اسے تخت و تاج کا وارث مل گیا ہے مگر قسمت میں کچھ اور تھا۔ عوام کا غیظ جو اُٹھا تو سب کچھ بہا لے گیا اور تخت پر بٹھانے کے لیے جس وارث کی خاطر اس نے دو دو عورتوں کو طلاق دی اسی وارث کو سینے سے لگائے وہ ملک سے بے سروسامانی کے عالم میں فرار ہوا اور پردیس میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر موت کی گود میں جا سویا۔

علمی آزمائش 74 کا جواب

حضرت امیر خسرو 652 ہجری میں مومن آباد پٹیالی ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ والد سلطان التمش کے دربار سے منسوب تھے۔ ابتدا میں سلطانی تخلص کیا اور فارسی میں شعر گوئی کی پھر ایک بلند مرتبہ صوفی نے زندگی کا رُخ بدل دیا اور وہ بیعت کے بعد اسی در کے گدا بن گئے۔ انہی دنوں مقامی زبان میں شعر کہنے لگے گویا اس زبان کے پہلے شاعر کہلائے۔ نظم و نثر کی ننانوے کتب تصنیف کیں۔ 8 شوال 725 ہجری کو راہی ملکِ عدم ہوئے۔

انعام یافتگان

1- ناصر الدین زنجانی، لاہور - 2 سلطان اختر، سیالکوٹ - 3 پروین ممتاز علی، حیدر آباد
4- شاہد خان حسن زئی، کوہاٹ 5- عطیہ صادق، ملتان

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے: محسن اختر بلوچ، عروج شاہد، نعمت مرزا، آفتاب منصور، محمد فیضان، عمار اسلام الدین شیخ، فرموده فاطمہ، زبیر احسن، نوید الحسن مرزا، جمیل عثمانی، عامر زبیر چوہدری، زبیر ملک، امیر الدین، نوید احسن، فرید حسن، زبیر اختر، تانیہ احسن، عامر اسلام، حسن خان اچکزئی، اطہر حسین، اختر عباس، سنجیدہ احمد، جاوید اقبال، احمد دین (ملیر) سلمان مشتاق، سید عزیز الدین، طارق حبیب، بابر توفیق۔ لاہور سے: الحاج کرم الٰہی اعوان، شاور علی، صاحب جان، امجد خان، احسان الحسن، بلیم وٹو، کوکب جمیل، احتشام لاہوری، احسن خان، ثناء اللہ بخاری، چوہدری اشفاق، نوشین اختر، اختر کوکب بلقیس، مہوش جان، شوکت ملک، انوار علی شاہ، شاہینہ بتول، بہادر خان اچکزئی، شازیہ اکرام، شاہ انوار شاہ۔ اسلام آباد سے: ثمین جاوید، شہزاد علی، اکبر حیات خان، ایمن غزل، زیب النسائی، اکبر خان، نیاز احمد، صالح عبداللہ، ثمین عزیز، مہناز عرفان، میثم زیدی، شبیر خان توری بنگش، فرحت احسان، ثناء اللہ بخاری۔ راولپنڈی سے: اختر علی صدیقی، منظر ڈڈیال، سلیم اللہ، عرفان اللہ قادری، نگار بانو، نورین توری، محمد سہیل، بے بی اسلام شیخ، جلیم اللہ خان، نوازش حسن، نورین زرین، ایمن غزل، یاسمین اختر ناز، چوہدری ممتاز الدین، نوید اسلم، ارباب حسن خان، کائنات بتول، شاہینہ شیخ، ثمینہ عزیز، اقرا تبسم، سلیم اللہ خان، نوروز عالم، فرحت جمال، جاوید اختر، کرم الدین، نزہت فردوس، فرحان مصطفیٰ، یوبی آزر، ریحانہ کنول، طاہر جعفری، غزالہ قمر، زہرہ جبیں، فرید احسان۔ جیکب آباد سے: بصیر الدین، احمد یار خان، فیصل بابر، اسلم مشتاق، ثمینہ جونیجو، قائم علی۔ سرگودھا سے: شفیق حسن، نوازش حسن، فوزیہ پروین، عالیہ سدید پچھی۔ رحیم یار خان سے: نازش سلطانی، شبیر حسین شیرازی، نصرت اسماعیل، فرحت زیبو، امتیاز احمد۔ اٹک سے: جاوید خانزادہ، محمد نعیم اکبر خان، شبیر بٹ، سہیل ناصری، عباس بابر، صبا بٹ۔ چکوال سے: عارف احمد، انعام الحق، نصرت علی، راؤ عبداللہ، فیصل مسیح، مسز پروین رضا۔ کمالیہ سے: نصرت علی، افشاں سحر، فصیح الدین، سعیدہ قریشی، میمونہ شاہد، اشرف رضا، صابر قریشی۔ بہاولنگر سے: انتظار احمد، رضیہ ممتاز، خاقان عباسی، ذوالقرنین جمالی، اشرف علی سعید۔ بہاولپور سے: زبیر احمد، کمال حسن، نعمانہ فرحت، نصرت جاوید خان، وصی الحسن، ابرار الحق۔ میانوالی سے: شمیم اختر، فہیم اختر، حبیب حسن خان، عباس جعفری، ناصر حسن، اسد اللہ۔ ٹنڈو جان محمد سے: تھری امولکھ، شریف ہاری، کمال احسن، جانباز جوکھیو۔ ڈیرہ غازی خان سے: اطہر حسین، شیخ تصدیق، تانیہ احسن، شوکت حسن، ظہیر الحسن۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے: بصیر خان، عائشہ فرحت، حضرت شاہ، زہیب لغاری۔ حیدر آباد سے: ذیشان اختر عطاری، بیگم شمیم النسائی، ممتاز الدین قادری، اکبر علی جوکھیو، کوکب قریشی، ناصر رند، فرحان مرتضیٰ، ناصر حسین فرحت، نعمان اشرف، ممتاز انصاری، فیض بگھیو، اشرف الدین انصاری، طہٰ یاسین۔ فہیم سعید، نعمان شاہ، نصیر حسین نصیر، زینت انصاری، رفیع اللہ انصاری۔ پشاور سے: بشریٰ مجید ملک، عائشہ ابدالی، الطاف سعید، فاخر قمر، سعید الدین، دردانہ خان، سلطان شاہ، سمندر خان، حسنین طوری، نعمت گل، وحید بنگش، فرحان مصطفیٰ، خاقان شاہ، ارباز خان، بشارت شاہ۔ گھوٹکی سے: بالے خان ڈرائیور، ذوالفقار بخشو۔ اوکاڑہ سے: نعمت خان لودھی، اشعر احمد، صالح الدین، زین الاسلام، پروین فرحت۔ واہ کینٹ سے: سلیم احمد، نصرت نیاز، اسلم عباسی، ناز فتح عالم، میمونہ شاہین، شاہد مظہر، تاج بی بی بلوچ، شاہد عمر، اے نظیر، ظفر حیات، شاہدہ عمر قریشی۔ نوشہرہ سے: خالد خان۔ بدین سے: اللہ ڈینو، نازش سہیل۔ ساہیوال سے: عباس سید، نظیر علی شاہ جی، ذوالفقار اسدی، اطہر حسین۔ میرپور خاص سے: ناصر خان، شریف شاہ، مظاہیر علی سید، صفیہ علی، ضوریز اختر۔ چارسدہ سے: نصرت علی خان، جمیل خان، عباس خان۔ جہلم سے: زاہد سرسوی، بنیامین مسیح، اظہر الدین ... کوہاٹ سے: عجب خان، محمد سلیم خان، طلحہ خان، نظیر شاہ، سعید آفریدی، صفدر اچکزئی، گل زمان خان۔ قصور سے: ممتاز علی، ملک فیروز، زین العابدین، مظہر علی، عقیل خان۔ خوشاب سے: حباب خان، احمد علی جان، سلمان شاہ، ربیع محمد مستری۔ صادق آباد سے: مومن خان، ناصر رند، تسلیم ضیائی، فرحت رضوی، پرویز اختر، سلمان علی، نظیر محمد، سلطان علی، سلیمان علی، نکہت فیروز شاہ۔ مظفر گڑھ سے: اکبر علی عابدی، ہیبت خان حسن زئی، ذیشان انصاری، نصرت خان مینگل۔ شکر گڑھ سے: شگفتہ اسلام۔ شہلا فرحت، مہوش فرحت، نوید الحسن، سبط علی۔ لیہ سے: حسن جان، محمد فیض، شوکت علی۔ خیرپور سندھ سے: محسن زیدی، فرخندہ تاثیر، نواز شیخ، احمد دین جوکھیو۔ ہری پور ہزارہ سے: خورشید احمد (کھلابٹ ٹاؤن) مسز فرح الطاف، زیب النسائی، ایرج گل۔ ننکانہ صاحب سے: فرانسس جیمز (مارٹن پور) فرحان زماں، عمر الطاف۔ حافظ آباد سے: ایمن شہزادی، حافظ محمد ابراہیم مستری (قلعہ رام کور) راحیلہ ناز، نذیر سلطان۔ کھاناں سے: سلیم کامریڈ۔ ملتان سے: محمد معین چشتی، سید خضر عباس بخاری ایڈووکیٹ (شجاع آباد) فرزانہ سلیم، چمن آرا، سیدہ نور فاطمہ، غزالہ غنی، تنویر نوازش تنویر، شاذ قریشی، ارم رحمٰن۔ ڈسکہ سے: سیما سمیع اللہ، کشور سلطانہ۔

ممالک غیر سے: زوہیب علی کمالی (دوحہ، قطر) ارشد شیراز، ارشد علی ارشد (دبئی) ناصر توقیر عثمانی (العین، یو اے ای) شاکر حسن شاکر (عمان، السعودیہ) فرحت شاہ (جرمنی) نصرت فاروقی، زینب فیروزی (اوسلو، ناروے) بلقیس جہاں (مانچسٹر)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

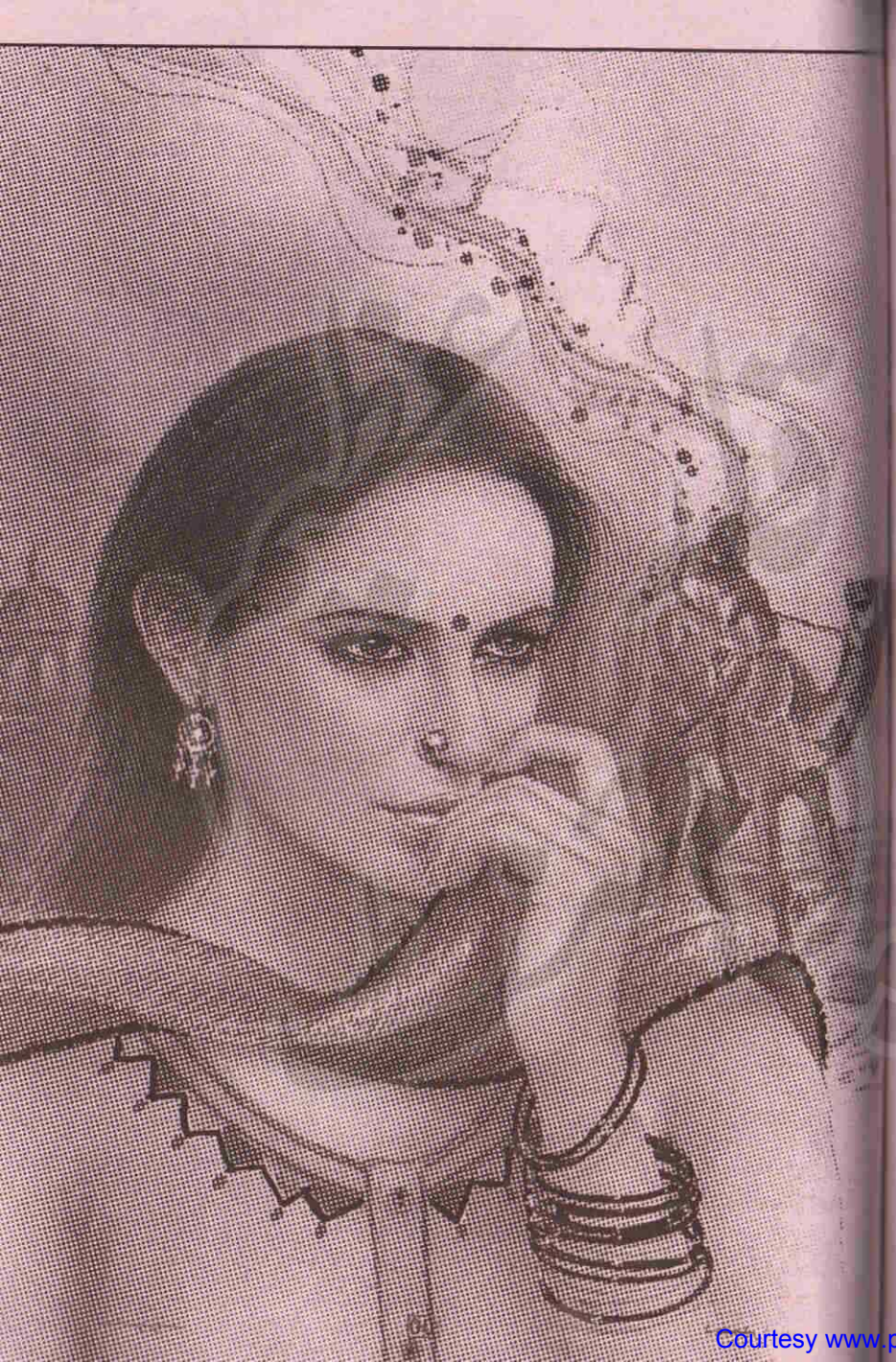

ریگستان میں پھول

جناب ایڈیٹر ماہنامہ سرگزشت
السلام علیکم!
امید ہے بخیریت ہوں گے۔ اپنی سرگزشت میں نے خود لکھی ہے۔ اب پتا نہیں اس میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں' لیکن خود پر گزری تو سب کو اہم لگتی ہے۔ مجھے بھی لگ رہی ہے۔ اگر آپ کو بھی دلچسپ لگے تو اسے سرگزشت میں جگہ دے دیں۔ شاید لاجونتی کی روح خوش ہوجائے۔

اشرف حسن (کراچی)

پتا نہیں کیوں اونٹ بھڑک اُٹھا تھا؟

یہ سفر اب تک تو بہت مزے مزے سے جاری تھا۔ اونٹ کے نگہبان اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور میں اونٹ پر اسی طرح لٹکا ہوا تھا جیسے کوئی مداری اپنا کرتب دکھا رہا ہو۔

ایک تو اونٹ کی سواری میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا پھر اس اونٹ کا بھڑک جانا اور بھی دہشت ناک ہوگیا تھا۔ میں چیخ رہا تھا لیکن اونٹ کے نگہبان پیچھے رہ گئے تھے۔

یہ ایک طویل و عریض صحرا تھا۔ دور دور تک سوائے ریت کے اور کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا، اگر آس پاس کوئی بستی ہوتی تو وہاں کے لوگ اس اونٹ کو قابو میں کر لیتے لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

میرے جسم کا سارا خون سمٹ کر میری کھوپڑی میں آ گیا تھا۔ سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی اور وہ کم بخت اونٹ دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

پھر شاید میں بے ہوش ہوگیا تھا یا ایسی ہی کوئی بات ہوئی تھی کیونکہ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں ہوں اور کن لوگوں کے درمیان ہوں؟

ایک بہت ہی خوبصورت چہرہ میرے سامنے تھا۔

بڑی بڑی آنکھیں۔ دمکتا ہوا سونے جیسا رنگ۔ نازک سے ہونٹ، واقعی وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی جو بہت غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی نمودار ہوگئی۔

''کہاں ہوں میں؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''ابھی یہ دودھ پی لو۔'' اس نے قریبی میز پر رکھا ہوا گلاس میری طرف بڑھا دیا۔ ''تم کو اس کی ضرورت ہے۔''

میں نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر دودھ پی لیا تھا۔ بدن میں توانائی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ بہت اچھا لگا تھا مجھے میں بستر پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

اس وقت کمرے میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جو تھر کی ثقافت کے مطابق سجایا گیا تھا۔ ایک دیوار پر لارڈ کرشنا کی ایک فریم کی ہوئی تصویر بھی تھی۔

''اب بتاؤ کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ؟'' اس لڑکی نے پوچھا۔

''میرا اونٹ بے قابو ہوگیا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''پھر مجھے ہوش نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہوا؟''

''تم ہمیں بستی سے باہر بے ہوش ملے تھے۔ شاید وہ اونٹ تمہیں گرا کر کسی طرف چلا گیا۔''

''ہاں یہی ہوسکتا ہے۔'' میں نے اس کی تائید کی۔ ''یہ جگہ کون سی ہے؟ کون سی بستی ہے؟''

''دھوم پور ہے'' اس نے بتایا۔

''اور تمہارا نام کیا ہے؟''

''کیوں نام پوچھ کر کیا کرنا ہے؟'' وہ مسکرا کر بولی۔

''تم میری محسن ہو۔ تمہارا نام جاننا تو بہت ضروری ہے۔''

''لاجونتی۔''

''تمہارا نام اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

اس کے چہرے پر شرم کے رنگ دوڑ گئے تھے۔

اس دوران اس کمرے میں چار آدمی داخل ہوگئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان میں سے ایک بوڑھا تھا جبکہ دوسرے جوان تھے۔ انہوں نے بھی وہاں کے ماحول اور ثقافت کے لحاظ سے لباس پہن رکھے تھے اور پگڑیاں باندھی ہوئی تھیں۔

"بابو تم ٹھیک تو ہو نا؟" بوڑھے نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"جی ہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ لوگوں کی مہربانی۔"

"یہ میرے باپو جی ہیں۔" لاجونتی نے اس بوڑھے کے بارے میں بتایا۔ پھر اس نے دوسرے لوگوں کا بھی تعارف کروایا۔ سب کا تعلق اسی بستی سے تھا۔

لاجونتی کمرے سے چلی گئی، پھر اس بوڑھے نے مجھے بتایا۔ "بابو جی میرا نام دھرم داس ہے۔ یہ بستی میرے ہی نام پر دھرم پورہ کہلاتی ہے۔ اس میں ساٹھ ستر گھر ہیں اور ہم سب ہندو ہیں۔"

"جی ہاں وہ تو میں سمجھ گیا تھا۔"

"میری ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "بیٹی کو تو تم نے دیکھ لیا ہوگا لاجونتی، جبکہ دونوں بیٹے رانی کوٹ میں آڑھت کا کام کرتے ہیں۔"

اس دوران لاجونتی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے بتایا۔ "باہر تخت لگا دیا ہے۔ کھانا بھی وہیں پروسا جائے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ لوگ اب مجھے اجازت دیں۔" میں نے کہا۔

"شام ہو رہی ہے بابو جی۔" بوڑھے نے کہا۔ "یہاں سے کیسے جاؤ گے؟ کل صبح ہی کسی سواری کا بندوبست ہو سکتا ہے، رات تو تمہیں گزارنی ہوگی۔"

میں نے لاجونتی کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں التجا کر رہی تھیں کہ میں وہیں رک جاؤں اور میں تو ویسے بھی نہیں... جاسکتا تھا۔

کمرے سے باہر آیا تو پوری بستی نگاہوں کے سامنے تھی۔ ساٹھ ستر گھر تھے اور سارے تھری یا راجستھانی انداز کے تھے۔ ہر دروازے پر عورتیں اور بچے تھے، جو بڑی حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ سیدھے سادے لوگ تھے اور ان لوگوں کے درمیان شہر کا ایک آدمی چلا آیا تھا۔

اندھیرا ہونے کے بعد کیروسین لیمپ روشن کر دیے گئے۔ اب صحرا کی وحشت ناکی خواب آور ہواؤں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ آسمان پر چاند تھا جس کی روشنی ریت پر عجب سی چاندنی بکھیر رہی تھی۔

میرے لیے ان لوگوں نے کھانے کا بہت اچھا بندوبست کیا تھا۔ کئی طرح کی سبزیاں اور دالیں تھیں پھر حتے گڑگڑائے جانے لگے۔

اس دوران گاؤں کی لڑکیوں نے ڈھولک بجانی شروع کر دی اور کچھ لڑکیوں نے کوئی گیت شروع کر دیا۔

اس کے بول تو سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن اس میں بے پناہ نغمگی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں جست لگا کر دو تین سو سال پیچھے کے ماحول میں پہنچ گیا ہوں۔

اچانک لاجونتی نے اٹھ کر رقص شروع کر دیا۔

اس نے اپنے پیروں میں گھنگھرو باندھ رکھے تھے جن کی چھن چھن اور گیتوں کی لے اور وہ پُراسرار سا ماحول یہ سب سحر زدہ کرنے والا تھا۔

مجھے اعتراف ہے کہ لاجونتی ایک باکمال رقاصہ تھی۔ اس نے کئی طرح کے رقص دکھائے۔ اندر رس، ملن رس، پیا کا رس اور جدائی کا رس، گیتوں پر کمال کا رقص کیا۔

اس نے ایک سماں سا باندھ دیا تھا اور میں جیسے اس کے آس پاس ہی رہ گیا تھا پلکیں جھپکنی بھول گئی تھیں۔ اس وقت شاید وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی صحرا نہ کوئی بستی نہ لاجونتی کے بستی کے لوگ، نہ اس کے ساتھ کی لڑکیاں۔ صرف وہ تھی اور پوری کائنات رقص کر رہی تھی اور میں پتھر بنا... اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

اچانک وہ سحر اس طرح ختم ہو گیا کہ لاجونتی نے اپنے پاؤں روک لیے تھے۔ رقص ختم ہو گیا تھا۔ اور نبض کائنات پھر سے جاری ہو گئی تھی۔

"میری بیٹی بہت بڑی نرتک ہے۔" دھرم داس نے بتایا۔ "اس نے یہ کلا بہت بڑے مہاراج سے سیکھی ہے۔"

میں کیا کہتا میں تو بس لاجونتی کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے مجھے اپنا اسیر کر لیا تھا۔ ایسا حادثہ بہت برسوں کے بعد سامنے آتا ہے۔ کیا ضروری تھا کہ میں سیر و تفریح کرنے کے لیے مٹھی آتا۔ کیا ضروری تھا کہ میرا اونٹ ناراض ہو جاتا۔ کیا ضروری تھا کہ میں اس بستی کے سامنے آ کر بے ہوش ہوتا۔ اور یہ بھی کیا ضروری تھا کہ اس بستی میں لاجونتی جیسی کوئی لڑکی بھی ہوتی۔

یہ سب کچھ ایک پلاننگ محسوس ہو رہی تھی۔ قدرت کی بے مثال پلاننگ جو مجھے گھیر کر اس بستی تک لے آئی تھی۔ اگر یہ سب نہ ہوتا تو شاید میری زندگی کی کہانی میں کوئی خاص بات بھی نہ ہوتی۔

میرے لیے اس کمرے میں رات گزارنے کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔ لاجونتی میرے لیے چائے لے کر آئی تھی۔

"میں جانتی ہوں کہ شہر کے لوگ چائے بہت پیتے ہیں۔" اس نے کہا۔ پھر کچھ ٹھہر کر بولی۔ "بابو صاحب تم کل صبح چلے جاؤ گے؟"

"ہاں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اب میرا یہاں سے جانے کو دل نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔ "میرے پاؤں یہاں آ کر رک گئے ہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"پتا نہیں کیوں، یہ میں خود نہیں جانتا۔"

"جانا تو پڑے گا نا کسی کو شہر میں تمہارا انتظار بھی تو... ہوگا۔"

"نہیں لاجونتی ایسا کوئی نہیں، جس کو میرا انتظار ہو، سب اپنی اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔"

"نہ تو شادی ہوئی ہے اور نہ ہی......" میں رک کر بولا۔ "اور نہ ہی کوئی میرا محبوب ہے۔ محبوب تو سمجھتی ہو نا؟"

"کیوں نہیں؟" وہ مسکرا دی۔ "ہماری بستی میں ایک بوڑھی عورت ہے۔ بہت کمال کی ہے۔ وہ تمہیں آسمان زمین کی سیر کرا کے بتا دے گی کہ تمہارا پریمی کہاں ہے۔"

"اچھا۔ کہاں ہے وہ عورت ملواؤ اس سے؟"

"ابھی بھی کیا جلدی۔ اب تو تم یہاں سے جا تو نہیں رہے؟"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ تمہارے پاؤں جو رک گئے ہیں۔" اس نے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

ایک طویل عرصے کے بعد میری ایسی کیفیت ہوئی تھی۔ کسی نے مجھے اس طرح جھنجھوڑ دیا تھا جیسے زلزلے زمین کو الٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ میں لاجونتی کے سحر میں کھو کر رہ گیا تھا۔

قسمت پتنگ کی طرح اُڑاتی ہوئی نہ جانے کہاں سے کہاں لے جاتی ہے؟ میں کہاں آ گیا تھا؟ اس نے کہا تھا کہ میرے پاؤں رک گئے ہیں اور میں یہاں سے نہیں جاسکوں گا۔

لیکن کیسے! میرے یہاں رکنے کا کیا جواز تھا۔ یہاں سے کیا تعلق تھا میرا، کچھ بھی نہیں۔ ایک مسافر کی طرح آیا تھا اور مسافر کی طرح واپس چلا جاتا۔

یہی سوچتے سوچتے آخرکار نیند آ ہی گئی تھی۔ یہ کم بخت ہر جگہ آ جاتی ہے۔ چاہے کوئی بھی جگہ ہو۔ کوئی بھی ماحول ہو۔ صبح دھرم داس مجھے جگانے کے لیے آیا تھا۔ اس نے مجھے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "بابو جی تمہارے لیے گاڑی کا بندوبست ہو گیا ہے۔ چائے پی کر نکل لو ورنہ دھوپ تیز ہو جائے گی۔"

ایک شاک سا لگا تھا کیا مجھے یہاں سے جانا تھا لیکن اس نے کہا تھا کہ میرے پاؤں رک گئے ہیں، میں یہاں سے نہیں جاؤں گا لیکن نہیں جانا تو ٹھہر نے کا تو کوئی جواز ہی نہیں تھا۔

میرے لیے لاجونتی چائے لے کر آ گئی۔ چائے کے ساتھ روٹیاں بھی تھیں۔ "لاجونتی میرے لیے گاڑی آ گئی ہے اور مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔"

"کس نے کہہ دیا کہ تم یہاں سے جا رہے ہو؟" لاجونتی پورے اعتماد سے بولی۔ "بابو جی یہاں آ کر تمہارا سفر شروع ہوا ہے۔ اب یہاں سے کہاں جا سکتے ہو؟"

اسی وقت باہر سے دھرم داس نے آواز لگائی۔ "لاجونتی بابو جی کو باہر بھیج دے۔ ٹریکٹر والا جلدی کر رہا ہے۔"

میں نے پریشان ہو کر لاجونتی کی طرف دیکھا۔ "بابو جی تم یہاں سے جاؤ گے تو لیکن جا نہیں سکو گے، تمہیں بھگوان نے بس یوں ہی ایک رات کے لیے مہمان بنا کے نہیں بھیجا ہے اور اگر یہاں سے گئے بھی تو اکیلے نہیں جاؤ گے۔"

"لاجونتی یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"بہت سے بھید اس طرح کے ہوتے ہیں کہ کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ رات میں نے ماتا سے بات کی تھی۔ اس نے مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہت کچھ بتایا ہے۔"

"کون ماتا جی؟"

"وہی جس کے لیے میں نے کہا تھا کہ تمہیں زمین آسمان کی سیر کرا کر تمہارے پیار کو تلاش کرے گی۔"

لاجونتی اس وقت مجھے پُراسرار سی لگ رہی تھی۔ ایک بار پھر میرے تصور میں صدیوں پرانی کہانیاں آ گئی تھیں۔ وہ کہانیاں جن میں اسی قسم کی دیوداسیاں ہوتی ہیں جنہوں نے ودیا حاصل کر رکھی ہوتی ہے جو آوارہ روحوں کی طرح بھٹکتی رہتی ہیں، جن کے سینوں میں بھیدوں کے خزانے ہوتے ہیں۔

دھرم داس کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت تک میں نے ناشتا ختم کر لیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا۔ "بابو جی تمہاری قسمت اچھی ہے کہ آج کچھ لوگ کوٹ کی طرف جا رہے ہیں۔ انہوں نے ٹریکٹر کا بندوبست کیا ہے۔ تم اسی میں بیٹھ کر چلے جاؤ گے۔ وہاں سے تم آگے کہیں جا سکتے ہو۔"

"ہاں میں وہاں سے کہیں بھی جا سکتا ہوں۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں تمہاری محبت اور تمہاری مہمان نوازی کا شکریہ ادا کر سکوں۔"

"ارے یہ کیا بات ہوئی۔" وہ ہنس پڑا۔ "شکریہ ادا کرنا ہو تو لاجونتی کا کرو، یہ بے چاری تمہارے لیے بہت پریشان رہی ہے۔"

میں نے لاجونتی کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں پھر بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "لاجونتی تمہارا بہت بہت شکریہ!! اب مجھے اجازت دو۔"

وہ مسکرا دی، بہت بھید بھری مسکراہٹ تھی جیسے وہ یہ جانتی ہو کہ مجھے کہیں نہیں جانا، اسی کے پاس واپس آنا ہے اور ہوا بھی وہی۔ کچھ دور چلنے کے بعد ٹریکٹر میں خرابی پیدا ہو گئی اور وہ ایک زبردست آواز کے ساتھ ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اس میں سفر کرنے والے نہ جانے کیا کیا بولنے لگے تھے۔

ٹریکٹر چلانے والا انہیں سمجھا رہا تھا کہ اس کی خرابی مشکل سے ٹھیک ہو گی اور ان لوگوں کو چاہیے کہ بستی واپس چلے جائیں۔ ٹریکٹر ابھی بستی سے زیادہ دور نہیں گیا تھا۔

اس وقت مجھے لاجونتی کا اعتماد یاد آ رہا تھا جس نے یہ کہا تھا کہ میں واپس نہیں جا سکوں گا۔ اس بستی نے میرے پاؤں تھام لیے ہیں۔ میرا سفر یہاں آ کر ایک دوسری جہت اختیار کر گیا ہے۔

اس نے کس طرح اتنے یقین کے ساتھ اتنا بڑا دعویٰ کر دیا تھا؟ وہ کتنی پُراسرار لڑکی تھی۔ وہی ہوا جو اس نے کہا تھا۔ ہمیں واپس آنا پڑا۔

بستی والے ہمیں دیکھ کر بہت حیران ہوئے تھے۔ ایک طرف لاجونتی بھی تھی جس کے ہونٹوں پر فاتحانہ سی مسکراہٹ تھی۔ دھرم داس نے مجھ سے کہا۔ "بابو صاحب لگتا ہے اوپر والا نہیں چاہتا کہ تم ابھی جاؤ۔"

"دھرم داس مجھے جانا تو ہے نا۔ تم یہ بتاؤ یہ ٹریکٹر کب تک ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کم از کم دو دن لگیں گے۔" اس نے بتایا۔

"اب جاؤ آرام کرو۔" لاجونتی نے کہا۔ "ہم نے تو تمہیں بھیج دیا تھا۔ اب خود ہی واپس آ گئے ہو تو ہم کیا کریں۔" یہ جملہ اس نے شوخ لہجے میں ادا کیا تھا۔

وہ مجھے کمرے میں لے کر آ گئی۔

"لاجونتی تم نے تو واقعی مجھے جانے سے روک لیا۔" میں نے کہا۔ "لیکن کب تک، جانا تو ہو گا نا۔"

"ہاں جانا تو ہو گا لیکن اس سے پہلے بہت کچھ ہو چکا ہو گا۔" ..... وہ دھیرے سے بولی۔

"کیا ہو چکا ہو گا؟"

"یہ میں ابھی نہیں بتا سکتی، اگر تم کہو تو میں ماتا جی کو تمہارے پاس لے آؤں؟"

"کون ماتا جی؟"

"وہی جو آسمان اور زمین کی سیر کرا کے سب کچھ بتا دیتی ہیں۔"

"چلو وقت گزارنے کے لیے یہی سہی۔"

"نہیں بابو۔ یہ وقت گزارنے والی بات نہیں ہے۔ اس عورت نے نہ جانے کیسے کیسے لوگوں سے یہ علم سیکھا ہے۔ اسّی برس کی ہو چکی ہے۔ بیس سال اس نے بنارس کے مندروں میں تپسیا کی ہے۔ تم اس سے مل تو لو۔"

"اچھا اچھا جاؤ بلا کر لے آؤ۔"

لاجونتی اس اسّی سالہ بڑھیا کو سہارا دے کر میرے پاس لے آئی تھی۔ اس کے چہرے پر اَن گنت جھریاں تھیں۔ ریگستان میں رہنے والوں کے چہروں پر ایسی ہی جھریاں ہوتی ہیں۔ یہ جھریاں سخت دھوپ کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ دھوپ ان کی جلد کو خشک کر کے جگہ جگہ سے چٹخا دیتی ہے۔"

گیروے رنگ کے لباس میں وہ بڑھیا بھی ایسی ہی تھی۔ اس کے گلے میں موٹے دانوں کی مالا میں پڑی ہوئی تھیں۔ اس مرجھائے ہوئے چہرے والی کی آنکھیں عجیب سی

تھیں جیسے وہ ذہن کے اُس پار دیکھ رہی ہو۔

اس بڑھیا نے لاجونتی سے کچھ کہا۔ اس کی تھری زبان میری سمجھ میں نہیں آئی تھی جب کہ لاجونتی اور اس کے باپ کی زبان بہت صاف تھی۔

"ماتا جی کہہ رہی ہیں کہ آج برسوں کے بعد چوکی کروں گی۔" لاجونتی نے بڑھیا کی بات کا مفہوم بتایا۔

بڑھیا نے پھر کچھ کہا۔ "ماتا جی پوچھ رہی ہیں کہ تمہیں کس کی تلاش ہے؟"

"اپنے محبوب کی۔"

"کہاں ہے محبوب؟"

اس وقت مجھے ایک شرارت سوجھی۔ میں نے کہا۔ "اس بے چاری کا انتقال ہو گیا ہے میں اس کی روح سے ملنا چاہتا ہوں۔" لاجونتی نے یہ بات بڑھیا کو بتا دی تھی۔ بڑھیا نے پھر کچھ پوچھا۔ "تم اپنا نام بتاؤ۔" لاجونتی نے کہا۔

"میرا نام اشرف حسن ہے۔" میں نے بتایا۔

بڑھیا نے اب میرا ہاتھ تھام لیا۔ وہ براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔ اس کے بول تو سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن اس گیت کا اثر آہستہ آہستہ دل و دماغ پر ہو رہا تھا۔

مجھے ایسا لگا جیسے میں پرواز کر رہا ہوں اور بڑھیا کی آواز فضاؤں میں رچی ہوئی ہے۔ میں چاند ستاروں کے درمیان سے گزر رہا ہوں اور وہ آواز ساتھ چل رہی ہے۔ اس آواز نے پوری کائنات کو بھر دیا ہے۔ اسی آواز کا حجم بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ میں پرواز کر رہا ہوں پھر چاند ستارے بھی پیچھے رہ جاتے ہیں۔

میں کہیں بہت دور نکل آیا ہوں۔ اب کوئی آواز نہیں ہے۔ ایک سناٹا دینے والی خاموشی ہے۔ مرعوب کر دینے والا سناٹا ہے۔ میں پرواز کیے جا رہا ہوں۔

ایسا دہشت ناک اندھیرا ہے کہ خوف محسوس ہونے لگا ہے۔ پھر بہت دور کہیں روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ نارنجی رنگ کی۔ گلابی، سفید، سبز، نیلی، رنگ بدلتی ہوئی روشنی جو تیز ہوتی جا رہی ہے۔ میری آنکھیں ان روشنیوں سے خیرہ ہوئی جا رہی ہیں۔ جو کچھ بھی دیکھ رہا ہوں وہ بہت حیرت انگیز ہے۔

پھر روشنیاں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ اب چاروں طرف ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی ہیں جیسے بہت سے پرندے پرواز کر رہے ہوں یا بہت سے لوگ ہزاروں لاکھوں کروڑوں لوگ سرگوشیاں کر رہے ہوں۔

پھر ایک واضح آواز سنائی دیتی ہے۔ اشرف حسن کا محبوب سامنے آئے۔ یہ شاید عالمِ ارواح ہے، اَن گنت دھندلے خاکے تیزی کے ساتھ ساتھ گزر رہے ہیں۔ مخلوق در مخلوق آواز، ساتھ ساتھ چل رہی ہے لیکن کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے پھر آواز غائب ہو گئی۔ خاکے سمٹنے لگے۔ سرگوشیاں معدوم ہوتی چلی گئیں۔

پھر وہی بے کراں سناٹا۔ اندھیرا اور برق رفتاری کے ساتھ جسم کا سفر۔ رنگین روشنیاں جو دور ہوتی چلی گئی تھیں پھر چاند اور ستارے جو دور ہوتے گئے پھر ..... پھر ایک آواز "آنکھیں کھول دو۔"

میں نے آنکھیں کھول دیں۔

میرا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ ایسی تھکان تھی جیسے صدیوں کے سفر سے لوٹا ہوں۔ وہی کمرا تھا، وہی بڑھیا اور لاجونتی لیکن میں جیسے اربوں کھربوں میل کا سفر کر کے واپس آیا تھا۔

میں نے جو کچھ بھی تجربہ کیا تھا اس کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں تھے۔ انتہائی حیرت انگیز۔ بڑھیا نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے لاجونتی سے کچھ کہا۔ لاجونتی نے میری طرف دیکھا۔ "ماتا جی پوچھ رہی ہیں کیسا لگا یہ سفر۔"

"بہت شاندار اور بہت حیرت انگیز۔"

"کیا تم کو اس سفر میں اپنا محبوب ملا؟"

"نہیں۔" میں نے اپنی گردن ہلا دی۔ "کوئی نہیں ملا۔"

"تمہارا محبوب نہ آسمان پر ہے۔ نہ روحوں کی دنیا میں ہے۔" بڑھیا نے کہا۔ "اب میں تمہارے پیار کو زمین پر تلاش کرتی ہوں۔" اس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور جیسے مراقبے میں ڈوب گئی۔

جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ میرے لیے انتہائی حیرت کی بات تھی۔ میں نے لاجونتی سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش کروا دیا تھا۔

پُراسرار بڑھیا نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھول دیں پھر اس نے لاجونتی سے کچھ کہا۔ لاجونتی نے بتایا۔ "ماتا جی دیکھ رہی ہیں کہ تمہارا محبوب اسی کمرے میں ہے۔"

"اسی کمرے میں۔ تو پھر ماتا جی سے پوچھو کہ وہ کون ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لاجونتی نے اس بڑھیا سے کچھ کہا۔ بڑھیا نے جواب دینے کے بجائے میرا ہاتھ تھام کر لاجونتی کا ہاتھ اُٹھایا اور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے ساتھ ہی کچھ کہا بھی تھا۔

میرے خدا کیسی عجیب اور مسرت انگیز بات تھی۔ لاجونتی میرا پیار تھی۔ میں نے تو اس بڑھیا سے شرارت کی تھی لیکن اس نے پوری کائنات سے لاجونتی کو تلاش کر کے میرے حوالے کر دیا تھا۔

لاجونتی اس وقت بُری طرح شرما رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کی۔ میں نے ہمت کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کو بوسہ دے دیا تھا۔

بڑھیا خوش ہو کر تالیاں بجانے لگی۔ لاجونتی نے اپنی گردن جھکا لی تھی۔ ”لاجونتی اپنی ماتا جی سے کہو کہ انہوں نے مجھے میری زندگی کا سب سے انمول تحفہ دے دیا ہے۔ میں خوشی سے پاگل ہوا جا رہا ہوں۔“

لاجونتی نے کچھ کہا۔ بڑھیا نے کھڑے ہو کر میری پیشانی پر بوسہ دیا اور کمرے سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے لاجونتی سے کہا۔ ”میں تمہاری ماتا جی کو کچھ دینا چاہتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ انہوں نے اپنے علم سے مجھے حیرت انگیز چیزیں دکھائیں بلکہ اس لیے کہ انہوں نے میرا پیار میرے حوالے کر دیا۔“

لاجونتی شرما کر رہ گئی پھر اس نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔ ”اشرف۔ میں نے کہا تھا نا کہ جیون کے کچھ بھید ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ہمیں بہت بعد میں پتا چلتا ہے کہ یہ سب اس لیے ہوا ہے۔ جیسے تمہارا یہاں آنا۔ یہاں رکنا، یہ سب مقدر میں لکھا ہوا تھا۔ اور میرے لیے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم نے مجھے قبول کر لیا ہے۔“

”میں بہت خوش نصیب ہوں لاجونتی کہ تم مجھے مل گئی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اب کیا ہونے والا ہے؟“

”جو کچھ ہونے والا ہے وہ سب پہلے سے طے ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”پتا جی بھی جانتے ہیں کہ ہم دونوں کے درمیان پیار کا رشتہ ہے۔“

”یہ بات تمہارے پتا جی بھی جانتے ہیں۔“

اس پر لاجونتی نے جو کہانی سنائی وہ اور بھی حیران کرنے والی تھی۔ اس نے بتایا۔ ”میں شاید اس پورے علاقے کی سب سے خوبصورت لڑکی ہوں۔ خوبصورتی جہاں ایک طرف خوشیاں لاتی ہے دوسری طرف پریشان بھی کرتی ہے۔ ٹھاکر رام سنگھ نے ایک دن مجھے دیکھ لیا اور مجھ پر مرمٹا۔ وہ مجھے اپنانا چاہتا ہے۔“

”اور یہ ٹھاکر رام سنگھ کون ہے؟“

”اس علاقے کا سب سے طاقت ور آدمی۔“ لاجونتی نے بتایا۔ ”بہت پیسے والا۔ سرحد پار سے اسمگلنگ کا سامان منگواتا ہے اشرف، تم نہیں جانتے کہ یہ علاقہ کیسا ہے اور یہاں کا قانون کیا ہے۔ یہاں تمہارے قانون کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ یہاں تو تمہاری کرنسی بھی نہیں چلتی۔ خیر تو ٹھاکر رام سنگھ ایک ظالم اور عیاش آدمی ہے۔ میں کسی طرح بھی اس سے شادی نہیں کروں گی۔ پتا جی بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں، وہ خود نہیں چاہتے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ٹھاکر رام سنگھ سے کیسے مقابلہ کیا جائے۔ ہم سب اسی پریشانی میں تھے کہ ماتا جی نے تمہارے آنے کی خبر دی۔“

”کیا تمہاری ماتا جی نے پہلے سے بتا دیا تھا؟“

”ہاں۔ تم ان کی روحانی قوت دیکھ چکے ہو۔“ لاجونتی نے کہا۔ ”اس بوڑھی عورت میں بہت سے کمال چھپے ہوئے ہیں، انہوں نے بتا دیا تھا کہ ایک آدمی بھٹکتا ہوا اس طرف آئے گا۔ وہ ہمیں بے ہوشی کی حالت میں ملے گا اور وہ مسلمان ہوگا اور وہ لاجونتی سے پیار کرے گا اور لاجونتی بھی دل و جان سے اس کی ہو جائے گی۔“

”اور تم میری ہو گئیں۔ کیوں؟“

”ہاں۔“ لاجونتی نے کہا۔ ”اشرف چونکہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ اسی لیے تمہیں جلدی جلدی یہ سب بتا رہی ہوں۔ تم آئے اور ہم نے پہچان لیا کہ تم وہی ہو جس کے بارے میں ماتا جی نے بتایا تھا لیکن تم چونکہ صرف ایک رات کے مہمان بن کر آئے تھے اور اتنی جلدی ہم تمہیں سب کچھ نہیں بتا سکتے تھے اسی لیے تمہیں جانے کی اجازت دے دی گئی لیکن تمہیں روکنے کا بندوبست بھی کر دیا گیا۔“

”وہ کس طرح؟“

”ٹریکٹر خراب نہیں ہوا تھا بلکہ سب کچھ میرے کہنے پر ہوا تھا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”ہاں اسی لیے تم نے اتنے اعتماد سے کہا تھا کہ میں کہیں نہیں جا سکوں گا۔“

”جی ہاں۔“

”لیکن لاجونتی یہ سوچو۔ میں یہاں رہ نہیں سکتا اور تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا کیونکہ ہم دونوں میں فرق ہے۔ میرا مطلب ہے مذہب کا فرق، محبت اور پیار اپنی جگہ لیکن یہ

باتیں بھی تو دیکھنی ہیں۔“

”اشرف صاحب بات یہ ہے کہ میں آپ کی ہو چکی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اور جہاں تک مذہب کا سوال ہے تو میں مسلمان ہونے کو تیار ہوں۔ تم یہ مت سمجھنا کہ میں ٹھاکر رام سنگھ کے ڈر سے یا تمہارے پیار کے لیے دھرم بدلنے کی سوچ رہی ہوں، نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بہت پہلے سے یہ سوچ رہی تھی۔“

”لیکن کیسے۔ تم تو زندگی بھر یہیں رہی ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ اسلام کیا ہے؟“

”جانتی ہوں میں۔ تم میری زبان سے اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں نے رانی کوٹ میں میٹرک تک تعلیم بھی حاصل کی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”وہیں میرے ایک مسلمان ٹیچر نے مجھے اسلام کے بارے میں سب کچھ بتایا تھا پھر کتابیں بھی دی تھیں جنہیں میں چوری چوری پڑھا کرتی۔ اسی لیے میں نے مسلمان ہونے کا ارادہ کر رکھا تھا۔“

”ہاں اب میری سمجھ میں آ گیا لیکن ہم یہاں سے بھاگیں گے کیسے؟“

”رات کے وقت خاموشی سے۔“ اس نے بتایا۔ ”پتا جی کی مرضی سے۔ یہ اس لیے ہوگا کہ بعد میں پتا جی پر الزام نہ آئے، وہ یہ بتا سکیں کہ ہم دونوں رات کے اندھیرے میں بھاگ لیے حالانکہ یہ ان ہی کی مرضی سے ہوگا۔“

”میں تیار ہوں لاجونتی۔“ میں نے کہا۔ ”اب تمہیں بچانا میرا فرض بن گیا ہے۔ دونوں طرح کی ذمے داریاں ہیں۔ مذہبی بھی اور پیار کی بھی۔“

”تو پھر میں یہ سب بابو جی کو بتا دوں؟“

”ہاں بتا دو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ایک اور بات۔ تم لوگوں کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں کیسا آدمی ہوں، ہو سکتا ہے کہ میں دھوکے باز نکل آؤں یا تمہارے ساتھ کچھ اور سلوک کروں تو پھر کیا ہوگا؟“

”جو میرے نصیب میں ہوگا۔ ویسے مجھے پورا یقین ہے کہ تم ایسا نہیں کرو گے۔ اس کے علاوہ ماتا جی نے بھی تمہارے بارے میں بہت کچھ بتا دیا ہے۔“

”میں تمہاری ماتا جی کے علم کا قائل ہو گیا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ عورت روحانیت کے بلند ترین درجے پر ہے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے واقعی آج اور کل کے سارے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ اس نے یہ بتا دیا کہ میں کیسا آدمی ہوں لیکن کیا اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہمارا مستقبل کیا ہو گا۔ ہم کس طرح زندگی گزاریں گے؟“

”ہاں ماتا جی نے یہ بتایا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”انہوں نے کہا ہے کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی محبت میں موت آئے گی۔“ انہوں نے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتایا۔

”چلو میرے لیے اتنا اطمینان کافی ہے۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”اور میرے لیے بھی۔“ لاجونتی نے میرے شانے پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

نہ جانے ہم کہاں تھے۔

صحرا میں راستہ تلاش کرنا آسان نہیں ہوتا اور خاص طور پر بھٹک جانے کی صورت میں۔ ہم بھٹک گئے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہمیں بھٹکا دیا گیا تھا اور صحرا کی رہنے والی لاجونتی کو بھی راستے کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

جس وقت ہم وہاں سے چلے تھے۔ اس وقت سب ٹھیک تھا۔

لاجونتی کے باپ رام داس نے ہمارے لیے ایک اونٹ کا بندوبست کر دیا تھا۔ اس اونٹ کو بستی میں نہیں لایا گیا تھا۔ بلکہ بستی سے کچھ فاصلے پر کھڑا کیا گیا تھا۔

یہ سارے معاملات بہت خاموشی سے طے ہو رہے تھے۔ اس اونٹ پر ہم دونوں کے لیے کھانے پینے کا بہت سا سامان رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ نارچ بھی تھی۔ ایک کمبل بھی تھا اور بھی چھوٹی موٹی دو چار چیزیں تھیں۔

رام داس نے بہت ہی پُرنم آنکھوں سے اپنی بیٹی کو رخصت کیا تھا پھر مجھ سے گلے ملتے ہوئے رو پڑا تھا۔ ”بیٹا! میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو، کیا ہو، کیسے ہو لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تم ٹھاکر رام سنگھ سے بہتر ہو۔ میری سب سے قیمتی چیز تمہارے ساتھ جا رہی ہے۔ میں نے اسے تمہارے حوالے کر دیا ہے۔ زندگی بھر اس کا خیال رکھنا۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہونے دینا۔“

”بابا آپ بے فکر ہو جائیں۔ لاجونتی میری محبت ہے اور اپنی محبت کو کوئی دکھ نہیں دیتا۔“

”بھگوان تم دونوں کو سکھی رکھے۔“ اس نے کہا۔ ”اپنے گھر پہنچ کر اپنی خیریت کی خبر ضرور دینا میرا ایک دوست حیدر آباد میں ہے۔ لاجونتی کو اس کا پتا معلوم ہے اسے بتا دینا۔ وہ مجھے بتا دے گا۔“

”بابا کہیں اس طرح جانے پر ٹھاکر رام سنگھ تمہارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خلاف نہ ہو جائے۔"

"اسی لیے تو تمہارے بھاگنے کا ٹانک رچایا جا رہا ہے۔ ورنہ کون اپنی اولاد کو اس طرح رخصت کرتا ہے۔" اس نے کہا۔ "چلو اب روانہ ہو جاؤ۔"

پھر ہم بستی سے باہر کھڑے ہوئے اونٹ پر بیٹھ گئے۔ اونٹ کی مہار لاجونتی نے سنبھالی تھی جب کہ میں اس کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اور یہ اداس کر دینے والا سفر شروع ہو گیا تھا۔

بہت ہی عجیب سفر تھا۔

میرا یہ سفر کہاں سے شروع ہوا تھا، کراچی سے سندھ کے میدانوں اور شہروں سے ہوتے ہوئے عمر کوٹ اس کے بعد صحرا دیکھنے کی آرزو میں اونٹ کا سفر کرنا اس کے بعد جو واقعات پیش آئے وہ سامنے تھے اور اب میں ایک انتہائی خوبصورت لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر جا رہا تھا جو میرے لیے بالکل اجنبی تھی۔

لیکن اب میرے اور اس کے ستارے ایک ہو گئے تھے۔ چاندنی رات، دور تک پھیلا ہوا صحرا اور ایک خوبصورت ترین لڑکی کا ساتھ یہ سب خواب کی طرح تھا جیسے اب خواب ختم ہو گا اور میں خود کو کراچی کے اپنے فلیٹ کے بستر پر پاؤں گا۔

آس پاس سے عورتوں اور بچوں..... کی آوازیں آ رہی ہوں گی اور باہر سڑک پر بے ہنگم گاڑیاں چل رہی ہوں گی۔

لیکن خواب تو ابھی جاری تھا اور اس خواب کا بھیانک ترین حصہ تو اب شروع ہونے والا تھا کیونکہ زندگی اتنی آسان تو نہیں ہوتی کہ اپنی مرضی سے گزار لی جائے۔

اچانک صحرا کی خاموشی مجروح ہو گئی، وہ گاڑیوں کی آوازیں تھیں ان آوازوں کو سنتے ہی لاجونتی نے اونٹ کو کچوکے دینے شروع کر دیے۔ وہ ایسے زور زور سے ہنکار رہی تھی اور اونٹ کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی اور تیز، اور تیز۔ میں نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اس کی کمر تھام لی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن لاجونتی نے خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ اسی لیے وہ مسلسل اونٹ کو کچوکے لگا رہی تھی اور اونٹ نے اس کا اشارہ سمجھ لیا تھا۔

پھر اچانک دو جیپیں ایک ساتھ نمودار ہو گئیں ان کی روشنیوں سے صحرا کا وہ حصہ روشن ہو گیا تھا۔ وہ جیپیں اونٹ کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھیں اونٹ کو مجبوراً رکنا پڑا تھا۔

"اشرف یہ ٹھاکر رام سنگھ کی جیپیں ہیں۔" لاجونتی نے مجھ سے کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر دونوں جیپوں سے لوگ اترنے لگے۔ قد آور لوگ۔ جن کے شانوں پر بندوقیں لٹک رہی تھیں۔ جیپوں کی روشنیاں گل کر دی گئی تھیں۔ اب صرف چاندنی تھی۔ تیز اور صاف چاندنی جس کی روشنی میں سب کچھ دیکھا جا سکتا تھا۔ میں نے ایک قد آور شخص کو دیکھا جس کی مونچھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ ایک شان کے ساتھ اونٹ کی طرف چلا آ رہا تھا۔

"اشرف یہی ہے ٹھاکر رام سنگھ۔" لاجونتی نے مجھے بتایا۔ "ہمارے اس طرح بھاگنے کا راز کھل گیا ہے۔"

رام سنگھ ہم سے کچھ فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیوں ہے" وہ کڑکتی ہوئی آواز میں بولا۔ "میرے سے چھپ کر اپنے یار کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔"

"زبان سنبھال کر بات کر ٹھاکر! یہ میری محبت ہے۔ میرا پتی ہے، شوہر ہے میرا۔"

"اوہ! دو دن میں یہ تیری محبت بھی ہو گیا۔ تیرا پتی بھی ہو گیا۔"

"ہاں محبت کے لیے دس بارہ سال نہیں لگتے۔ دو منٹ میں ہو جاتی ہے۔"

"شرم نہیں آتی تجھے ایک مسلمان کو اپنی محبت کہہ رہی ہے۔ اپنا پتی مان رہی ہے۔"

"ٹھاکر میں بھی مسلمان ہو چکی ہوں۔" لاجونتی نے کہا۔

"اور ہم نے باقاعدہ شادی کی ہے۔"

"اچھا تو مسلمان ہو گئی ہے؟"

"ہاں۔" لاجونتی نے کہا۔ "ہٹ جا ہمارے راستے سے۔"

اس وقت میں نے پہلی بار زبان کھولی۔ "دیکھو بھائی ٹھاکر! یہ اب ایک مسلمان لڑکی ہے اور اس نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا ہے اور اپنی مرضی سے میرے ساتھ جا رہی ہے۔ اس لیے تمہیں ہمیں روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"حق!" ٹھاکر زور سے ہنس پڑا۔ "اس پورے علاقے میں صرف ایک حق چلتا ہے اور وہ ہے ٹھاکر رام سنگھ کا حق، میں اگر چاہوں تو اس چھوکری کو زبردستی اٹھا کر لے جا سکتا ہوں لیکن نہیں مسلمان ہو کر یہ میرے لیے ملیچھ ہو چکی ہے۔ کسی کام کی نہیں رہی۔"

"تو پھر جانے دو ہمیں۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔ ٹھاکر رام سنگھ تم دونوں کو

یوں ہی چھوڑ دے۔ تم دونوں کے لیے بس یہی ریگستان رہ گیا ہے۔ یہاں سے تم نکل نہیں سکتے۔ یہ اونٹ ایک بار راستہ بھٹک جائے تو پھر بھٹکتا ہی رہتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ اندازہ کر سکتا۔ ٹھاکر رام سنگھ نے کوئی اشارہ کیا اور اس کے آدمیوں نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔

"سنبھل جانا اشرف۔" لاجونتی زور سے چیخی۔

میں نے اس کی کمر پکڑ لی اور اونٹ نے بھڑک کر بے سمت دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ خوفزدہ ہو کر کسی اور راستے پر بھاگ پڑا تھا۔ گولیوں کی آوازیں ابھی تک پیچھا کر رہی تھیں اور اونٹ دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

اور ہم بھٹک گئے۔

بے چاری لاجونتی کو بھی اندازہ نہیں رہا تھا کہ اونٹ کدھر لے جا رہا ہے۔ بس ہم رات کے سینے پر ریت پر سفر کرتے جا رہے تھے اور یہ سفر افراتفری کا تھا۔ خوف کا تھا۔ اندیشوں کا تھا۔

ہم نہ جانے کہاں سے کہاں نکل آئے۔

آہستہ آہستہ اونٹ کی رفتار کم ہونے لگی۔ نہ جانے ہم نے کتنی دور کا سفر کیا تھا اور کتنی دیر کا سفر کیا تھا۔ اس کا بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

اس بھاگ دوڑ میں میرے ہاتھ کی گھڑی نہ جانے کہاں گر چکی تھی۔

اونٹ رک گیا تو ہم نیچے آ گئے۔

ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ محبت ہمیں نہ جانے کہاں لے آئی تھی۔ اس وقت لاجونتی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ "مجھے معاف کر دینا اشرف! یہ ساری مصیبت میری وجہ سے آئی ہے۔ میں تمہیں جانے دیتی تو یہ سب کیوں ہوتا، تم تو اپنی دنیا میں پُرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ میں تمہیں کہاں سے کہاں لے آئی ہوں۔ معاف کر دینا مجھے۔ معاف کر دینا۔"

"کیا پاگل ہو گئی ہو؟" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کیوں ایسی باتیں کر رہی ہو۔ یہ سب تو ہونا تھا کیونکہ اب ہم الگ الگ نہیں ہمیشہ کے لیے ایک ہو چکے ہیں۔ تمہاری ماتا جی نے یہی بتایا تھا نا کہ اب ہمارا مرنا جینا ایک ساتھ ہے۔"

"ہاں یہی بتایا تھا کاش میں نے تمہیں ماتا جی سے نہیں ملوایا ہوتا۔ کاش تم محبت کے چکر میں نہیں پڑتے۔"

"لاجونتی اب جو ہو گیا وہ ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "ہم نہیں جانتے کہ ہم اس ریگستان سے نکل بھی سکیں گے یا نہیں لیکن تم اپنے مسلمان ہونے کی خواہش پوری کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں یہیں موت آ جائے۔"

"بتاؤ مجھے مسلمان ہونے کے لیے کیا کرنا ہو گا؟"

"کچھ نہیں تم میرے ساتھ کلمہ دُہرا دو۔" میں نے کہا۔ "میرا مذہب بہت سیدھا سادا ہے۔"

میں نے کلمہ پڑھا، اس نے کلمہ دُہرا دیا۔ وہ مسلمان ہو گئی تھی۔ "لاجونتی اب تم لاجونتی نہیں بلکہ حیا ہو۔ حیا کا بھی وہی مفہوم ہوتا ہے۔ میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ حالانکہ میں ایک ایسا آدمی ہوں جسے مذہب سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی ہے۔ اس کے باوجود میں اس وقت بے پناہ فخر محسوس کر رہا ہوں۔"

"کیا تمہارا سماج مجھے قبول کر لے گا؟"

"کیوں نہیں کرے گا کیونکہ اپنا سماج میں خود ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور اسی وقت ہم میاں بیوی بھی ہیں حالانکہ یہ ایسی بات کرنے کا موقع نہیں ہے لیکن میں بھی اپنی آرزو پوری کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت خدا ہمارا گواہ ہے، یہ ریگستان، یہ چاند، یہ بادلوں کے آوارہ ٹکڑے اور یہ ایک طرف کھڑا ہوا اونٹ ہمارا گواہ ہے۔ میں قرآن کی چند آیات پڑھ رہا ہوں اس کے بعد ہم دعا مانگیں گے اور ایک دوسرے کو قبول کر لیں گے اور وہ بھی اس لیے کہ شاید یہ ریگستان ہی ہماری قبر ہو۔"

حیا (اب میں اسے حیا ہی لکھوں گا) نے اپنی گردن جھکا لی۔ میں نے بستی آیات یاد تھیں وہ پڑھ ڈالیں پھر میں نے دعا کے لیے اپنے ہاتھ اٹھا دیے۔ "یا خدا تجھ سے زیادہ دیکھنے اور سننے والا کون ہے۔ تیرے سوا کون ہے جس نے ہم دونوں کے ملنے کا موقع پیدا کیا اور تیرے سوا دلوں کی نیتیں جاننے والا کون ہو سکتا ہے۔ یا خدا ہمارے درمیان محبت کے جس جذبے نے سر اٹھایا ہے اس کی آبیاری کرنا۔ اگر ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں تو ہمیں ایک دوسرے کا سہارا بنائے رکھنا ورنہ ہمیں ایک دوسرے کی آغوش میں موت دے دینا۔ آمین۔"

کیا عجیب منظر تھا۔

کیسی شادی تھی یہ ویران ریگستان کے سینے پر ہونے والی جس میں دونوں کی طرف سے کوئی شریک نہیں تھا۔ کوئی گواہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود ہم ایک دوسرے کے ساتھ مخلص تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے دل میں بسا لیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ ہم رو بھی رہے تھے اور مسکرا بھی رہے تھے۔ ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کے وعدے بھی کر رہے تھے۔ اس وقت شاید ہم دونوں ہی پر جنونی کیفیت طاری تھی۔

ہم نے اسی طرح ایک دوسرے کی آغوش میں وہ رات گزار دی۔ اور صبح ایک بھیانک سچائی بن کر ہمارے سامنے آ گئی تھی۔

مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ریگستان میں صبح اتنی جلدی اتنی گرم اور وحشت خیز ہو جاتی ہے۔ ہواؤں کے گرم جھکڑ چلنے لگتے تھے۔ ہمارا پورا بدن ریت سے اَٹ گیا تھا۔ اونٹ بھی بلبلانے لگا تھا۔

''اشرف سایہ ڈھونڈو سایہ۔'' حیا ایک جنونی کیفیت میں بولی۔ ''ورنہ ہم جھلس کر رہ جائیں گے۔''

''سایہ کہاں سے ڈھونڈ لائے۔''

''کہیں بھی۔ اونٹ ہمارے پاس ہے ہم اس پر بیٹھ کر چلتے ہیں۔''

پھر اس نے بتایا کہ ریگستان میں کس طرح چہرے کو کپڑے سے چھپا کر سفر کیا جاتا ہے۔ ورنہ ریت حلق آنکھوں، کانوں اور ناک میں گھس جاتی ہے۔

اس نے میرے چہرے پر نقاب باندھ دی تھی اور خود بھی ویسی نقاب باندھ لی تھی پھر ہم اونٹ پر بیٹھ گئے۔ ابھی ہمارے پاس پینے کے لیے پانی تھا اور کھانے کے لیے بسکٹ بھی تھے۔

یہ ہماری شادی کی پہلی صبح تھی۔ میرا خیال ہے کہ ایسی صبح شاید کسی نے دیکھی ہو۔ ہم زندگی بچانے کی جدوجہد کر رہے تھے اور اس وقت ہمارے جینے کا انحصار صرف سایہ پر تھا ہلکا سا سایہ کسی بھی چیز کا سایہ لیکن سایہ کہاں تھا؟

پھر حیا نے کہا۔ ''اشرف اس ریگستان میں کہیں بھی سایہ نہیں ملنے والا۔ اب صرف ایک راستہ ہے ہم اس اونٹ کو کھڑا کر کے اس کے سائے میں بیٹھ جاتے ہیں۔''

ہم نے یہی کیا۔ اونٹ کو کھڑا کیا اور اس کے سائے میں ایک دوسرے سے لپٹ کر بیٹھ گئے۔ ہم نے اپنے سر گھٹنوں میں چھپا لیے تھے۔ ہوائیں ہمارے سروں پر سے سائیں سائیں گزر رہی تھیں اور وہ ہم پر گرم گرم ریت بھی پھینکتی.... جا رہی تھی۔

اور اسی وقت ایک آواز آئی۔ ''ارے کون ہیں یہ دونوں؟''

☆☆☆

ہم نے تین چار دنوں تک صرف آرام کیا تھا۔

اپنے فلیٹ میں اور اپنے شہر میں جو کچھ گزر چکا تھا وہ بھیانک خواب کی طرح تھا۔ ہم اس موت کے صحرا سے زندہ نکل آئے تھے۔

صحرا میں جانے والے ایک قافلے نے ہماری جانیں بچالی تھیں۔ وہ لوگ جیپوں پر تھے اور شاید قدرت انہیں اس طرف لے گئی تھی۔ جہاں ہم دونوں اونٹ کے سائے میں بیٹھے اپنے خدا سے خیر طلب کر رہے تھے اور خدا نے ہمارے لیے خیر بھیج دیا تھا۔

ہم رانی کوٹ آ گئے۔ وہاں سے حیدرآباد۔ جہاں ہم نے دھرم داس کے باپ کے دوست کو یہ بتا دیا تھا کہ ہم خیریت سے پہنچ گئے ہیں اور پھر کراچی۔

میں نے آتے ہی سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اپنے دوستوں کو جمع کیا اور محلے کی مسجد کے قاضی صاحب کو بلایا اور حیا سے نکاح کر لیا۔

اب وہ شرعی اور قانونی طور سے میری بیوی تھی۔

بھیانک دن گزر چکے تھے۔ زندگی اب آسان ہو گئی تھی۔ میرا اپارٹمنٹ پہلے ہی صاف ستھرا اور خوبصورتی سے سجا ہوا تھا حیا نے اپنی پسند سے کچھ اور چیزیں خرید لی تھیں۔

چونکہ حیا کے لیے شہر کا ماحول نئی چیز نہیں تھا، اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کر رکھی تھی اس لیے بہت جلد ایڈجسٹ کر لیا تھا۔

میں نے اس کی اسلامی تعلیم بھی شروع کروا دی تھی۔ وہ دن میری زندگی کے سب سے خوبصورت دن تھے اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وفاداری اور خدمت کس کو کہتے ہیں۔

اس نے بازار سے اپنے لیے شہری ماحول کے مطابق سوٹ بھی خرید لیے تھے۔ وہ بلاشبہ لاکھوں میں ایک تھی۔ میرے دوست میری قسمت پر رشک کرنے لگے تھے۔

شادی کو ایک سال گزر گیا۔ پتا ہی نہیں چلا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے رہتے تھے۔ اس دوران حیا کے باپ کی خبریں بھی ملتی رہتی تھیں اور یہ بھی پتا چلا کہ ٹھاکر رام سنگھ نے مایوس ہو کر ملک ہی چھوڑ دیا ہے۔ شاید وہ ہندوستان چلا گیا تھا۔

میں نے اپنے بزنس پر پھر سے دھیان دینا شروع کر دیا تھا۔

خدا نے میری وہ دعا بھی سن لی تھی جو میں اس سے مانگ نہیں سکا تھا۔ میری زندگی میں ایک اور خوشی آنے والی

تھی۔ حیا ماں بننے والی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس خوشی اور فخر کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں، جو اس عمل سے گزرتے ہوں گے۔

شادی شدہ جوڑے کی تکمیل ہی اس مرحلے سے ہو جاتی ہے۔

اس دن میں نے حیا سے کہا تھا۔ ''حیا شام کو تیار رہنا۔ تمہارا نام شہر کے سب سے اچھے اسپتال میں درج کروانا ہے۔''

''کیوں اس فضول خرچی کی کیا ضرورت ہے؟''

''اس لیے کہ ہمارے پاس پیار کی نشانی آنے والی ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ پیار بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں شام کو اس کے لیے بہت سے پھل وغیرہ لے کر آیا تھا اور جب اپنے اپارٹمنٹ پہنچا تو نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بات ہو گئی ہو۔ کوئی اَن ہونی بات۔

میں نے تاکید کی تھی کہ دروازہ ہر حال میں بند رہنا چاہیے لیکن دروازہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ میں حیا سے ایسی لاپروائی کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔

میں اسے آوازیں دیتا ہوا اپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا۔

وہ لاؤنج میں نہیں تھی۔ اپنے کمرے میں تھی۔ الماریاں کھلی ہوئی تھیں۔ سامان بکھرا ہوا تھا اور وہ اپنے بستر پر اپنے ہی خون میں نہائی پڑی تھی۔

☆☆☆

شاید کئی برس گزر گئے۔

یا کئی صدیاں گزر گئیں۔ مجھے ہوش کہاں رہا تھا۔ میری تو دنیا اُجڑ گئی تھی۔ پولیس نے اسے ڈکیتی کا کیس قرار دیا تھا کیونکہ حیا کے بہت سے زیورات غائب تھے۔

لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ ڈکیتی نہیں ہے بلکہ ٹھاکر رام سنگھ نے اپنا انتقام لیا ہے۔ حیا مرتے مرتے بھی اس کی نشان دہی کر گئی تھی۔ اس نے ایک اشارہ دے دیا تھا۔ اس کے پاس ایک کی چین تھی جس کی زنجیر کے سرے پر ہاتھی دانت کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا اونٹ تھا۔ یہ کی چین میں نے ہی اسے دیا تھا۔ موت کے وقت وہی کی چین اس کی مٹھی میں دبا ہوا تھا۔

اس اشارے کو میرے علاوہ اور کون سمجھ سکتا تھا۔ اگر میں کسی سے اظہار بھی کرتا تو میری بات نہیں مانی جاتی۔ کوئی نہیں سمجھتا لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ حیا یہ بتا گئی ہے کہ اس کا قاتل ٹھاکر رام سنگھ ہی ہے۔

میری دنیا ویران ہو گئی تھی کچھ بھی تو نہیں رہا تھا میرے پاس۔ میری تو کائنات ہی وہی تھی۔ اور جب وہی نہیں رہی تو پھر زندگی میں کیا رہ گیا تھا۔

خدا ہی جانتا ہے کہ میرے دوستوں نے مجھے کس طرح سنبھالا ہو گا۔ پولیس ڈاکوؤں کو پکڑنے میں ناکام رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ یہ واردات ڈکیتی نہیں تھی بلکہ اس کو ڈکیتی کا رنگ دیا گیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد مجھ پر وحشت سی سوار ہو گئی تھی۔ ''تم نے کہا تھا ساتھ نبھائیں گے عمر بھر، وعدہ خلافی تم تو میری جان کر گئے۔''

ہم نے ریت، چاند اور رات کو گواہ بنا کر ایک دوسرے کو اپنایا تھا لیکن وہ سب کچھ بھول کر اُس دنیا میں چلی گئی جہاں سے واپسی نہیں ہوتی۔

میں نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ ٹھاکر رام سنگھ کی موت کا فیصلہ۔ کسی طرح بھی ہو اس کی یہی سزا تھی۔ وہ کہیں نہیں گیا تھا، اسی ملک میں تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کے ذریعے ہمارا سراغ لگا لیا ہو گا۔ اور وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ اپارٹمنٹ میں داخل ہوا ہو گا۔

اس کا ارادہ ہم دونوں کے قتل کا ہو سکتا تھا لیکن میں دفتر گیا ہوا تھا اسی لیے اس نے اپنا سارا غصہ حیا پر اُتار دیا اور جاتے ہوئے ایسا تاثر دے گیا جیسے گھر میں ڈاکو گھس آئے ہوں۔

میں جانتا تھا کہ وہ کہاں مل سکتا ہے۔ اسی بستی کے پاس جس بستی نے مجھے حیا کی صورت میں ایک تحفہ دیا تھا۔ اور اسی بستی کے ایک بے رحم شخص نے وہ تحفہ مجھ سے چھین لیا تھا۔

☆☆☆

ایک بار پھر اونٹ کا سفر۔

وہی ریگستان لیکن اس بار اونٹ بھڑکا نہیں تھا بلکہ اپنے مالک کے ساتھ سیدھے راستے پر جا رہا تھا۔ اسی راستے پر جو دھرم پور کی طرف جاتا تھا۔

کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ صحرا کی ویرانیاں اسی طرح تھیں۔ گرم ہواؤں کے تھپیڑے اسی طرح تھے۔ آسمان بھی وہی تھا صرف میں بدل گیا تھا۔

آنکھیں وحشت زدہ۔ ایک لانبی بے ترتیب داڑھی۔ ماتھے پر لگا ہوا چندن گیروے رنگ کا لباس۔ گلے میں موٹے دانوں کی مالا۔

مجھے دیکھ کر کوئی بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ میں ایک سادھو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دکھائی دے رہا تھا جو بھٹکتا ہوا دھرم پور کی طرف آ نکلا ہے۔ اونٹ کا مالک بھی ہندو ہی تھا اسی لیے وہ راستے بھر میرا احترام کرتا آیا تھا۔

شام کے وقت ہم دھرم پور پہنچ گئے تھے۔

اس بستی کو دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ یہی بستی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی۔ سب کچھ وہی تھا بس اس بستی کا ایک خوبصورت پھول تاراج کر دیا گیا تھا۔

بستی کی عورتیں اور مرد ایک مسافر ہندو سادھو کو دیکھ کر اپنی اپنی جھونپڑیوں سے باہر آ گئے تھے۔ میں نے ان میں رام داس کو بھی دیکھا۔

اس بستی کا کھیا اور میری حیا کا باپ وہ بہت دبلا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے میرے پاس آ گیا۔ ''آئیں مہاراج کہاں سے آنا ہو رہا ہے؟''

''بہت دور سے۔'' میں نے بتایا۔ وہ بھی مجھے پہچان نہیں سکا تھا۔

''آئیں میرے ساتھ آ جائیں آرام کریں۔''

وہ مجھے اسی کمرے میں لے آیا جس میں کبھی میں رکا تھا اور جہاں میں نے حیا کو حاصل کیا تھا۔ اس کی محبت پائی تھی۔ اس کمرے میں اس کی یادیں اس کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ اس کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس کی نرم ہتھیلی کا لمس اپنے ماتھے پر محسوس ہو رہا تھا۔

رام داس میرے لیے لسی بنا کر لے آیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تمہارے بچے نہیں ہیں۔''

وہ کانپ گیا پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ نہ جانے کیوں ایک آن میں اس کی یہ کیفیت ہو گئی تھی۔

''ارے کیا ہوا ہے تمہیں؟''

''مہاراج ایک بیٹی تھی میری۔ ایک ہی بیٹی لیکن اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی۔''

''کیا ہوا تھا اس کے ساتھ۔''

''یہ بہت عجیب کہانی ہے مہاراج۔ بہت دکھ دینے والی۔'' اس نے کہا۔ ''مہاراج اس نے شہر میں تعلیم پائی۔ میٹرک کر لیا تھا اس نے۔ اس دوران وہ مسلمانوں کے قریب ہو گئی۔ وہ مسلمان ہونا چاہتی تھی۔''

''اوہ تو تم نے اسے منع نہیں کیا۔''

''نہیں مہاراج بلکہ میں تو اس کا ساتھ دیتا رہا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''کیونکہ میں اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ اتنا کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ پھر ایک آدمی ہمارے بستی میں آ گیا۔ وہ مسلمان تھا مہاراج اور میری بیٹی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ میں نے بھی اسے نہیں روکا کیونکہ میں اسے ایک ظالم ٹھاکر رام سنگھ سے بچانا چاہتا تھا۔ میں نے ان دونوں کو یہاں سے نکل جانے میں مدد کی۔ بھگا دیا دونوں کو۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شخص میری بیٹی کا بہت خیال رکھے گا اور ہوا بھی یہی۔ دونوں بہت خوش تھے بہت اچھی زندگی گزر رہی تھی ان کی۔ پھر۔۔۔''

وہ خاموش ہو گیا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ ''مہاراج میرے لیے بھگوان سے کہیں کہ مجھے سکون دے۔ سکون دے مجھے۔''

''تم بتاؤ تو سہی اس کے بعد کیا ہوا؟''

''مہاراج رام لیلا کے دن کچھ سادھو ہندوستان سے آئے تھے۔ انہوں نے جب یہ کہانی سنی تو بہت ناراض ہوئے کہنے لگے مجھے شرم آنی چاہیے کہ میں نے اپنی بیٹی ایک مسلمان کے حوالے کر دی۔ اب میں سارے جنم بے چین رہوں گا۔ سارے دیوی دیوتا میری اس حرکت سے بہت ناراض ہو گئے ہیں۔''

وہ پھر خاموش ہو گیا۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''پھر یہ ہوا مہاراج کہ میرے اندر ایک ہندو کی غیرت جاگ اٹھی اور میں نے شہر جا کر اس کا خون کر دیا۔''

''کیا!'' میں تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ ''خون تم نے کیا؟''

''ہاں مہاراج۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''میں اس سے ملنے کے بہانے پہنچا اور اسے مار کر واپس آ گیا۔''

اس وقت میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اس کم بخت نے کیا کر دیا تھا۔ میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ میری کہانی میں یہ موڑ آئے گا۔

پستول میرے پاس تھا، میں اگر چاہتا تو اس کم بخت کو چھلنی کر دیتا لیکن کیا فائدہ وہ تو خود ہی بے سکون ہو رہا تھا۔ بہر حال اس کے بعد مجھ سے وہاں رہا نہیں گیا اور میں واپس آ گیا۔

بستی کی ماتا جی کی ہر بات درست ہوئی تھی سوائے ایک بات کے کہ ہم دونوں ایک ساتھ جئیں گے اور مریں گے تو ایسا نہیں ہو سکا۔ میری حیا پہلے مر گئی اور میں آج تک اپنی زندگی کی شکستہ گاڑی پر سفر کیے جا رہا ہوں۔

میں کئی بار یہ لکھ چکا ہوں کہ میں کرداروں کی تلاش میں رہتا ہوں۔

ایسے کردار جو دوسروں سے بہت مختلف ہوتے ہیں جو بہت دلچسپ ہوتے ہیں جن کے مشاغل دوسروں سے الگ ہوتے ہیں اور وہ خود کو اپنے مشاغل کے سلسلے میں حق پر سمجھتے ہیں۔

گپ ہانکنے والے، ڈینگیں مارنے والے، کبوتر باز، پتنگ باز، سونا بنانے کی کوشش کرنے والے، جھگڑا کرنے والے روزانہ ایک نئی فلم دیکھنے والے غرضیکہ اس قسم کے بے شمار کردار میری زندگی میں میرے سامنے آئے اور میں ان کی کہانیاں لکھتا چلا گیا۔

بالم خان بھی ایسے ہی ایک دلچسپ انسان تھے۔

وہ ہمارے محلے سے کچھ فاصلے پر ایک کوارٹر میں رہا کرتے۔ میں یہاں دس دفعہ کہی بات پھر دُہرانی چاہتا ہوں، میں نے مضافات کے لوگوں میں زیادہ علمی شعور پایا ہے جبکہ شہروں میں بسنے والے ایسی باتوں کے عادی نہیں ہوتے۔

وہاں علمی اور ادبی باتیں ہوا کرتی ہیں اور یہاں گاڑیوں کے نئے ماڈلز اور فلاں سیاست داں نے یہ کر دیا کے علاوہ اور کوئی بات ہی نہیں ہے۔

بہر حال بالم خان ایک بہت دلچسپ کردار تھے۔

ان کی عادت تھی، مقدمہ کرنا ہم سنتے آئے تھے کہ کسی زمانے میں نواب اور راجا وغیرہ شوقیہ مقدمے بازی کیا کرتے تھے۔ بالم خان بھی اسی مرض میں مبتلا تھے عجیب عجیب بات پر مقدمہ اسی علاقے میں ان کی کئی دکانیں کرائے پر چل رہی تھیں اگر وہ چاہتے تو معقول زندگی بسر کر سکتے تھے لیکن وہ

آخری مقدمہ

محترم مدیر
سلام مسنون!
کافی عرصے بعد حاضر ہوا ہوں۔ پہلے کی طرح یہ بھی سو فیصد سچی سرگزشت ہے۔ بالم خان ایسے ہی کردار تھے کہ ان کی ذات سے بہت ساری کہانیاں پیوستہ تھیں۔ یہ کہانی بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔ پڑھیں اور لطف لیں۔ سرگزشت کے معیار کی ہو تو شائع کر دیں۔

نصیر الدین نیاز (کوئٹہ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی ساری رقم مقدمے بازی پر خرچ کر دیا کرتے۔

وہ عام طور پر مقدمہ ہار جایا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ مجسٹریٹ وغیرہ بھی انہیں اچھی طرح پہچان گئے ہوں گے۔ مجھ سے ان کی اچھی خاصی جان پہچان ہو گئی تھی اسی لیے اپنے مقدموں کی داستانیں مجھے سنایا کرتے تھے۔

اور کبھی کبھی مشورہ بھی لے لیتے۔

ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''بھائی میں سوچتا ہوں کہ نظام علی پر مقدمہ کر دوں۔''

''نظام علی پر وہ کیوں؟''

''کم بخت گریبان کھول کر چلا کرتا ہے۔'' انہوں نے اپنی اس خواہش کی وجہ بتائی۔

''بالم خان، اگر وہ گریبان کھول کر چلتا ہے تو اس میں آپ کا کیا نقصان ہے۔''

''یہ توہین ہے میری۔'' بالم خان نے کہا۔ ''ایک زمانے میں شریفوں کو تاؤ دلانے کے لیے غنڈے اسی قسم کی حرکتیں کرتے تھے، وہ کم بخت مجھے تاؤ دلایا کرتا ہے۔''

''بالم خان، میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ بے چارہ آپ کا بہت احترام کیا کرتا ہے۔''

''یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن وہ گریبان کیوں کھلا رکھتا ہے؟'' بالم خان نے کہا۔ ''اسی لیے میں اس پر کیس کرنے جا رہا ہوں۔''

میں نے سمجھانے کی کوشش بھی کی لیکن بالم خان نے نظام علی پر کیس کر ہی دیا تھا، لطف یہ تھا کہ خود نظام علی بھی اس انوکھے کیس سے محظوظ ہوا تھا کیونکہ پورے علاقے کو بالم خان کے بارے میں معلوم تھا۔

کچھ محلے کے منچلے ان سے فرمائش کر کے کسی نہ کسی کے خلاف اسی قسم کے مقدمات کروا دیا کرتے تھے۔ ''خان صاحب فلاں بندے کا۔۔۔ کتا بہت زور سے بھونکتا ہے۔ تو ہو جائے ایک کیس۔''

''خان صاحب فلاں آدمی اپنی چھت پر کھڑے ہو کر کبوتر بازی کیا کرتا ہے تو کر دیں ایک کیس۔''

تو بالم خان کی زندگی یہی تھی فلاں پر کیس۔ فلاں پر کیس۔

ایک بار تو انہوں نے حد ہی کر دی تھی انہوں نے ایک مرے ہوئے آدمی پر بھی کیس کر دیا تھا اس کی داستان بھی بہت عجیب ہے، وہ آدمی ایک دکاندار تھا۔ اپنے ہی محلے کا تھا لیکن بہت جھگڑالو قسم کا۔

اسی لیے لوگ اس کی دکان سے کترایا کرتے تھے۔

اس شخص کا پورا نام سلطان صلاح الدین تھا۔ خدا جانے اس کے والدین نے اس کا ایسا نام کیوں رکھ دیا تھا۔ بہر حال محلے والے پورا نام تو کیا لیتے۔ اسے صلو صلو کہا کرتے تھے۔

ہم سب کو بھی یہی معلوم تھا کہ اس کا نام صلو ہے۔

یہ بھید اُس دن کھلا جب ہم محلے والے اس کے مرنے کے بعد اس کے سوئم کے لیے اس کی قبر پر گئے، جہاں اس کے پورے نام کا کتبہ لگا ہوا تھا۔ یعنی سلطان صلاح الدین۔

بس پھر کیا تھا بالم خان کی مقدمے بازی والی رگ پھڑک اُٹھی۔ انہوں نے دوسرے دن عدالت میں مقدمہ درج کرا دیا کہ ایسے جھگڑالو اور بدمعاش شخص کا نام سلطان صلاح الدین رکھ دینا سلطان صلاح الدین کی توہین ہے۔

لوگ سمجھانے لگے کہ بھائی وہ بے چارہ مر چکا ہے اب اس کا جو بھی نام ہو، لیکن بالم خان کہاں ماننے والے تھے ان کا مؤقف تھا کہ اس کے کتبے سے یہ نام ہٹا دیا جائے اور صرف صلو لکھا جائے کیونکہ وہ اسی نام سے مشہور تھا۔

بہر حال اس دلچسپ کیس کا فیصلہ بھی بالم خان کے خلاف ہی ہوا لیکن اس کیس نے اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی تھی بلکہ اس زمانے کے ایک دو اخبارات نے اس کا تذکرہ بھی کیا تھا۔

اور وہ دن بالم خان کے لیے انتہائی حیرت اور صدمے کا تھا جب کہ خود ان پر بھی ایک کیس کر دیا گیا تھا ان پر کیس کرنے والا شاید ان سے بڑا جھکی تھا۔

اس کا نام قدرت اللہ تھا ایک بیٹی تھی جو بیوہ ہو چکی تھی۔ اس بیٹی کا نام نوری تھا لیکن اس نوری کی ایک آنکھ بالکل بے نور تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی دوسری آنکھ میں کسی حد تک نور باقی ہو۔

اس زمانے میں شاید چیچک پر قابو نہیں پایا جا سکا تھا، اسی لیے اس مرض نے اس کے چہرے کو داغدار کر دیا تھا اور اس کی وجہ سے اس کی ایک آنکھ بھی بیٹھ گئی تھی۔

بچّہ کوئی نہیں تھا بیوہ ہونے کے بعد وہ اپنے باپ قدرت اللہ کے گھر ہی میں رہنے لگی تھی۔

پس منظر کچھ یوں ہے کہ بالم خان نے نہ جانے کس موڈ میں ایک بار اسے مسکرا کر بھی دیکھ لیا تھا اور اس سے دو چار باتیں بھی کی تھیں اس کی خیریت معلوم کر لی تھی۔

بس ان کی یہی ہمدردی ان کے گلے پڑ گئی تھی۔

ایک دن قدرت اللہ ان کے پاس چلا آیا تھا، یہاں یہ

سلطان محمد تغلق کی طرح فیروز شاہ نے بھی بڑی احتیاط کی تھی کہ سکّے عمدہ اور خالص تیار ہوں۔ اس کے عہد کے خاص سکّے علاوہ طلائی اور نقرئی سکّے کے جو پہلے سے رائج تھے، چہل و ہشت گانی، بست و پنج گانی (یہ سکّے خاص فیروز شاہ کی اختراع تھے) بست و چہار گانی، دوازدہ گانی، دہ گانی، ہشت گانی، شش گانی تھے۔ ان کی قیمتیں علی الترتیب 48 سے لے کر 6 جیتل تک تھیں۔

ایک بار بادشاہ کو خیال آیا کہ خرید و فروخت کے وقت ایک جیتل سے کم کا حساب ہوتا ہوگا تو بیچنے والا کیونکر فاضل رقم واپس کرتا ہوگا جبکہ جیتل سے کم کوئی سکّہ نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے دو سکّے اور رائج کیے، ایک نصف جیتل کا جسے آدھ کہتے تھے اور دوسرا پاؤ جیتل کا جس کا نام بیکھ رکھا گیا۔

ایک دفعہ بادشاہ کو خبر ملی کہ شش گانی سکّہ میں کچھ خفیف سی کھوٹ ہے۔ بادشاہ نے وزرا کو حکم دیا کہ تحقیقات کی جائے۔ یہ واقعہ 772ھ (1370ء) کا ہے۔ خاں جہاں کو خبر ہوئی تو بادشاہ سے عرض کیا کہ سکّہ کی حالت نا کتخدا لڑکی سی ہے کہ اگر اس کی عصمت پر جھوٹا الزام بھی لگ جائے تو پھر اسے کوئی نہیں پوچھتا اس لیے اگر اعلانیہ تحقیقات کی گئی اور کھوٹ ثابت ہو گیا تو شاہی سکّے کا اعتبار اٹھ جائے گا اس لیے پہلے خفیہ جانچ مناسب ہے اس وقت کبیر شاہ ٹکسال کا مہتمم تھا۔ اس سے خاں جہاں نے کہا کہ تم اپنے طور پر تحقیق کر کے مجھے اطلاع دو۔ چنانچہ اس نے تفتیش کی اور خاں جہاں سے کہا کہ واقعی ٹکسال کے بعض شریر آدمیوں نے سکّے میں۔۔ کھوٹ ملا دی ہے۔ خاں جہاں نے حکم دیا کہ سناروں کو بلا کر بادشاہ کے سامنے اسی طور سے جانچ کرائی جائے کہ وہ سکّہ کے کھرے ہونے کی طرف سے مطمئن ہو جائے۔ کبیر شاہ نے سناروں سے حالات بیان کیے انہوں نے مشورہ دیا کہ ہم لوگ بادشاہ کے سامنے بغیر کسی سامان کے طلب کیے جائیں لیکن تھوڑی سی چاندی کسی کوئلہ کے اندر رکھ کر شگاف کو موم سے بند کر دیا جائے۔ جب ہم سکّہ گلائیں گے تو کوئلہ والی چاندی سکّہ کی چاندی سے مل کر وزن کو پورا کر دے گی۔ چنانچہ اس پر عمل کیا گیا اور مجمع عام میں، بادشاہ کے سامنے سکّہ کی جانچ کی گئی۔ چونکہ اس ترکیب سے کسی کو کھوٹ کا پتا نہ چلا اور سکّے کا وزن صحیح نکلا اس لیے بازاروں میں عام اعلان کر دیا گیا کہ جانچ سے سکّہ شش گانی بالکل کھرا معلوم ہوتا ہے اور اس میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔

اقتباس: تاریخ اسلامی ہند علامہ نیاز فتح پوری — تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

بات بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بالم خان اور قدرت اللہ کی عمروں میں پندرہ سولہ برس کا فرق تھا۔ یعنی قدرت اللہ بالم خان سے بڑا تھا لیکن اس کے ہاتھ پاؤں ابھی تک مضبوط تھے اور اس کی آواز بھی اسی طرح گونجدار تھی جیسے مٹکے میں منہ ڈال کر بول رہا ہو۔

اس نے چھوٹتے ہی بالم خان سے کہا۔ ''کیوں میاں یہ تم نے کیا تماشا لگا رکھا ہے۔ شادی کی تاریخ کیوں نہیں دے رہے؟''

''شادی کی تاریخ۔'' بالم خان نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ''میں نہیں سمجھا کیسی شادی؟''

''واہ میاں واہ تم تو اس طرح انجان بن رہے ہو جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔ میں تمہاری اور اپنی بیٹی نوری کی شادی کی بات کر رہا ہوں۔''

''لیکن میں نے تو اس سے شادی کی کوئی بات نہیں کی۔''

''کیسے نہیں کی۔ خود نوری بتا رہی تھی کہ تم نے اس سے باتیں کی تھیں، اس سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا اس کی خیریت معلوم کی تھی۔''

''ہاں یہ سب تو ہوا تھا لیکن اس سے شادی کا کیا تعلق؟''

''تعلق یہ ہے کہ وہ بے چاری تمہارے آسرے پر بیٹھ گئی ہے۔ آج تک کسی نے اس سے ہمدردی کا اظہار نہیں کیا تھا اسی لیے اس نے تمہارے حوالے سے اپنے دل میں امیدیں پیدا کر لی ہیں۔ اب تمہیں اس سے شادی کرنی ہی پڑے گی۔ وہ اولاد ہے میری مجھ سے اس کا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔''

''واہ یہ اچھی زبردستی ہے۔'' بالم خان بھڑک اُٹھے تھے۔ ''مجھے نہیں کرنی ہے شادی۔''

''شادی تو تمہارا باپ بھی کرے گا۔'' قدرت اللہ غصے سے بولا۔ ''تم کسی لڑکی کو اس طرح دھوکے میں نہیں رکھ سکتے۔''

ان دونوں میں اچھی خاصی تو تکار شروع ہو گئی تھی۔

یہ بہت دلچسپ معاملہ تھا۔ پورا محلہ ان دو جھکی لوگوں کی باتیں سن سن کر لطف اندوز ہو رہا تھا اور اس جھگڑے کے ایک ہفتے کے بعد ہی قدرت اللہ نے بالم خان پر کیس کر دیا تھا۔

ہو سکتا ہے کہ پڑھنے والے یہ سوچ رہے ہوں کہ اس زمانے میں کیسے مقدمات ہوا کرتے تھے اور کیا عدالتوں کے پاس اتنا وقت ہوتا تھا کہ وہ اس طرح کی باتوں پر توجہ دیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانے میں جرم نہ ہونے کے برابر تھے۔ زندگی آج کی طرح ہیجان انگیز اور افراتفری کا شکار نہیں تھی۔

آج کی طرح فراڈ، غبن، ڈکیتی، دہشت گردی اغوا برائے تاوان وغیرہ کا سلسلہ نہیں تھا اسی لیے اس قسم کے دلچسپ مقدمات بھی عدالتوں میں پیش ہوا کرتے اور جج صاحبان خود بھی لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

قدرت اللہ نے یہ مؤقف پیش کیا تھا کہ بالم خان نے ان کی بیٹی کو محبت کے آسرے پر رکھا ہے، لہٰذا یا تو ہر جانہ دلوایا جائے یا پھر بالم خان کو شادی کے لیے مجبور کیا جائے۔

بالم خان بہت بھنائے بھنائے پھر رہے تھے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ خود ان پر کیس ہوا تھا اور وہ بھی بغیر کسی جواز کے یعنی ان کا کوئی قصور ہی نہیں تھا اور یہ کیس ان کے گلے پڑ گیا تھا۔

میں نے اس وقت ان کو یاد دلایا۔ ''خان صاحب! یہ سب مکافاتِ عمل ہے۔''

''کیسا مکافاتِ عمل ہے؟''

''آپ خود سوچیں! آپ نے بھی تو لوگوں پر بغیر کسی جواز کے اسی قسم کے مقدمات کیے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کسی کا گریبان کھلا ہے تو اس پر مقدمہ۔ کسی کا کتا بھونک رہا ہے تو اس پر مقدمہ، کسی کی آواز بلند ہے تو اس پر مقدمہ اب آپ پر کیس بن گیا ہے تو برداشت کریں۔''

ایک دن یہ ہوا کہ نہ جانے کس طرح بالم خان نے اس شادی پر آمادگی ظاہر کر دی۔

یہ آمادگی انہوں نے میرے ہی ذریعے بھجوائی تھی۔

''میاں محلے میں ایک تم ہی سمجھدار معلوم ہوتے ہو۔ جاؤ میری طرف سے قدرت اللہ کو پیغام دے دو کہ میں اس کی بیٹی سے شادی کے لیے تیار ہوں۔''

''خان صاحب! یہ اتنی بڑی تبدیلی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی؟''

''میاں بات یہ ہے کہ اس بات کا تو قائل ہوں کہ کسی اور پر کیس کرتا پھروں لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اور مجھ پر مقدمہ کر دے اسی لیے اس کیس کی واپسی کے لیے میں شادی کے لیے تیار ہو گیا ہوں۔''

''خان صاحب! ایک بار پھر سوچ لیں یہ زندگی بھر کا سودا ہے، کہیں آپ کے گلے نہ پڑ جائے۔''

''کچھ بھی ہو، میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے تم بس چلے جاؤ۔''

میں نے قدرت اللہ کو بالم خان کا پیغام پہنچا دیا تھا قدرت اللہ تو خوشی سے اُچھل پڑا تھا۔ ''میاں اب کس بات کا جھگڑا اس سے کہو کہ میں کیس واپس لے رہا ہوں۔''

قدرت اللہ نے کیس واپس لے لیا تھا۔

بالم خان کی شادی بھی محلے والوں کے لیے تفریح کا سبب بن گئی تھی سارے لونڈے لپاڑے شور مچاتے پھرتے تھے۔ شادی کا ہے موسم اک نوری اور اک بالم۔

محلے ہی میں ٹینٹ لگایا گیا تھا محلے والوں نے اس شادی پر خوب انجوائے کیا تھا۔ نوری اپنے گھر سے رخصت ہو کر بالم خان کے گھر آ گئی تھی۔

اس کے بعد ایک تبدیلی ہوئی کہ بالم خان نے مقدمہ بازی ختم کر دی تھی اب وہ کسی پر مقدمہ نہیں کرتے تھے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ ان کی شادی شدہ زندگی کیسی گزر رہی ہے؟ ایک دن انہوں نے خود مجھے بتایا۔ ''میاں کیا تمہیں اندازہ ہے کہ اس شادی کے بعد مجھ پر کیا گزری ہے؟''

''نہیں خان صاحب یہ تو آپ بتائیں گے۔''

''ہاں میں اس شادی میں ہارا بھی ہوں اور جیتا بھی ہوں۔''

''میں نہیں سمجھا یہ کس طرح ہوا ہے؟''

''ہارا تو اس طرح کہ خود مجھ پر ایک کیس ہو گیا۔'' بالم خان نے کہا۔ ''یہ توہین ہے میری اور میری توہین میری ہار ہے۔''

''چلیں یہ تو ہار کی بات ہوئی اور جیتے کس طرح ہے؟''

''جیتا اس طرح ہوں کہ نوری واقعی نوری ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''اس نے مجھے اتنا آرام اور اتنی محبت دی ہے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ کنیزوں کی طرح میری خدمت کرتی ہے۔''

''خاں صاحب خدا آپ کو خوش رکھے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ سب جان کر خوشی ہو رہی ہے۔''

اس کے بعد خان صاحب واقعی بدل گئے۔ اب انہیں اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ کون گریبان کھول کر سامنے سے گزر رہا ہے یا کس کا کتا بھونکا کرتا ہے۔

ایک عرصہ ہو گیا اس محلے سے آئے ہوئے۔ نہ جانے خان صاحب اب ہیں بھی یا نہیں، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ایسے کردار اب دکھائی نہیں دیتے۔

''تم روز ناشتا کرتے ہوئے نخرے کرتی ہو۔'' امی نے خفگی سے کہا۔ ''انڈا پورا کھاؤ اور دودھ کا گلاس ختم کرو۔''

''نہیں امی! مجھ سے اب نہیں کھایا جا رہا۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے بھئی، تم روز اس بحث میں دیر کر دیتی ہو۔'' ابو نے کہا۔ ''زبردستی کیوں کرتی ہو، اس کا دل نہیں چاہ رہا ہے تو کیسے دودھ پیے۔'' پھر وہ مجھ سے بولے ''چلو بیٹا، اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔ پھر مجھے آفس بھی جانا ہے۔''

میں جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور ابو کے ساتھ باہر آ گئی۔

ابو نے موٹر سائیکل نکالی تو مجھے امی کے بڑبڑانے کی آواز آ رہی تھی ''یہ لڑکی تو کچھ کھاتی پیتی بھی نہیں ہے، لنچ بھی ویسے کا ویسا ہی واپس لے آتی ہے، یہ باپ کی شہ نے اسے اور بگاڑ دیا ہے۔''

ابو نے مجھے اسکول چھوڑا۔ واپسی میں امی مجھے لینے آتی تھیں۔ ان دنوں میری عمر صرف پانچ سال ہی تو تھی۔ میں اکلوتی تھی اس لیے امی ابو کی لاڈلی تھی۔ خاص طور ابو تو مجھ پر جان چھڑکتے تھے، کبھی میری آنکھوں میں آنسو دیکھ لیتے تو تڑپ جاتے تھے۔

ہمارا گھرانا خاصا خوشحال اور کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ ابو کسی

تلافی

محترمہ عذرا رسول صاحبہ

السلام علیکم!

لوگ گناہ کرتے ہیں اور بھول جاتے ہیں، مگر ضمیر کبھی نہیں بھولتا۔ مسلسل کچوکے لگاتا رہتا ہے۔ میرے ضمیر پر بھی ایک بوجھ ہے جسے میں اُتارنا چاہتی ہوں لیکن کیا کروں، بزدل ہوں نا، اس لیے اپنا اور تمام کرداروں کا نام بدل دیا ہے۔ امید ہے اس میں کہیں کوئی خامی نظر آئے گی تو اسے آپ درست کرا دیں گی، لیکن شائع ضرور کریں۔

ثمرہ حمید (لاہور)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملٹی نیشنل کمپنی میں مارکیٹنگ آفیسر تھے۔ اب ان کی ترقی ہونے والی تھی اور وہ مجھ سے کہتے تھے "ثمرہ بیٹی! دعا کرو کہ جلدی سے میری ترقی ہوجائے، پھر مجھے کمپنی کی طرف سے گاڑی بھی مل جائے گی۔"

"ابو، میں تو روز دعا کرتی ہوں۔" میں کہتی "پھر ہم اس گاڑی میں خوب گھومیں گے۔"

میں شرارتی بھی بہت تھی۔ گھر میں آئے دن کوئی نہ کوئی نقصان کرتی رہتی تھی۔ امی، ابو سے شکایت کرتیں تو وہ ہنس کر کہتے "ارے چیزوں کی اتنی پروا مت کیا کرو سعدیہ! یہ نقصان تم سے یا مجھ سے بھی تو ہوسکتا تھا۔"

امی چڑ کر کہتیں "آپ کی ان ہی باتوں نے اسے بگاڑا ہے۔"

زندگی یوں ہی خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے ہوئے گزر رہی تھی۔ یوں تو محلے کے ہر گھر میں میرا آنا جانا تھا لیکن برابر والی آصفہ آنٹی کے گھر تو میں کئی کئی گھنٹے گزارتی تھی۔ وہ بہت خوش اخلاق اور محبت کرنے والی تھیں۔ پھر وہ تھیں بھی خاصی خوبصورت اور پُرکشش۔ اس کے علاوہ ان کی بیٹی بشریٰ سے میری دوستی تھی جو میری ہی ہم عمر تھی۔

آصفہ آنٹی بیوہ تھیں۔ شوہر کے مرنے کے بعد وہ بہت ہمت سے حالات کا مقابلہ کررہی تھیں۔ ان کا مکان دو منزلہ تھا، اس کا اوپر والا حصہ انہوں نے کرائے پر اُٹھا رکھا تھا۔ وہ پڑھی لکھی تھیں اس لیے کسی پرائیویٹ اسکول میں ملازمت بھی کرتی تھیں۔ یوں تنگی ترشی سے ان کا گزارہ ہوجاتا تھا۔

وہ اکثر شام کو ہمارے گھر بھی آجاتی تھیں اور کافی دیر تک امی سے باتیں کرتی رہتی تھیں۔ وہ ابو سے بھی اپنے مختلف نوعیت کے کام کراتی رہتی تھیں، کبھی بجلی کا بل جمع کرانا ہوتا تھا، کبھی گیس کا۔ کبھی کوئی اور اسی نوعیت کا کام ہوتا تھا۔

ابو بھی ان کی خوش اخلاقی سے بہت متاثر تھے اور ان کا کام خوشی خوشی کردیا کرتے تھے۔

بشریٰ تھی تو میری ہی ہم عمر لیکن وہ میرے ساتھ اسکول میں نہیں پڑھتی تھی۔ میں شہر کے ایک مہنگے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتی تھی۔ آصفہ آنٹی اس اسکول کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتی تھیں۔ اس لیے بشریٰ اس اسکول میں پڑھتی تھی جہاں آصفہ آنٹی ٹیچر تھیں۔

وقت گزرتا رہا اور میں پہلی کلاس سے پانچویں میں آگئی۔

ایک صبح میں اسکول جانے کو اُٹھی تو امی خلافِ معمول سو رہی تھیں۔ ان کی طبیعت رات ہی سے خراب تھی۔ میرے آواز دینے پر انہوں نے آنکھیں کھولیں اور نحیف لہجے میں ابو سے بولیں "رضوان! آج آپ ثمرہ کو ناشتا کرادیں اور خود بھی ناشتا کرلیں۔ مجھ میں اُٹھنے کی ہمت نہیں ہے۔"

"ارے ناشتے کو چھوڑو، میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔" ابو نے کہا۔

"اب میں اتنی بیمار بھی نہیں ہوں۔ رات کو نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر آرام کروں گی تو ٹھیک ہوجاؤں گی۔" امی نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

ابو نے جلدی جلدی انڈے اُبالے، ڈبل روٹی پر مکھن لگایا اور دودھ کا گلاس بھر کے پہلے مجھے ناشتا کرایا پھر خود بھی اُلٹا سیدھا ناشتا کیا اور جاتے ہوئے امی سے بولے "دیکھو سعدیہ! طبیعت اگر زیادہ خراب ہو تو مجھے فون کردینا۔" یہ کہہ کر انہوں نے بائیک نکالی اور مجھے لے کر روانہ ہوگئے۔

چھٹی کے وقت میں کافی دیر امی کا انتظار کرتی رہی لیکن جب وہ آدھا گھنٹا گزرنے کے بعد بھی نہ آئیں تو میں پریشان ہوگئی۔ اسکول ٹیچرز اور پرنسپل ابھی اسکول ہی میں تھیں۔ میں واپس اندر گئی اور اپنی کلاس ٹیچر کو بتایا کہ آج میری امی مجھے لینے نہیں آئیں۔ اب میں گھر کیسے جاؤں گی؟

"بیٹا! آپ کے پاس اپنے گھر کا فون نمبر ہے؟"

"جی مس!" میں نے کہا۔

وہ مجھے آفس میں لے گئیں اور گھر فون کردیا۔ فون کی گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے فون نہیں اُٹھایا۔ مجھے ابو کا سیل نمبر بھی یاد تھا۔ میں نے کہا کہ آپ میرے ابو کو فون کریں۔ شاید امی گھر میں موجود نہیں ہیں۔

ابو پندرہ منٹ کے اندر اندر وہاں پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر میں حیران رہ گئی کہ وہ موٹر سائیکل کے بجائے نئی گاڑی میں تھے۔

"ابو! یہ گاڑی کس کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ثمرہ بیٹا! میری ترقی ہوگئی ہے اور مجھے آج ہی کمپنی سے یہ گاڑی ملی ہے۔" ابو نے جواب دیا پھر پُرتشویش لہجے میں بولے "بیٹا، مجھے تمہاری امی کی طرف سے پریشانی ہے۔ وہ آخر فون ریسیو کیوں نہیں کررہیں۔ کہیں ان کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہوگئی ہو؟"

ہم گھر پہنچے تو دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ میں بھاگتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔

امی کی حالت بہت خراب تھی۔ ان کا چہرہ پسینے میں ڈوبا

ہوا تھا اور اس پر تکلیف کے شدید تاثرات تھے۔

"سعدیہ! آنکھیں کھولو۔" ابو نے کہا "کیا بات ہے، طبیعت زیادہ خراب ہے؟"

"میرے..... سینے..... میں..... شدید درد ہورہا ہے۔ مجھ سے سانس بھی نہیں لی جارہی۔"

"چلو، میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔" ابو نے کہا۔

"آپ ثمرہ..... کا خیال....." ان کا جملہ ادھورا رہ گیا اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

ابو تڑپ کر آگے بڑھے۔ امی کی نبض دیکھی، سینے سے کان لگا کر ان کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی پھر چیخ کر بولے "سعدیہ! آنکھیں کھولو، اُٹھو..... ڈاکٹر کے پاس چلو۔" پھر وہ بچوں کی طرح رونے لگے۔

انہیں روتا دیکھ کر میں بھی رونے لگی۔ ہماری آواز سن کر سب سے پہلے آصفہ آنٹی ہمارے گھر آئیں۔ پھر محلے کی دوسری عورتیں بھی آنے لگیں۔ آصفہ آنٹی نے محلے کے کسی لڑکے کو بھیج کر ڈاکٹر کو بلوالیا تھا۔ ڈاکٹر نے امی کی نبض دیکھی، اسٹیتھواسکوپ سے ان کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی پھر مایوسی سے سر ہلا کر بولا "سوری!" اور امی کا چہرہ چادر سے ڈھانپ دیا۔

ابو تڑپ کر بولے "ڈاکٹر صاحب! ذرا غور سے دیکھیے، ممکن ہے سعدیہ کو صرف سکتہ ہوگیا ہو۔ آپ کہیں تو میں اسے اسپتال لے چلتا ہوں۔ وہاں آکسیجن لگادیں، کوئی ایسا انجکشن لگادیں کہ یہ پھر سے سانس لینے لگے۔"

ڈاکٹر نے ابو کا شانہ تھپتھپایا اور نرم لہجے میں بولا "آپ کی مسز کا ہارٹ فیل ہوا ہے۔ ابھی تک دنیا میں کوئی بھی ایسی دوا یا انجکشن تیار نہیں ہوا جو انہیں دوبارہ زندہ کرسکے۔"

پھر تو ابو یوں بلک بلک کر روئے کہ وہاں موجود سب لوگوں کی آنکھیں بھی اشک بار ہوگئیں۔

"صبر کریں رضوان صاحب!" محلے کے ایک بزرگ نے ابو سے کہا "اللہ کی امانت تھی، اس نے واپس لے لی۔ بس مرحومہ کے لیے مغفرت کی دعا کریں اور خود کو سنبھالیں ورنہ آپ کی بچی کو کون سنبھالے گا؟"

محلے کے دوسرے لوگوں نے بھی تسلی کے وہی روایتی جملے دُہرائے۔ ان سب نے ابو کو یہی مشورہ دیا کہ اگر اس موقعے پر آپ ہمت ہار بیٹھے تو آپ کی بیٹی کا کیا ہوگا؟

ابو نے روتے روتے اچانک میری طرف دیکھا اور بڑھ کر مجھے سینے سے لگالیا۔ میں ابو کے سینے سے لگ کر اتنا روئی کہ ان کی قمیص کا ایک حصہ میرے آنسوؤں سے تر ہوگیا۔

امی کے سوئم کے بعد سبھی لوگ چلے گئے۔ سوائے ایک آنٹی آصفہ کے۔ وہ ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں اور ان دنوں زیادہ وقت ہمارے ہی گھر میں گزارتی تھیں۔ وہ ہر طرح میری اور ابو کی دل جوئی کرتی تھیں۔

مرنے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جاتا، پھر بھی ابو کو سنبھلنے میں کئی ہفتے لگ گئے۔

زندگی ایک دفعہ پر معمول پر آگئی لیکن اب امی کے بغیر مجھے گھر کے در و دیوار کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ ابو نے تو آفس جانا شروع کردیا تھا لیکن میں نے امی کی موت کے بعد اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔

ابو کا معمول اب یہ تھا کہ وہ علی الصباح اُٹھ کر فجر کی نماز پڑھتے تھے، پھر میرے لیے اور اپنے لیے ناشتا تیار کرتے تھے۔ ناشتا کرانے کے بعد وہ مجھے آصفہ آنٹی کے گھر چھوڑ جاتے تھے۔ آصفہ آنٹی نے بھی ان دنوں اسکول سے چھٹی لے رکھی تھی۔ میرا دل ان کے گھر میں بھی نہیں لگتا تھا کیونکہ

کیسے چلے آئے

1921ء میں نئی دہلی میں ایک لنچ کے موقعے پر قائداعظم محمد علی جناح اپنی بیگم رتی جناح کے ساتھ مدعو تھے۔ اس موقعے پر لارڈ ریڈنگ مسز جناح سے باتیں کرتے ہوئے کہنے لگے کہ "مسز جناح! میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ مجھے جرمنی جانے کی کتنی تمنا ہے..... لیکن افسوس میں نہیں جاسکتا۔"

مسز جناح نے پوچھا "آخر آپ وہاں کیوں نہیں جاسکتے؟"

لارڈ ریڈنگ نے جواب دیا "اصل بات یہ ہے کہ جرمن ہم برطانوی لوگوں کو پسند نہیں کرتے۔"

رتی جناح فوراً بولیں "پھر آپ ہندوستان کیسے چلے آئے؟"

مرسلہ: ارشاد العصر جعفری، مظفر گڑھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بشریٰ اسکول چلی جاتی تھی۔ آصفہ آنٹی میری دل جوئی کی خاطر مجھے طرح طرح کے قصے سناتی تھیں۔

ابو آفس جانے سے پہلے میرے لنچ کے لیے آصفہ آنٹی کو کچھ روپے دے دیا کرتے تھے، جانتے تھے کہ ان کا ہاتھ بھی تنگ ہے اور وہ بہ مشکل تمام گزارہ کرتی ہیں۔ آصفہ آنٹی نے ایک آدھ دفعہ تو پیسے لینے میں پس وپیش سے کام لیا، پھر ابو کے اصرار پر انہوں نے پیسے لینا شروع کر دیے۔ وہ اتنی رقم ہوتی تھی کہ اس سے دوپہر کے کھانے کے ساتھ ساتھ ان کے رات کے کھانے کا انتظام بھی ہو جاتا تھا۔

ایک دن ابو کے آنے کے بعد وہ شام کو ہمارے گھر آئیں۔ ابو آفس سے آنے کے بعد رات کا کھانا خود ہی پکایا کرتے تھے۔ انہیں ہوٹل کے کھانے پسند نہیں تھے۔ وہ کچھ دنوں میں اچھا خاصا کھانا پکانے لگے تھے، بس وہ روٹیاں تنور سے لے آتے تھے۔

ابو اس وقت بھی کچن میں مصروف تھے۔ میں چھوٹے موٹے کاموں میں ان کی مدد کر رہی تھی اور یہ بھی سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ابو کھانا کیسے تیار کرتے ہیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ایک دن میں ابو کو اپنے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھلا کر حیران کر دوں گی۔

آصفہ آنٹی سیدھی کچن میں پہنچیں اور ابو کو کھانا پکاتے دیکھ کر شاکی لہجے میں بولیں ”رضوان صاحب! آپ کیا مجھے غیر سمجھتے ہیں؟ آپ تھکے ہوئے دفتر سے آتے ہیں، اس کے بعد کھانا پکانے میں لگ جاتے ہیں۔ کیا دو آدمیوں کا کھانا میں تیار نہیں کر سکتی؟“

”یہ بات نہیں ہے۔“ ابو نے جلدی سے کہا ”میں اور ثمرہ آخر کب تک آپ پر بوجھ بنے رہیں گے؟ یہی سوچ کر میں.....“

”بس بس!“ آصفہ آنٹی نے ان کی بات کاٹ دی ”آپ نے تو واقعی میرے خیال کی تصدیق کر دی۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ مجھ پر بوجھ ہیں۔ آپ کی اس بات سے مجھے انتہائی صدمہ پہنچا ہے۔“

”ارے، میرا یہ مطلب نہیں تھا محترمہ!“ ابو نے کہا ”میں تو صرف خود کو مصروف رکھنے کے لیے یہ سب کرتا ہوں۔“

”مصروف رکھنے کے اور بھی تو بہت سے طریقے ہیں اور یہ محترمہ کیا ہے؟ میرا نام آصفہ ہے۔ آپ کے اس لفظ ”محترمہ“ سے بھی غیریت کی بو آ رہی ہے۔“ پھر وہ اپنائیت سے بولیں ”بس آج کے بعد رات کا کھانا بھی آپ کے لیے میں ہی تیار کروں گی۔“

”ایک شرط پر۔“ ابو نے کہا ”اس کے لیے آپ کو پیسے لینا پڑیں گے۔ دیکھیے آصفہ! مجھے غلط مت سمجھیے گا۔ میں جانتا ہوں کہ آج کل آپ کا ہاتھ بھی تنگ ہے۔ اگر آپ واقعی اپنا سمجھتی ہیں تو انکار نہیں کریں گی۔“

”اب آپ نے بات ہی ایسی کہہ دی ہے کہ میں انکار کر ہی نہیں سکتی۔“ آصفہ آنٹی نے کہا۔

پھر انہوں نے ابو کو کچن سے باہر نکالا اور خود کھانا پکانے لگیں۔ نہ صرف انہوں نے سالن تیار کیا بلکہ روٹیاں بھی پکا دیں۔

یوں رات کا کھانا بھی آنٹی بہت اہتمام سے ہمارے گھر بھیجنے لگیں۔ وہ طرح طرح کے کھانے پکانے میں ماہر تھیں۔ پھر ابو انہیں ہر ماہ اس مد میں اتنی رقم دے دیتے تھے کہ ان کا گزارہ بھی بہت اچھے طریقے سے ہونے لگا تھا۔

ابو کے سمجھانے بجھانے پر میں نے دوبارہ اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ ہاں، دوپہر سے شام تک کا وقت میں آنٹی کے گھر ہی میں گزارتی تھی۔ اسکول سے واپسی میں وہی مجھے لے کر آتی تھیں۔ ان کا اسکول میرے اسکول سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔

یوں زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی۔

ایک دن آصفہ آنٹی مجھے بشریٰ کے ساتھ گھر میں چھوڑ کر کسی کام سے باہر چلی گئیں۔ انہوں نے مجھے تاکید کر دی کہ جب تک میں واپس نہ آؤں، تم بشریٰ کے ساتھ ہی رہنا۔

میں تھوڑی دیر تو بشریٰ کے ساتھ کھیلتی رہی، پھر مجھے خیال آیا کہ آج تو ہفتہ ہے۔ ہفتے والے دن ابو جلدی آ جاتے تھے، پھر وہ مجھے گاڑی میں بٹھا کر سیر کے لیے لے جاتے تھے۔

یہ سوچ کر میں بے چین ہو گئی۔ میں نے بشریٰ سے کہا کہ میں ابھی آتی ہوں۔

میں بھاگی بھاگی گھر پہنچی تو گیٹ کی ایک جھری سے مجھے ابو کی گاڑی دکھائی دی۔ گویا ابو آ چکے تھے۔ گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں گھر میں داخل ہو گئی۔

ڈرائنگ روم سے ابو کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

میں اندر داخل ہونے ہی والی تھی کہ آصفہ آنٹی کی آواز سن کر چونک اٹھی۔ وہ ابو سے کہہ رہی تھیں ”رضوان! آپ ابھی نوجوان ہیں، پوری زندگی آپ کے سامنے پڑی ہے، پھر بچی کا ساتھ ہے۔ کل وہ جوان بھی ہو جائے گی۔ پھر آپ

کو دوسری شادی کرنے میں قباحت کیا ہے؟“

”میں نہیں چاہتا آصفہ کہ میری بچی پر سوتیلی ماں کا سایہ بھی پڑے۔ ثمرہ بہت ذہین اور فرمانبردار بچی ہے۔ اس نے تو ابھی سے گھر کی ذمے داریاں اٹھالی ہیں۔ اس کے جوان ہونے کے بعد تو میرے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے گا۔ میں اس کی شادی کر دوں گا۔ پھر وہ جانے اور اس کے سسرال والے جانیں۔“

”لیکن رضوان! میں تو.....“ آنٹی کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ کسی نے اطلاعی گھنٹی بجائی تھی۔

اچانک ابو کمرے سے باہر نکل آئے۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے اور بولے ”تم گھر میں موجود ہو اور مجھے پتا نہیں۔“

ان کے پیچھے پیچھے آصفہ آنٹی بھی باہر آ گئیں اور چونک کر بولیں ”تم کب آئیں ثمرہ؟ میں نے تو تم سے کہا تھا کہ جب تک میں نہ آؤں، تم بشریٰ کو اکیلا مت چھوڑنا۔“

ابو گیٹ پر جا چکے تھے۔ میں نے جلدی سے کہا ”آنٹی، میں تو ابھی ابھی آئی ہوں۔ میں صرف یہ دیکھنے آئی تھی کہ ابو آفس سے آ گئے یا نہیں؟“

ابو خاکی رنگ کا ایک لفافہ لیے ہوئے واپس آئے۔ شاید ان کے آفس کا کوئی خط تھا۔

آصفہ آنٹی نے کہا ”اب میں چلتی ہوں، ثمرہ بھی آ گئی ہے، گھر میں بشریٰ اکیلی ہو گی۔“

میری ایک پھوپو لاہور میں رہتی تھیں۔ وہ ایک دن اچانک ہمارے گھر پہنچ گئیں۔ وہ ابو سے بڑی تھیں۔ ابو ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ مجھ سے تو وہ خاص طور پر بہت محبت کرتی تھیں۔ مجھے ان کے آنے پر بہت خوشی ہوئی۔

پھر ابو کے دفتر سے آنے کے بعد وہ دیر تک بند کمرے میں ابو سے نہ جانے کس بات پر بحث کرتی رہیں۔

ایک دن میں آصفہ آنٹی کے گھر سے آئی تو ابو کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور پھوپو بہت بلند آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔ ”بس رضوان!“ پھوپو نے سخت لہجے میں کہا ”اب میں تمہاری ایک نہیں سنوں گی۔ گھر میں ایک بیٹی موجود ہے۔ کل ماشاء اللہ وہ جوان بھی ہو جائے گی، پھر اس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ اسے زمانے کی اونچ نیچ کون سمجھائے گا؟ نوخیز لڑکیوں کو اس عمر میں زیادہ نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے اور گھر میں کوئی سرپرست موجود نہ ہو تو ایسی لڑکیاں اکثر بے راہ روی کا شکار ہو جاتی ہیں لیکن تمہیں تو اپنے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔“

”آپا! مجھے آپ کی بات سے انکار نہیں..... لیکن ہماری پڑوسن آصفہ، ثمرہ کا ہر طرح سے خیال رکھتی ہے.....وہ.....“

”پڑوسن میں اور گھر والی میں بہت فرق ہوتا ہے رضوان!“ پھوپو نے کہا ”پھر نہ جانے کیوں، مجھے تمہاری وہ پڑوسن ایک آنکھ نہیں بھاتی، اب اگر تم نے میری بات نہ مانی تو پھر مجھ سے کوئی تعلق بھی نہ رکھنا دوبارہ، آج کی کسی فلائٹ سے میری سیٹ کنفرم کرا دو۔“

”ایسی بھی کیا جلدی ہے آپا!“ ابو نے کہا ”ابھی تو آپ کو آئے ہوئے تین دن بھی نہیں ہوئے۔“

”میں پورا گھر ناصرہ پر چھوڑ کر آئی ہوں۔ وہ بچی آخر کب تک گھر سنبھالے گی۔ پھر تم اپنے بہنوئی کی عادت تو جانتے ہی ہو۔ انہیں کسی کے ہاتھ کا کھانا پسند ہی نہیں آتا۔“

”ٹھیک ہے، میں کل کی فلائٹ سے آپ کی سیٹ بک کرا دیتا ہوں۔“ ابو نے کہا۔

”میں نے اب تک تم سے جو باتیں کی ہیں ان کا جواب ہاں یا نا میں دو۔“ پھوپو نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں پہلے بھی صائمہ کے بارے میں تفصیل بتا چکی ہوں۔ وہ بہت معصوم اور محبت کرنے والی لڑکی ہے۔ بے چاری نوعمری ہی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ اس کا تو آگے پیچھے بھی کوئی نہیں۔“

”آپا، آپ کہتی ہیں تو میں آپ کی بات سے کیسے انکار کر سکتا ہوں۔“

دوسرے دن پھوپو لاہور چلی گئیں۔

ابو شام کو مجھے گاڑی میں سیر کرانے لے گئے۔ اس دن اور رات کا کھانا بھی ہم نے ایک شاندار ریسٹورنٹ میں کھایا پھر ابو نے کہا ”ثمرہ بیٹا! میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”ارے تو کیجیے نا؟“ میں نے کہا۔

”ثمرہ بیٹا! تم گھر میں بالکل اکیلی رہتی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارا یہ اکیلا پن ختم ہو جائے۔“

”میں اکیلی کب رہتی ہوں ابو!“ میں نے کہا ”سارا وقت تو آصفہ آنٹی کے گھر رہتی ہوں۔“

”بیٹا، آصفہ آنٹی بھی کب تک ہمارا بوجھ برداشت کریں گی۔ پھر لڑکیوں کا یوں کسی دوسروں کے گھر میں رہنا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ اپنا گھر تو پھر اپنا گھر ہوتا ہے۔ میں..... میں تمہارے لیے نئی امی لانا چاہتا ہوں۔“ ابو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”نئی امی!“ میں نے حیرت سے پوچھا ”کیا امیاں بھی نئی اور پرانی ہوتی ہیں؟“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں بیٹا، ہوتی ہیں۔ نئی امی ہر طرح سے تمہارا خیال رکھیں گی۔ تم ساری دوپہر آصفہ کے گھر گڑی میں جھلستی ہو۔ نئی امی کے آنے کے بعد آرام سے اپنے کمرے میں اے سی چلا کر سونا۔ ان کے آنے سے گھر کی تنہائی بھی دور ہو جائے گی اور ہمیں آصفہ کے احسان سے نجات مل جائے گی۔"

"لیکن نئی امی میری امی کی طرح تو نہیں ہو سکتیں ابو!"

"وہ تم سے اتنا ہی پیار کریں گی، وہ پڑھی لکھی ہیں۔ تمہیں ہوم ورک بھی کروا دیا کریں گی اور تمہاری دوسری تمام ضرورتوں کا خیال بھی رکھیں گی۔ ان کے آنے سے مجھے بھی سکون مل جائے گا کہ میری بیٹی گھر میں اکیلی نہیں ہے۔ بولو، کیا کہتی ہو، لے آؤں نئی امی؟"

میں ان کی بات کا جواب سوچ ہی رہی تھی کہ وہ میری خاموشی کو رضامندی سمجھے اور بولے "بس تو پھر فیصلہ ہو گیا کہ میں تمہارے لیے نئی امی لے آؤں۔ صائمہ کا بالکل اپنی امی ہی کی طرح ادب اور احترام کرنا۔"

یہی نام پھوپو نے بھی لیا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ پھوپو ہی ابو کی دوسری شادی کروانا چاہتی ہیں۔

دوسرے ہی ہفتے صائمہ نئی امی بن کر ہمارے گھر میں آ گئیں۔ وہ بھی میری امی کی طرح انتہائی خوبصورت تھیں، بہت نرم اور دھیمے لہجے میں بات کرتی تھیں اور ان کی آواز بہت اچھی تھی۔

انہیں پہلی دفعہ دیکھ کر مجھے اپنی امی یاد آ گئیں۔ ان کے بال بھی امی کی طرح بہت لمبے اور چمک دار تھے۔

امی کو یاد کرتے ہی میں رونے لگی۔ نئی امی نے بہت پیار سے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور بولیں "ثمرہ بیٹا! کیا بات ہے، کیا تمہیں میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا؟"

"نہیں، وہ دراصل مجھے اپنی امی یاد آ گئی تھیں، پیچھے سے تو آپ بالکل امی کی طرح لگتی ہیں۔"

"میں ہر طرح سے تمہاری امی کی طرح ہوں بیٹا! اب تم میری بیٹی ہو۔ میں بھی پوری کوشش کروں گی کہ تمہیں اتنی ہی محبت دے سکوں جتنی تمہاری امی تمہیں دیتی تھیں۔ بس، اب میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہ دیکھوں ورنہ میں بھی رونے لگوں گی۔" یہ کہہ کر وہ واقعی رونے لگیں اور اس بُری طرح روئیں کہ میں گھبرا گئی۔ میں نے اپنی ہتھیلی سے ان کے آنسو صاف کیے تو میری ہتھیلی گیلی ہو گئی۔

"واہ صائمہ امی!" میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے تسلی دیتے دیتے خود رونے لگیں۔" میں زبردستی مسکرائی۔

"ثمرہ بیٹا! میں خود بھی اس دکھ سے گزر چکی ہوں۔ میں تو اس وقت صرف دو سال کی تھی جب میری امی کا انتقال ہوا تھا۔" انہوں نے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی آپ سے وعدہ کرتی ہوں صائمہ امی کہ آج کے بعد میری آنکھوں میں آنسو نہیں آئیں گے۔"

"اور بیٹا! یہ صائمہ امی کیا ہے؟" وہ ہنس کر بولیں "تم مجھے صرف امی بھی تو کہہ سکتی ہو۔"

"امی کہوں گی تو مجھے بار بار اپنی امی یاد آئیں گی۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"اچھا تم مجھے ماما کہہ لیا کرو۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

"ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔" میں نے کہا۔

ماما کے آنے کے بعد میں کئی دن تک آصفہ آنٹی کے گھر نہیں گئی۔ اب ماما ہی مجھے اسکول سے لے کر آتی تھیں۔

وہ میری ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتی تھیں۔ میرے کپڑے دھونا، استری کرنا، میرے بال سنوارنا اور میرے جوتوں پر روزانہ پالش کرنا۔ مجھے ہلکا سا بخار بھی ہو جاتا تو وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر بھاگتیں۔

ان کے اسی سلوک کی وجہ سے میں ان سے خاصی مانوس ہو گئی تھی۔ میں امی کو بھلا تو نہیں پائی تھی لیکن ماما کے پیار نے ان کی کمی خاصی حد تک پوری کر دی تھی۔

میں ماما کے ساتھ ایسی مگن ہوئی کہ دو ہفتے تک آصفہ آنٹی کے گھر بھی نہ جا سکی۔

ایک دن بشریٰ ہی ہمارے گھر چلی آئی۔ اس نے آتے ہی شکوہ شروع کر دیا کہ تم تو بہت بے مروت ہو ثمرہ! تم اپنی نئی امی کو پا کر ہمیں بھی بھول گئیں۔ امی تو اکثر تمہیں یاد کر کے روتی ہیں۔ وہ تو تمہیں بھی اپنی بیٹی ہی سمجھتی ہیں۔"

مجھے خود بھی شرمندگی ہو رہی تھی کہ پھپھو آصفہ آنٹی نے بشریٰ سے بڑھ کر میرا خیال رکھا، ابو کو کھانے کی تکلیف نہیں ہونے دی۔ وہ بے چاری یہ سب کچھ میری محبت میں ہی تو کر رہی تھیں۔

میں نے بشریٰ سے وعدہ کر لیا کہ میں آج شام کو تمہارے گھر ضرور آؤں گی۔

شام کو ابو آئے تو وہ ماما سے بولے "تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ثمرہ کو بھی تیار کر دو، ہمیں بیگ صاحب کے گھر دعوت میں جانا ہے۔"

"ابو!" میں نے کہا "میرا وہاں جانا کیا ضروری ہے؟ آپ ماما کے ساتھ چلے جائیں۔"

"اور تم اتنی رات تک اکیلی رہو گی؟" ماما نے کہا۔

"نہیں ماما، میں آصفہ آنٹی کے گھر چلی جاؤں گی۔ میں کئی دن سے ان کے گھر نہیں گئی ہوں، جب آپ لوگ آئیں تو مجھے بلوا لیجیے گا۔"

"نہیں ثمرہ بیٹا! کسی کے گھر اتنی رات تک رہنا اچھی بات نہیں ہے۔ تم کل اسکول سے آنے کے بعد کچھ دیر کے لیے آصفہ آنٹی کے گھر چلی جانا۔"

میں نے ابو کی طرف دیکھا کہ شاید وہ مجھے اجازت دے دیں۔ ابو نے کہا "ثمرہ بیٹا! تمہاری ماما ٹھیک کہہ رہی ہیں، تم کل آنٹی کے گھر چلی جانا۔"

اس دن مجھے پہلی دفعہ ماما پر غصہ آیا۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی؟ میں نے مہینوں آنٹی کے گھر میں گزارے ہیں۔ اس وقت تو ابو کو کبھی بُرا نہیں لگتا تھا، آج وہ بھی ماما کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔ میں بہت بے دلی سے تیار ہوئی اور ابو کے ساتھ بیگ کے گھر چلی گئی۔

دوسرے دن میں آصفہ آنٹی کے گھر پہنچی تو بشریٰ نے چھوٹتے ہی طنزیہ لہجے میں کہا "شکر ہے، تمہیں ہمارے گھر کا راستہ تو یاد آیا۔"

"یہ بات نہیں ہے بشریٰ!" میں نے کہا "میں تو کل ہی شام کو آتی لیکن....." پھر میں نے اسے وجہ بتا دی کہ میں کیوں نہ آ سکی۔

آصفہ آنٹی نے محبت بھرے لہجے میں کہا "ثمرہ! اِدھر آ کر میرے پاس بیٹھو۔ میں تو تمہاری صورت دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔" پھر انہوں نے بشریٰ سے کہا "کھڑی کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہے، جا ثمرہ کے لیے کچھ کھانے کو لا اور شربت بھی بنا لینا۔"

"یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے آنٹی؟" میں نے کہا "میں کوئی مہمان تو نہیں ہوں۔"

"ارے تو پہلے کیا تم مہمان تھیں؟" آنٹی نے کہا "میرے لیے تو جیسے بشریٰ ہے، ویسے ہی تم ہو بلکہ میں نے تو کوشش کی ہے کہ تمہیں اچھے سے اچھا کھلاؤں۔" پھر وہ دھیمے لہجے میں بولیں "ثمرہ بیٹی! صائمہ تمہیں پریشان تو نہیں کرتی ہے؟"

"نہیں آنٹی!" میں نے جلدی سے کہا "ماما تو بہت اچھی ہیں۔ وہ تو بالکل میری امی کی طرح میرا خیال رکھتی ہیں۔"

"ارے بیٹا! یہ سب دنیا دکھاوے کے لیے اور تمہارے ابو کو متاثر کرنے کے لیے صائمہ کی چال ہے۔ سوتیلی ماں سوتیلی ہی ہوتی ہے۔ وہ کبھی سگی ماں کا درجہ نہیں لے سکتی۔"

پھر وہ مزید دھیمے لہجے میں بولیں "پہلے تم ہر دوسرے تیسرے دن شام کو اپنے ابو کے ساتھ گھومنے پھرنے جایا کرتی تھیں۔ کبھی الہ دین پارک، کبھی سندباد اور کبھی سی ویو۔ صائمہ کے آنے کے بعد تمہارے ابو تمہیں ایک دفعہ بھی کہیں گھمانے لے گئے ہیں؟"

میں نے ذہن پر زور دیا تو مجھے بھی یاد آ گیا کہ ابو آخری دفعہ مجھے شادی سے ایک ہفتے پہلے گھمانے لے گئے تھے۔

"اور یہ صائمہ! آہستہ آہستہ تمہارے ابو کے دل میں تمہارے خلاف نفرت بھر دے گی۔ سوتیلی مائیں یہی تو کرتی ہیں۔ اب بھی تم نے غور کیا ہو گا کہ تمہارے ابو دفتر سے آنے کے بعد صائمہ انہیں لے کر کمرے میں بند ہو جاتی ہو گی۔ وہ تمہارے خلاف، تمہارے ابو کے دل میں نفرت کا بیج بو رہی ہے۔ ایک دفعہ اس نے تمہارے ابو کو اپنے بس میں کر لیا تو تمہاری حیثیت اس گھر میں نوکرانی سے بھی بدتر ہو گی۔"

کوئی اور یہ بات کہتا تو میں اسے کھری کھری سنا دیتی لیکن آصفہ آنٹی کبھی کوئی فضول بات کرتی ہی نہیں تھیں۔ مجھے ان کی باتوں پر کچھ کچھ یقین آنے لگا۔ واقعی، ابو آفس سے آنے کے بعد کھانا کھاتے تھے، کچھ دیر ٹی وی دیکھتے تھے پھر ماما مجھے کمرے میں سلا کر اپنے کمرے میں چلی جاتی تھیں۔ تو کیا واقعی ماما یہ پیار و محبت کا ڈراما ابو اور دنیا کو دکھانے کے لیے کر رہی تھیں؟

آصفہ آنٹی دیر تک مجھ سے اسی قسم کی باتیں کرتی رہیں۔

میں ان کے گھر سے لوٹی تو خاصی فکرمند تھی۔ ماما کی شکل مجھے ذرا بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

ماما میرا اُداس چہرہ دیکھ کر خاصی پریشان ہو گئیں اور بولیں "ثمرہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے بیٹی! تم اتنی پریشان کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں ماما، میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں تمہیں گرم دودھ کے ساتھ سر درد کی گولی کھلاتی ہوں۔ تم اپنے کمرے میں چل کر لیٹو۔"

میں خود بھی تنہائی چاہتی تھی اس لیے خاموشی سے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ میرے کانوں میں آصفہ آنٹی کے یہ جملے گونج رہے تھے۔ "سوتیلی ماں، کبھی سگی ماں کی جگہ نہیں لے سکتی۔ صائمہ، تمہارے ابو کے دل میں تمہارے خلاف نفرت بھر رہی ہے۔ تمہاری حیثیت اس گھر میں نوکرانیوں سے بھی بدتر ہو گی۔"

ابھی میں سب سوچ ہی رہی تھی کہ ماما میرے لیے گرم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دودھ سر درد دور کرنے کی ایک گولی لے آئیں۔ آنٹی کی باتیں سن کر واقعی میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔

میں دودھ پی کر اور گولی کھا کر لیٹ گئی تو ماما ہولے ہولے میرا سر دبانے لگیں۔ وہ ساتھ ساتھ کوئی لوری بھی گنگنا رہی تھیں۔ میں شاید آپ کو بتا چکی ہوں کہ ان کی آواز بہت اچھی تھی۔ میں نے اکثر انہیں گنگناتے بھی سنا تھا۔ وہ بہت اچھا گاتی تھیں۔

ان کے نرم اور خوبصورت ہاتھوں کے لمس اور ان کی مترنم آواز سے واقعی مجھے بہت سکون ملا اور میں نہ جانے کب سو گئی۔

دوسرے دن بشریٰ پھر مجھے بلانے آ گئی۔ اس وقت تک ابو بھی آ چکے تھے۔

میں نے ماما سے آنٹی کے گھر جانے کی اجازت مانگی تو انہوں نے کہا ''تم کل ہی تو کئی گھنٹے وہاں گزار کر آئی ہو، لڑکیوں کا روز روز جانا اچھا نہیں لگتا۔''

''لیکن ماما، وہ آنٹی آصفہ......''

''اسے جانے دو صائمہ!'' ابو نے کہا ''آصفہ نے بچپن سے اس کا خیال رکھا ہے۔ اسے اپنی بیٹی سے بڑھ کر چاہا ہے۔''

ابو کی اجازت ملتے ہی میں ماما کی طرف دیکھے بغیر تیر کی طرح گھر سے نکل گئی۔

جب آصفہ آنٹی کو میں نے بتایا کہ ماما تو آنے کی اجازت نہیں دے رہی تھیں لیکن ابو نے اجازت دے دی۔

''بیٹا، تمہارے ابو بہت سیدھے اور نیک انسان ہیں۔ تمہاری یہ سوتیلی ماں ایک دن ضرور ان کے دل میں تمہارے لیے نفرت بھر دے گی۔''

''پھر آنٹی، آپ ہی بتائیے، میں کیا کروں؟'' میں نے کہا۔

''تم زیادہ سے زیادہ اپنے ابو کے قریب رہنے کی کوشش کرو۔ شام کو ان کے ساتھ پہلے کی طرح گھومنے پھرنے جایا کرو اور صائمہ کی کوئی بھی بات بُری لگے تو اپنے ابو سے بالکل مت چھپاؤ، آخر وہ بھی تو تمہارے ابو کو تمہارے خلاف کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پھر تم ایسا کیوں نہیں کر سکتیں؟''

آصفہ آنٹی مجھے نرم اور دھیمے لہجے میں بہت اپنائیت سے سمجھا رہی تھیں اور ان کی باتیں میرے دل پر اثر کر رہی تھیں۔

اس دوران میں ایک بات میں نے اور محسوس کی کہ ان کے گھر میں اب پہلی سی خوشحالی نہیں ہے۔ تین چار ماہ سے ان کا کرائے کا مکان خالی تھا۔

آنٹی نے بتایا کہ لوگ مکان دیکھنے تو آتے ہیں لیکن ان میں سے کچھ تو مجھے پسند نہیں آتے، کچھ لوگوں کو مکان پسند نہیں آتا۔

اکثر چھڑے چھانٹ لوگ بھی مکان لینا چاہتے ہیں۔ ان سے مجھے کرایہ بھی زیادہ ملے گا اور زیادہ پریشانی بھی نہیں ہوگی کیونکہ وہ لوگ صبح جائیں گے تو پھر شام ہی کو اپنے دفتروں سے واپس آئیں گے۔''

''تو آنٹی! آپ ان لوگوں کو اپنا مکان کرائے پر کیوں نہیں دے دیتیں؟''

آصفہ آنٹی افسردگی سے مسکرائیں اور بولیں ''تم ابھی بچی ہو۔ یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ محلّے کے لوگ یہ بات پسند نہیں کریں گے کہ میں اپنا مکان ایسے لوگوں کو دوں۔'' پھر وہ مزید افسردہ ہو کر بولیں ''اب تو اسکول سے میری ملازمت بھی ختم ہو گئی ہے۔''

''کیوں آنٹی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا ''آپ تو بہت پابندی سے اسکول جاتی تھیں۔''

''بس بیٹا! اسکول کے مالک کی مرضی، میں کیا کہہ سکتی ہوں۔''

اس دن میں گھر واپس آئی تو مزید افسردہ تھی۔ ایک تو ماما کے خلاف میرے دل میں نفرت جڑ پکڑ رہی تھی، پھر آنٹی کی پریشانی نے مجھے بہت اُداس کر دیا تھا۔

میں نے کھانا بھی برائے نام کھایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ماما سے میری یہ حالت چھپی نہ رہ سکی۔ وہ بھی پیچھے پیچھے میرے کمرے میں آ گئیں اور بولیں ''کیا بات ہے چندا! تم جب بھی آصفہ کے گھر سے آتی ہو، بہت پریشان ہو جاتی ہو؟''

''اس لیے کہ آصفہ آنٹی آج کل خود پریشان ہیں۔ ان بے چاری کی آمدنی کا بھی کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا، بس چند گھروں میں جا کر ٹیوشنز پڑھا دیتی ہیں جس سے ان کے گھر کا چولھا دن میں ایک دفعہ جل جاتا ہے۔'' یہ جملہ آصفہ آنٹی ہی نے کہا تھا ورنہ مجھے اس وقت اتنی سمجھ کہاں تھی کہ میں اس قسم کے جملے بول سکوں۔ پھر میں نے انہیں بہت تفصیل سے بتایا کہ آصفہ آنٹی کیوں پریشان ہیں؟

''تم فکر مت کرو جان!'' ماما نے کہا ''مجھے خوشی ہے کہ تم دوسروں کی تکلیف کو اتنا محسوس کرتی ہو۔ میں اس سلسلے میں رضوان سے بات کروں گی۔ وہ آصفہ کی مالی امداد بھی کر دیں اور محلّے والوں کو راضی بھی کر لیں گے کہ آصفہ اپنا مکان ان لوگوں کو دے دے جو تنہا رہتے ہیں۔''

ان کی اس بات سے مجھے بہت سکون ملا۔

دوسرے دن ماما محلّے کے مختلف گھروں میں گئیں کہ وہ آصفہ آنٹی کو مکان کرائے پر اُٹھانے دیں۔

وہ واپس آئیں تو ان کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ محلّے والوں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

شام کو ابو آئے تو ماما نے ان سے کچھ رقم لے کر مجھے دی اور کہا کہ فی الحال تم یہ پانچ ہزار روپے آنٹی کو دے آؤ۔ رضوان محلّے والوں سے بات بھی کریں گے۔ ان کا مکان بھی کرائے پر اُٹھ جائے گا۔''

میں پیسے لے کر سیدھی آصفہ آنٹی کے گھر پہنچی اور وہ روپے ان کے حوالے کر دیے۔ انہوں نے پہلے تو انکار کیا پھر پیسے لے لیے۔

ماما نے کہا تھا کہ تم آصفہ کے گھر بیٹھ مت جانا۔ آج تم نے ہوم ورک بھی نہیں کیا۔

میں فوراً ہی واپس آ گئی۔

ابو اور ماما اپنے کمرے میں کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔ ابو نے حیرت سے کہا۔ ''اتنی بڑی بات میرے علم میں نہیں آئی؟''

''آپ شاید بھول رہے ہیں کہ ان دنوں آپ شادی کرنے کے لیے لاہور آئے ہوئے تھے۔ میں آج محلّے کے کئی گھروں میں گئی تھی۔ ہر عورت نے مجھ سے کہا کہ آصفہ کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو صائمہ!'' ابو نے حیرت سے کہا۔ ''میں آصفہ کو برسوں سے جانتا ہوں، وہ بے چاری بیوہ عورت ہے۔ وہ تو......''

''بس رہنے دیں۔ محلّے کی کچھ عورتیں تو دبی دبی زبان میں یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ آصفہ کے آپ سے بھی تعلقات تھے۔''

''مجھ سے تعلقات ضرور تھے لیکن پڑوسن ہونے کے ناتے اس نے مجھ سے اور ثمرہ سے ہمدردی کی تھی۔ اس بے چاری نے تو ہر طرح سے ہمارا خیال رکھا۔ ثمرہ تو سارا وقت اسی کے گھر میں رہتی تھی۔ اب لوگوں کی غلیظ ذہنیت کا کیا، کیا جائے؟''

''اس کے تو اپنے کرائے دار سے بھی تعلقات تھے۔''

''کہنے والے تو کچھ نہ کچھ کہہ دیتے ہیں۔ اس کے کرائے دار اشرف صاحب بہت شریف اور اپنے کام سے کام رکھنے والے آدمی تھے۔ وہ ایک بینک میں منیجر تھے۔ صبح کے گئے رات ہی کو واپس آتے تھے۔ ہاں، چھٹی والے دن ان کے کچھ دوست ضرور آتے تھے لیکن وہ سب کے سب انتہائی معزز لوگ تھے۔''

''آپ خود اچھے ہیں تو ہر انسان کو اچھا سمجھتے ہیں۔'' ماما نے کہا ''محلّے والوں نے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ کسی بچے کی پتنگ ان کی چھت پر چلی گئی تھی۔ وہ اپنی چھت کے ذریعے ان کی چھت پر کودا تو اس نے ان دونوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ وہ خاموشی سے گیا اور اپنی ماں کو بلا لایا۔ پھر تو محلّے میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد محلّے والوں نے اشرف صاحب کو مکان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔''

''ارے صائمہ! لوگ تو رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں۔ چھوٹی سی بات کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔''

''محلّے کی عورتیں تو یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ آپ ہر ماہ اسے خاصی معقول رقم دیا کرتے تھے۔''

''ارے بھئی، تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے؟'' ابو جھنجلا کر بولے۔ ''وہ ثمرہ کو دن بھر اپنے گھر میں رکھتی تھی، دوپہر کا کھانا کھلاتی تھی، پھر بعد میں وہ مجھے رات کا کھانا بھی دینے لگی تھی۔ اس کے عوض میں اسے کچھ رقم دے دیا کرتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس بے چاری کا ہاتھ تنگ ہے۔ وہ اپنا ہی گزارا مشکل سے کرتی تھی۔ پھر ہمارا بوجھ کیسے اُٹھاتی؟''

''اچھا زیادہ اس کی طرف داری مت کریں۔'' ماما نے تلخ لہجے میں کہا ''محلّے کی عورتیں تو یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ آصفہ آپ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔''

''ارے بھئی، شادی کرنا کوئی گناہ تو نہیں ہے۔'' ابو نے ہنس کر کہا ''یہ تو اس کا شرعی حق تھا۔''

''تو پھر کر لیتے اسی سے شادی!'' ماما نے ترش لہجے میں کہا ''وہ جوان ہے، خوبصورت ہے اور آپ کو پسند بھی کرتی تھی۔ آپ کا اور ثمرہ کا ہر طرح سے خیال بھی رکھتی تھی۔''

''حقیقت تو یہ ہے صائمہ کہ ثمرہ کی وجہ سے میں دوسری شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ ویسے وہ تم سے زیادہ حسین اور پُرکشش نہیں ہے۔''

''اچھا اب زیادہ باتیں نہ بنائیں۔'' ماما نے کہا ''ہاں، محلّے میں اب زیادہ اس کی وکالت کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس کی ملازمت کیوں ختم ہوئی ہے؟'' ماما کا لہجہ پھر تلخ ہو گیا ''اسکول کے مالک کی بیوی کو بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شک ہوگیا تھا کہ آصفہ اس کے شوہر پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ ممکن ہے اس نے بھی ان کی کوئی حرکت اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہو۔ بس اس نے آصفہ کو نوکری سے نکلوادیا۔"

"تمہیں ابھی یہاں آئے دو ہفتے بھی نہیں ہوئے اور اتنی باتیں معلوم کرلیں کہ میں برسوں سے یہاں رہتے ہوئے بھی نہ جان سکا۔"

"ہاں، اب میں ثمرہ کو ان کے گھر نہیں جانے دوں گی۔" ماما نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

میں اس وقت بہت چھوٹی تھی لیکن اتنا ضرور سمجھ گئی کہ لوگ آصفہ آنٹی کو اچھا نہیں سمجھتے۔ مجھے یہ بات سن کر بھی حیرت ہوئی کہ آنٹی، ابو کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھیں۔ مجھے اس بات کا افسوس بھی تھا۔ کاش، ابو آصفہ آنٹی سے شادی کرلیتے۔

دوسرے دن میں آصفہ آنٹی کے گھر جانے لگی تو امی نے سختی سے منع کردیا کہ تم آج کے بعد آصفہ کے گھر نہیں جاؤ گی۔"

"کیوں ماما؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں کا کیا مطلب ہے؟" ماما نے درشت لہجے میں کہا "بس میں نے کہہ دیا کہ تم وہاں نہیں جاؤ گی۔"

انہوں نے کبھی مجھ سے غصے میں بات نہیں کی تھی اس لیے سہم گئی۔ میں نے سوچ لیا کہ آج شام کو ابو سے ماما کی شکایت ضرور کروں گی۔ وہ مجھے روکنے والی کون ہوتی ہیں؟ مجھے تو امی نے بھی وہاں جانے سے نہیں روکا۔

شام کو ابو آئے تو میں منہ بنا کر بیٹھ گئی۔ مجھے افسردہ اور روٹھا ہوا تو ابو دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔

انہوں نے مجھ سے پوچھا "کیا بات ہے؟ آج ہماری بیٹی ہم سے کچھ ناراض ہے؟"

میں نے ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ابو مزید پریشان ہوگئے اور بلند آواز میں بولے "صائمہ! کیا تم نے ثمرہ سے کچھ کہا ہے؟"

ماما کچن میں تھیں، ابو کی آواز سن کر فوراً وہاں آگئیں اور بولیں "میں نے تو اسے کچھ بھی نہیں کہا۔"

"جھوٹ مت بولیں ماما!" میں نے تڑخ کر کہا "آپ نے بشریٰ کے گھر جانے کو کیوں منع کیا ہے۔ کیا میں کبھی ان کے گھر جاؤں گی نہیں؟"

"ثمرہ!" ابو چیخ کر بولے "تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں کہ بڑوں سے بات کیسے کی جاتی ہے۔"

"آپ بھی مجھے ہی ڈانٹ رہے ہیں؟" میں نے روتے ہوئے کہا "یہ مجھے روکنے والی ہوتی کون ہیں؟ آخر ہیں نا سوتیلی ماں۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

ابو نے آگے بڑھ کر چٹاخ سے ایک تھپڑ میرے گال پر رسید کردیا۔ میرا گال جیسے جلنے لگا، کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ تھپڑ کی تکلیف سے زیادہ مجھے اس بات کا صدمہ تھا کہ ابو نے پہلی دفعہ مجھ پر ہاتھ اُٹھایا تھا۔

آخر ماما نے ابو کے دل میں میرے خلاف نفرت بھر دی تھی۔

میں چند لمحے تو سکتے میں کھڑی رہی، پھر بے اختیار مجھے امی یاد آگئیں اور میں اس بُری طرح بلک بلک کر روئی کہ ابو خود بھی گھبرا گئے۔

ماما نے بڑھ کر مجھے سینے سے لگالیا "بس بیٹا! روتے نہیں ہیں۔" پھر وہ ابو سے بولیں "ثمرہ ابھی بچی ہے، آپ نے اس پر ہاتھ کیوں اُٹھایا؟"

ابو کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ انہوں نے گاڑی کی چابی اُٹھائی اور باہر نکل گئے۔

"تمہارے ابو کو نہ جانے کیا ہوگیا ہے؟" ماما نے کہا "آج کل ہر وقت جھنجلائے جھنجلائے سے رہتے ہیں۔"

"آپ تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئیں؟" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "آپ نے ابو کے دل میں میرے لیے آخر نفرت پیدا کر ہی دی۔ آج انہوں نے مجھے تھپڑ مارا ہے، کل وہ مجھے اس گھر سے نکال دیں گے۔"

صدمے سے ماما کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔ انہوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا، پھر شکستہ لہجے میں بولیں "یہ تم کیا کہہ رہی ہو جان! یہ باتیں تمہیں کس نے سکھائی ہیں؟ یہ سگا اور سوتیلا کیا ہوتا ہے۔ میں نے تو ہمیشہ تمہیں اپنی بیٹی سمجھا ہے اور سمجھا کیا ہے، تم میری بیٹی ہو۔ میں....."

"بس، بس رہنے دیں۔" میں نے ان کی بات کاٹ دی "میں خوب سمجھتی ہوں آپ کے ہتھکنڈے۔ پہلے جھوٹی محبت جتا کر دکھاوا کیا، پھر آہستہ آہستہ ابو کو میرے خلاف کردیا۔"

"ایسا نہیں کہتے چندا!" ماما نے کہا اور بلک بلک کر رونے لگیں۔ "اس دنیا میں تمہارے اور رضوان کے سوا میرا ہے ہی کون؟ میں کس اذیت ناک عذاب سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہوں، یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔"

وہ اس بُری طرح رو رہی تھیں کہ روتے روتے نڈھال

ہوکر دھم سے فرش پر گر پڑیں۔ میں اپنا رونا دھونا بھول کر بُری طرح گھبرا گئی۔ میں نے دوڑ کر پانی کا گلاس اُٹھایا اور ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے لیکن وہ ہوش میں نہ آئیں۔

میں دوڑتے ہوئے آصفہ آنٹی کے گھر پہنچی اور انہیں بتایا کہ ماما کو پتا نہیں کیا ہوگیا ہے؟ وہ بے ہوش ہوگئی ہیں۔"

"تو میں کیا کروں؟" آنٹی نے بہت رُکھائی سے کہا "اور تمہیں کیا فکر ہے، مرتی ہے تو مرنے دو؟"

میں دوڑ کر دوبارہ گھر پہنچی۔ امی ابھی تک فرش پر پڑی تھیں۔ میں دوگھر چھوڑ کر فریدہ آنٹی کے گھر میں پہنچی اور ان کو بتایا تو وہ اپنے بیٹے اختر کے ساتھ دوڑی آئیں۔ میں نے اور فریدہ آنٹی نے بہ مشکل تمام ماما کو فرش سے اُٹھا کر بیڈ پر لٹایا۔

اس دوران.... اختر بھائی ڈاکٹر کو بلالائے۔ ڈاکٹر نے ماما کا معائنہ کیا اور فوری طور پر انہیں انجکشن دے کر اور کچھ دوائیں لکھ کر اختر بھائی کو دیں کہ انہیں یہ دوائیں استعمال کرائیں۔ انہیں کوئی شدید صدمہ پہنچا ہے۔

انجکشن کے اثر سے چند منٹ بعد ماما نے آنکھیں کھول دیں۔ فریدہ آنٹی اس وقت بھی ہمارے گھر ہی میں موجود تھیں۔ انہوں نے بہت نرم لہجے میں پوچھا "اب کیسی طبیعت ہے صائمہ؟"

ماما نے زخمی زخمی نظروں سے میری طرف دیکھا، پھر انہوں نے نحیف لہجے میں کہا "اب میں ٹھیک ہوں فریدہ باجی! بس ذرا چکر سا آ گیا تھا۔" یہ کہہ کر پھر انہوں نے میری طرف دیکھا اور ان کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر تکیے میں جذب ہوگئے۔

مجھ سے ان کی یہ حالت دیکھی نہ گئی اور میں دوڑ کر ان سے لپٹ گئی اور روتے ہوئے بولی "مجھے معاف کردیں ماما..... پلیز، مجھے معاف کردیں۔" میں ان کے سینے میں منہ چھپائے بلک بلک کر رو رہی تھی۔

ماما نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا "تو تو میری رانی بیٹی ہے۔ اپنے ان قیمتی آنسوؤں کو مت بہا میری جان! بس مجھ سے وعدہ کر..... کہ تو آئندہ ایسی باتیں نہیں کرے گی۔"

"میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں ماما کہ آئندہ میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گی جس سے آپ کو صدمہ پہنچے۔"

ماما کے چہرے پر ایک طمانیت سی پھیل گئی۔

فریدہ آنٹی بھی یہ کہہ کر رخصت ہوگئیں کہ ثمرہ بیٹا! اب تم بچی نہیں رہی ہو۔ اپنی ماما کو زیادہ پریشان مت کیا کرو۔"

پھر واقعی میں نے عہد کرلیا کہ اب میں ماما سے کبھی بدتمیزی نہیں کروں گی۔ ان کی ہر بات مانوں گی۔

شام کو ابو آئے تو میں نے انہیں ماما کی طبیعت کے بارے میں بتایا۔

"اب کیسی طبیعت ہے صائمہ!" انہوں نے پوچھا لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ ان کے لہجے میں وہ تشویش اور پریشانی نہیں تھی جس کی میں توقع کررہی تھی۔

پھر نہ جانے ابو کو کیا ہوگیا؟ وہ بہت چڑچڑے ہوگئے۔ نہ وہ ماما سے پہلے کی طرح بات کرتے تھے، نہ مجھ سے۔

ایک شام ابو آئے تو حسبِ معمول انہوں نے کھانا کھایا، کچھ دیر ٹی وی کے آگے بیٹھے، پھر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ باہر جانے لگے تو میں نے پوچھ لیا "ابو، کہاں جارہے ہیں؟"

"اب میں تم سے پوچھ کر کہیں جاؤں گا؟" ابو نے درشت لہجے میں کہا اور مجھے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے باہر نکل گئے۔

وہ گاڑی بھی نہیں لے گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ محلے میں ہی کسی کے گھر جارہے ہیں۔ میں نے دیکھا، ان کا رُخ مارکیٹ کی طرف تھا جو ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں سمجھی ابو شاید سگریٹ یا کوئی اور چیز لینے گئے ہیں۔

اس وقت فریدہ آنٹی کی بیٹی سعدیہ آئی اور ماما سے بولی "آنٹی! امی نانی کے گھر گئی ہیں۔ ابو تو دس بجے سے پہلے نہیں آتے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ثمرہ کو اپنے گھر لے جاؤں؟ مجھے اکیلے میں ڈر لگتا ہے۔"

ماما نے اجازت دے دی۔

آنٹی فریدہ کا گھر ہماری سامنے والی رو میں کارنر پر تھا۔ میں سعدیہ کے ساتھ چلی گئی۔

ہم دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے، پھر سعدیہ نے کہا "آؤ، چھت پر چلتے ہیں۔ ہمارے مکان کی چھت سے مارکیٹ صاف نظر آتی ہے، آنٹی فریدہ کا مکان سہ منزلہ تھا اور اس کی چھت سے کافی دور دور تک نظر آتا تھا۔

ہم دونوں چھت پر پہنچے اور مارکیٹ والی سمت کی منڈیر سے وہاں کی گہما گہمی دیکھتے رہے۔

پھر میرے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا کہ میں چھت کی اس سمت پر آ گئی جو ہماری گلی کی طرف تھی۔

اچانک ابو کو آصفہ آنٹی کے گھر کے سامنے دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ انہوں نے دروازہ کھلوایا اور بے تکلفی سے اندر داخل ہوگئے۔ میں سمجھی کہ شاید آصفہ آنٹی کو پیسے دینے گئے ہیں۔ میں جانتی تھی کہ ابو مالی طور پر ان کی مدد کرتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہتے ہیں۔

چھت پر اس وقت اندھیرا تھا اس لیے ابو مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہاں سے نہ صرف آصفہ آنٹی کا کچن بلکہ برآمدہ بھی نظر آ رہا تھا۔

پھر وہ بہت بے تکلفی سے برآمدے میں پڑے ہوئے تخت پر نیم دراز ہو گئے۔

میری آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ وہ آصفہ آنٹی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

اچانک مجھے بشریٰ نظر آئی۔ آنٹی نے سخت لہجے میں اس سے کچھ کہا۔ مجھے ان کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن بشریٰ کے سہمے ہوئے انداز سے مجھے معلوم ہو گیا کہ آنٹی نے اسے ڈانٹا ہے۔

پھر میری آنکھوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا، ابو نے جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور بشریٰ کو دے دیے۔ پھر اس کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا، وہ فوراً اپنے کمرے میں چلی گئی۔

آصفہ آنٹی نے آگے بڑھ کر بہت آہستگی سے بشریٰ کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ میں حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

پھر وہ اور ابو اُٹھ کر اس کمرے میں چلے گئے جس کی کھڑکی بالکل سامنے برآمدے میں کھلتی تھی، یہاں سے وہ کمرا صاف نظر آ رہا تھا کیونکہ کھڑکی کافی بڑی تھی۔ میں اُدھر ہی دیکھ رہی تھی کہ میری آنکھوں نے ایک ایسا منظر دیکھا کہ میں سکتے میں رہ گئی۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے اور میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

سعدیہ دوسری طرف مارکیٹ کے نظارے میں گم تھی۔

میری چیخ سن کر اس نے وہیں سے پوچھا ''کیا ہوا ثمرہ؟''

میں ہمت کر کے لرزتے قدموں سے وہاں سے ہٹ گئی اور گرتی پڑتی سعدیہ کے پاس پہنچی اور بولی ''سعدیہ! نیچے چلو، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

میں نہیں چاہتی تھی کہ سعدیہ بھی وہ منظر دیکھے۔ آصفہ آنٹی ابو کی آغوش میں تھیں اور.....

میں سعدیہ کو لے کر گرتی پڑتی زینے کی طرف لپکی، پھر سعدیہ اگر مجھے پکڑ نہ لیتی تو شاید میں زینے سے لڑھک جاتی۔

نیچے آ کر روشنی میں سعدیہ نے میری حالت دیکھی تو وہ گھبرا گئی اور بولی ''کیا ہوا ثمرہ! تمہارا چہرہ تو ہلدی کی طرح زرد ہو رہا ہے اور تمہیں اتنا پسینا کیوں آ رہا ہے؟'' پھر وہ بولی

''تم یہاں بیٹھو، میں تمہارے لیے پانی لاتی ہوں۔''

میرے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ ہاتھ پاؤں گویا بے جان ہو کر رہ گئے تھے اور پورا جسم لرز رہا تھا۔

سعدیہ پانی لے کر آئی تو میں نے ایک سانس میں..... گلاس خالی کر دیا۔

''ثمرہ! آخر ہوا کیا ہے؟'' سعدیہ نے پوچھا۔ ''تم اتنی زیادہ کس چیز سے ڈر گئیں؟''

اسی وقت آنٹی فریدہ آ گئیں۔ میری حالت دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئیں اور بولیں ''میں نے ہزار دفعہ منع کیا ہے کہ رات کے وقت چھت پر مت جایا کرو مگر تم لوگ تو سنتی ہی نہیں ہو۔'' پھر وہ ہمارے سر پر ہاتھ پھیر کے بولیں ''تم نے کیا دیکھا ہے ثمرہ؟''

''آنٹی، وہ..... میں.....'' میں نے بتانا چاہا پھر میری آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

''اچھا، آج کے بعد تم لوگ اندھیرا ہونے کے بعد چھت پر نہیں جاؤ گی۔ کھلی چھتوں پر رات کو ہزاروں قسم کی بلائیں ہوتی ہیں۔''

اب میں انہیں کیسے بتاتی کہ وہ بلائیں کھلی چھت پر نہیں بلکہ کمرے میں تھیں۔

جب میرے اوسان ذرا بحال ہوئے تو فریدہ آنٹی مجھے خود گھر تک چھوڑنے کے لیے آئیں۔

ماما بھی میری حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔ فریدہ آنٹی نے کہا ''سعدیہ اور ثمرہ دونوں چھت پر گئیں۔ ثمرہ نے چھت پر نہ جانے کیا دیکھ لیا ہے کہ یہ بُری طرح خوف زدہ ہو گئی ہے۔''

ماما نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ ان کی آغوش میں آ کر مجھے بہت سکون ملا۔

میں نے سوچا کہ ماما کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ انہیں اس بات سے شدید صدمہ پہنچے گا اور ڈاکٹر نے کہا تھا کہ انہیں کسی قسم کا صدمہ نہ پہنچے۔

ابو ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ مجھے اب ان کی شکل سے بھی نفرت سی محسوس ہو رہی تھی، عجیب طرح کی کراہیت سی آ رہی تھی۔

ماما کے لاکھ پوچھنے کے بعد بھی میں نے انہیں کچھ نہ بتایا۔

تھوڑی دیر بعد ابو بھی آ گئے۔ وہ ہماری طرف دیکھے بغیر سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے، انہیں دیکھ کر میرے اندر نفرت کی شدید لہر اُٹھی۔ مجھے تو ان کے وجود سے بھی گھن آ رہی تھی۔ میں تو اپنے ابو کو بہت شریف اور نیک سمجھتی تھی لیکن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچانک میرا وہ یقین اور اعتماد پاش پاش ہو گیا تھا۔

رات تک مجھے بخار ہو گیا۔ ماما ہی نے مجھے بخار کی دوا دی اور چادر اوڑھا کر سلا دیا مگر میں سوئی کب تھی۔ میرا ذہن تو مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مجھے آصفہ آنٹی کے وہ الفاظ یاد آ رہے تھے جب ماما کی طبیعت خراب ہونے پر میں انہیں بلانے گئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ مرتی ہے تو مرنے دو۔

ابو تو اکثر رات کو گھر سے نکل جاتے تھے۔ اب میں یہی سوچ رہی تھی کہ وہ آصفہ آنٹی کے گھر جاتے ہوں گے۔

اس دن کے بعد سے مجھے چپ لگ گئی تھی۔ میں تو گویا ہنسنا ہی بھول گئی تھی۔ ابو کو تو اس کی خاص پروا نہیں تھی لیکن ماما میری وجہ سے بہت پریشان رہنے لگی تھیں۔ پھر ماما کی خاطر میں نے چند دن میں خود کو سنبھال لیا لیکن ابو اب مجھے اجنبی اجنبی سے لگتے تھے۔ میں ان سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی بلکہ ان کا سامنا کرنے سے بھی کتراتی تھی۔

پھر وقت کا پہیا اتنی تیز رفتاری سے گھوما کہ مجھے احساس بھی نہ ہوا۔

میں نے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ اب مجھے بہت سی باتیں سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ ماما کے ساتھ شادی سے پہلے آصفہ آنٹی کا ہمارے گھر آنا اور گھنٹوں ابو کے ساتھ کمرے میں رہنا اب میری سمجھ میں آ رہا تھا۔

مجھے اب ان کی وہ باتیں بھی یاد آتی تھیں جو ایک دن میں نے اتفاق سے سن لی تھیں۔

آصفہ آنٹی ابو کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھیں۔ کاش، وہ ان ہی سے شادی کر لیتے۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میرے ابو اس کردار کے مالک بھی ہو سکتے ہیں۔

میٹرک کے بعد ماما نے مجھے شہر کے ایک بہترین کالج میں داخلہ دلایا تھا۔ یہ مخلوط تعلیمی ادارہ تھا۔ وہاں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ وہاں کئی لڑکوں نے مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی لیکن میں نے انہیں ذرا بھی منہ نہ لگایا۔ یوں پورے کالج میں مشہور ہو گیا کہ ثمرہ انتہائی مغرور لڑکی ہے۔

میری امی بہت حسین تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ ثمرہ تو ہو بہو اپنی ماں کی تصویر ہے۔ وہی خوبصورت اور پرکشش جسم، لمبے بال اور سرخ و سفید رنگت!

میں ہنس کر کہتی تھی کہ میں اپنی کس ماں کی تصویر ہوں؟ ماما بھی کم حسین نہیں تھیں۔

ابو کی مزید ترقی ہو گئی تھی اور ان کی تنخواہ کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اب ان کی عیاشیاں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ وہ مختلف عورتوں کو گھر بھی لانے لگے تھے۔ بہانا یہ بناتے تھے کہ یہ میری ماتحت ہے۔ دفتر میں کام آج کل بہت زیادہ ہے اس لیے میں کام گھر پر لے آیا ہوں۔ پھر وہ اس لڑکی کو لے کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم کمپیوٹر پر کام کر رہے ہیں۔

انہیں اب ماما کا خیال تھا نہ میرا، نہ جانے ان کی غیرت کہاں جا سوئی تھی۔ گھر میں ایک جوان لڑکی کے ہوتے ہوئے وہ اس قسم کی گھٹیا حرکتیں کرتے تھے۔

ایک دن دوپہر کے وقت آنٹی آصفہ حواس باختہ سی ہمارے گھر آئیں اور بولیں ''صائمہ، بشریٰ کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ وہ اچانک بے ہوش ہو گئی ہے۔''

''تو ہم کیا کریں؟'' ماما سے پہلے میں نے تڑخ کر کہا ''وہ مرتی ہے تو مرنے دیں۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو ثمرہ!'' آنٹی نے کہا ''تمہیں تو بچپن میں گودوں میں کھلایا ہے میں نے۔''

''آپ کو یاد ہے، جب ایک دفعہ ماما کی طبیعت خراب ہوئی تھی اور میں بھی اسی طرح بھاگی بھاگی آپ کے گھر پہنچی تھی تو آپ نے کیا کہا تھا؟''

''ایسی باتیں نہیں کرتے ثمرہ!'' ماما نے مجھ سے کہا اور آنٹی کے ساتھ باہر نکل گئیں۔ میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس بھی نہ ہوئی۔ ان لوگوں کے لیے میرا دل پتھر ہو چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ بشریٰ نے خودکشی کی کوشش کی تھی اور خواب آور گولیوں کی اچھی خاصی مقدار اپنے معدے میں اُتار لی تھی۔

ماما اور محلے کے دوسرے لوگوں نے مل کر بروقت بشریٰ کو اسپتال پہنچا دیا تھا۔ یوں اس کی جان بچ گئی لیکن وہ ابھی اسپتال ہی میں تھی۔

اسی شام مجھے معلوم ہوا کہ آنٹی فریدہ کو بھی دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ اسپتال میں ہیں۔

میں ماما کے ساتھ فوراً ان کی تعزیت کے لیے اسپتال پہنچ گئی۔

وہ آئی سی یو میں تھیں اور ڈاکٹر انہیں کسی سے ملنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

ماما وارڈ کے باہر ایک بینچ پر بیٹھ گئیں۔ میں نے اور سعدیہ نے ان سے کہا کہ آپ گھر جائیں۔ آنٹی کو ہوش آئے گا تو میں آپ کو بلا لوں گی۔ ہم دونوں نے بہ مشکل تمام ماما کو

راضی کیا۔ میں نے سعدیہ سے بھی کہا کہ تم کئی گھنٹے سے یہاں ہو، گھر جا کر آرام کر لو۔ تھوڑی دیر بعد آ جانا۔ اس وقت تک میں یہاں موجود رہوں گی۔ سعدیہ کے ابو ان دنوں کسی کام کی وجہ سے اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔

سعدیہ جانے کو تیار تو نہ تھی لیکن میرے بہت زیادہ اصرار پر وہ بھی ماما کے ساتھ ہی چلی گئی۔

میں انہیں گیٹ تک چھوڑ کر واپس آئی تو کوریڈور کے ایک نیم کھلے دروازے میں سے مجھے بشریٰ دکھائی دی۔ اس کی حالت اب کافی بہتر تھی۔ اس نے بہت خوشامد بھرے انداز میں مجھے بلا لیا۔ بشریٰ بچپن میں میرے ساتھ کھیلی تھی۔ اس سے مجھے اتنی نفرت نہیں تھی جتنی اس کی ماں سے تھی۔ اس وقت آصفہ آنٹی بھی موجود نہیں تھیں۔

سعدیہ نے نحیف لہجے میں مجھ سے کہا ''ثمرہ! میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو لیکن میری ایک بات سن لو اور یہ بات میں صرف تمہیں بتا رہی ہوں۔ کل رات امی گھر پر نہیں تھیں۔ ان کے رشتے کی ایک خالہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ تمہارے ابو رات میں ہمارے گھر آئے۔ تم بھی جانتی ہو کہ وہ اکثر بلکہ کبھی کبھی تو روزانہ ہمارے گھر آتے ہیں۔''

''میں یہ بات آج سے نہیں بلکہ برسوں سے جانتی ہوں۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''کل رات وہ آئے تو امی گھر پر موجود نہیں تھیں۔ انہوں نے..... انہوں نے..... مجھے..... ہاں ثمرہ، مجھے..... جسے وہ بیٹی کہتے ہیں.....''

''بس کرو بشریٰ!'' میرے جسم میں چنگاریاں سی بھر گئیں ''میں سمجھ گئی تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''میری ماں تو شروع ہی سے بدکردار ہے ثمرہ!'' بشریٰ نے کرب ناک انداز میں کہا ''یہ میری بدقسمتی ہے کہ وہ میری ماں ہے لیکن تمہارے ابو نے تو مجھے بھی..... میں اپنی نظروں میں گر گئی ہوں ثمرہ! پھر میرے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ میں اپنی جان دے دوں۔ یوں بے عزت ہو کر جینے سے تو مر جانا بہتر ہے۔ نہ جانے ان ڈاکٹروں نے مجھے کیوں بچا لیا؟ خیر، یہ لوگ ہمیشہ تو مجھے نہیں بچا سکیں گے۔''

''پاگل مت بنو بشریٰ!'' میں نے کہا ''تم اب ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گی۔''

''تو کیا میں بھی اپنی ماں کی طرح ایک طوائف بن کر زندگی گزاروں گی؟'' بشریٰ نے تلخ لہجے میں کہا ''اور اب میں تمہیں ایک اور بات بتانا چاہتی ہوں۔ نہ جانے کل میں رہوں یا نہ رہوں۔ میں اس راز کو اپنے سینے میں لے کر نہیں مرنا چاہتی۔''

''کیسا راز!'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''یہ تو تم جانتی ہو کہ میری ماں بہت حسین ہے، اسے مردوں کو لبھانے کے طریقے بھی آتے ہیں۔ میرے ابو کا انتقال ہوا تو میری عمر صرف ایک سال تھی۔ میری ماں نے تمہارے ابو کو پھانسا یا تمہارے ابو نے انہیں پھانسا۔ بس دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ تمہاری امی بھی کم خوبصورت نہیں تھیں۔ مجھے ان کا سراپا آج بھی یاد ہے۔ تمہارے ابو اور میری امی ایک دوسرے کے عشق میں اس بُری طرح گرفتار تھے کہ وہ شادی کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے راستے کا سب سے بڑا کانٹا تمہاری امی تھیں۔ پھر جانتی ہو کیا ہوا، تمہارے ابو ہومیوپیتھک کی ایک ایسی دوا لے کر آئے جس کے اوورڈوز سے براہِ راست دل پر اثر پڑتا ہے۔ وہ نہ جانے کس بہانے سے تمہاری امی کو وہ دوا دیتے رہے۔ دو ہفتے کے اندر اندر اس دوا نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا اور ایک روز ان پر دل کا شدید دورہ پڑا جس نے ان کی جان لے لی۔''

میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ میں نے درشت لہجے میں کہا ''تم جھوٹ بول رہی ہو۔ میرے ابو سے انتقام لینے کے لیے ایسا کہہ رہی ہو۔''

''تمہارے ابو سے انتقام تو اب اللہ خود ہی لے گا۔'' اس نے شکستہ لہجے میں کہا ''تمہارے ابو سے بھی اور میری بدکردار ماں سے بھی جسے یہ احساس بھی نہیں رہا کہ گھر میں ایک بیٹی بھی موجود ہے جو جوان ہو رہی ہے۔''

''لیکن تم تو اس وقت بہت چھوٹی تھیں۔'' میں نے کہا ''تمہیں ان باتوں کا علم کیسے ہوا؟''

''ان باتوں کا علم تو مجھے بہت بعد میں ہوا۔ ایک روز تمہارے ابو، امی سے باتیں کر رہے تھے۔ یہ باتیں کرتے ہوئے وہ ہنس بھی رہے تھے کہ انہوں نے کس خوبصورتی سے اپنی راہ کا کانٹا دور کر دیا۔''

''لیکن بشریٰ، تمہاری اس کہانی میں بہت بڑا جھول ہے۔'' میں اب بھی اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھی کہ ابو، امی کی جان بھی لے سکتے ہیں۔''

''تمہیں اب بھی اس میں جھول نظر آ رہا ہے۔'' بشریٰ نے نحیف لہجے میں کہا ''بہرحال، میرا کام تمہیں اس راز سے آگاہ کرنا تھا۔ اب میں سینے پر کوئی بوجھ لیے بغیر مر سکوں گی۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میں صرف یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ جب ابو کا راستہ صاف ہی ہوگیا تھا تو انہوں نے تمہاری امی سے شادی کیوں نہیں کی؟''

''امی کی ہوس اور بدکرداری انہیں لے ڈوبی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ہمارے ایک کرائے دار اشرف صاحب ہوا کرتے تھے۔ امی ان سے بھی بے تکلف ہوگئیں، پھر آہستہ آہستہ راتوں کو اُٹھ کر اوپر جانے لگیں۔ میں نے بھی اکثر اس بات کو محسوس کیا کہ امی کا بیڈ خالی ہے۔ میں یہی سمجھتی تھی کہ وہ باتھ روم میں ہوں گی۔ تمہارے ابو کو بھی ان تعلقات کا علم ہوگیا۔ اس پر پہلی دفعہ ان دونوں میں شدید تلخ کلامی ہوئی۔ امی نے کہا کہ ابھی میں تمہاری بیوی نہیں ہوں جو تم مجھ پر یوں حکم چلا رہے ہو۔ تمہارے ابو نے انہیں بے حیائی اور بدکرداری کا طعنہ دیا۔ امی نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ تم خود کون سے پارسا ہو۔ تم تو خود بتا چکے ہو کہ آفس کی ایک دو لڑکیوں سے تمہارے تعلقات ہیں پھر میں بھی تو تمہارے لیے غیر ہی تھی۔ تم نے تو بغیر نکاح کے مجھے بیوی سمجھنا شروع کردیا۔ تمہارے ابو نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں ایسی بدچلن اور بدکردار عورت سے شادی نہیں کرسکتا۔ ان ہی دنوں تمہاری پھوپو لاہور سے آئیں اور تمہارے ابو کی شادی صائمہ آنٹی سے کرادی۔'' اتنا کہہ کر بشریٰ خاموش ہوگئی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

مجھے یاد آرہا تھا کہ آصفہ آنٹی نے مجھے بھی ماما کی طرف سے بدظن کرنے کی کوشش کی تھی۔

''تمہیں اس دوا کا نام یاد ہے جو امی استعمال کرتی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

بشریٰ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''مجھے اس دوا کا نام کیسے یاد رہ سکتا ہے لیکن ممکن ہے تمہاری امی کے سامان میں اس دوا کی خاص شیشیاں یا ان کے کور موجود ہوں۔''

میں بشریٰ کے پاس سے اٹھی تو میرے دل پر ایک بوجھ سا تھا۔

آنٹی فریدہ کو ہوش آچکا تھا۔ ڈاکٹرز نے بتایا کہ اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے اور تھوڑی دیر بعد انہیں آئی سی یو سے کمرے میں منتقل کردیں گے۔

میں نے اسی وقت سعدیہ کے سیل فون پر اسے فون کردیا۔

وہ آئی تو اس کے ساتھ ماما بھی تھیں۔ ماما نے مجھ سے کہا ''ثمرہ بیٹی! اب تم گھر جا کر آرام کرلو۔ کئی گھنٹوں سے یہاں ہو۔''

سعدیہ نے بھی کہا ''ہاں ثمرہ! اب تم جاؤ، میں اور آنٹی یہاں ہیں۔ میں نے ابو کو بھی فون کردیا تھا۔ وہ بھی ایک گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔''

میں بوجھل دل اور شکستہ قدموں سے اسپتال سے باہر آگئی۔ میں جانتی تھی کہ ماما نے امی کی ہر چیز بہت سنبھال کر رکھی ہے، ان کے استعمال کی الماری کو اسی طرح مقفل کردیا تھا جیسے وہ تھی۔

میں نے گھر پہنچ کر ماما کی الماری سے امی کی الماری کی چابی نکالی اور الماری کھول لی۔

الماری میں امی کے کپڑے، ان کے استعمال کی چیزیں، ان کے میک اپ کا سامان، ان کے پرفیومز، گھڑیاں دیکھ کر میں بلک بلک کر رونے لگی۔ مجھے اس دن ایسا لگ رہا تھا جیسے آج ہی امی کا انتقال ہوا ہو۔ ان کے کپڑوں میں آج بھی ان کے بدن کی مہک موجود تھی۔

الماری کے دوسرے خانے میں ان کے استعمال کی دوائیں تھیں۔ مجھے جلد ہی ہومیو پیتھک دواؤں کی تین شیشیاں مل گئیں۔ ان میں سے دو خالی تھیں اور ایک آدھی سے زیادہ استعمال شدہ تھی۔

میں نے وہ شیشی نکال لی اور الماری کو اسی طرح بند کرکے چابی ماما کی الماری میں رکھ دی۔

گھر سے کچھ فاصلے پر ہومیو پیتھک دواؤں کا ایک اسٹور تھا۔ مزید تصدیق کے لیے میں دوا کی شیشی اس اسٹور پر لے گئی۔

وہاں بوڑھے سے ایک صاحب بیٹھے تھے۔ وہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر بھی تھے اور شام کو دکان کے ایک حصے میں اپنا کلینک بھی کرتے تھے۔

میں نے انہیں سلام کیا اور اپنے پرس سے دوا کی شیشی نکال کر ان کے سامنے رکھ دی اور پوچھا ''انکل! میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ دوا کس بیماری کی ہے؟''

انہوں نے شیشی پر ایک نظر ڈالی اور پوچھا ''بیٹی! تمہیں اس دوا کی کیا ضرورت پڑگئی؟''

''اصل میں مجھے کبھی کبھی چکر سے آجاتے ہیں۔ میں نے ایک ہومیو ڈاکٹر صاحب کو دکھایا تھا۔ انہوں نے مجھے دوا بھی دی تھی لیکن وہ دوا میری امی کی دواؤں میں مل گئی۔ میرے پاس سے ڈاکٹر صاحب کا پرچہ بھی گم ہوگیا۔ میرا خیال ہے کہ یہی وہ دوا ہے۔''

''یہ دوا تو دل کے مریضوں کے لیے ہوتی ہے بیٹا!'' انہوں نے کہا ''اور اگر تمہاری امی اب یہ دوا استعمال نہیں

کرتیں تو اسے ضائع کردو کیونکہ یہ جتنی اچھی ہے، اتنی ہی خطرناک بھی ہے۔''

''خطرناک ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا ''وہ کیسے انکل!''

''بیٹا، اس کی خوراک اگر دگنی کردی جائے تو اچھا بھلا آدمی بھی دل کے مرض میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹرز عموماً یہ دوا دیتے وقت بہت محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس کی اوور ڈوز اگر مسلسل کئی دن لی جائے تو حرکت قلب بند بھی ہوسکتی ہے۔'' پھر وہ مسکرا کر بولے ''ویسے تمہیں اس عمر میں کیا بیماری ہے کہ تمہیں دوا کی ضرورت پڑگئی؟''

''یہ میری نہیں، میری امی کی دوا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تو ہے۔''

''او......''

''ڈاکٹر صاحب! امی تو یہ دوا باقاعدگی سے استعمال کرتی ہیں اور وہ بالکل صحت مند ہیں۔''

''بیٹا، میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ اگر اس دوا کی مقررہ خوراک لی جائے تو یہ دوا دل کے مریضوں کے لیے بہت بہترین ہے۔'' پھر وہ ہنس کر بولے ''تم تو اتنی بحث کررہی ہو کہ اگر ہومیو پیتھی پڑھ لوگی تو بہت کامیاب رہوگی۔''

میں نے ہنس کر کہا ''ڈاکٹر صاحب! ہم لوگ ایک شادی میں سکھر جارہے ہیں۔ امی کے چھوٹے بھائی کی شادی ہے، وہاں امی نہ جانے کب تک رہیں اور وہاں یہ دوا ملے یا نہ ملے۔ آپ مجھے اس کی تین چار شیشیاں اور دے دیں۔''

''یہ دوا اتنی مقدار میں دیتا تو نہیں ہوں لیکن تم نے مجھ سے اتنی بحث کی ہے کہ میں تمہیں دے دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ شوکیس میں سے اس دوا کی چار شیشیاں نکال لائے۔

میں نے ان کی قیمت ادا کی اور دکان سے باہر آگئی۔ میں ابو سے اسی طریقے سے انتقام لینا چاہتی تھی۔

گھر آکر میں نے وہ شیشیاں اپنی الماری میں کپڑوں کے پیچھے چھپا کر رکھ دیں۔

شام کو ابو آئے تو حسبِ معمول ان کے ساتھ ان کی سیکریٹری بھی تھی۔ ہر دو چار دن بعد ان کی سیکریٹری بدل جاتی تھی۔

گرمی کا زمانہ تھا، میں نے جلدی جلدی شربت کے دو گلاس تیار کیے اور ان دونوں گلاسوں میں اس جان لیوا خوراک کی دگنی مقدار ملادی۔

پھر میں شربت لے کر ابو کے کمرے کے دروازے پر پہنچی اور آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''کون ہے؟'' ابو نے درشت لہجے میں پوچھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے جھٹکے سے دروازہ کھول دیا ''کیا ہے؟'' وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولے۔

''ابو گرمی بہت ہے، میں نے اپنے لیے شربت بنایا تھا، سوچا کہ آپ کے لیے بھی بنالوں۔'' میں نے معصومیت سے کہا۔

وہ شربت ابو کا پسندیدہ شربت تھا۔ انہوں نے ٹرے مجھ سے لے لی اور دوبارہ دروازہ بند کردیا۔

صبح میں نے دیکھا، دونوں گلاس خالی تھے۔

ابو شام کو گھر میں آئے تو خلافِ معمول وہ اکیلے تھے۔ میں نے جبراً ہنس کر پوچھا ''ابو، آپ کے لیے شربت بناؤں؟''

ابو نے غور سے مجھے دیکھا، پھر بولے ''ہاں اگر اپنے لیے بنا رہی ہو تو ایک گلاس مجھے بھی دے دو۔''

''ابو، میں تو روز ہی اس وقت شربت پیتی ہوں۔ پہلے آپ کے ساتھ پیتی تھی لیکن اب آپ تو پیتے ہی نہیں...... میں اکیلے ہی وہ شربت پیتی ہوں اور ان دنوں کی یاد تازہ کرلیتی ہوں جب میں اپنے ابو کے ساتھ شربت پیتی تھی۔'' میں نے جذباتی لہجے میں کہا اور آنکھوں میں آنسو بھی لے آئی۔

ابو لاکھ بُرے سہی لیکن ان کے دل کے کسی گوشے میں آج بھی میری محبت موجود تھی لیکن میرے دل میں ان کے لیے شدید نفرت تھی۔

''ارے بیٹا، بس اتنی سی بات!'' ابو نے کہا ''چلو آج سے میں روز تمہارے ساتھ شام کی چائے یا شربت پیا کروں گا۔''

ابو دوسرے دن بھی اکیلے تھے۔ میں نے ان کے لیے شربت بنایا اور اس میں دوا کی مقدار تین گنا کر ڈالی۔

ایک ہی ہفتے میں اس دوا کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ ابو کو اُٹھتے بیٹھتے چکر آنے لگے۔

ماما ان کی طرف سے بہت فکرمند رہنے لگیں۔ انہیں زبردستی ایک معروف اسپیشلسٹ ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ اس نے ابو کا چیک اپ کیا اور مختلف قسم کے لیبارٹری ٹیسٹ کرنے کے بعد بتایا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے ایسا ہوگیا ہے۔ یہ چند دن ریسٹ کریں گے تو بالکل ٹھیک ہوجائیں گے۔

ماما کے اصرار پر ابو نے آفس سے پندرہ دن کی چھٹی لے لی۔ اب میں انہیں پانی میں ملا کر صبح و شام اس دوا کی دگنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے زیادہ مقدار دینے لگی۔

ایک رات ابو کی حالت اچانک بگڑ گئی۔ ماما نے گھبرا کر مجھے جگایا ''ثمرہ! اُٹھو، دیکھو تمہارے ابو کو کیا ہو گیا؟'' ان کی آواز میں وحشت تھی۔

''کیا ہوا ماما!'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

ابو بیڈ پر لیٹے اکھڑے اکھڑے سانس لے رہے تھے۔

''گاڑی نکالو بیٹا!'' ماما نے کہا ''ہم انہیں ابھی اسپتال لے جائیں گے۔'' ماما کی آواز آنسوؤں سے گندھی ہوئی تھی۔

میں نے کافی دن پہلے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی۔ میں گاڑی نکالنے دوڑی۔ میں نے جان بوجھ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے میں دیر لگائی۔ پھر بہت اطمینان سے گاڑی باہر نکالی۔

دوسرا مرحلہ ابو کو گاڑی تک پہنچانے کا تھا۔

''چلیں اُٹھیں۔'' ماما نے کہا ''ہمت کر کے گاڑی تک چلیں۔''

''مجھ میں تو ہلنے کی سکت بھی نہیں ہے۔'' ابو نے کہا ''میرا سر بُری طرح چکرا رہا ہے اور سینے میں شدید تکلیف ہے۔''

''آپ ہمت تو کریں' میں اور ثمرہ آپ کو سہارا دے کر گاڑی تک لے جائیں گے۔''

ماما نے ابو کو سہارا دے کر اُٹھانے کی کوشش کی لیکن ابو کی حالت مزید غیر ہو گئی۔ انہیں سانس لینے میں بہت دقت ہو رہی تھی۔

پھر انہوں نے ایک گہرا سانس لینے کی کوشش کی اور ان کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

ماما نے ایک دلخراش چیخ ماری اور دہاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ میرا دل اس وقت اتنا پتھر ہو گیا تھا کہ باپ کے مرنے پر بھی میری آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔

رات ہی کو محلے کے تمام لوگ جمع ہو گئے۔ محلے کی عورتیں ماما کو تسلیاں دے رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ ثمرہ کا خیال کرو۔ اسے سکتہ ہو گیا ہے۔ اسے رُلاؤ ورنہ اس کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔

پھر محلے کی عورتوں نے، ماما نے اور دوسرے لوگوں نے مجھے رُلانے کی بہت کوشش کی لیکن میری آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہیں آیا۔

سہ پہر تک پھپھو بھی لاہور سے پہنچ گئیں۔ وہ بے چاری اب خاصی ضعیف ہو گئی تھیں۔ وہ بھی بلک بلک کر رونے لگیں۔ انہوں نے مجھے سینے سے لگایا اور دیر تک ایسی باتیں کرتی رہیں جن سے مجھے رونا آ جائے لیکن میری آنکھیں خشک ہی رہیں۔

شام تک ابو کی تدفین بھی ہو گئی۔ ایک بات میں نے نوٹ کی کہ آصفہ آنٹی بھی بہت بُری طرح بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں یا پھر سرے سے انہوں نے چوڑیاں پہنی ہی نہیں تھیں۔

ماما کی طرح رونے سے ان کی آنکھیں بھی متورم ہو رہی تھیں اور وہ بُری طرح ہلکان تھیں۔

''اونہہ مگرمچھ کے آنسو اور ڈراما!'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔

ابو کے آفس سے بھی بہت سارے لوگ آئے تھے۔ ان میں وہ لڑکیاں بھی تھیں جو وقتاً فوقتاً ابو کے ساتھ گھر پر کام کرنے کے لیے آتی رہتی تھیں۔

اس موقعے پر ابو کی فرم کے ایم ڈی بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا ''رضوان صاحب بہت ہی قابل اور محنتی افسر تھے۔ کام زیادہ ہوتا تھا تو وہ رات رات بھر گھر پر کام کرتے تھے۔ میں نے ہی ان سے کہا تھا کہ آپ آفس کی کسی لڑکی کو اپنے ساتھ لے جایا کریں۔ آپ اکیلے تو رہتے نہیں ہیں، آپ کی مسز اور بیٹی بھی ہوتی ہے۔ لڑکی کے گھر والوں سے میں خود بات کرا لوں گا۔''

''تو کیا وہ لڑکیاں آفیشل کام کے لیے آتی تھیں؟'' ماما نے پوچھا۔

''جی مسز رضوان!'' ایم ڈی صاحب نے کہا ''پھر رضوان صاحب ہی نے مجھ سے کہا کہ روزانہ کسی ایک لڑکی پر اتنا بوجھ ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ آفس کی ایک دو مزید لڑکیوں سے بات کر لیں۔''

ان کی بات سن کر میں ہکا بکا ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگی۔ گویا ابو واقعی گھر میں آفس کے کام کرتے تھے۔

''رضوان گزشتہ کئی ماہ سے بہت چڑچڑے ہو گئے تھے۔'' ماما نے کہا ''وہ بات بات پر مجھ سے اُلجھ پڑتے تھے۔''

''مسز رضوان! بات دراصل یہ ہے کہ وہ ڈائریکٹر بننے والے تھے۔ ان کی توقع کے خلاف مالکان نے ان کے ایک ماتحت کو ڈائریکٹر بنا دیا۔ بس انہیں یہی جھنجلاہٹ تھی۔ وہ تو ملازمت بھی چھوڑنا چاہتے تھے۔ میرے سمجھانے بجھانے پر انہوں نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا۔ نیا ڈائریکٹر اتنا نااہل تھا کہ کمپنی کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور رضوان صاحب کو اس ڈائریکٹر کی جگہ پوسٹ کر دیا گیا۔ انہیں اطلاع تو دو تین ہفتے پہلے ہی مل گئی تھی لیکن ان کی تقرری کا باقاعدہ خط

کل ہی موصول ہوا ہے لیکن زندگی نے ان کے ساتھ وفا نہ کی۔''

پھر سب آنے والے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ صرف پھپھو پوتی آصفہ، بشریٰ اور آنٹی فریدہ رہ گئیں۔

مجھے اب بشریٰ کی بات پر بھی شبہ ہو رہا تھا۔ میں اشارے سے اسے چھت پر لے گئی اور اس سے کہا ''بشریٰ! تم نے مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا؟ تم نے جس رات کی بات کی ہے، اس رات تو ابو کراچی میں موجود ہی نہیں تھے۔ وہ کمپنی کے کام سے لاہور گئے ہوئے تھے۔ مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو ورنہ میں تمہارے ساتھ بہت بُری طرح پیش آؤں گی۔ تم جانتی ہو کہ میرا ایک کزن ایس پی ہے۔ میں ابھی اسے کال کر کے بلا لوں گی۔ پھر وہ سب کچھ خود ہی معلوم کر لے گا۔''

''وہ ثمرہ..... بات اصل میں..... یہ ہے کہ..... میں.....''

''کیا میں میں کر رہی ہو؟'' میں نے اسے بُری طرح جھڑک دیا ''بتاؤ، بات کیا ہے؟''

''میں عرفان سے شادی کرنا چاہتی تھی۔''

عرفان ہمارے ہی محلے میں رہتا تھا اور انتہائی اوباش اور نکما لڑکا تھا۔ بس اس میں ایک خوبی تھی کہ وہ خوب رو، خوش لباس اور چرب زبان تھا۔

''پھر..... پھر کیا ہوا؟ کر لیتیں عرفان سے شادی۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''اس عرفان نے تو مجھے شادی سے پہلے ہی برباد کر دیا۔ میں نے انکل رضوان سے کہا کہ آپ عرفان کے والدین سے بات کریں۔ وہ تو یہ سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئے اور مجھے بُرا بھلا کہنے لگے۔''

میں نے اس رات خواب آور گولیاں کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہا۔ پھر مجھے تم نظر آئیں تو تمہیں انکل رضوان سے متنفر کرنے کے لیے میں نے تم سے جھوٹ بول دیا۔''

میں نے طیش میں آ کر زنانے کا ایک تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا۔ ''تو نے اتنی سی بات کے لیے ان پر اتنا گھناؤنا الزام لگا دیا۔'' پھر میں چونک کر بولی ''اور وہ دو والی بات! کیا وہ بھی جھوٹ تھی؟''

''نہیں، وہ جھوٹ نہیں تھی۔'' بشریٰ نے کہا۔

میں بوجھل قدموں سے نیچے آ گئی۔

ابو کے سوئم کے بعد گھر میں ویرانی اور سناٹا چھا گیا۔ البتہ پھپھو پوتی کے سوا وہاں آصفہ آنٹی بھی موجود تھیں اور ماما کا سلوک بھی ان کے ساتھ بُرا نہیں تھا۔

اس دن ماما کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ ان کے کمرے کا اے سی خراب تھا اس لیے وہ میرے کمرے میں آرام کر رہی تھی۔

ابو کے انتقال کے بعد سے ماما کے کمرے کی حالت ابتر تھی۔ وہ تو انتہائی نفاست پسند تھی، ذرا سی بھی بے ترتیبی برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ میں ان کے کمرے کی صفائی ہی کر دوں۔

میں نے ان کی الماری کھولی تو ان کی الماری سے کچھ کپڑے نکل کر گر پڑے۔

میں نے کپڑے تہ کیے اور انہیں دوبارہ الماری میں رکھ ہی رہی تھی کہ میری نظر ایک لفافے پر پڑی۔

اس پر ماما کا نام لکھا تھا۔

کسی کا خط پڑھنا انتہائی غیر اخلاقی حرکت ہے لیکن اس وقت مجھ سے یہ غیر اخلاقی حرکت سرزد ہو گئی۔

انہوں نے لکھا تھا ''ڈیر صائمہ! میں نے تمہیں وہ توجہ نہیں دی جس کی تم حق دار تھیں۔ اس کے لیے مجھے معاف کر دینا۔ پھر میں دفتر کے کاموں میں اتنا مصروف ہوا کہ نہ تمہارے لیے وقت نکال سکا، نہ ثمرہ کے لیے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں ثمرہ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ میں نے مہینوں سے اسے بھی ٹائم نہیں دیا ہے۔ تم نے محسوس کیا ہو گا کہ میرے ذہن پر ہر وقت جھنجلاہٹ طاری رہتی تھی۔ اس کی وجہ تم نہیں ہو، نہ ثمرہ ہے بلکہ دفتر کے کچھ معاملات ہیں۔ میرا پروموشن ہونے والا تھا لیکن میرے ایک نااہل ماتحت کو میرے سر پر بٹھا دیا گیا ہے۔ میں نے بعد میں سوچا کہ اس میں تمہارا یا ثمرہ کا کیا قصور ہے۔ میں تم لوگوں سے بے رخی کیوں برت رہا ہوں۔ پھر دفتر کا اتنا کام آ پڑا کہ مجھے رات رات بھر نہ صرف خود کام کرنا پڑا بلکہ آفس کی ایک دو لڑکیوں کو بھی اپنے ساتھ کام پر لگا لیا۔

میں یہ سب باتیں تم سے زبانی بھی کر سکتا تھا لیکن میں آج تم سے ایک اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اعتراف میں تمہارے سامنے بیٹھ کر نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے تمہارے ساتھ شادی سے پہلے آصفہ سے نکاح کر لیا تھا۔ اس نکاح میں محلے کے چند معزز افراد شریک تھے۔ آصفہ کے بارے میں محلے کے اوباش نوجوانوں نے بے پر کی اڑائی تھی کہ اپنے مالک مکان سے ناجائز تعلقات تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آصفہ نے ان لوگوں کو بُری طرح جھڑک دیا تھا۔ بس اس میں ایک خامی یہ تھی کہ اس میں جلن اور حسد کا مادہ ضرورت سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ زیادہ ہی تھا۔ وہ تم سے بہت حسد کرتی تھی۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس نے ثمرہ کو بھی تمہارے خلاف کرنے کی کوشش کی تھی۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میری چند خواتین سے دوستی ہے، میں کبھی کبھی ان کے ساتھ آؤٹنگ پر بھی جاتا ہوں لیکن بات صرف دوستی تک ہی محدود ہے۔ میری زیادتیوں کو معاف کر دینا اور ثمرہ کو بھی کسی بھی وقت سمجھانا کہ وہ بھی اپنے دل سے میرے خلاف بھرا ہوا بغض نکال دے۔ باتیں تو بہت ہیں لیکن وہ باتیں میں اس وقت کروں گا جب تم میرا یہ خط پڑھ لوگی۔''

میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ جسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ میں نے بہ مشکل تمام وہ خط اسی طرح الماری میں رکھا، ماما کے کپڑے رکھے اور اپنی غلطی پر اس بُری طرح بلک بلک کر روئی کہ امی، پھوپو اور آصفہ آنٹی بھاگتے ہوئے آ گئیں۔

میں زور زور سے چیخ رہی تھی ''ابو! آپ کہاں چلے گئے ابو! پلیز مجھے معاف کر دیجئے گا..... ابو، بس ایک دفعہ..... ایک دفعہ..... مجھے سینے سے لگا کر پیار کر لیں اور کہیں کہ ثمرہ بیٹا، میں کبھی تجھ سے ناراض نہیں ہو سکتا ہوں..... ابو جی..... میں نے نادانستگی میں آپ کا دل دکھایا ہے۔ مجھے معاف کر دیجئے گا۔''

میں دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

ماما نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی تو پھوپو نے کہا ''اسے اچھی طرح رو لینے دو صائمہ تاکہ اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے۔''

میں رو رو کر ہلکان ہوگئی تو ماما نے مجھے پانی پلایا اور دیر تک مجھے تسلی دیتی رہیں کہ تو خود کو بے سہارا کیوں سمجھتی ہے۔ تیرے سر پر میں موجود تو ہوں۔''

اب میں انہیں کیسے بتاتی کہ میں نے خود ہی اپنے ابو کی جان لے لی۔

ماما نے شاید پھوپو کو بھی بتا دیا تھا کہ ابو نے آصفہ آنٹی سے نکاح کر لیا تھا۔

ایک دن پھوپو نے امی کی الماری صاف کی تو انہیں وہ دوائیں مل گئیں جو امی کی موت کا سبب بنی تھیں۔

پھوپو نے اسی وقت اختر صاحب کو بلا لیا۔ وہ بے چارے تھے کہ ہر گھر کا کام کرنے کو تیار رہتے تھے۔ انہوں نے ہومیو پیتھک کی ڈگری بھی حاصل کر رکھی تھی لیکن کبھی پریکٹس نہیں کرتے تھے۔

پھوپو نے ان سے کہا ''بھیا، یہ کچھ دوائیں ہیں، اب یہ ہمارے تو کسی کام کی نہیں ہیں۔ تم انہیں کسی مستحق کو دے دینا۔''

اختر انکل نے دوائیں دیکھیں اور کہا ''اچھا ہوا آپا، آپ نے مجھے یہ دوائیں دکھا دیں۔ ان میں سے یہ دوا تو بہت ہی زود اثر بھی ہے اور نقصان دہ بھی ہے۔''

''وہ کیسے؟'' پھوپو نے پوچھا۔

''آپا، ان مریضوں کو اس دوا کے صرف چند قطرے دیے جاتے ہیں جو زیادہ دماغی کام کرتے ہیں یا پھر جنہیں کمزوری سے چکر آتے ہیں۔ یہ دوا بھابی کو میں نے ہی لا کر دی تھی اور ان سے کہہ دیا تھا کہ اس دوا کے صرف چند قطرے استعمال کریں۔ لائیے، یہ دوائیں مجھے دے دیں۔''

''ہاں، یہ بات تو مجھے رضوان بھی بتا رہے تھے کہ وہ دوا بہت خطرناک ہے، اگر میری بیوی نے اس دوا کے دس بیس قطرے ایک ساتھ استعمال کر لیے تو وہ تو اللہ کو پیاری ہو جائے گی لیکن وہ پڑھی لکھی اور ذہین عورت ہے۔'' آصفہ آنٹی بولیں ''میں نے بھی مذاق میں کہا تھا، پھر تو آپ کے راستے کا کانٹا صاف ہو جائے گا۔ آپ کو پھر سے ایک نئی نویلی دلہن مل جائے گی۔'' اس پر رضوان نے کہا تھا ''آصفہ آئندہ ایسی بات مذاق میں بھی مت کہنا۔ سعدیہ مجھے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔''

میں نے بشریٰ کو دیکھا، اس کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے نظریں چرا رہی تھی۔

میں نے پھر اسے اوپر چلنے کا اشارہ کیا اور بولی ''تم نے مجھ سے اتنے جھوٹ بولے ہیں کہ اب تو میں تمہیں ہر قیمت پر پولیس کے حوالے کروں گی۔ میں اپنے کزن کو کال کر رہی ہوں۔'' میں نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر ملانے لگی۔

''ایک منٹ ثمرہ!'' اس نے مجھے روک دیا اور میرے قدموں میں گر پڑی ''مجھے معاف کر دو ثمرہ! میں تم سے حسد اور جلن میں اندھی ہوگئی تھی۔''

''سچ تو یہ ہے کہ امی اور انکل رضوان میں اتنی ہی بات ہوئی تھی جو میں بتا رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ میں اسے کس بنیاد پر پولیس کے حوالے کر سکتی ہوں، میں تو خود گنہگار ہوں مگر اللہ جانتا ہے کہ میں نے جو کچھ بھی کیا، نادانستگی میں کیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے اس جرم کی تلافی کیسے کروں؟ کیا آپ کے ذہن میں اس کا کوئی حل ہے؟

جوڑ بے جوڑ

جناب معراج رسول صاحب
السلام علیکم!
یہ آپ بیتی میری ہے۔ میرے دل کی آہ بھی اسے کہہ سکتے ہیں جبکہ سوزِ جگر کسی اور کا ہے۔ اب تک میں سرگزشت کا صرف قاری تھا مگر اب لکھاری کی صف میں آنا چاہتا ہوں۔ پہلا واقعہ اپنی زندگی کا لکھا ہے تاکہ میرا اندازِ تحریر بھی دیکھ لیں۔
اعزاز حسن سید(فیصل آباد)

میں نے جب ایک شادی کی تقریب میں اسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

کیا خوبصورت نقش و نگار تھے۔ کیا آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں میں نہ جانے کتنی کہانیاں چھپی ہوئی ہوں گی۔ کتنے طوفان ہوں گے۔ ایسے چہرے ذرا کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ جو ذرا سی دیر میں دل کو تہ و بالا کر کے رکھ دیں۔

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے؟ کیا نام ہے اس کا، کہاں رہتی ہے؟''

اگر شادی کی وہ تقریب کسی رشتے دار یا جاننے والے کی ہوتی تو میں کسی سے اس کے بارے میں معلوم ہی کر لیتا، لیکن وہ کسی اجنبی شخص کی شادی کی تقریب تھی اور میں ادھر سے گزرتے ہوئے کھانا کھانے کے لیے ہال میں جا گھسا تھا۔

میں برسوں سے یہی کر رہا ہوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہفتے میں ایک آدھ تقریب نمٹا ہی دیتا ہوں۔ جہاں میں رہتا ہوں وہاں سے کچھ فاصلے پر بے شمار شادی ہالز بنے ہوئے ہیں۔ اس لیے مجھے یہ آسانی حاصل ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے ہفتے میں دو چار ڈنر اس طرح ہو جاتے ہیں۔

اس طرح کھانا بھی ایک ہنر ہے۔ بہت کم لوگ اس ہنر سے واقف ہیں۔ فی الحال میری اس داستان کا موضوع کھانا نہیں ہے بلکہ وہ پری چہرہ ہے جس کو دیکھ کر میں بے حال ہو رہا تھا۔ اس لیے اس ہنر کی باتیں پھر کبھی سہی۔

فی الحال تو اس چہرے کی بات کر لی جائے۔

بہت خوبصورت چہرہ تھا اور اس کی آنکھیں اور بھی غضب کی تھیں۔ شاید مجھے اس لیے بھی اچھی لگ رہی تھیں کہ وہ کبھی کبھی میری طرف بھی دیکھ لیتی۔ جیسے اسے یہ احساس ہو گیا ہو کہ اس محفل میں اس کا کوئی دیوانہ بھی موجود ہے اور وہ اس کی حوصلہ افزائی کے لیے کبھی کبھی اس کی طرف دیکھ لیتی ہے۔

اس سلسلے میں خواتین کی نفسیات آج تک میری سمجھ میں نہیں آ سکی ہے۔ اگر انہیں جی بھر کر دیکھ لیں تو ناراض ہو جاتی ہیں اور نہ دیکھیں تو بھی ناراض ہو جاتی ہیں کہ مجھے دیکھا کیوں نہیں؟ کیا میں اتنی گئی گزری ہوں کہ کوئی میری طرف توجہ بھی نہ دے؟ اب بتاؤ۔ شریف آدمی کیا کرے کیا نہ کرے۔

میں بھی نگاہ چرا کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر میں نے یہ محسوس کیا کہ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی ہے۔ یہ مسکراہٹ اس کی پسندیدگی کی علامت تھی۔ یعنی اس نے خود کو دیکھے جانے کا برا نہیں مانا تھا۔

اچانک کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ ایک بڑے میاں تھے۔ روشن دماغ قسم کے۔ میرا مطلب ہے کہ ان کے سر پر بال نہیں تھے۔ البتہ ان کی آنکھوں میں بچوں جیسی چمک تھی۔ ”کیا بات ہے برخوردار! کیا وہ لڑکی بہت پسند آ گئی ہے؟“ بڑے میاں نے پوچھا۔

”جی۔“ میں اس ڈائریکٹ قسم کے سوال کو سن کر بوکھلا گیا تھا۔ ”نہیں تو۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا بات ہے کہ کھانا لگ چکا ہے اور تم اس لڑکی کو دیکھے جا رہے ہو۔“ بڑے میاں نے کہا۔

اس وقت میں نے ایسی شرمندگی محسوس کی کہ بس کچھ نہ پوچھیں۔

میں کچھ کہے بغیر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس لڑکی نے بھی بڑے میاں کی باتیں سن لی ہوں اور میرے لیے اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ہو۔

میں کھانے کی میز کی طرف بڑھنے والا تھا کہ بڑے میاں نے لپک کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”صاحب زادے۔ اب ایسی بھی کیا بوکھلاہٹ۔ کھانا کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔ جب آ ہی گئے ہو تو مل ہی جائے گا۔“

میں پھر چونک اُٹھا۔ کیا بڑے میاں کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ میں بن بلایا مہمان ہوں۔ یا پھر یہ بات یوں ہی کہہ دی ہے۔

بڑے میاں مسکرائے جا رہے تھے۔ بہر حال ان سے جان چھڑا کر میں کسی طرح کھانے والوں کی بھیڑ میں گھس گیا۔ بڑے میاں سے بچنے کے لیے میں نے اپنی پلیٹ میں کھانا لیا اور ایک کونے کی میز کی طرف آ گیا۔ ابھی میں کرسی پر بیٹھنے ہی والا تھا کہ بڑے میاں کی آواز سنائی دی۔ ”برخوردار اب اتنی دور کیوں آ کر بیٹھ گئے؟“

بڑے میاں اپنی پلیٹ لیے میری ہی طرف بڑھے آ رہے تھے۔ ”ہاں صاحب زادے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اتنی دور کیوں آ گئے؟ کسی چیز کی ضرورت پڑی تو اب لینے کے لیے اتنی دور جاؤ گے۔“

”شکریہ! میرا خیال ہے کہ مجھے اب ضرورت نہیں پڑے گی۔“ میں نے ایک کرسی سنبھال لی تھی۔

بڑے میاں بھی میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ ہم نے کھانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد بڑے میاں نے اچانک پوچھ لیا۔ ”اشرف تو تمہارا دوست ہوگا نا۔“

”کون اشرف؟“ میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

”کمال صاحب کا بیٹا۔“

”نہیں۔ میں کسی اشرف کو نہیں جانتا۔“ میں نے کہا۔

”برخوردار! ایسا لگتا ہے کہ تم نے ہال کے گیٹ پر لگے ہوئے بورڈ کو نہیں دیکھا۔“ بڑے میاں نے کہا۔ ”اتفاق سے دولہا کا نام اشرف ہی لکھا ہوا ہے۔“

میرے پیروں تلے زمین سی نکل گئی تھی۔ کم بخت نے کتنی ہوشیاری اور ذہانت کے ساتھ مجھے پھانسا تھا۔ ”ہاں میاں، اب بتاؤ۔“ بڑے میاں نے شرارت بھرے لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

”اچھا۔ آپ دولہا اشرف کی بات کر رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اصل میں ہم سارے دوست پیار میں اشرف کو

مون کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس لیے اس کا اصل نام ذہن سے نکل جاتا ہے۔“

”مون۔ اچھی بات ہے۔“ بڑے میاں مسکرا دیے۔ ”دوست اسی طرح ایک دوسرے کے نام رکھ دیتے ہیں۔ تو تم آسٹریلیا سے کب آئے؟“

”آسٹریلیا سے؟“ میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ ”نہیں جناب آسٹریلیا سے میرا کیا تعلق؟ میں تو کبھی آسٹریلیا نہیں گیا۔“

”تو پھر اشرف سے تمہاری دوستی کس طرح ہو گئی کیونکہ وہ تو صرف تین برس کی عمر میں آسٹریلیا گیا تھا اور زندگی میں پہلی بار پاکستان آیا ہے۔“

میرا دل چاہا کہ اس کم بخت بوڑھے کی گردن دبا کر رکھ دوں۔ اس نے کس ہوشیاری سے مجھے ٹریپ کیا تھا۔ اور میرا یہ دل چاہ رہا تھا کہ بس ایک لمحے کے لیے یہ اپنی آنکھیں بند کرے اور میں کھانا چھوڑ کر باہر کی طرف دوڑ لگا دوں۔ ایسی توہین پہلے کبھی نہیں ہوئی ہوگی۔

”میاں کھاتے رہو۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”اس لیے میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ جب آ ہی گئے ہو تو اچھی طرح کھا کر جانا۔ یہ کیا کہ ایڈونچر بھی کیا اور بھوکے ہی چلے گئے۔“

اس بار اس کی بات سن کر میں بھی مسکرا دیا۔ ستم ظریف قسم کے بڑے میاں تھے۔ ”آپ واقعی بہت کمال کے آدمی ہیں جناب!“ میں نے کہا۔ ”دراصل میں کسی اور شادی کے دھوکے میں اس ہال میں گھس آیا ہوں۔“

”ارے بھائی صفائی دینے کی کیا ضرورت ہے۔ جو کچھ ہے ٹھیک ہی ہے۔ بس کھاتے جاؤ۔ ویسے تم میں ہر طرح کی خوبیاں معلوم ہوتی ہیں۔“

”جی میں سمجھا نہیں۔ کیسی خوبیاں؟“

یہی کہ لڑکیوں کو گھور کر دیکھنا۔ کسی غیر کی شادی میں پہنچ جانا۔ کچھ بھی ہو۔ تم آدمی کمال کے معلوم ہوتے ہو۔“

میرا دل چاہا کہ اس بار کم از کم کرسی اٹھا کر اس کے سر پر مار ہی دوں۔ اس نے تو مجھے نچا کر رکھ دیا تھا۔

”کیا بات ہے برخوردار! تم نے ہاتھ کیوں روک دیے؟“

”نہیں تو۔ بس میں کھا چکا۔“ میں نے کہا۔

”بس اتنی دیر سے تمہاری یہ خوبی مجھے اچھی لگی ہے کہ تم ذرا کم کھاتے ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

خون ہی کھول کر رہ گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اچھا جناب! مجھے اب اجازت دیں۔“

”ارے۔ اب ایسی بھی کیا جلدی۔ ناز سے ملتے جاؤ۔“

”کون ناز؟“ میں نے پوچھا۔

”ارے بھئی وہی لڑکی جس کو تم مسلسل دیکھے جا رہے تھے۔ وہ میری بیٹی ہے۔“

اس بار تو شامیانہ ہال کی دیواریں کرسیاں میزیں سب کی سب میرے سر پر برس گئی تھیں۔ اس نے ذرا سی دیر میں میرا کیا حشر کر کے رکھ دیا تھا۔

اس کے ہونٹوں پر وہی شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔ کیسا ستم ظریف آدمی تھا۔ میری ساری ذہانت، ساری حاضر جوابی، ساری دلیری اس کے سامنے ہوا ہو کر رہ گئی تھی۔

”اب میں سنجیدہ ہوں۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”اب میں تمہیں اپنی بیٹی سے ملوا دیتا ہوں۔“

”جناب! مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میں اب جا رہا ہوں۔“

”اس طرح تو نہیں جا سکتے۔“ اس نے کہا۔ ”ناز گیٹ ہی پر کھڑی ہوئی ہے۔ چلو میں بھی تمہارے ساتھ ہی اُٹھ رہا

سحر انصاری، حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ دکن میں آپ نے یہی ایک قابل ذکر کام کیا دیگر اہم امور کراچی آ کر سرانجام دیے۔ یاد رہے کہ اگر آپ دکن میں پیدا نہ ہوئے ہوتے تو کراچی آ کر بھی کچھ نہ کر سکتے۔

کراچی میں آپ نے اردو، انگریزی اور لسانیات میں یکے بعد دیگرے تین ایم اے کیے، اس سے پہلے کہ آپ مزید کوئی ایسی حرکت کرتے، آپ کی شادی ہو گئی۔ پھر ایک خاصے بڑے عرصے تک آپ نے کچھ اور نہیں کیا، میرا مطلب ہے عرصہ دراز تک جامعہ کراچی میں پڑھاتے رہے، البتہ یونیورسٹی کے بعد آپ رات گئے تک ادبی سرگرمیوں میں مشغول رہتے، آپ نے جوانی کے سنہرے دن یونیورسٹی میں اور راتیں ادبی تقاریب میں ہی گزار دیں۔ قریباً تیس پینتیس برس سے ادبی تقاریب کے منتظمین تقریب کے لیے جگہ کے انتخاب اور ریفریشمنٹ کے انتظام سے بھی پہلے آپ کو بک کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔اس سے ملنے کے بعد چلے جانا۔''

یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس نے مجھے باندھ کر رکھ دیا تھا۔ہم ہال کے گیٹ تک آ گئے۔اور یہاں واقعی وہی لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔وہی حسین چہرے اور خوبصورت آنکھوں والی لڑکی۔لیکن۔لیکن وہ ایک ٹھگنی لڑکی تھی۔اس کا قد چار فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔

ذرا سی دیر میں اس کا سارا حسن ماند پڑ کر رہ گیا تھا۔وہ بونی تھی۔میں نے جس وقت اسے دیکھا وہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔اس لیے اس کے قد کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔

''ناز! یہ ہیں مسٹر۔'' بوڑھے نے میری طرف دیکھا۔''ہاں میاں۔میں نے تمہارا نام تو پوچھا ہی نہیں۔تعارف کیا کرواؤں؟''

''جی۔میرا نام اعزاز ہے۔'' میں نے بتایا۔

''اور اعزاز میاں۔یہ ہے میری بیٹی۔'' بوڑھے نے بتایا۔''ناز نام ہے اس کا۔ہم سب اس سے بہت پیار کرتے ہیں لیکن یہ خود پیار سے محروم ہے۔'' اس وقت بڑے میاں کی آواز میں اتنا درد اور کرب تھا کہ میں کانپ کر رہ گیا۔

قدرت نے اس حسین لڑکی کے ساتھ کیسی ستم ظریفی کی تھی۔اگر اس کا قد بڑا ہو جاتا تو کیا حرج تھا۔لیکن قدرت کے بھید قدرت ہی جان سکتی ہے۔

اور اس وقت نہ جانے کیوں میں نے اس بوڑھے سے کہا۔''قبلہ! آپ لوگ رہتے کہاں ہیں؟''

''کیوں بھائی خیریت؟'' بوڑھے کی زندہ دلی واپس آ گئی تھی۔''یہ پتا کیوں پوچھا جا رہا ہے؟''

''بس یونہی۔آپ مجھے بہت اچھے لگے ہیں۔'' میں نے کہا۔''آپ سے دوبارہ ملنے کو دل چاہنے لگا ہے۔''

''کیوں بیٹا ناز! اس شریف نوجوان کو ایڈریس دے دیا جائے؟'' بوڑھے نے اپنی بیٹی سے پوچھا۔

''دے دیں پاپا۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''لو میاں۔ایڈریس سمجھ لو۔'' بوڑھے نے اپنا پتا اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔''جب آنا ہو آ جانا۔خانہ بے تکلف ہے۔''

''ضرور آؤں گا جناب!''

واپس آ کر میں اس لڑکی کے بارے میں بہت دیر سوچتا رہا تھا۔کیسا ستم ہوا تھا اس کے ساتھ۔اس کے ساتھ ہی اس بوڑھے کی خوش مزاجی کی حقیقت سامنے آ گئی تھی..... وہ بے چارہ اپنے دکھوں کو چھپانے کے لیے خوش مزاجی کی چادر اوڑھے بیٹھا تھا۔

کتنا دکھ تھا اس کی اس بات میں کہ ہم سب اس سے بہت پیار کرتے ہیں لیکن یہ خود پیار سے محروم ہے۔یقیناً کسی نے اس کی طرف پیار کا ہاتھ نہیں بڑھایا ہوگا۔

کسی نے اس کا ساتھ نہیں دیا ہوگا۔اس کی زندگی کا سفر یوں ہی رائیگاں جا رہا ہوگا۔اس نے یقیناً تعلیم بھی حاصل کی ہوگی۔اس میں اور بھی خوبیاں ہوں گی لیکن اس کے قد نے اس کی ہر خوبی کو ختم کر کے رکھ دیا تھا۔

میں نے کبھی ایک شخص کی کہانی سنی تھی۔وہ ایک ڈاکٹر کے پاس گیا۔اس نے بتایا۔''ڈاکٹر صاحب۔میں ہنسنے کے لیے ترس گیا ہوں۔دکھوں نے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔میری زندگی میں خوشی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔کیا آپ کے پاس کوئی ایسی دوا ہے کہ میں جی بھر کر ہنس سکوں۔کچھ ہی دیر کے لیے سہی۔خوش ہو جاؤں۔''

''نہیں میرے پاس ایسی کوئی دوا نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔''البتہ میں تمہیں ایک مشورہ دے سکتا ہوں۔فلاں ہوٹل کے باہر ہر رات ایک جوکر کھڑا ہوتا ہے۔اس کی حرکتیں ایسی ہوتی ہیں کہ تم ہنس ہنس کر پاگل ہو جاؤ گے۔''

وہ شخص یہ مشورہ سن کر رو پڑا۔''ڈاکٹر صاحب! وہ جوکر میں ہی تو ہوں۔''

یہاں بھی ایسا ہی تھا۔بڑے میاں اپنے کرب اور اپنے دکھوں سے ذرا دیر کے لیے نجات حاصل کرنے کے لیے مسخرے بن گئے تھے۔دلچسپ باتیں کرنے لگے تھے۔

اگر کوئی اور بات نہ بھی ہوتی تب بھی ان کی دلچسپ باتیں سننے کے لیے ان کے پاس ضرور جاتا اور ایک دن میں ان کے پاس پہنچ ہی گیا۔

شام کا وقت تھا۔بڑے میاں بھی گھر پر تھے اور ان کی وہ بیٹی بھی تھی۔بڑے میاں نے بڑی خوش دلی سے میرا استقبال کرتے ہوئے کہا۔''تمہاری بے چینی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ تم چکر ضرور لگاؤ گے۔''

''جناب! میں تو آپ سے ملنے آیا ہوں۔'' میں اپنی جھینپ مٹانے کے لیے بولا۔

''اچھا!'' اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔''یہ بتاؤ میری بیٹی کا نام کیا ہے؟''

''آپ نے ناز بتایا تھا۔''

''گڈ! اور اب میرا نام بتاؤ؟''

''آپ کا نام۔'' میں کچھ بوکھلا گیا تھا۔''آپ نے

شاید اپنا نام نہیں بتایا تھا۔''

''کھانے کے دوران میں نے اپنا نام بتا دیا تھا میاں لیکن تمہیں اس لیے یاد نہیں رہا کہ تمہیں مجھ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے ورنہ تم میرا نام ضرور یاد رکھتے۔''

''آپ مجھے پھر شرمندہ کر رہے ہیں جناب!'' میں نے کہا۔

''چلو ایک بار پھر اپنا نام بتا رہا ہوں۔میرا نام ناصر حسین ہے۔''

''ناصر صاحب! آپ واقعی بہت زبردست آدمی ہیں۔''

''آؤ اندر آ جاؤ۔'' ناصر صاحب نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

بہت خوبصورت اور سلیقے سے سجا ہوا ڈرائنگ روم تھا۔جس کی سجاوٹ یہ بتا رہی تھی کہ اس میں پیسے سے زیادہ اعلیٰ ذوق کا کمال ہے۔

''دیکھا تم نے۔'' ناصر صاحب نے کہا۔''یہ تم جو سجاوٹ دیکھ رہے ہو۔یہ سب اسی ناز کا کارنامہ ہے۔خدا نے اس میں سلیقہ بھر دیا ہے لیکن افسوس..... قد کے معاملے میں اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔''

''ایسا نہ کہیں جناب! آپ کی بیٹی اس وقت بھی لاکھوں میں ایک ہے۔''

''اس میں کوئی شک نہیں ہے۔'' ناصر صاحب خوش ہو گئے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ لڑکی بھی کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔اپنے خوبصورت ہونٹوں پر خوبصورت مسکراہٹ لیے ہوئے۔

''ناز یہ دیکھو! یہ اعزاز میاں مجھ سے ملنے کے بہانے یہاں تک آ پہنچے ہیں۔''

میں جھینپ کر رہ گیا۔عجیب بے دھڑک قسم کے بڑے میاں تھے۔''بابا۔'' ناز نے بڑے میاں کو مخاطب کیا۔''آپ ان سے پوچھیں کہ یہ میرا وقت برباد کرنے تو نہیں آئے۔''

''بیٹا اب اس قسم کی باتیں تم خود ہی پوچھ لو۔'' ناصر صاحب نے کہا۔''میں تو اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔''

ناصر صاحب ڈرائنگ روم سے باہر چلے گئے۔ان کے جانے کے بعد میں نے ناز سے پوچھا۔''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔وقت برباد کرنے سے تمہارا کیا مقصد ہے۔کون تمہارا وقت برباد کرتا ہے؟''

''آپ جیسے لوگ!'' اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مسکراہٹ آ گئی تھی۔ ''آپ جیسے نہ جانے کتنے لوگ! جو کسی نہ کسی طرح میری زندگی میں آئے اور جب انہوں نے مجھے دیکھ لیا تو مڑ کر آنے کی زحمت ہی نہیں کی۔''

''افسوس ہوا یہ سن کر۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ لوگ آپ کی زندگی میں شامل کس طرح ہوتے رہے تھے؟''

''فون کے ذریعے۔'' ناز نے بتایا۔ ''کبھی کسی کا رانگ نمبر آ گیا۔ اس نے میری آواز سن لی تو بس میرے پیچھے پڑ گیا۔ یا پھر کچھ Net کے ذریعے بھی آئے۔ ان سے چیٹنگ ہوتی رہی۔ تصویر کی فرمائش کی تو Net پر تصویر دے دی۔ میری صورت دیکھ کر میرے دیوانے ہو گئے۔ مجھ سے ملنے کی خواہش کرتے رہے اور جب ان کے مجبور کرنے پر میں ان کے سامنے آئی تو اس کے بعد انہوں نے میرا نام بھی نہیں لیا۔ بس یہ ہے میری داستان لیکن.....'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔

''لیکن کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''لیکن یہ کہ آپ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے پہلی ملاقات میں مجھے دیکھ بھی لیا۔ اس کے باوجود مجھ سے ملنے چلے آئے۔ میں آپ کی ہمت کو سلام کرتی ہوں۔''

''دیکھو ناز دنیا کا ہر آدمی ایک جیسا نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔ ''پھر یہ بھی تو ممکن ہے کہ میرا ارادہ تم سے عشق کرنے کا نہ ہو۔ میں تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔''

''میرے لیے یہ بھی بہت بڑی بات ہو گی کہ آپ جیسے لمبے قد کا آدمی مجھ جیسی ٹھگنی سے دوستی کرنا چاہتا ہے۔''

''تم بلاوجہ احساس کمتری میں مبتلا ہو۔'' میں نے کہا۔ ''جب کہ یہ Fact ہے کہ تم ہزاروں لاکھوں لڑکیوں سے بہتر ہو کیونکہ تمہارا ذہن روشن ہے۔ تمہاری روح سچی ہے۔''

''آپ کا شکریہ اعزاز صاحب!'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں اپنے بارے میں ایسی باتیں پہلی مرتبہ سن رہی ہوں۔''

''اور سنتی رہو گی کیونکہ میں نے دوستی کرنے کا ارادہ کر لیا ہے بشرطیکہ تم بھی میری دوستی قبول کر لو۔''

''قبول ہے جناب!'' وہ ہنس پڑی۔

''اور مجھے بھی قبول ہے۔'' بڑے میاں ایک پردے کی آڑ سے نکلتے ہوئے بولے۔ ''میاں۔ اس غیر اخلاقی سرگرمی کے لیے مجھے معاف کر دینا کہ میں نے تم دونوں کی باتیں چھپ کر سن لی ہیں لیکن میرے لیے یہ احتیاط اس لیے بھی ضروری تھی کہ ناز ایک سیدھی سادی، بھولی بھالی لڑکی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایڈونچر پسند اس سے ناجائز فائدہ اٹھا لے۔''

''بابا۔'' ناز جلدی سے بولی۔

''یہ سب سچائیاں ہیں بابا کی جان۔'' ناصر حسین نے کہا۔ ''یہ پورا معاشرہ ہی بے رحم اور سنگ دل ہو گیا ہے۔''

''چلیں۔ اب میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''تم ایک شریف نوجوان ہو اعتراض میاں۔''

''اعتراض نہیں اعزاز۔'' میں نے تصحیح کی۔

''سوری۔ مجھے نام یاد نہیں رہتے۔ بہرحال تم جو بھی ہو۔ بہت اچھے ہو۔''

''شکریہ جناب!''

''تو بھئی۔ دوستی کے پہلے دن کی روایت تو نبھانی پڑے گی۔'' ناصر حسین نے کہا۔ ''یہ ہمارے یہاں کی پرانی رسم چلی آ رہی ہے۔''

''اور وہ کیا ہے جناب؟''

''کوئی خاص نہیں۔ بس بازار سے لپک کر ایک کیک لے آؤ۔'' ناصر حسین نے کہا۔ ''کیک کاٹنے کے بعد تم دونوں کی باقاعدہ دوستی شروع ہو جائے گی۔ اب تم بھی یہ سوچ رہے ہو گے کہ یہ کیسا باپ ہے جو اپنی بیٹی کے حوالے سے ایسی باتیں کر رہا ہے۔''

''نہیں۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں سوچی۔''

''اگر نہیں سوچی تو یہ تمہاری بے حسی اور بے وقوفی ہے۔'' ناصر حسین نے کہا۔ ''تمہیں ضرور سوچنا چاہیے۔ بہرحال اب یہ سن لو کہ میں ایسی باتیں اس لیے کر رہا ہوں کہ میری بیٹی کی زندگی میں آج تک خوشی کا کوئی لمحہ نہیں آیا ہے۔ اسے آج تک کسی کی دوستی بھی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ تم نے آ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیر دی ہیں۔ اسی لیے میں اس قسم کی الٹی سیدھی باتیں کر رہا ہوں۔''

میں خود اس محرومی کو محسوس کرنے لگا تھا۔ ایک باپ کے جذبات کتنے سچے تھے۔ وہ اپنی اولاد کو ہر طرح خوش دیکھنے کا خواہش مند تھا۔

بہرحال ناز سے اس طرح میری دوستی ہو گئی۔

وہ ایک سمجھدار خیال کرنے والی اور ذہین لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ بس پرابلم یہی تھی کہ ہم دونوں جب ساتھ نکلتے تو گلی ڈنڈا معلوم ہوتے۔ اس بے چاری کا قد واقعی بہت چھوٹا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دو چار دوستوں نے مجھے اس کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ وہ مجھے چھیڑنے لگے تھے۔ ”بھائی خیریت تو ہے۔ یہ کہیں کہاں سے مل گئی۔ میرا خیال ہے کہ تم اولاد کی طرح اس کی پرورش کرنا چاہتے ہو۔“

”بکواس بند کرو۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

”اس میں کیا شک ہے۔ تمہارے ساتھ چلتے ہوئے وہ اور بھی اچھی معلوم ہوتی ہے۔“

اس وقت میں ان بے عقلوں کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے انہیں لیکچر دینے لگتا کہ انسان کی اصل خوبی اس کے قد میں نہیں..... اس کے ذہن میں ہوتی ہے۔ نپولین بونا پارٹ کا قد بھی چھوٹا تھا۔ اس لیے اسے بونا کہتے ہیں۔ ٹانگا نیکا کا جنرل موگانا اس سے بھی چھوٹے قد کا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن میرے لیکچر کا اثر یہ ہوتا کہ وہ میری طرف اس طرح دیکھنے لگتے جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔

ایک بار میں اس کے ساتھ شاپنگ کے لیے ایک مارکیٹ کی طرف گیا۔ اسے اپنے لیے کپڑے خریدنے تھے۔ اسی لیے وہ ایک دکان میں گھس گئی جبکہ میں باہر ہی کھڑا رہا تھا کیونکہ اس دکان میں بہت رش تھا۔

کچھ دیر بعد ایک نوجوان نے میرے شانے کو ہلاتے ہوئے بتایا۔ ”جناب! آپ کی بچی آپ کو بلا رہی ہے۔“

”میری بچی۔ میری کون سی بچی ہے؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”وہ دیکھیں دکان کے باہر۔“ نوجوان نے اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا ناز اشارے سے مجھے بلا رہی تھی۔ میں چونکہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اسی لیے اس نوجوان نے میری اس طرف توجہ دلائی تھی اور وہ کم بخت اسے میری بچی سمجھا تھا۔

مجھے غصہ بھی آیا تھا اور شرمندگی بھی محسوس ہوئی تھی۔ بہرحال اس قسم کے اور بھی کئی واقعات ہوئے۔ ان باتوں کا احساس خود اس کو بھی ہوتا رہتا تھا۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ ”اعزاز! میرا خیال ہے کہ میں اب تمہارے ساتھ نہ نکلا کروں۔“

”وہ کیوں؟“

”اس لیے کہ تم میری وجہ سے خواہ مخواہ تماشا بن کر رہ جاتے ہو۔“ اس نے کہا۔

”ایسا مت کہو۔ مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔“

ناصر حسین یعنی ناز کے والد صاحب سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ایک شام انہوں نے کہا۔ ”میاں۔ میرے ایک عزیز کی شادی ہے۔ چل رہے ہو ہمارے ساتھ۔“

”ارے نہیں جناب! میں بن بلایا مہمان آپ لوگوں کے ساتھ کہاں جاؤں گا۔“

”خیر۔ ایسا تو نہ کہو۔“ وہ شرارت سے ہنس دیے۔ ”تمہارے لیے یہ کوئی نیا تجربہ تو نہیں ہوگا۔ تم اس رات بھی تو یوں ہی پہنچ گئے تھے۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“

”میاں۔ یہ تو اسی وقت پتا چل گیا تھا جب تم دولہا کے نام پر بوکھلا گئے تھے۔ خیر چھوڑو۔ ہم دونوں چلے جاتے ہیں۔“

میں گھر پہنچا تو پھوپی میرے انتظار میں تھیں۔ وہ بھی ایک عجیب چیز ہیں۔ انہوں نے شاید یہ قسم کھالی تھی کہ مجھے کنوارا نہیں رہنے دیں گی۔ ہر حال میں میری شادی کرا کے رہیں گی۔ اس دن بھی وہ ایک رشتہ ہی لے کر میرے پاس آئی تھیں۔ ”اعزاز! تمہیں ہر حال میں یہ رشتہ کرنا ہوگا۔ لڑکی بہت اچھی ہے۔“

”پھوپی کیا اچھائی ہے اس لڑکی میں؟“

”ارے اس کا قد بہت زبردست ہے۔ بالکل تمہاری ہائٹ ہے اس کی۔“

”یہ کون سی خوبی ہوگئی۔ ویسے پھوپی۔ میں ایک لڑکی کو پسند کر چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اچھا۔ وہ کون ہے؟“

”ہے ایک سیکسی خرام حسینہ!“ میں نے کہا۔ ”آپ اسے دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔“

”بیٹا۔ اگر ایسی بات ہے تو دکھاؤ مجھے۔ مجھے تو تمہاری خوشی چاہیے۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم نے کچھ دیکھ کر ہی پسند کی ہوگی۔“

سچ تو یہ ہے کہ میں نے ابھی تک ناز کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا لیکن پھوپی نے آ کر جیسے میری قومی غیرت کو جھنجوڑ دیا تھا۔ انہوں نے جیسے ہی کسی رشتے کی بات کی تھی۔ میں نے اسی وقت ناز کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میں اتنے دنوں میں ناز کو اچھی طرح پرکھ چکا تھا۔ وہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میں اس سے شادی کر لیتا تو وہ زندگی بھر میری وفادار رہتی کیونکہ ایک لمبے قد والے نے اسے پسند کر کے اس سے شادی کی تھی۔

اس طرح زندگی بہت آرام کے ساتھ گزر جاتی۔

”تو پھر کب لا رہے ہو اس کو؟“ پھوپی نے کہا۔

”پھوپی۔ کل ہی لے کر آؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”لیکن شرط یہ ہے کہ آپ اس کے سامنے اسے کچھ مت بولیے گا۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ جب وہ تمہاری پسند ہے تو پھر مجھے کیا بولنا ہے۔“

دوسرے دن میں نے ناز کو اپنے گھر چلنے کی دعوت دے دی۔ میں نے اسے پھوپی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ بہرحال جب اسے لے کر پہنچا تو پھوپی میرا ہاتھ تھام کر مجھے ایک طرف لے آئیں۔ ”بیٹا۔ اس لڑکی کی چھوٹی بہن تو آ گئی۔ خود وہ لڑکی کہاں ہے؟“

”پھوپی۔ یہی ہے وہ لڑکی۔“

”ہائیں اتنی سی۔ تم کیا بچی سے شادی کرو گے۔“

”پھوپی یہ بچی نہیں ہے۔ اس کا قد چھوٹا رہ گیا ہے۔“

”واہ میاں! تم کو یہی ایک ملی تھی۔“

”پلیز پھوپی۔ اب اس کے سامنے کچھ مت کہیے گا۔ آپ دس منٹ اس سے باتیں تو کر کے دیکھیں۔ آپ کو اس کی خوبیوں کا اندازہ ہو جائے گا۔“

”اچھا بیٹے جاؤ۔ بازار سے کچھ ناشتے وغیرہ کا سامان لے آؤ۔ میں جب تک اس سے باتیں کرتی ہوں۔“

اور جب میں آدھ گھنٹے کے بعد واپس آیا تو پھوپی اس کی گرویدہ ہو چکی تھیں۔ وہ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک طرف لے آئیں۔ ”بیٹا! یہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ قد سے کیا ہوتا ہے۔ یہ تمہارے گھر کو جنت بنا کر رکھ دے گی۔ مجھے تمہاری پسند سو فیصد قبول ہے۔“

”آ گیا یقین۔ میں نے کیا کہا تھا۔“

”تم نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔“ پھوپی مسکرا کر بولیں۔ ”اب تم شادی میں دیر نہیں کرو گے۔ مجھے اس کے گھر والوں کے پاس لے چلو۔ میں خود رشتے کی بات کر کے آؤں گی۔“

”ابھی نہیں پھوپی۔ پہلے مجھے دفتر سے شادی کے لیے لون لینے دیں۔“ میں نے بتایا۔ ”تاکہ رشتہ ہوتے ہی تاریخ رکھ کر شادی کر لوں۔ میں خود بھی دیر نہیں کرنا چاہتا۔“

اس کے بعد میں نے دفتر میں لون کی درخواست دے دی۔ پورا ڈپارٹمنٹ اس بات پر خوش تھا کہ بلآخر میں نے بھی شادی کا فیصلہ کر ہی لیا ہے۔ طرح طرح کے سوالات کیے جا رہے تھے۔ ”کیسی ہے؟ کیا کرتی ہے؟ کیا لو میرج کر رہے ہو؟ یا خاندان والوں نے رشتہ طے کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔“

اور میں سب کو یہ بتا رہا تھا کہ یہ لو میرج تو ہے لیکن اس میں خاندان والوں کی رضامندی بھی شامل ہے۔ دوسری طرف پھوپی نے شور مچا رکھا تھا۔ ”ارے بیٹا کب تک لون ملے گا؟ کب ہوگی شادی؟“

”ہو جائے گی پھوپی۔ بس لون ملنے والا ہے۔“

میں نے یہ سوچا تھا کہ لون ملنے کے بعد ہی میں پھوپی کو لے کر ناز کے گھر جاؤں گا اور اس دوران اس سے ملاقات بھی نہیں کروں گا۔ یہ بالکل خاص اسٹائل کا سسپنس ہوگا۔

لڑکا اچانک غائب ہو جاتا ہے۔ لڑکی اس کے لیے پریشان رہتی ہے۔ وہ فون کرتی ہے۔ فون کا جواب نہیں دیتا۔ اس بے وفائی پر لڑکی کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ چپکے چپکے روتی ہے۔ بے چین رہتی ہے۔ رات رات بھر جاگتی رہتی ہے اور کبھی کبھی المیہ گانے بھی گانے لگتی ہے اور جب وہ ہر طرح سے مایوس ہو جاتی ہے تو پھر اچانک لڑکا اپنا رشتہ لے کر اس کے گھر پہنچ جاتا ہے۔

لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ وہ لڑکے پر چیختی ہے۔ ناراض ہوتی ہے کہ اس نے اس کے ساتھ ایسا مذاق کیوں کیا؟ پھر بے ساختہ اس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگتی ہے۔

میں نے یہی سوچ رکھا تھا اور ایک دن میرا لون منظور ہو گیا۔ اب میرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ہاں۔ اس دوران میں نے وہی کیا جو میں نے سوچ رکھا تھا۔ یعنی ناز سے کوئی رابطہ نہیں رکھا۔ وہ بے چاری مجھے فون کرتی تھی۔ لیکن میں اس کے فون کا جواب بھی نہیں دیتا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ کتنا بے قرار ہو رہی ہوگی۔ لیکن جب اس ڈرامے کا کلائمکس اس کے سامنے آئے گا تو پھر اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا۔

لون منظور ہوتے ہی میں نے پھوپی سے کہا۔ ”پھوپھی۔ اب وہ وقت آ گیا ہے۔ آپ جس کا انتظار کر رہی تھیں۔“

”کیا مطلب! کیا تمہارا قرض منظور ہو گیا ہے؟“

”ہاں پھوپی۔ منظور ہو گیا ہے۔“

”تو پھر چلو۔ دیر کس بات کی ہے۔ بلکہ پہلے انہیں فون کر دو کہ ہم لوگ آ رہے ہیں۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں پھوپی۔ یہی تو نہیں کرنا ہے۔ ہم اچانک ان کے گھر پہنچیں گے۔ سسپنس آخر تک ہونا چاہیے۔ کہانی کی یہی خوبی ہوتی ہے۔"

"ارے کیسی کہانی۔"

"یہ آپ نہیں سمجھیں گی۔ چلیں بس تیار ہو جائیں۔"

میں نے پھوپی کو تیار کیا۔ محلے کی دکان سے ناز کی پسند کا کیک خریدا اور ہم ناز کے گھر پہنچ گئے۔ ناصر حسین نے بہت گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا تھا۔ "میاں۔ اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے؟ بے چاری ناز تمہارے لیے بہت پریشان رہتی تھی۔"

"جی ہاں۔ اس کا اندازہ تھا مجھے۔" میں مسکرا دیا۔ پھر پھوپی کا تعارف کروایا۔ "یہ میری پھوپی بھی ہیں اور ماں بھی۔ انہوں نے ہی میری پرورش کی ہے۔"

"جی بھائی صاحب! اب تو یہی خواہش رہ گئی ہے کہ اعزاز میاں کا سہرا دیکھ لوں۔" پھوپھی نے کہا۔

"کیوں نہیں۔ یہ کام تو اب ہو جانا چاہیے۔" ناصر حسین نے کہا۔

"بس تو بھائی صاحب! ہم اسی لیے حاضر ہوئے ہیں۔" پھوپی جلدی سے بولیں۔ "مجھے آپ کی بیٹی بہت پسند آئی ہے۔"

ناصر حسین یہ سن کر اس طرح چپ ہو گئے۔ جیسے کچھ سوچ رہے ہوں جبکہ میرا خیال یہ تھا کہ وہ یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑیں گے۔ اس کے برعکس ان پر ایک طرح کی بے حسی طاری ہو گئی تھی۔

"کس سوچ میں پڑ گئے بھائی صاحب!" پھوپی نے پوچھا۔

"اعزاز میاں!" ناصر حسین نے میری طرف دیکھا۔ "بیٹا۔ ناز برآمدے میں بیٹھی ہے۔ تم ذرا اس سے جا کر مل لو۔ وہ تمہیں سب بتا دے گی۔"

بہت عجیب سی بات تھی۔ بہرحال میں مکان کے پچھلے حصے کی طرف آ گیا۔ جہاں ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا اور ناز یہاں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ "ہیلو۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے اندازہ ہے کہ تم مجھ سے ناراض ہو گی لیکن میں ایک پلانگ کے تحت جان بوجھ کر تم سے دور ہوا تھا اور تمہارے فون کا جواب نہیں دے رہا تھا۔"

"یہ بات نہیں ہے اعزاز!" وہ دھیرے سے بولی۔ "بات کچھ اور ہے۔"

"وہ کیا بات ہے؟"

"میں نے کسی سے منگنی کر لی ہے۔" اس نے بتایا۔

"کیا۔" میں نے یقین نہ کرنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "تم نے کس سے منگنی کر لی اور کون ہے وہ؟"

"سلمان نام ہے اس کا۔" اس نے بتایا۔ "بہت سمجھدار بہت ذہین ایک محکمے میں اعلیٰ عہدے پر کام کرتا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیوں مذاق کر رہی ہو۔ تمہیں کون مل سکتا ہے۔"

"مل گیا ہے نا۔ اس لیے کہہ رہی ہوں۔ اگر کہو تو اس سے ملوا دوں۔ اتفاق سے وہ اس وقت یہیں کچن میں ہے۔ اسے کھانے بنانے کا بھی بہت شوق ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی تجربہ کرتا ہی رہتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"چلو۔ بلا لو اس کو۔ میرا مطلب ہے اپنے سلمان صاحب کو۔ میں بھی تو دیکھوں کہ مجھ جیسا دوسرا کون پیدا ہو گیا ہے۔"

اس نے غصے سے میری طرف دیکھا اور کچن کی طرف چلی گئی۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو سلمان بھی اس کے ساتھ تھا اور سلمان کو دیکھ کر میں نے اپنے سارے اعتراض واپس لے لیے۔ میری ساری الجھنیں دور ہو گئیں۔ ہر سوال کا جواب مل گیا تھا مجھے۔ کیونکہ وہ سلمان قد میں خود ناز سے بھی چھوٹا تھا۔

"اب کہو۔" ناز نے فخریہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ "مجھے مل گیا نا میرا ساتھی۔"

"ہاں ناز! بہت بہت مبارک ہو تمہیں۔" میں نے کہا۔ "واقعی تمہیں ویسا ہی ساتھی مل گیا ہے۔ جیسا ملنا چاہیے تھا۔"

میں نے اس سے اجازت چاہی اور پھوپی کو لے کر واپس آ گیا۔

اس دن مجھے اس بات کا پتا چل گیا کہ جوڑے واقعی آسمانوں پر بنتے ہیں اور اب پھوپی ایک بار پھر میرے لیے میرے قد کے برابر کوئی رشتہ تلاش کرنے کی مہم پر لگی ہوئی ہیں۔

خون کا اثر

جناب مدیر اعلیٰ
سلام تہنیت!
مجھے نہیں پتا کہ میں نے اپنی زندگی کا جو عکس کاغذ پر اُتارا ہے، اس میں کہاں تک کامیاب رہی ہوں کیونکہ میں الفاظ کی نشست وبرخاست، صحیح استعمال نہیں جانتی۔ پڑھنے کا خوب شوق ہے اس لیے آج لکھنے کی بھی کوشش کرلی۔ اگر میری، اس بڑھیا کی زندگی کا یہ سیاہ باب پسند آجائے تو شائع کردیں۔

نوراں (لاہور)

میں بابا کو روٹی دینے کھیتوں کی طرف جا رہی تھی۔ دور دور تک ہرے بھرے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے لیکن میں سورج کی تپش سے بے نیاز تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ آج مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ روٹی پہنچنے میں دیر

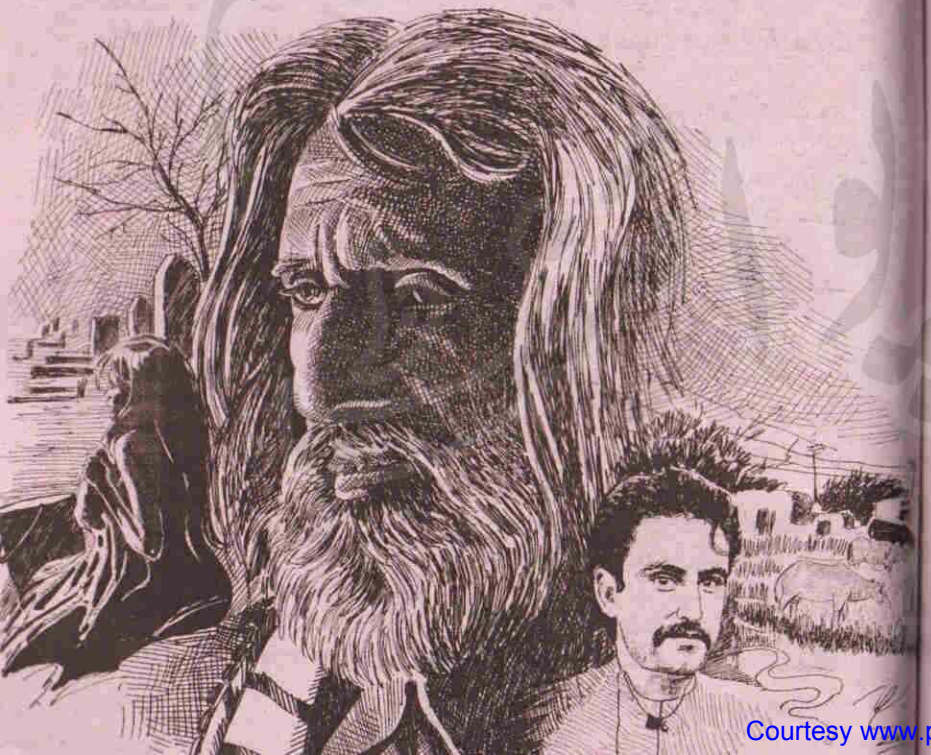

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوتی تھی تو پھر بابا روٹی نہیں کھاتے تھے۔

اچانک کھیتوں میں سے دو آدمی نمودار ہوئے۔ وہ چہروں ہی سے اوباش لگ رہے تھے لیکن مجھے ان کی پروا نہیں تھی۔

وہ کھیتوں میں سے نکل کر اچانک پتلی سی اس پگڈنڈی پر آ گئے جس پر میں جا رہی تھی۔

ان دونوں نے گویا میرا راستہ روک لیا اور مکروہ انداز میں مسکرانے لگے۔

"بڑی جلدی میں ہو سوہنیو!" ان میں سے ایک اوباش انداز میں بولا۔

"میرا راستہ چھوڑو۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"راستہ بھی چھوڑ دیں گے، ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" دوسرے نے کہا اور آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

میرے ہاتھ سے روٹی کی چنگیر گر گئی۔ لسی کی چھوٹی سی مٹکی جو میرے دوسرے ہاتھ میں تھی، میں نے وہی اس کے سر پر دے ماری۔

وہ چکرا کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے اور کپڑوں پر لسی کے ساتھ ساتھ خون کی آمیزش بھی ہو گئی۔

یہ دیکھ کر دوسرا آدمی بپھر گیا اور بولا "تو نے ہمیں کیا سمجھ رکھا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے میری کمر میں ہاتھ ڈالا اور مجھے اُٹھا لیا۔

میری عمر ہی اس وقت کیا تھی، مشکل سے چودہ برس۔ میں چھریرے بدن کی ہلکی پھلکی لڑکی تھی۔ وہ جوان اور توانا مرد تھا۔ میں اس کی گرفت میں بُری طرح مچلنے لگی۔ اس کے سینے اور چہرے پر گھونسے مارے لیکن اسے کوئی اثر نہ ہوا اور وہ مجھے اُٹھائے ہوئے کھیتوں کی طرف بڑھا۔

اچانک کسی نے پیچھے سے اس کے بال پکڑ کے گھسیٹ لیا۔

وہ بھنا کر پلٹا تو اسے کھینچنے والے نے اس کے چہرے پر زوردار گھونسا رسید کر دیا۔

اس نے ایک دم مجھے چھوڑ دیا۔ میں دھپ سے زمین پر گری اور فوراً ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

زخمی ہونے والا آدمی بھی اب سنبھل چکا تھا۔ وہ اچانک کھڑا ہو گیا اور میرے ہمدرد اجنبی کی طرف جھپٹا لیکن میں نے جلدی سے اپنی ٹانگ آگے بڑھا دی۔ وہ لڑکھڑا کر پھر گر پڑا۔

اجنبی نے اچانک جھک کر ایک ڈانگ اُٹھائی۔ وہ ڈانگ یا تو اسی کی تھی یا پھر ان دونوں بدمعاشوں میں کسی کی تھی۔ اس نے جوں ہی ڈنڈا اُٹھایا، وہ دونوں گرتے پڑتے وہاں سے بھاگے۔

"تمہاری بہت بہت مہربانی۔" میں نے کہا۔

"تم اس وقت کہاں جا رہی تھیں؟" اس نے پوچھا۔

"میں بابا کو روٹی دینے کھیتوں میں جا رہی تھی کہ ان دونوں بدمعاشوں نے میرا راستہ روک لیا۔ تم نہ آتے تو نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔" میں نے کہا۔

"روٹی تو مٹی میں مل گئی، لسی بھی گر گئی۔ اب تم بابا کو کیا دو گی، وہ بے چارے تو بھوکے رہیں گے۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا "میرے پاس کچھ روٹیاں اور ساگ ہے۔ تم وہ اپنے بابا کو دے دینا۔"

"تم کیا کھاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"میری فکر مت کرو۔ میں تو اب گھر پہنچ کر ہی کھاؤں گا۔" اس نے روٹی کی پوٹلی کھیتوں میں سے اُٹھا کر مجھے دے دی، پھر ہنس کر بولا "کیا نام ہے تمہارا؟"

"نوراں!" میں نے نظریں جھکا کر کہا۔

"میرا نام اکبر ہے۔ تمہارے بابا کا نام کیا ہے؟"

"ان کا نام اللہ داد ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں حسن پور کا رہنے والا ہوں۔ تم شاید نواب پور میں رہتی ہو؟"

"ہاں، میں نواب پور میں رہتی ہوں۔"

وہ مجھے روٹی دے کر مسکراتا ہوا چلا گیا۔

میں بھی تیزی سے کھیتوں کی طرف روانہ ہو گئی۔

یہ واقعات اب سے ساٹھ پینسٹھ برس پہلے کے ہیں۔ اب تو مجھے اکثر لوگوں کے چہرے اور نام بھی یاد نہیں رہتے، آنکھیں دھندلا گئی ہیں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ آج بھی میں بغیر سہارے کے چل سکتی ہوں۔

اس واقعے کے دس بارہ دن بعد ہمارے گھر دو تین عورتیں اور ایک مرد آیا۔

ہمارے گھر میں صرف میں اور بابا رہتے تھے۔ اماں کا انتقال تو برسوں پہلے ہو چکا تھا اور بھائی بہن کوئی تھا نہیں۔ میں بابا کی اکلوتی تھی۔

بابا ان عورتوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ سمجھا کہ شاید یہ کوئی مسافر ہیں اور دم لینے کو یہاں رک گئے ہیں۔ اس دور میں لوگ عموماً پیدل ہی سفر کیا کرتے تھے۔ پیسے والے لوگ البتہ گھوڑے استعمال کرتے تھے۔

بابا نے انہیں عزت سے گھر میں بٹھایا اور مجھ سے کہا کہ

مہمانوں کے لیے کچھ لسی پانی کا انتظام کر۔

میں نے جلدی جلدی گڑ کا شربت بنا کر انہیں پلایا۔

ان عورتوں میں سے ایک بولی "اللہ داد آپ ہی ہیں؟"

"ہاں جی، میرا ہی نام اللہ داد ہے۔"

"آپ کے گاؤں کے مولوی کرامت اللہ میرے عزیز ہیں لیکن وہ اس وقت موجود نہیں ہیں۔"

"اسے بھی آپ اپنا ہی گھر سمجھیں جی!" بابا نے کہا "مولوی صاحب کی مہمان ہیں تو ہماری بھی مہمان ہوئیں۔"

اسی وقت مولوی کرامت بھی آ گئے۔ بابا ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ ایک بابا ہی کیا، پورا گاؤں ان کی عزت کرتا تھا۔

وہ عورت بولی "میں حسن پور میں رہتی ہوں اور اپنے بیٹے اکبر کے لیے نوراں کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں۔"

میں شرما کر اندر والی کوٹھری میں چلی گئی۔ وہ جی دار اور گھبرو جوان مجھے بھی پہلی ہی نظر میں پسند آیا تھا۔

"ہماری تھوڑی بہت زمینداری ہے۔" عورت نے کہا "اکبر میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ آپ بے شک تسلی سے سوچ لیں، معلومات کر لیں، پھر جواب دیں۔ میں پرسوں آ جاؤں گی۔"

"صغراں بہت خاندانی عورت ہے اللہ داد!" مولوی صاحب نے کہا "یہ میری رشتے دار بھی ہوتی ہے اور میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اکبر بہت محنتی اور شریف لڑکا ہے۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ نوراں وہاں راج کرے گی۔"

"مولوی صاحب! آپ کی بات سر آنکھوں پر۔" بابا نے کہا "لیکن مجھے کچھ سوچنے کا موقع تو دیں۔"

"بھائی اللہ داد! آپ اچھی طرح سوچیں، آخر بیٹی کا معاملہ ہے۔" ماسی صغراں نے کہا۔

یوں اکبر سے میری شادی ہو گئی۔ اس دور میں اتنی ہی کم سنی میں شادیاں ہو جاتی تھیں۔

اکبر تو مجھے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ ماسی صغراں بھی مجھے بہت چاہتی تھی۔

دو مہینے تک تو اس نے مجھے گھر کے کسی کام کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا۔ کہتی تھی، تو اتنی سوہنی کڑی ہے، ایسے جھاڑو دے گی تو میلی ہو جائے گی۔

اماں کی اس بات پر مجھے ہنسی آ جاتی تھی۔ میں اب انہیں اماں ہی کہنے لگی تھی۔ میں کہتی "اماں، کام کرنے سے بھی کوئی

تعویذ سے نکاح

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے بارے میں مشہور واقعہ ہے، آپ ظہر کی نماز سے پہلے حجرے میں بیٹھے تھے۔ ایک نوجوان آیا، سلام و دعا کے بعد بیٹھ گیا۔ مولانا نے آنے کا مقصد پوچھا۔

کہنے لگا "حضرت، میں اپنے چچا کی بیٹی سے شادی کا خواہش مند ہوں، لڑکی بھی مجھے پسند کرتی ہے لیکن چچا جان مانتے نہیں ہیں، آپ میرے ساتھ چل کر چچا سے بات کریں۔"

مولانا نے جواب دیا "یہ تیرے گھر کا ذاتی مسئلہ ہے۔ اپنے خاندان کے بزرگوں کو درمیان میں لاؤ۔" بار بار اصرار کے باوجود مولانا گنگوہیؒ ساتھ جانے پر راضی نہ ہوئے تو نوجوان نے صحن میں موجود کنواں پر جا کر کپڑے اتار کر ایک چادر باندھ لی۔

مولانا کو آواز دی کہ میرا جنازہ آپ ہی کو پڑھانا ہے۔ مولانا "ٹھہرو، ٹھہرو" کا شور مچاتے ننگے سر، ننگے پاؤں بھاگے۔ نوجوان کو واپس پکڑ کر حجرے میں لائے، سر پکڑ کر بیٹھ گئے پھر کاغذ قلم لے کر لکھا اور تاکید کی کہ چچا کو جا کر یہ تحریر دکھاؤ۔

"یا اللہ میں کچھ جانتا نہیں اور یہ شخص کوئی بات مانتا نہیں۔ تو اس کا مولا اور یہ تیرا غلام۔ اب تو جانے اور تیرا کام۔"

نوجوان اپنی گلی میں داخل ہوا۔ اس کے چچا اور دیگر اسے تلاش کر رہے تھے دیکھ کر کہا "کدھر گئے تھے، آؤ تیری شادی کرا دیں۔"

یہ تھی اللہ والوں کی اللہ پر اعتماد کا عالم۔

مرسلہ: احمد خان توحیدی، چکری راولپنڈی

الہ آباد کے ایک مشاعرے میں ایک بزرگ شاعر نے تیغ الہ آبادی (مصطفیٰ زیدی مرحوم) سے پوچھا "کیوں میاں تیغ! کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟"

تیغ کے جواب دینے سے پہلے شمیم کرمانی نے کہا "اجی جناب! کون باپ ایسا ہوگا جو اپنی بیٹی کو خود اپنے ہی ہاتھوں تہ تیغ کر دے۔"

مرسلہ: افتخار خاں، سرائے عالم گیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میلا ہوتا ہے؟"

"ہوتا ہے کڑیے!" اماں پیار بھرے لہجے میں کہتیں "تو ابھی بچی ہے، تو ان باتوں کو کیا جانے۔"

میرے ہاتھ پیروں کی مہندی کا رنگ پھیکا پڑا تو اماں نے ایک مرتبہ پھر میرے ہاتھوں اور پیروں میں مہندی لگادی اور بولیں "نئی نویلی دلہن کے سونے ہاتھ اور سونی کلائیاں اچھی نہیں لگتیں۔"

اماں کے چاؤ چونچلے دیکھ کر اکبر بھی مسکراتا تھا اور کہتا تھا "اماں! تجھے تو ہر وقت بہو کی فکر لگی رہتی ہے، کبھی میرا بھی خیال کرلیا کر۔ میں جو سارا دن کھیتوں میں ہل چلاتا ہوں۔ میں تو میلا نہیں ہوتا۔"

"تو مرد ہے پتر!" اماں کہتی "مرد کی تو شان ہی کام کرنے میں ہے۔"

دن اسی طرح خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے گزر رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہماری شادی کو ایک سال گزر گیا۔ اب اماں کی اُٹھتے بیٹھتے ایک ہی رٹ تھی کہ نوراں، اب جلدی سے مجھے پوتا دے دے۔ میرا ارمان بھی پورا ہوجائے۔ نہ جانے کب میری آنکھیں بند ہوجائیں۔"

"اماں! یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔" میں نظریں جھکا کر کہتی۔

"ہاں بیٹی! تُو ٹھیک ہی کہتی ہے۔ پر میں تو اللہ سے مانگ مانگ کر تھک گئی۔"

میں ان کی اس بات کا کیا جواب دیتی۔

چھ مہینے مزید گزرے تو اماں کے رویّے میں بھی واضح فرق آنے لگا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے مجھے طعنے دینے لگیں، بات بے بات جھڑکنے لگیں۔

وہ کہتی تھیں "جس درخت میں پھل پھول نہ ہوں، وہ جلانے کے کام آتا ہے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میں بنجر زمین کا سودا کررہی ہوں۔"

وہ یہ باتیں مجھے سنانے کے لیے کرتی تھیں۔

میں اماں کی ان باتوں سے ہر وقت پریشان رہنے لگی تھی۔ میری اس اداسی اور پریشانی کو اکبر نے بھی محسوس کرلیا اور مجھ سے ایک دن بولا۔ "کیا بات ہے نوراں؟ تو آج کل اتنی اداس اور پریشان کیوں رہتی ہے؟"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے اسے ٹالنے کو کہا۔

"اچھا، میں سمجھ گیا۔" وہ مسکرا کر بولا "تجھے بابا کی یاد آرہی ہے۔ کل میں تجھے تو اب پورلے جاؤں گا، اب تو خوش ہوجا۔"

وہ مجھے بابا سے ملوانے لے گیا۔ بابا اب بہت ضعیف ہوگئے تھے یا پھر مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا۔ وہ کچھ بیمار بھی تھے۔

میں نے پریشان ہوکر کہا "بابا! تمہاری طبیعت خراب ہے تو تم دوا کیوں نہیں لائے؟"

"بھئی، میں گاؤں کے حکیم صاحب سے دوا لایا تو ہوں، لیکن اس سے کچھ افاقہ ہی نہیں ہوا۔"

"بابا، میں تمہیں شہر کے بڑے اسپتال لے جاؤں گا۔ کل تم تیار رہنا۔ میں تانگا لے کر آؤں گا۔"

"میں بھی چلوں گی۔" میں نے اکبر سے کہا۔

دوسرے دن ہم بابا کو شہر کے اسپتال لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے بابا کا معائنہ کیا، پھر انہوں نے بابا کو کچھ دوائیں دیں اور اکبر کو کچھ دور لے جاکر کچھ بتانے لگے۔

اکبر لوٹا تو اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے اکبر! ڈاکٹر صاحب نے کیا کہا ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔" اکبر نے کہا "ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ بابا کو مکمل آرام کی ضرورت ہے اور دوائیں بھی پابندی سے کھانی ہیں۔"

میری شادی کے بعد ہماری پڑوسن شیداں ہی بابا کا خیال رکھتی تھی۔ اکبر نے اسے بھی سمجھا دیا کہ بابا کو کون سی دوا کس وقت دینا ہے۔

ہم بابا کو چھوڑ کر تانگے میں گاؤں واپس جارہے تھے تب بھی اکبر کے چہرے پر فکر و تشویش کے آثار تھے۔

میں نے پریشان ہوکر پوچھا "اکبر! تم مجھ سے کیا چھپا رہے ہو، بتاؤ نا ڈاکٹر صاحب نے کیا کہا ہے؟"

"میں نے بتایا تو ہے۔" اکبر نے جواب دیا۔

"نہیں، مجھے سچی بات بتاؤ۔" میں نے کہا "تمہیں میری قسم اکبر!"

اکبر یہ سن کر تلملا گیا اور بولا "نوراں! تجھے ہزار دفعہ کہا ہے کہ مجھے اپنی قسم مت دیا کر۔"

"پھر تم مجھے سچی بات کیوں نہیں بتاتے؟" میں نے کہا۔

"سچی بات تو یہ ہے نوراں..... کہ..... بابا کو..... بڑی بیماری ہے۔" اکبر نے اٹکتے ہوئے کہا۔

میرے سر پر گویا آسمان ٹوٹ پڑا۔ بڑی بیماری اس زمانے میں ٹی بی کو کہا جاتا تھا۔ اس وقت تک وہ بیماری ناقابلِ علاج تھی۔ ٹی بی کا مریض کبھی زندہ نہیں بچتا تھا۔

میں یہ سن کر بُری طرح رونے لگی۔ اکبر نے بہ مشکل تمام مجھے تسلی دلاسے دے کر خاموش کرایا اور بولا "ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ ابھی ان کی بیماری اتنی زیادہ نہیں ہے، دواؤں سے ٹھیک ہوجائے گی۔"

میں جانتی تھی کہ اکبر مجھے جھوٹی تسلیاں دے رہا ہے۔ ہمارے گاؤں میں کئی آدمی اس بیماری کا شکار ہوکر مرچکے تھے۔ ان کا علاج کسی بھی ڈاکٹر کے پاس نہیں تھا۔

اماں نے بابا کی بیماری کے بارے میں سنا تو ان کا رویہ بھی خاصا بدل گیا۔ اب وہ مجھے طعنے بھی نہیں دیتی تھیں، ہر وقت میری دل جوئی کی کوشش کرتی تھیں۔ اماں دل کی بُری نہیں تھیں۔ بس انہیں اپنے بیٹے کے لیے وارث چاہیے تھا۔

اکبر تو پہلے بھی میرے ناز اُٹھاتا تھا، وہ اب ہر وقت مجھے بہلانے کی کوشش کرتا تھا۔

گاؤں سے باہر میلا لگا تو اکبر ضد کرکے مجھے وہاں لے گیا۔ اس زمانے میں سنیما تو صرف بڑے شہروں میں تھے لیکن تھیٹر کمپنیاں اکثر گاؤں کے باہر آکر اپنے پنڈال سجالیتی تھیں۔ اکبر مجھے تھیٹر دکھانے بھی ضرور لے جاتا تھا۔

میں ہفتے میں ایک بار اور کبھی کبھی دو بار بابا سے ملنے بھی چلی جاتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ گھلتا جارہا ہو۔ جیسے برف کی سِل آہستہ آہستہ پگھلتی ہے۔ اب بابا سارا وقت گھر ہی میں رہتا تھا۔ اس نے اپنی زمین ٹھیکے پر دے دی تھی۔ میں جب بھی اسے دیکھ کر آتی، پہلے سے زیادہ اداس ہوجاتی۔

آخر ایک منحوس صبح بابا اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ میں تو غم سے پاگل ہوگئی۔ اس موقعے پر اماں نے مجھے بہت سہارا دیا۔ ان کی دل جوئی اور شفیق رویّے سے میں بھی اپنا غم کچھ کچھ بھولنے لگی تھی۔ اکبر تو اب ہر وقت میری شکل ہی دیکھتا رہتا تھا اور سمجھتا رہتا تھا کہ نوراں، ماں باپ تو کسی کے بھی ہمیشہ زندہ نہیں رہتے۔ مجھے ہی دیکھ، میں اس وقت چار پانچ سال کا تھا جب میرے باپ کا انتقال ہوا تھا۔

اماں کے نرم و شفیق رویّے اور اکبر کی والہانہ محبت مجھے دوبارہ زندگی کی طرف لے آئی۔

میں اب پہلے کی طرح گھر کے کاموں میں دلچسپی لینے لگی۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وقت ہی سب سے بڑا مرہم ہے۔ مجھے بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صبر آگیا تھا۔

دو مہینے مزید گزر گئے۔ میں اماں کے رویّے میں ایک مرتبہ پھر تبدیلی محسوس کررہی تھی۔

اس دن پڑوس کی ماسی جیناں ہمارے گھر آئی ہوئی تھی۔ میں اس کے لیے شربت بنارہی تھی۔ اس نے اماں سے کہا "صغراں! ابھی تک بہو کی گود ہری نہیں ہوئی۔"

اماں نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا "جیناں! کبھی بنجر زمین بھی فصل دیتی ہے۔ میں نے تو اپنے بیٹے کی قسمت ہی پھوڑ دی۔"

"ایسی مایوسی کی کیا بات ہے صغراں! ابھی کون سی اکبر کی عمر گزر گئی ہے۔ تو اس کی دوسری شادی کرادے ورنہ پوتا کھلانے کی آس ہی لیے اس دنیا سے گزر جائے گی۔"

"دوسری شادی!" اماں نے حیرت سے کہا "لیکن اکبر اس پر کب راضی ہوگا۔ اس چڑیل نے تو اکبر پر نہ جانے کون سا جادو کیا ہے کہ وہ اس کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کا روادار نہیں۔"

میں نے خاموشی سے ماسی جیناں اور اماں کو شربت دیا اور اپنی کوٹھری میں جاکر پڑ گئی۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس وقت بابا مجھے بہت یاد آئے۔ اماں اگر ان کی زندگی میں یہ بات کہتی تو شاید میں وہاں ایک پل نہ ٹکتی لیکن اب میرا ٹھکانا بھی کہاں تھا؟

میں نے اس روز فیصلہ کرلیا کہ آج ہی اکبر سے صاف صاف بات کروں گی اور اسے بتادوں گی کہ اماں کا رویہ میرے ساتھ کیا ہے؟ میں نے اب تک اماں کی باتوں کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔

شام کو اکبر آیا تو وہ حسبِ معمول میرے لیے آم لے کر آیا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ کھیت سے لوٹتے وقت میرے لیے موسم کا پھل ضرور لاتا تھا۔

میں نے اسے کھانا دیا تو وہ بولا "نوراں! کبھی تُو بھی میرے ساتھ کھانا کھالیا کر۔"

"میں کھالوں گی، تم آرام سے کھانا کھاؤ۔" میں نے کہا۔

وہ کھانا کھا چکا تو میں نے اور اماں نے کھانا کھایا۔ پھر میں اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔

اکبر میرے پیچھے پیچھے وہاں آیا اور بولا "اتنی گرمی میں تُو یہاں کیوں پڑی ہے؟ چل کوٹھے پر، میں نے بستر لگادیا ہے۔"

میں اس کے ساتھ اوپر چلی گئی لیکن اس کی کسی بات کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جواب نہیں دیا۔

''کیا بات ہے نوراں؟'' اکبر نے پوچھا ''کیا تُو مجھ سے ناراض ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے بلند آواز میں کہا اور اسے اماں کے رویے کے بارے میں بتا دیا۔

اکبر بستر پر لیٹا ہوا تھا، تڑپ کر اُٹھ بیٹھا اور بولا ''تُو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟''

''پہلے بتاتی تو کیا کر لیتے؟'' میں نے کہا۔

''میں اماں سے یہ تو کہہ ہی سکتا تھا کہ اولاد دینا یا نہ دینا کسی بندے کے ہاتھ میں نہیں ہے۔''

''اور وہ تمہاری بات سمجھ جاتی؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''وہ تو مجھے بنجر زمین کہتی ہے، بنجر زمین! بنجر زمین بھی کیا فصل دیتی ہے؟''

''نوراں، تو اماں کی بات کا بُرا نہ مانا کر۔ وہ اب بوڑھی ہوگئی ہے۔ تو نے سنا نہیں کہ بوڑھا اور بچہ برابر ہوتا ہے۔'' اکبر نے پھر مجھے باتوں میں بہلانے کی کوشش کی۔

''ارے وہ تو پوتے کے لیے تمہاری دوسری شادی کرنے جا رہی ہے۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔'' اکبر نے کہا ''اماں ایسی بات نہیں کر سکتی۔''

''میں اگر اپنے کانوں سے نہ سن لیتی تو مجھے بھی یقین نہیں آتا۔ ماسی جیناں اسے مشورہ دے رہی تھی کہ اکبر کی دوسری شادی کرا دو ورنہ پوتے کی آس لیے اس دنیا سے رخصت ہو جاؤ گی۔ نوراں تو بنجر ہے، بانجھ!''

''نوراں!'' اکبر نے جو شیلے لہجے میں کہا ''اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ تب بھی میں دوسری شادی نہیں کروں گا۔''

''میرے مرنے کے بعد بھی نہیں؟''

اکبر نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور درشت لہجے میں بولا ''خبردار! آئندہ یہ بات منہ سے بھی مت نکالنا۔''

پھر گھر میں ماسی جیناں کی آمد و رفت بڑھ گئی۔ اماں اور ماسی جیناں گھنٹوں بیٹھی کھسر پھسر کرتی رہتیں۔

آخر اماں نے اکبر کے لیے ایک لڑکی پسند کر ہی لی۔ وہ اس گاؤں کے ایک مزارع کی بیٹی تھی۔ شکل صورت تو واجبی سی تھی لیکن تھی خاصی تیز طرار اور شوخ و چنچل!

رات کو اکبر کھانا کھا کر بیٹھا تو اماں نے کہا ''اکبر! مجھے تجھ سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔''

اکبر نے حیرت سے اماں کو دیکھا، پھر بولا ''اماں! ایسی کون سی ضروری بات ہے جس کے لیے تو پہلے سے مجھے بتا رہی ہے۔ بول، میں سن رہا ہوں۔''

میں جانتی تھی کہ وہ ضروری بات کیا ہوگی؟

اماں نے ایک نظر مجھے دیکھا، پھر بولی ''اکبر! میں نے تیری دوسری شادی کرانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''دوسری شادی؟'' اکبر ہنس کر بولا ''اماں! مجھ سے ایک ہی نہیں سنبھلتی، تو دوسری شادی کی بات کر رہی ہے۔ کیوں میری جان کی دشمن ہوئی ہے۔ میں تو دو بیویوں کے درمیان چکی کے دو پاٹوں کی طرح پس کر رہ جاؤں گا۔''

''میری بات کو مذاق میں مت ٹال اکبر!'' اماں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے پوتے کی شدید خواہش ہے اور نوراں تو میری یہ خواہش پوری کرنے سے رہی۔''

''کیوں اماں، نوراں کیا عورت نہیں ہے؟'' اکبر بھی سنجیدہ ہوگیا۔

''نوراں اگر میری یہ خواہش پوری کرنے کے قابل ہوتی تو اب تک کر چکی ہوتی۔ وہ ادھوری عورت ہے، بانجھ عورت تو ادھوری ہی ہوتی ہے بیٹا!''

''اماں، تو بھی کیسی باتیں کرتی ہے۔'' اکبر تنک کر بولا ''رحمت چاچا کے گھر دس سال بعد اولاد پیدا ہوئی تھی۔ اللہ کی مرضی میں کسی بندے کا کیا دخل؟''

''میں دس سال تک کیا بیٹھی رہوں گی۔'' اماں نے کہا ''نہ جانے کب میرا بلاوا آ جائے۔''

''اماں بلاوا تو کسی کا بھی آ سکتا ہے۔ یہ کسے معلوم ہے کہ کون کب اس دنیا سے جائے گا۔'' اکبر نے کہا۔

''باتیں بنانا چھوڑ۔'' اماں نے کہا ''میں نے فاخرہ کی ماں سے بات بھی کر لی ہے۔ وہ ہر طرح سے راضی ہے۔''

''فاخرہ!'' اکبر نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا ''وہ کالی کلوٹی! تو اسے میری بیوی بنانا چاہتی ہے؟''

''کان کھول کر سن لے اکبر!'' اماں نے درشت لہجے میں کہا ''میں نے تیری دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا ہے اور میں تیری دوسری شادی کرا کے ہی دم لوں گی۔''

''تو پھر میری بات تو بھی اچھی طرح کان کھول کر سن لے۔ میں کسی بھی قیمت پر دوسری شادی نہیں کروں گا۔'' یہ کہہ کر اکبر پیر پٹختا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔

میں بھی اس کے پیچھے لپکی۔

مجھے اماں کی آواز سنائی دی ''اس چڑیل نے نہ جانے اکبر کو اُلو کا گوشت کھلایا ہے یا کوئی جادو کیا ہے لیکن میں بھی

اپنی ضد کی پکی ہوں۔ دیکھتی ہوں، وہ کب تک یہ بات نہیں مانتا۔''

اماں کی اس بات سے تو مجھے بھی فکر پیدا ہوگئی۔ وہ اپنی ضد کی پکی تھی۔ اکبر کو اپنی جان کی قسم دے کر مرنے کی دھمکی دے کر مجبور کر سکتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

اچانک مجھے شیداں کا خیال آیا۔ شیداں میری پڑوسن تھی اور وہ یوں بھی مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ بابا کی زندگی کے آخری دنوں میں اس نے بابا کی بھی بہت خدمت کی تھی۔

دوسرے دن میں نے اکبر سے کہا ''اکبر! میرا دل گھبرا رہا ہے۔ تو مجھے کل نواب پور چھوڑ دے۔ وہاں اپنی پرانی سکھی سہیلیوں سے ملوں گی تو دل ذرا بہل جائے گا۔''

اکبر نے مجھے اسی دن نواب پور چھوڑ دیا۔ شیداں اکثر ایک پیر صاحب کے پاس جایا کرتی تھی اور ان سے تعویذ وغیرہ لاتی رہتی تھی۔ وہ ان پیر صاحب کی بہت تعریف کرتی تھی، کہتی تھی ''وہ بہت بڑے اللہ لوک ہیں۔ کسی بھی سائل سے ایک بھی پیسا نہیں لیتے۔ بے غرض ہو کر سب کی خدمت کرتے ہیں۔''

میں نے شیداں کو اپنی پریشانی بتائی تو وہ ہنس کر بولی ''یہ تو کوئی فکر کی بات ہی نہیں ہے۔ تُو اگر مجھے پہلے بتا دیتی تو اب تک تو تیری گود میں دو بچے کھیل رہے ہوتے۔ بے اولاد دوں کو اولاد دلانے میں تو پیر صاحب مشہور ہیں۔ تو کل ہی میرے ساتھ ان کے پاس چلنا۔ وہ میرا بہت خیال کرتے ہیں ورنہ لوگوں کو وہاں گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔''

دوسرے دن میں شیداں کے ساتھ پیر صاحب کے آستانے پر پہنچ گئی۔ ان کے آستانے کے گرد بڑا سا ایک احاطہ تھا جس میں آم اور جامن کے درخت لگے ہوئے تھے۔ زمین پر نرم نرم گھاس تھی اور اس پر بہت سے مرد اور عورتیں بیٹھے ہوئے تھے۔

پیر صاحب کا مریدِ خاص شاید شیداں کو پہچانتا تھا۔ اس نے فوراً ہمیں پیر صاحب کے پاس پہنچا دیا۔

ان کا نورانی چہرہ اور لمبی سفید داڑھی دیکھ کر میں بھی ان سے مرعوب ہوگئی۔ پیر صاحب کی رنگت سرخ و سفید تھی اور آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا ''تیری قسمت میں اولاد ہے لیکن تجھے اس کے لیے بہت محنت کرنا پڑے گی۔''

میں ان کی اس بات سے مزید متاثر ہوگئی۔ آخر انہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں اولاد کے لیے ان کے پاس گئی تھی۔ شیداں نے فخریہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

میں نے آہستہ سے کہا ''پیر صاحب! میں ہر طرح کی محنت کرنے کو تیار ہوں، بس مجھے کسی بھی قیمت پر اولاد دلا دیں۔''

''دلائیں گے، ضرور دلائیں گے۔'' پیر صاحب نے آنکھیں بند کر کے کہا اور کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے۔

انہوں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو ان کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے کہا ''لڑکی! تیرے سر پر تو بہت سی مصیبتیں ناچ رہی ہیں۔ تیری ساس نے بھی تجھ پر کچھ عمل کرایا ہے۔ پہلے تو مجھے اس کا توڑ کرنا پڑے گا۔'' پھر وہ شیداں سے بولے ''تو اس کے لیے کہیں سے کالے بکرے کا بندوبست کر۔''

''پیر صاحب!'' شیداں نے کہا ''میں اور یہ بھلا کالا بکرا کہاں ڈھونڈتی پھریں گی۔ آپ کوئی اور حل بتائیں۔''

''کالا بکرا بہت ضروری ہے۔ تم دل جان کو اس بکرے کے پیسے دے دینا۔ وہ خود کالے بکرے کا بندوبست کر لے گا۔''

''ٹھیک ہے پیر صاحب!'' شیداں خوش ہو کر بولی۔

''بس اب تم جاؤ، باقی کام تمہیں دل جان بتا دے گا۔''

میں اور شیداں وہاں سے خوشی خوشی باہر نکلے۔ دل جان نے بتایا کہ کالے بکرے کے لیے پندرہ روپے کی ضرورت پڑے گی۔''

پندرہ روپے کی رقم اس دور میں بہت اہمیت رکھتی تھی۔

اکبر اکثر مجھے پیسے بھی دیتا رہتا تھا۔ میرے پاس اس وقت بھی بیس پچیس روپے تھے۔ میں نے فوراً پندرہ روپے نکال کر دل جان کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

''کالے بکرے کے خون پر پیر صاحب کوئی عمل کریں گے۔'' دل جان نے بتایا ''اب تم لوگ کل اسی وقت آنا۔''

واپسی میں شیداں نے کہا ''پیر سائیں بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ ان کے در سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔'' پھر اس نے ایسی دسیوں مثالیں دے ڈالیں جنہیں پیر صاحب نے اولاد کی نعمت سے مالا مال کیا تھا۔

شام کو اکبر مجھے لینے آیا تو شیداں نے کہا ''اکبر بھائی! نوراں کو کچھ دن یہیں چھوڑ دو۔ یہاں آ کر اس کا دل کچھ بہل گیا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے بھی اس سے کہا کہ مجھے کچھ دن کے لیے یہیں چھوڑ دو تو اکبر راضی ہو گیا۔ وہ میری بات تو کبھی ٹالتا ہی نہیں تھا۔

اس نے کہا ''نوراں! جب تک تیرا دل چاہے یہاں رہ۔ جب تجھے آنا ہو تو مولوی صاحب کو بتا دینا۔ وہ مجھے پیغام بھجوا دیں گے تو میں تجھے آ کر لے جاؤں گا۔''

اکبر کے جانے کے بعد شیداں پھر پیر صاحب کی عظمت کے گن گانے لگی۔

میں نے احتیاطاً اکبر سے مزید پیسے لے لیے تھے۔

دوسرے دن ہم پیر صاحب کے آستانے پر پہنچے تو پھر وہاں وہی عالم تھا۔ دل جان شیداں کو دیکھ کر سیدھا ہماری طرف آیا اور بولا ''آج تم لوگوں کو کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔ پیر صاحب ایک وظیفے میں مصروف ہیں۔ وہ وظیفہ بہت جلالی ہے اس لیے وہ ابھی کسی سے نہیں مل سکتے۔''

اس دن دو گھنٹے بعد میرا نمبر آیا۔

پیر صاحب نے مجھے دیکھتے ہی کہا ''میں تیرے ہی لیے وظیفہ کر رہا تھا۔ میں نے تیری بہت سی بلائیں دور کر دی ہیں لیکن تجھے ایک اور کالے بکرے کی قربانی دینا ہو گی۔''

میں نے جھٹ پیسے نکالے اور پیر صاحب کی طرف بڑھا دیے۔

پیر صاحب ایک دم جلال میں آ گئے ''مجھے پیسے دیتی ہے، تو شاید جانتی نہیں کہ میں کسی سے ایک پیسا لینا بھی حرام سمجھتا ہوں۔ اپنے پیسے اپنے پاس رکھ۔ میں تیرا کام نہیں کر سکتا۔''

''اِسے معاف کر دیں پیر صاحب!'' شیداں نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا ''یہ ابھی بچی ہے، اس سے بھول ہو گئی۔''

''نہیں۔'' پیر صاحب گرج کر بولے ''اس نے ہمیں حرام کام پر آمادہ کرنا چاہا تھا۔''

میں بلک بلک کر رونے لگی اور بولی ''پیر صاحب! مجھے معاف کر دیں، آیندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی۔''

پیر صاحب میرے رونے سے کچھ نرم پڑے اور بولے ''میں تیری پہلی غلطی سمجھ کر معاف کر رہا ہوں۔ تو جانتی ہے، مجھے تیرے لیے کتنی محنت کرنا پڑ رہی ہے۔ میں نے کل ساری رات قبرستان میں وظیفہ پڑھا ہے اور آج بھی صبح سے وظیفے میں مصروف تھا۔ تو مجھے پیسے کا لالچ دے رہی تھی۔''

''وہ پیسے تو میں صدقے کے بکرے کے لیے دے رہی تھی پیر صاحب!'' میں نے کہا ''مجھے اللہ کے واسطے معاف کر دیں۔''

''جا، میں نے تجھے معاف کیا۔'' پیر صاحب نے کہا ''دل جان کے پاس جا، وہ تجھے سمجھا دے گا کہ کیا کرنا ہے۔''

دل جان نے پہلے کی طرح پندرہ روپے لیے اور بولا ''کل تم لوگ اسی وقت آ جانا۔ پیر صاحب راتوں کو جاگ جاگ کر خلقِ خدا کی خدمت کے لیے وظیفے کرتے ہیں، چلے کاٹتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی اللہ کی مخلوق کے لیے وقف کر دی ہے۔ وہ چوبیس گھنٹے میں صرف ایک دفعہ کھاتے ہیں، جو کی ایک روٹی اور ستو۔ تم انہیں پیسے دے رہی تھیں؟ شکر کرو کہ پیر صاحب نے تمہیں معاف کر دیا، ورنہ وہ اگر ایک دفعہ کسی سے ناراض ہو جائیں تو پھر کبھی اس کا کام نہیں کرتے۔''

ہم لوگ پیر صاحب کی بے نیازی اور خدمتِ خلق سے متاثر ہو کر لوٹ آئے۔

تیسرے دن ہم لوگ وہاں پہنچے تو پھر دل جان نے کہا ''پیر صاحب! وظیفے میں مصروف ہیں۔ وہ وظیفہ ہمارے ہی لیے ہے۔ تمہیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔''

ہم لوگ ایک درخت کی چھاؤں میں جا کر بیٹھ گئے۔

ہم سے کچھ فاصلے پر تین عورتیں بیٹھی تھیں۔ وہ شاید ابھی ابھی آئی تھیں۔

دل جان ان کے پاس آیا اور بولا ''آج پیر صاحب بہت مصروف ہیں۔ وہ ایک جلالی وظیفہ کر رہے ہیں اس لیے وہ آج تم سے نہیں مل سکیں گے۔''

''لیکن ہم تو بہت دُور سے آئے ہیں۔'' ایک عورت نے کہا۔

''تم کیا چاہتی ہو، پیر صاحب ناراض ہو کر تم لوگوں کو دھتکار دیں۔ جاؤ، کل آنا۔'' پھر وہ بولا ''ہاں، وہ پیر صاحب نے تم سے صدقے کے لیے کچھ کہا تھا؟''

''ہاں، انہوں نے ایک کالے بکرے کا صدقہ کرنے کو کہا تھا اور کسی غریب اور نادار کو ایک جوڑا دینے کی بات کی تھی۔ کالے بکرے کا بندوبست تو آپ ہی کر دیں بھائی، بلکہ میں جوڑے کے پیسے بھی دے دیتی ہوں۔ میں کہاں کسی نادار اور مستحق کو ڈھونڈتی پھروں گی۔ یہاں تو بہت سے نادار اور مستحق لوگ آتے ہوں گے۔ آپ خود ہی ان میں سے کسی کو جوڑا دے دیجیے گا۔''

دل جان نے ان عورتوں سے بیس روپے وصول کیے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں حیران تھی کہ دل جان اتنے کالے بکرے کہاں سے لاتا ہوگا؟

میں نے یہی بات شیداں سے کہی تو اس نے خوف زدہ ہوکر مجھے خاموش رہنے کو کہا اور بولی ''ایسی شبے کی بات بھی نہ کرنا۔ دل جان بے چارہ نہ جانے کہاں کہاں سے کالے بکروں کا بندوبست کرتا ہے۔ پورے علاقے میں دل جان کے آدمی کالے بکروں کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو چار چار دن کالا بکرا نہیں ملتا۔''

دو ڈھائی گھنٹے کے انتظار کے بعد ہمارا نمبر آ گیا۔

اس دن پیر صاحب کے اردگرد اگربتیاں سلگ رہی تھیں۔ ایک مٹی کے پیالے میں کچھ انگارے تھے۔ انہوں نے اس میں لوبان ڈالا اور مجھ سے بولے ''اِدھر میرے پاس آ!''

میں اُٹھ کر ان کے پاس چلی گئی۔ انہوں نے میرے سر اور چہرے پر لوبان کی دھونی دی۔ میری پیشانی پکڑ کر کچھ دیر تک کوئی وظیفہ پڑھتے رہے۔ پھر انہوں نے آنکھیں کھولیں تو ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

وہ بہت خفیف انداز میں مسکرائے اور بولے ''لڑکی! میں نے تیرے سر کی تمام بلائیں ٹال دی ہیں اور ایسا حصار باندھ دیا ہے کہ اب تیری ساس یا کوئی بھی دشمن تجھ پر کوئی عمل نہیں کر سکتا۔ کوئی ایسی کوشش بھی کرے گا تو وہ عمل اس پر الٹ جائے گا۔''

''پیر صاحب! اب تو نوراں کی گود ہری ہو جائے گی؟''

''میں نے تو اپنا کام کر دیا۔ اب اگر اسے اولاد کی ضرورت ہے تو اسے خود محنت کرنا ہوگی، بول کر سکے گی محنت؟''

''میں محنت سے نہیں گھبراتی پیر صاحب!'' میں نے کہا ''آپ بتائیے، مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''تجھے سات راتوں کو قبرستان میں جا کر کسی پُرانی اور ٹوٹی ہوئی قبر پر بیٹھ کر غسل کرنا پڑے گا۔'' پیر صاحب نے کہا۔

میں کانپ کر رہ گئی۔ قبرستان جانے، وہ بھی رات کے وقت، پھر کسی پُرانی قبر پر بیٹھ کر نہانا! کوئی بھی لڑکی ہوتی تو اسی وقت ہمت ہار دیتی لیکن میرے دل میں اکبر کی محبت اتنی شدید تھی کہ میں نے عمل کرنے کی ہامی بھر لی۔

''ایک بات کا خیال رہے، تجھے آدھی رات گزرنے کے بعد قبرستان میں جانا ہوگا اور بالکل تنہا جانا ہوگا۔''

''بالکل تنہا!'' میں نے سہم کر پوچھا۔

''ہاں، اگر تو اولاد چاہتی ہے تو تجھے یہ کرنا ہوگا۔ ہاں، قبرستان کے باہر تک تُو کسی کے ساتھ بھی جا سکتی ہے۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولے ''اس عمل کا ایک مخصوص وقت مقرر کر لے۔ سات دن میں ایک دفعہ میں ناغہ نہیں ہونا چاہیے۔ نہاتے ہوئے تو کوئی دنیاوی خیال دل میں مت لانا، بس اللہ کو یاد کرنا، میں بھی یہاں بیٹھ کر چلّا کاٹوں گا اور تیری حفاظت کے لیے اپنے مؤکل کو بھیج دوں گا۔ ایک بات اور سمجھ لے۔'' پیر صاحب نے کہا ''اگر تو خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگی تو عمل باطل ہو جائے گا۔ غسل کرنے کے بعد تجھے قبرستان کے دوسرے راستے سے باہر آنا ہوگا۔ اب جا اور میرے کہنے پر عمل کر۔''

میں وہاں سے نکلی تو بہت فکرمند تھی۔ شیداں بھی پریشان نظر آ رہی تھی۔

اس نے مجھ سے پوچھا ''نوراں! کیا تو یہ عمل کر سکے گی؟''

''ہاں، میں اکبر کے لیے، اپنی اولاد کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔''

''آدھی رات گزرنے کے بعد قبرستان میں کیسے جائے گی؟'' شیداں فکرمند تھی۔

''اب جو بھی ہو۔'' میں نے کہا ''پیر صاحب نے کہا تو ہے کہ انہوں نے میرے گرد حفاظت کا حصار کھینچ دیا ہے اور ان کے مؤکل بھی میری حفاظت کریں گے۔''

''اچھی طرح سوچ لے نوراں!'' شیداں نے کہا ''اگر عمل ادھورا رہ گیا یا تو وہاں سے ڈر کر بھاگ آئی تو پھر کبھی بھی تیرے من کی مراد پوری نہ ہو سکے گی۔''

''اگر ایسا ہوا تو میں اسے اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لوں گی۔'' میں نے کہا۔

پیر صاحب نے جمعرات کی رات سے عمل شروع کرنے کو کہا تھا اور وہ عمل پورے سات دن تک یعنی بدھ کے روز تک جاری رہتا۔

اس دن منگل تھا اس لیے میں اطمینان سے سو گئی۔

میں اپنے بابا کے گھر میں رہ رہی تھی۔ شیداں بھی وہیں میرے ساتھ رہتی تھی۔ اس کا شوہر بہت نیک آدمی تھا۔ اس کا صرف ایک بیٹا تھا جو باپ کے ساتھ زمینوں پر اس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔

دوسرا دن بھی گزر گیا۔ بدھ کی رات کو شیداں مجھ سے

زیادہ پریشان تھی۔

اس نے کہا ''دیکھ نوراں! اب بھی وقت ہے۔ ہم پیر صاحب کے پاس چلتے ہیں۔ ممکن ہے، وہ تجھے کوئی اور آسان عمل بتا دیں۔''

''شیداں!'' میں نے کہا ''تُو نے شاید پیر صاحب کی بات غور سے نہیں سنی۔ انہوں نے کہا تھا کہ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے مجھے اولاد مل سکتی ہے۔ اب میں اگر دوبارہ ان کے پاس گئی تو کہیں وہ غصے میں آ کر مجھ سے ناراض نہ ہو جائیں۔ نہیں شیداں! میں پیر صاحب کو ناراض نہیں کرنا چاہتی۔ ہاں اگر تجھے قبرستان تک میرے ساتھ چلنے میں کوئی اعتراض ہے تو مجھے بتا دے۔ میں وہاں تک اکیلی بھی جا سکتی ہوں۔''

''مجھے بھلا کیا اعتراض ہوگا۔'' شیداں نے کہا ''مجھے قبرستان کے اندر تو جانا نہیں ہے۔ صرف باہر تک تجھے چھوڑنا ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولی ''ہاں نوراں! تجھے غسل کرنے کے لیے پانی کی ضرورت بھی تو ہوگی؟''

''پانی کی ایک بالٹی بھر کے ہم گھر سے لے جائیں گے۔'' میں نے کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تُو نے یہ عمل کرنے کا پکا فیصلہ کر لیا ہے۔'' شیداں نے کہا۔

''ہاں شیداں! اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ مجھ پہ سوکن آئے۔ اماں ضد کی بہت پکی ہے، وہ اکبر کو رو رو دھو کر، اپنی محبت کا واسطہ دے کر راضی کر لے گی تو میں تو یوں ہی جیتے جی مر جاؤں گی۔''

ہم دونوں اس رات دیر تک جاگتے رہے۔

دوسرے دن شام کے وقت میں نے نہا دھو کر، صاف ستھرے کپڑے پہنے، عشا کی نماز پڑھی پھر شیداں کے ساتھ کھانا کھایا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میرا دل خود بھی اس خوف سے لرز رہا تھا کہ میں قبرستان میں آدھی رات کے بعد اکیلی کیسے جاؤں گی؟ پھر کسی پُرانی قبر پر بیٹھ کر غسل کرنا اس سے بھی بڑا مرحلہ تھا۔ اگر کوئی مجھے اس حالت میں وہاں دیکھ لیتا تو؟ پھر میں نے اپنے دل کو تسلی دی کہ آدھی رات کے بعد قبرستان میں بھلا کون آئے گا؟ وہاں بابا کی قبر بھی تو ہے۔ یہ سوچ کر مجھے بہت تقویت ملی کہ بابا نہ سہی، ان کی قبر تو میرے نزدیک ہوگی۔ میں کوئی ایسی پُرانی قبر دیکھوں گی جو بابا کی قبر کے نزدیک ہو۔

جانے سے پہلے شیداں نے مجھے ایک مرتبہ پھر سمجھایا۔ اصل میں خود اس کا مارے خوف کے دم نکل رہا تھا۔ شاید اسے یہ خوف تھا کہ جب تک میں قبرستان میں رہوں گی، اسے بھی باہر تنہا رہ کر میرا انتظار کرنا پڑے گا۔ اگر وہ خود مجھے پیر صاحب کے پاس لے کر نہ گئی ہوتی تو کبھی میرے ساتھ جانے پر راضی نہ ہوتی۔

آدھی رات گزرنے کی بعد ہم دونوں گھر سے نکلے۔ پانی کی بھری ہوئی بالٹی اور ایک ڈونگا ہمارے ساتھ تھا۔ بالٹی کو میں نے اور شیداں نے تھام رکھا تھا۔

میں رات کے اس پہر پہلی دفعہ باہر نکلی تھی۔ رات کے ہولناک سناٹے میں صرف ہمارے قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ درخت بھی مجھے ایسے لگ رہے تھے جیسے لمبے لمبے بھوت کھڑے ہوں۔ شیداں کی تو مارے خوف کے جان نکلی جا رہی تھی۔ وہ آیت الکرسی کا ورد کرتی جا رہی تھی۔

قبرستان وہاں سے کافی دور تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں ہم دونوں تھکن سے چور ہو گئے۔ ایک تو راستہ کچھ زیادہ تھا دوسرے پانی کی بھری ہوئی بالٹی اُٹھا کر چلنے میں مزید دشواری ہو رہی تھی۔

ہم دونوں کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے قبرستان تک پہنچ ہی گئے۔

قبرستان میں داخلے کے دو راستے تھے۔ دوسرا راستہ قبرستان کے دوسرے سرے پر تھا۔ مجھے یاد آیا کہ پیر صاحب نے کہا تھا، غسل کے بعد مجھے دوسرے راستے سے باہر نکلنا ہے۔

میں نے شیداں سے کہا ''شیداں! تو یہاں ٹھہرنے کے بجائے قبرستان کے دوسرے راستے پر جا کر میرا انتظار کر۔''

شیداں کی تو گویا جان نکل گئی۔

قبرستان کے دوسرے سرے پر تنہا جانا اس کے لیے بہت مشکل تھا لیکن وہ بے چاری میری محبت اور مروت میں اس پر بھی آمادہ ہو گئی۔

اچانک قبرستان سے ایک ہولناک آواز بلند ہوئی۔ شیداں گھبرا کر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ خود میرا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔

آواز دوبارہ آئی تو میں نے اس سے کہا ''یہ تو اُلو کی آواز ہے۔ قبرستان میں کسی اُلو کا بسیرا ہے۔ اب میں چلتی ہوں۔''

میں نے پانی کی بالٹی اُٹھائی اور دھڑکتے دل اور لرزتے قدموں سے قبرستان میں داخل ہو گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قبرستان میں تو لوگ رات میں جاتے ہوئے بھی خوف زدہ ہوتے ہیں، میں تو ایک تنہا لڑکی تھی۔ مجھے نہ صرف اندر جانا تھا بلکہ کسی پرانی قبر پر بیٹھ کر غسل بھی کرنا تھا۔

ہر لمحہ مجھے یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی کوئی پیچھے سے مجھے پکڑ لے گا۔ میں نے قبرستان کے بارے میں بہت سی خوف ناک کہانیاں سن رکھی تھیں جو ایک ایک کر کے میرے ذہن میں آ رہی تھیں۔

میں نے سنا تھا کہ گناہ گار لوگوں کی روحیں بھوت بن کر قبرستان میں بھٹکتی رہتی ہیں۔

میں آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔

پھر مجھے ایک پرانی قبر نظر آئی۔ بابا کی قبر وہاں سے کافی دور تھی لیکن مجھے یہ تو اطمینان تھا کہ بابا یہیں کہیں میرے آس پاس موجود ہیں۔

میں نے قبر پر قدم رکھا تو اسی اُلو کی چیخ مجھے بہت قریب سے سنائی دی۔ میں بُری طرح اُچھل پڑی لیکن پھر ہمت کر کے قبر پر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنے کپڑے اُتارے اور پیر صاحب کی ہدایت کے مطابق صرف اللہ کو یاد کرتے ہوئے غسل کرنے لگی۔

اس دن زیادہ سردی تو نہیں تھی لیکن فضا میں خنکی تھی۔ نہانے سے میرے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ اب یہ کپکپی خوف کی وجہ سے تھی یا سردی کی وجہ سے۔ بس میرا پورا جسم سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

میں نے پیر صاحب کی ہدایت کے مطابق بہت اطمینان سے غسل کیا پھر کپڑے پہنے اور بالٹی اُٹھا کر قبرستان کے دوسرے سرے کی طرف چل دی۔

خوف مجھے اب بھی محسوس ہو رہا تھا لیکن وہ کیفیت نہیں تھی۔

میں دل کڑا کر کے قبروں کے درمیان سے راستہ بناتی ہوئی آگے بڑھتی رہی اور آخرکار قبرستان کے دوسرے سرے پر پہنچ گئی۔ وہاں سے باہر نکل کر میں نے اردگرد نظر دوڑائی لیکن مجھے شیداں کہیں نظر نہ آئی۔

میں نے آہستہ سے آواز دی ''شیداں!'' لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ دوسری دفعہ میں نے ذرا بلند آواز میں پکارا ''شیداں!'' اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہ ملا۔ شاید شیداں خوف زدہ ہو کر یا تو واپس چلی گئی تھی یا پھر قبرستان کے اسی راستے پر موجود تھی جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا۔

میں ڈری سہمی وہاں تک پہنچی، شیداں وہاں بھی نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ گئی تھی لیکن اس میں تو اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ اکیلی واپس بھی جا سکتی۔

میں واپسی میں سارے راستے اسے تلاش کرتی اور آوازیں دیتی رہی لیکن وہ مجھے کہیں نہ ملی۔

میں گھر پہنچی تو شیداں لحاف میں لپٹی ہوئی بُری طرح کانپ رہی تھی۔

میں نے اسے آواز دی ''شیداں!''

وہ چیخ مار کے اُٹھ بیٹھی۔

''کیا ہوا شیداں!'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں..... میں..... مجھی کہ..... وہی..... مم..... میرے..... پیچھے پیچھے تک..... گھر آ گیا۔'' شیداں نے کانپتے ہوئے کہا۔

''کون تمہارے پیچھے آ گیا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے لرزتے ہوئے بتایا ''تیرے جانے کے بعد میں کچھ دیر تو اس خیال سے وہاں کھڑی رہی کہ ابھی تو خوف زدہ ہو کر بھاگتی ہوئی آ جائے گی لیکن تیرا تو بہت دل گردہ ہے نوراں! میں جب دوسرے راستے کی طرف چلی تو مجھے ایسا لگا جیسے قبرستان میں سے کوئی نکل کر میرے پیچھے پیچھے چل رہا ہو۔

میں پلٹ کر بھاگی تو وہ بھی میرے پیچھے بھاگا۔ میں نے ایسی دوڑ لگائی کہ گھر آ کر ہی دم لیا۔ اس نے بھی گھر تک میرا پیچھا کیا۔

''کون تھا وہ؟'' میں نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

''وہ کوئی انسان تو ہو نہیں سکتا۔ اس کا قد تیری اس چھت سے بھی اونچا تھا۔ سر اتنا بڑا کہ تربوز لگ رہا تھا۔ اس کے لمبے لمبے ہاتھوں میں نوکیلے ناخن تھے اور وہ چیختا ہوا میرے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ تو نے مجھے آ کر آواز دی تو میں سمجھی کہ وہی بھوت اندر آ گیا۔

شیداں کی بات سن کر میں بھی خوف زدہ ہو گئی لیکن پھر میں نے سوچا کہ یہ شیداں کا وہم ہوگا۔ اگر کوئی بھوت ہوتا تو وہ پہلے مجھے پکڑتا، میں تو قبرستان کے اندر ہی تھی، اسے باہر نکل کر شیداں کے پیچھے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟

میں نے شیداں کو چائے بنا کر پلائی اور خود بھی پی کیونکہ مجھے بھی سردی لگ رہی تھی۔

پھر میں بھی لحاف میں دبک کر سو گئی۔ سوتے میں بھی مجھے قبریں اور مردے نظر آتے رہے اور میں بار بار چونک کر

اٹھتی رہی۔

دوسرے دن شیداں کو تیز بخار چڑھ گیا۔ اس حالت میں وہ میرے ساتھ جا بھی نہیں سکتی تھی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ میں تنہا کیسے جاؤں گی؟ پھر مجھے اکبر کا خیال آیا، اپنی سوکن کا خیال آیا تو میں نے جانے کا ارادہ کر لیا۔

میں قبرستان کے اندر ایک ہینڈ پمپ دیکھ چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ گھر سے پانی بھر کے لے جانے کی مشقت کیوں کروں؟ میں وہیں ہینڈ پمپ سے بالٹی بھر لوں گی۔

اس رات میں بالٹی لے کر تن تنہا نکل کھڑی ہوئی۔ کل کے مقابلے میں اس دن مجھے خوف کم محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود کتوں اور جنگلی جانوروں کا ڈر تو تھا۔ ویسے اس علاقے میں صرف گیدڑ تھے یا کتے تھے۔

میں ڈری سہمی سی قبرستان کے دروازے تک پہنچ گئی۔

اندر داخل ہوتے ہوئے مجھے ایک مرتبہ پھر خوف نے گھیرا لیکن میں دل کڑا کر کے اندر داخل ہو ہی گئی۔ وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر ہینڈ پمپ تھا۔

میں نے اس کے نیچے بالٹی رکھی اور ہینڈ پمپ چلانا شروع کر دیا۔ قبرستان کے سناٹے میں ہینڈ پمپ کی ٹھک ٹھک کی تیز آواز گونجی تو کوئی چیز پھڑ پھڑائی ہوئی، میرے سر پر سے گزر گئی۔ میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں دوبارہ ہینڈ پمپ چلانے میں مصروف ہو گئی۔

میں آج بھی سوچتی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میں نے اس رات اتنی ہمت کیسے کر لی؟

بالٹی بھرنے کے بعد میں پھر اسی قبر پر پہنچی کیونکہ پیر صاحب نے ہدایت کی تھی کہ غسل مقررہ وقت اور مقررہ جگہ پر ہی کرنا ہوگا۔

میں قبر پر بیٹھی تو مجھے ایسا لگا جیسے قبر کا ایک حصہ ٹوٹ گیا ہو۔ ہو سکتا ہے یہ کل بھی ٹوٹا ہوا ہو، میں نے اپنے دل کو تسلی دی۔ کل تو خوف کے مارے میں اردگرد کا جائزہ بھی نہ لے سکی تھی لیکن آج، کل کے مقابلے میں خوف بہت کم تھا۔

میں نے اپنے کپڑے اُتارے اور غسل شروع کر دیا۔

ابھی میں نے تیسرا یا چوتھا ڈونگا ہی اپنے جسم پر ڈالا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے زمین میرے قدموں کے نیچے سے سرک گئی ہو۔ میں دھڑام سے قبر میں جا گری۔ میرے منہ سے دل خراش چیخ برآمد ہوئی۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے قبر کا مردہ حرکت کر رہا ہو۔

پھر وہ درشت لہجے میں بولا ''ہواز دیئر؟'' (وہاں کون ہے؟)

خوف کے مارے میری گھگھی بندھ گئی کہ یہ مردہ کس زبان میں بات کر رہا ہے۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے کیا کہا تھا؟

وہ پھر بولا ''تم کون ہے؟'' پھر اچانک ٹارچ کی روشنی مجھ پر پڑی۔

وہ کوئی مردہ نہیں تھا بلکہ انگریز فوجی تھا جو اپنی یونٹ سے فرار ہو کر وہاں آ چھپا تھا۔ یہ بات بھی مجھے اس فوجی نے بعد میں بتائی۔

وہ نہ جانے کب کا تر سا ہوا تھا۔ میں تو پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں جا گری تھی۔ پھر میں چیختی رہی، کسمساتی رہی، لیکن ہونی کو نہ روک سکی۔

اس نے بعد میں مجھے قبر سے نکالا، میں نے اپنے کپڑے پہنے اور ہارے ہوئے جواری کی طرح واپس چل دی۔ اب مجھے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ نہ کسی بھوت کا، نہ چڑیل کا، نہ مردے کا۔

میں گھر واپس پہنچی تو شیداں میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

وہ مجھے دیکھ کر بولی ''نوراں! تو بہت دل گردے والی لڑکی ہے۔ تو ضرور کامیاب ہوگی۔''

''میں کل سے وہاں نہیں جاؤں گی۔'' میں نے کہا۔

''کیوں، کیا تیرے پیچھے بھی وہی بھوت لگ گیا تھا؟''

شیداں خوف زدہ ہو کر بولی۔

''ہاں شیداں! وہ بھوت آج میرے پیچھے لگ گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا اور اُجڑی اُجڑی سی اپنی چارپائی پر گر گئی۔

اماں کہتی تھی کہ کام مت کر میلی ہو جائے گی۔

آج میں واقعی میلی ہو گئی تھی۔ میں نے اکبر کی امانت میں خیانت کی تھی۔ پھر میں نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ میں نے جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا۔ بھول چوک کو تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے۔

میں نے دوسرے ہی دن اکبر کو پیغام بھجوا دیا کہ مجھے آ کر لے جاؤ۔

شیداں نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی، اس نے کہا ''ہم ایک مرتبہ پھر پیر صاحب کے پاس جائیں گے اور ان سے کوئی اور عمل پوچھیں گے۔'' لیکن میں نے انکار کر دیا۔

میں نے سوچ لیا کہ اولاد میری قسمت میں ہے ہی نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ورنہ میرا عمل یوں ضائع نہ ہوتا۔

اکبر شام ہی کو آ گیا۔ اس نے سائیکل خرید لی تھی۔ اس نے مجھے سائیکل پر بٹھایا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ بہت خوش تھا اور کہہ رہا تھا ''نوراں! تیرے بغیر تو گھر مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔''

اکبر بھی مجھ سے یوں ملا جیسے ہماری شادی اسی دن ہوئی ہو۔

میں اس کے بعد کھوئی کھوئی رہنے لگی۔ میرا عمل تو ادھورا رہ ہی گیا تھا، میری عزت بھی جاتی رہی۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے مجھے زور کا چکر آیا، یوں محسوس ہوا جیسے اُبکائی سے میری آنتیں باہر آ جائیں گی۔

میں ہینڈ پمپ کے پاس بیٹھ کر اُبکائیاں لینے لگی۔

اماں بھاگی بھاگی آئی اور بولی ''نوراں، تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''اماں، صبح سے مجھے چکر اور اُبکائیاں آ رہی ہیں۔'' میں نے کہا۔

اماں کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔

وہ بھاگی بھاگی گئی اور گاؤں کی دائی حاجراں کو بلا لائی۔

حاجراں خاصی عمر رسیدہ اور تجربے کار دائی تھی۔ اس نے میرا جائزہ لیا اور اماں کو خوش خبری سنا دی کہ مبارک ہو، صغراں! تم دادی بننے والی ہو۔

اماں تو مارے خوشی کے گویا ناچ اُٹھی۔

حاجراں نے کہا ''یاد رکھنا صغراں! تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم مجھے سونے کے کنگن دو گی۔''

''ہاں ہاں، مجھے یاد ہے۔'' اماں نے کہا ''میں تجھے جوڑا بھی دوں گی اور سونے کے کنگن بھی۔''

اماں نے اسی وقت ایک آدمی دوڑا کر اکبر کو کھیتوں سے بلوا لیا۔ اکبر بھی یہ خوش خبری سن کر دیوانہ ہو گیا۔

اس نے اسی وقت ایک آدمی بھیج کر میروں کے حساب سے گڑ منگوایا اور پورے محلے میں تقسیم کرایا۔

اس دن کے بعد سے اماں نے تو گویا مجھے ہتھیلی کا چھالا بنا لیا۔ وہ مجھے ہل کر پانی بھی نہ پینے دیتیں۔

آخر وہ وقت بھی آیا جب اس گھر میں بچے کے رونے کی آواز آئی۔ میری حالت خراب تھی۔ مجھے صرف حاجراں کی آواز سنائی دی ''مبارک ہو صغراں! پوتا ہوا ہے۔''

اماں نے اس خوشی میں پورے گاؤں کو کھانا کھلایا۔ اکبر بھی بہت خوش تھا۔ بچے کو جو بھی دیکھتا تھا، وہ یہی کہتا تھا کہ یہ تو بالکل کسی انگریز کا بچہ لگتا ہے۔

اس کی سرخ و سفید رنگت، سنہرے بال اور نیلی آنکھیں تھیں۔ یقیناً اس کے باپ کے بال بھی سنہرے اور آنکھیں نیلی ہوں گی۔ میں نے قبر کے اندھیرے میں اس کی شکل تو نہیں دیکھی تھی لیکن اپنے بیٹے کو دیکھ کر میں تصور کر سکتی تھی کہ اس کا باپ کیسا ہو گا؟

اس کے فوراً بعد پاکستان بن گیا اور ہم لوگ پاکستان چلے آئے۔

یہاں اکبر نے کپڑے کی تجارت شروع کی۔ اللہ نے اس کے کاروبار میں ایسی برکت دی کہ چار پانچ سال بعد ہی اس نے نہ صرف گاڑی خرید لی بلکہ ماڈل ٹاؤن میں ایک بنگلا بھی بنا لیا۔

پاکستان آنے کے دس سال بعد اماں کا انتقال ہوا۔ انہوں نے نہ صرف پوتے کو گود میں کھلایا بلکہ بیٹے کی دن دونی اور رات چوگنی ترقی بھی دیکھی۔

اکبر نے بیٹے کا نام انور رکھا تھا۔ اس نے انور کو بہترین اسکول میں داخل کرایا، پھر اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت بھیج دیا۔ وہ وہاں ایسا گیا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

مجھے اس کے جانے کا ذرہ برابر صدمہ نہیں ہے، ہاں اکبر اسے یاد کر کے آب دیدہ ہو جاتے ہیں۔

انہیں آج تک اس حقیقت کا علم نہیں ہے کہ انور ان کا بیٹا نہیں تھا۔

سنا ہے اس نے وہاں کسی میم سے شادی کر لی ہے اور اب اس کے بھی جوان بچے ہیں۔

ابھی ابھی اکبر نے مجھے اطلاع دی ہے کہ انور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پاکستان آ رہا ہے۔

اکبر کی یہ بات سن کر یہ واقعہ پھر سے تازہ ہو گیا اور تازہ کیا ہو گیا، یہ تو میرے ذہن پر نقش ہے۔ اس پیر فرتوت نے مجھ سے بکروں کے بہانے نہ صرف روپے اینٹھے بلکہ مجھے اتنا مشکل عمل بتایا جسے شاید کوئی بھی عورت نہ کر سکے۔ وہ بہت آسانی سے کہہ دیتا کہ تم نے تو درمیان ہی میں عمل اُدھورا چھوڑ دیا۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔

شیداں البتہ اس پیر فرتوت کی پہلے سے بھی زیادہ معتقد ہو گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے کہ مجھ سے نادانستگی میں اتنا بڑا گناہ سرزد ہو گیا۔

بیٹا برائے فروخت

عذرا رسول صاحبہ

سلام تہنیت

میں اس واقعے کا عینی شاہد ہی نہیں ایک اہم کردار بھی ہوں۔ اس لیے اسے تحریر کر رہا ہوں تاکہ تمام لوگوں تک میری بات پہنچ جائے۔ اس بگڑتے معاشرے میں جو ہندوانہ رسم ''تلک'' ایک الگ انداز میں پھیل رہی ہے، رک جائے۔

مختار حسین (سرگودھا)

وجاہت صاحب ایک شریف اور کم گو قسم کے انسان تھے۔

اس لیے جب ان کی بیٹی درخشاں کے رشتے کی بات ہونے والی تھی تو انہوں نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ ''بھئی آپ میرے ساتھ چل کر اس لڑکے کو دیکھ لیں اس سے بات کر کے اس کے بارے میں سمجھ لیں۔''

''وجاہت صاحب! یہ کام تو آپ کا ہے جو کچھ دیکھنا ہے، آپ کو دیکھنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ لڑکی کے والد ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں ایک سیدھا سادا انسان ہوں۔'' انہوں نے کہا۔ ''میں شاید اتنی ہوشیاری سے اسے نہ پرکھ سکوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وجاہت صاحب سے میرا تعلق صرف اتنا تھا کہ ہم دونوں ایک ہی دفتر میں کام کیا کرتے تھے اور ہمارے درمیان اچھی خاصی دوستی سی تھی۔ وجاہت صاحب مجھ پر بہت بھروسا بھی کرتے تھے۔

اسی لیے انہوں نے بجائے اپنے کسی رشتے دار کو ساتھ لے جانے کے مجھے ترجیح دی تھی کہ میں ان کے ساتھ چل کر لڑکے کو دیکھ لوں اور یہی ان کی کمزوری تھی یا اسے وجاہت صاحب کی سادگی سمجھ لیں۔

میں نے اُن سے کہا۔ ''وجاہت صاحب! میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ ابھی سے کیوں اپنے آپ کو کمزور ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں؟''

''میں نہیں سمجھا؟''

''سیدھی سی بات ہے لڑکے والوں کو آپ کے پاس آنا چاہیے۔ آپ خود چلے جائیں گے تو آپ کی غرض سمجھی جائے گی۔''

''یہ بات تو ہے۔''

''تو پھر اُن کو بلائیں اور جس دن وہ لڑکا آنے والا ہو مجھے بتا دیجیے گا۔''

وجاہت صاحب نے تیسرے دن دفتر میں مجھے بتایا کہ وہ لڑکا اپنے باپ کے ساتھ شام کے وقت ان کے گھر آرہا ہے۔ ''ہاں یہ بات ہوئی نا۔'' میں نے کہا۔ ''اب میں آپ کے پاس آجاؤں گا۔''

میں شام کے وقت وجاہت صاحب کے گھر پہنچ گیا۔

گھر والوں نے لڑکے والوں کی آمد کے سلسلے میں خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ وقت مقررہ پر دونوں باپ بیٹا آگئے تھے۔ لڑکا پچیس چھبیس کی درمیانی عمر کا ایک خوش شکل نوجوان تھا جبکہ اس کا باپ تھوڑا پست قامت ایسا شخص تھا جس کی آنکھیں تیزی سے چاروں طرف گردش کرتی رہتی تھیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ ایسے لوگ خطرناک ہوا کرتے ہیں۔

اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں پھر لڑکے کے باپ نے بولنا شروع کیا۔ ''دیکھیں جناب! میں نے اپنے لڑکے کی بہت زبردست تربیت کی ہے۔ اس کو انجینئر بنوایا ہے، بہت خرچ ہوا ہے اس پر۔''

اس وقت نہ جانے کیوں میں دخل دے بیٹھا تھا۔ ''جناب! یہ خرچ تو آپ نے اپنی اولاد پر کیا ہے نا اور میرا خیال ہے کہ پوری دنیا کا یہی دستور ہے۔''

''جی ہاں، یہ تو ہے۔'' اس نے کچھ ناگواری سے گردن ہلائی۔ ''لیکن میں نے اس کی پرورش اس طرح کی ہے جس طرح شہزادوں کو رکھتے ہیں، اس کے لیے تو ایک سے ایک رشتے آرہے تھے لیکن ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اس گھر سے بات چلائی جائے۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ!'' وجاہت صاحب انکساری سے بولے۔

''ہمیں چیزوں کی طلب نہیں ہے جناب!'' لڑکے کے باپ نے بتایا۔ ''آپ کیش پچیس لاکھ روپے دے دیجیے گا۔''

''کیا کہا پچیس لاکھ روپے.....؟'' وجاہت صاحب بوکھلا کر بولے۔

''جی جناب! ہم نے اس پر انویسٹمنٹ بھی تو کی ہے۔''

''تو یہ کہیں کہ آپ کا بیٹا فروخت کے لیے ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ نے اس کی قیمت لگا دی ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب؟'' وہ بھڑک اُٹھا تھا۔ ''یہ تو میں نے زمانے کا دستور بتایا ہے جو کچھ خرچ کر چکا ہوں اس کا ریٹرن بھی تو آنا چاہیے۔''

مجھے اس شخص کی ذہنیت پر افسوس ہونے لگا تھا، خدا جانے وہ کس قسم کا آدمی تھا۔ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں۔

اس گفتگو کے دوران اس لڑکے کا رویہ بھی بہت غصہ دلانے والا تھا۔ وہ گردن جھکائے بالکل خاموش بیٹھا رہا تھا اگر اس میں غیرت ہوتی تو وہ یقیناً اپنے باپ کو ٹوک دیتا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے باپ کی اس سودے بازی کا مکمل ساتھ دے رہا ہو۔

وجاہت صاحب بے چارے بالکل خاموش تھے انہوں نے اپنی گردن جھکا رکھی تھی بہرحال مجھے اتنا غصہ آیا کہ میں کھڑا ہو گیا تھا۔ ''اچھا وجاہت صاحب آپ کی مرضی کہ آپ اس قسم کا رشتہ قبول کرتے ہیں یا نہیں لیکن مجھے اجازت دیں۔''

اور میں تاؤ کھاتے ہوئے اس مکان سے باہر آگیا۔

مجھے اس وقت وجاہت صاحب پر بھی غصہ آرہا تھا، انہیں فوراً انکار کر کے ان دونوں کو باہر نکال دینا چاہیے تھا

لیکن ان کی شرافت اور بزدلی کی وجہ سے دونوں وہیں بیٹھے رہے تھے۔

وجاہت صاحب دوسرے دن جب دفتر آئے تو میں ان پر برس پڑا۔ ''حد ہو گئی وجاہت صاحب، آپ نے اُن دونوں کو اپنے گھر میں برداشت کیسے کر لیا۔ اسی وقت کیوں نہیں نکال دیا؟''

''بھائی ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ میں لڑکی کا باپ ہوں، وہ دونوں میرے گھر آئے تھے۔ میرا فرض تھا کہ میں انہیں چائے وغیرہ پلا کر رخصت کرتا، اب اس طرح نکال دینا تو مناسب نہیں تھا نا۔''

''بہرحال آپ نے انکار تو کر دیا ہوگا؟''

''نہیں تو۔'' وجاہت صاحب نے شرمندگی سے اپنی گردن جھکا لی۔ ''یہی تو مجھ سے نہیں ہو سکا۔''

''کیا؟'' میں حیران رہ گیا تھا۔ ''کیا ہو گیا ہے وجاہت صاحب آپ کو یعنی آپ اسے پچیس لاکھ دے رہے ہیں؟''

''وہ کہاں سے دوں گا، تم تو جانتے ہو میری کیا پوزیشن ہے؟''

''تو پھر انکار کیوں نہیں کیا؟''

''اب کیا بتاؤں ایک مجبوری ہے؟''

''کیسی مجبوری؟''

''دراصل وہ صاحبزادی کی خواہش ہے۔''

''اوہ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں سمجھ گیا کہ یہ معاملہ کچھ اور ہو گیا ہے۔ آپ نے اپنی صاحبزادی کو بتایا نہیں کہ اس نے جس گھر کو پسند کیا ہے وہ کس قماش کے لوگ ہیں؟''

''ہاں معلوم ہے اس کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ بھائی اب کوئی ایسا راستہ نکالو کہ سب ٹھیک ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے، میں سوچتا ہوں۔''

دو چار دن سوچنے کے بعد میں نے ایک شرائط نامہ تیار کر کے وجاہت صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ ''یہ لے جا کر لڑکے کے باپ کو دکھا دیں۔''

''کیا لکھا ہے اس میں؟''

''میں پڑھ کر سناتا ہوں۔ شرط نمبر ایک چونکہ پہلی

ماہنامہ پاکیزہ کراچی
پاکیزہ
دسمبر 2011ء کے
آخری یادگار شمارے
کی خاص جھلکیاں
عمیرہ احمد..... عکس
عکس در عکس پھیلے سلسلۂ زندگی کے
پوشیدہ پہلوؤں کی کھوج و جستجو کا سفر
شیریں حیدر
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
مسائل حیات متعلق مختلف زاویۂ
نظر کو اجاگر کرتا ایک پُرتاثر ناول
راحت وفا..... ایک تھی نینا
انسانی ذہن کی نفسیاتی الجھنوں، کیفیات اور
احساسات کے گرد گھومتا سلسلے وار ناول
انجم انصار اور سدرۃ المنتہیٰ
کے دلکش و خوب صورت ناولٹ
ناہید فاطمہ حسنین، سلمیٰ غزل،
سلمیٰ یونس، عقیلہ حق، شمع خانم
عذرا آفتاب، نئی مصنفات کی نوآموز کاوشیں
آپ کی آراء و تاثرات سے سجے مستقل سلسلے
کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

(ا) قرآن کریم نے اپنے پانچ نام گنوائے ہیں
i) القرآن (ii) الفرقان (iii) الذکر (iv) الکتاب (v) التنزیل،
(2) اسکے نزول کی ابتدا رمضان کے مہینے میں ہوئی، وہ لیل القدر کی رات تھی، یہ وہی تاریخ تھی جس میں بعد میں غزوہ بدر پیش آیا۔
(3) سب سے پہلے نازل ہونے والی سورۃ علق کی پہلی پانچ آیات ہیں۔
(4) آخری وحی (i) واتقوا.....الی اللہ (بقرہ:281)
(ii) الیوم اکملت.....الاسلام دینا (المائیدہ:3)
(5) کاتبان وحی: کم وبیش 40 صحابہ کرام
(6) قرآن کی مدت نزول تقریباً 14 دن، 5 ماہ، 22 سال
(7) پارے، 30، منزلیں: 7، سورتیں مدنی 28، مکی 86 کل 114۔ رکوع: 540، آیات (بشمار کوفی) 6236
(8) سجدہ ہائے تلاوت: متفق علیہ، مختلف فیہ
(9) جامع مضمون: فلاح انسانیت (دنیوی واخروی)
(10) معنوی مضمون بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلوی،
i) علم العقائیہ (ii) علم احکام (iii) تذکر باللہ (iv) تذکیر بایام اللہ (v) تذکر بالموت وما بعدہ۔
(11) کلمات (بقول عطام) 77,439
(12) حروف (بقول ابن عباس) 3,23,671 بقول ابن عبدالکافی 3,87,079
(13) جبریل امین نے نزول قرآن کیلئے حضرت محمد ﷺ پر 26,000 مرتبہ نزول فرمایا جو اوسطاً روزانہ 3 دفعہ ہے۔

(14) قرآن پاک میں لفظ یوم بمعنی دن "365" مرتبہ آیا ہے اور سال کے دن بھی "365" ہوتے ہیں کہو سبحان اللہ، لفظ شہر بمعنی مہینا بارہ مرتبہ آیا ہے اور سال میں 12 ماہ ہی ہوتے ہیں۔
(15) قرآن پاک کے ہر مضمون میں غور وفکر اور تدبر وتفکر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔
(16) 150 جگہ صدقہ وخیرات کا ذکر ہے۔
(17) قرآن پاک میں 70 سے زائد.... مقامات پر دعا مانگنے کی تاکید کی گئی ہے۔
(18) قرآن پاک میں 700 دفعہ نماز پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے جس سے نماز کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔
(19) قرآن پاک میں سب سے طویل ذکر حضرت موسیٰؑ کا آیا ہے۔
(20) قرآن مجید کی سب سے بڑی آیت سورہ بقرہ کی آیت نمبر 282 ہے۔ جو تجارتی معاہدات اور قرض کے لین دین سے متعلق ہے۔
(21) قرآن پاک کی سب سے چھوٹی آیات طٰہٰ ہے۔
(22) قرآن پاک کی سب سے بڑی سورۃ البقرہ ہے۔
(23) قرآن پاک کی سب سے چھوٹی سورت الکوثر ہے۔
(24) قرآن پاک کی سب سے جامع سورۃ جس میں سارے قرآن پاک کی تعلیمات اور دعوت کا خلاصہ دیا گیا ہے سورۃ العصر ہے۔
(25) قرآن پاک کی سورہ الفاتحہ ایک ایسی سورہ ہے جو صرف حضور حضرت محمد ﷺ کو باری تعالیٰ کی طرف سے بطور تحفہ دی گئی۔ ایسی سورۃ تورات، انجیل اور زبور یعنی دیگر الہامی کتابوں میں کسی پیغمبر کو نہیں دی گئی۔ یہ ایک جامع دعا ہے اور ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔

مرسلہ: عبدالرحمن فیصل آباد

پارٹی دوسری پارٹی سے ایک لڑکے کا سودا کر رہی ہے اسی لیے شادی کے بعد دوسری پارٹی کا لڑکے پر کوئی اختیار نہیں ہوگا، لڑکا پارٹی نمبر ایک یعنی لڑکی والوں کے ساتھ رہے گا اور زندگی بھر اپنے گھر اور خاندان والوں سے ملنے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

بولے۔ "یہ تو بہت سخت شرط ہے۔" وجاہت صاحب گھبرا کر

"بہت ضروری ہے۔ آپ اس کا اثر دیکھیے گا۔ اب شرط نمبر دو بھی سن لیں! پارٹی نمبر ایک یعنی لڑکی والے لڑکے کو جس طرح چاہے رکھ سکتے ہیں یعنی وہ چاہے اسے گھر کا فرد بنا کر رکھیں یا ملازم بنا کر۔"

"بھائی یہ کیسی شرط ہے؟"

"وجاہت صاحب! آپ ان شرائط کو آزما کر تو دیکھیں پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔ "تیسری شرط یہ ہے کہ لڑکا حالانکہ انجینئر ہے لیکن اسے لڑکی والوں یعنی پارٹی نمبر ایک کی مرضی کے مطابق کام کرنا ہوگا، اسے ایک دکان میں سیلز مین کے طور پر بھی رکھا جا سکتا ہے۔"

"بھائی۔ یہ تم کیا ستم کر رہے ہو؟ ایسی شرائط کون مانتا ہے؟" وجاہت صاحب کی بوکھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ آپ یہ لے جائیں، ان کی پچیس لاکھ والی شرط خود بہ خود ختم ہو جائے گی۔ اب آگے سنیں!..... چونکہ لڑکا مکمل طور پر پارٹی نمبر ایک یعنی لڑکی والوں کا ہو جائے گا اسی لیے لڑکے کا باپ اپنی وراثت میں سے لڑکے کو کچھ نہیں دے گا اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ کسی انجینئر سے اِدھر اُدھر کے کام کیوں کرائے جائیں گے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو چیز دکان سے کسی خریدار کے پاس آ گئی تو دکاندار کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اس سامان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے؟"

"بھائی یہ تو بہت خطرناک قسم کی شرائط ہیں۔"

"وجاہت صاحب! اب ایک بات اور سن لیں! یہ شرائط نامہ لڑکے کے سامنے پیش نہیں کریں گے۔ بلکہ اس سے چھپا کر پیش کریں گے۔"

"تم نے تو مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔"

"وجاہت صاحب! آپ کو نہیں بلکہ اس لالچی شخص کو مشکل میں ڈال رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ ہمت کر کے پہنچ تو جائیں پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے؟"

وجاہت صاحب نے وعدہ کر لیا کہ وہ میری بات پر

عمل کریں گے۔

چار پانچ دنوں کے بعد انہوں نے بتایا۔ "بھائی صورتِ حال ہی کچھ اور ہو گئی۔"

"کیا ہو گیا؟"

"وہ شخص مان گیا ہے۔"

"کیا کہا..... مان گیا ہے؟"

"ہاں۔" وجاہت صاحب پریشان ہو رہے تھے۔ "اب بتاؤ اب کیا ہوگا؟ تم نے تو مصیبت میں پھنسوا دیا۔ اب میں اس کم بخت کو دینے کے لیے پچیس لاکھ کہاں سے لاؤں؟"

"بس بس آپ فکر نہ کریں۔ اب بات بن گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ شرائط نامے پر دستخط کروالیں۔"

"تاکہ اور زیادہ پھنس جاؤں۔"

"کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔ "آپ میرے مشورے پر عمل تو کریں۔ اس کے بعد بتاؤں گا کہ آپ کو کیا کرنا ہے؟"

یہ کام بھی ہو گیا۔ وجاہت صاحب اس شخص سے دستخط کرا کر لے آئے تھے، مجھے اس شخص کی ذہنیت پر افسوس ہو رہا تھا۔ نہ جانے کس مزاج کا انسان تھا، اس نے اپنے بیٹے کو جیسے مکمل طور پر فروخت ہی کر دیا تھا۔

وجاہت صاحب دو چار دنوں کے بعد دستخط بھی کروا کے لے آئے تھے۔ "ہاں اب بتاؤ اب کیا کرنا ہے؟ میں تو مکمل طور پر پھنس چکا ہوں۔"

"کچھ نہیں ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب آپ اس شرائط نامے کی فوٹو کاپی مجھے دے دیں اور اس لڑکے سے میری ملاقات کروا دیں۔"

"تمہاری ملاقات ہے؟"

"ہاں اس کے بعد ہی آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس شرائط نامے نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔"

"اور یہ ملاقات کہاں ہوگی؟"

"کہیں بھی لیکن اپنے گھر پر نہیں بلکہ ایسا کریں کہ آپ اسے میرے فلیٹ پر بھیج دیں۔"

دوسرے دن وجاہت صاحب نے بتایا کہ وہ لڑکا کل میرے فلیٹ میں آ رہا ہے۔ انہوں نے لڑکے کو میرے فلیٹ کا ایڈریس سمجھا دیا تھا۔

دوسری شام وہ لڑکا وعدے کے مطابق آ گیا تھا۔ اس دن بھی وہ بڑا مہذب دکھائی دے رہا تھا، وہ اس بات پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حیران تھا کہ میں نے اسے کیوں بلایا ہے؟

اس لڑکے کا نام فیصل ندیم تھا۔

''فیصل میاں، تم جانتے ہو کہ میں نے تم کو کیوں بلایا ہے؟''

''نہیں جناب یہ تو آپ ہی بتائیں گے۔''

''صرف یہ بتانے کے لیے بلایا ہے کہ تمہارے گھر والوں کے نزدیک تمہاری کوئی اہمیت نہیں.....'' میں نے کہا۔ ''تم ان کی نگاہوں میں دو کوڑی کے انسان ہو۔''

''کیا؟'' وہ بھڑک اٹھا تھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''تم دھیان سے میری بات سنو! اس کے بعد ناراض ہونا لیکن میری ایک شرط ہے کہ جو کچھ تمہیں معلوم ہو جائے اس کا ذکر اپنے گھر میں مت کرنا اور تمہیں اپنے طور پر جو قدم اٹھانا ہو وہ اٹھا لینا لیکن گھر والوں کو بتائے بغیر۔''

''خدا جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''تم یہ پڑھ لو!'' میں نے شرائط نامہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ ''اس کے بعد شاید تمہیں کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔''

شرائط نامہ پڑھ کر وہ جیسے سکتے میں رہ گیا تھا۔ گم ہو کر رہ گیا تھا، بہت دیر کے بعد اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''تو یہ ہے میری حیثیت۔''

''ہاں، تمہاری یہی حیثیت ہے۔ انہوں نے پچیس لاکھ کے عوض تمہیں فروخت کر دیا ہے۔ اب ہم جس طرح چاہیں تمہیں استعمال کر سکتے ہیں۔''

''لعنت ہے ایسی زندگی پر۔'' وہ غصے سے بولا۔ ''آپ یہ شرائط نامہ پھاڑ کر پھینک دیں۔ ایک روپیا بھی نہ دیں۔''

''افسوس تو یہی ہے کہ اس کے بغیر شادی نہیں ... ہو سکتی۔''

''ہو سکتی ہے شادی۔ میں کروں گا چاہے مجھے کورٹ میرج کرنی پڑے، میں بکنے کے لیے نہیں ہوں، انسان ہوں۔''

''نہیں یہ تمہارے بس کی بات نہیں .....'' میں نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔

''کیوں..... میرے بس کی بات کیوں نہیں ہے؟''

''اس لیے کہ تم پوری طرح اپنے والد کے کنٹرول میں ہو۔'' میں نے کہا۔ ''اگر ایسی بات نہ ہوتی تو وہ اتنی آسانی سے تمہارا سودا نہیں کرتے۔''

''بس جناب! اب بہت ہو گئی۔ آپ انکل سے کہیں کہ وہ شادی کی تیاریاں کریں مجھے ہر حال میں یہ شادی کرنی ہے۔''

مختصر یہ کہ یہ شادی ہو گئی۔

لڑکے کے باپ نے بہت واویلا مچایا تھا۔ ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ پچیس لاکھ اس کے ہاتھ سے جا رہے تھے لیکن چونکہ میں نے اس کی دُم پر پاؤں رکھ دیا تھا اس لیے وہ صرف تلملا کر رہ گیا تھا۔

شادی کے بعد لڑکے نے واقعی اپنے باپ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور وہ دونوں میاں بیوی ایک الگ مکان میں رہنے لگے۔

وجاہت صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا، میں نے انتہا بڑا مسئلہ یونہی حل کرا دیا تھا۔ اس کے تقریباً ایک سال کے بعد ایک دن اچانک مارکیٹ میں صاحبزادے کے والد سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے جان بوجھ کر انہیں آواز دے کر روک لیا۔ ''ارے جناب، بات تو سنیں!''

میری آواز سن کر وہ رک گئے تھے۔ انہوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے ان کی خیریت دریافت کرنے کے بعد ان سے پوچھا۔ ''جناب! میرے خاندان میں ایک لڑکی ہے بہت اچھی، بہت کھاتے پیتے لوگ ہیں۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟''

''جناب! آپ سے صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ کیا آپ کے پاس کوئی اور بیٹا فروخت کے لیے موجود ہے؟''

ظاہر ہے وہ اس کا کیا جواب دے سکتے تھے، وہ مجھے قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

ہو سکتا ہے کہ اس کہانی میں ایسی کوئی خاص بات نہ ہو، لیکن کیا یہ خاص بات نہیں ..... کہ کچھ والدین نے اپنی ڈگری یافتہ اولاد کے گلے میں ایک اور تختی بھی لٹکا رکھی ہے جس پر واضح طور پر برائے فروخت لکھا ہوا ہے۔

ایک طرف تو ایسے لڑکے کے والدین ہوتے ہیں اور دوسری طرف لڑکیوں کے والدین سے میرا یہ سوال ہے کہ فرض کریں کہ آپ نے پچاس ساٹھ لاکھ کے عوض کوئی لڑکا خرید بھی لیا تو کیا آپ اپنی بیٹی کی اچھی قسمت کی گارنٹی دے سکیں گے؟

بس آپ سے یہی سوال ہے۔

تحریر شناس

محترمی!

سلام مسنون

میں اپنے ایک جاننے والے کی کہانی بھیج رہی ہوں۔ یہ کہانی نہیں ایک بہت بڑا سبق ہے اس لیے اسے آپ کے رسالے میں بھیج رہی ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے پڑھیں۔

آصفہ ضیا احمد (حیدرآباد)

آپ نے بہت سی سچی کہانیاں پڑھی ہوں گی یا سنی ہوں گی، آج میں بھی آپ کو ایک عجب سی سچی کتھا سنا رہی ہوں۔ یہ سرگزشت میرے ایک قریبی جاننے والے کی ہے مگر اس کا اصل لطف بھی آئے گا جب یہ آپ بیتی اسی کی زبانی سنیں اس لیے میں نے انہی کے الفاظ میں لکھی ہے۔

☆☆☆

بعض لوگ ستاروں کی چال سے قسمت کا حال بتاتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں تو بعض ہتھیلی کی لکیریں پڑھ کر لوگوں کو مستقبل کا آئینہ دکھاتے ہیں اور کچھ لوگ محض اپنی قیافہ شناسی سے کام لے کر آنے والے وقت اور گزرے ہوئے لمحات کے بارے میں سب کچھ بتادیتے ہیں، اتنی سچی اور صحیح باتیں بتاتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان علوم کو جاننے والے اب نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگر ہم تاریخ کے اوراق اُلٹ کر دیکھیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ زمانہ قدیم میں باقاعدہ یہ علوم سیکھے اور سکھائے جاتے تھے، لوگ اپنی محنت اور لگن سے اس میں اتنی دسترس حاصل کرتے تھے کہ وہی ان کا ذریعۂ معاش بن جاتا تھا۔ بڑے بڑے شاہوں کے دربار میں انہیں عزت واحترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

زمانہ طالب علمی میں، میں نے شوقیہ ایک صاحب سے تحریر شناسی کا فن سیکھا۔ وہ اس میدان کے شہ سوار تھے۔ انہوں نے بڑی عرق ریزی کے بعد اس فن میں مہارت حاصل کی تھی۔ انگلش اور اردو کے حروف تہجی کی بناوٹ، تحریر کا جھکاؤ اور الفاظ کا درمیانی فاصلہ، ان سے وہ لکھنے والے کی شخصیت اور اس کے ماضی، حال اور مستقبل کی کئی ایسی باتیں بتاتے تھے جس کا علم صرف لکھنے والے کو ہی ہوتا تھا۔ میں نے ان کی شاگردی اختیار کر کے اس فن میں بڑی جانفشانی کے بعد اپنا مقام بنایا۔ پہلے تو میں نے گھر ہی میں طبع آزمائی کی اس کے بعد اپنا ہنر دوستوں پر آزمایا۔ وہ سب میرے اس فن سے اتنے متاثر ہوئے کہ کالج میں میرے اردگرد لڑکوں کا ایک ہجوم رہنے لگا بلکہ بہت سے لڑکے تو اپنی گرلز فرینڈز کے لو لیٹرز بھی تنہائی میں مجھے دکھا کر ان کی اگلی پچھلی ہر بات جاننے کی کوشش کرتے۔ میں کچھ اُگلتا اور کچھ ہضم کر جاتا کیونکہ اس دنیا میں فرشتہ تو کوئی بھی نہیں ... اور بقول میرے استاد کے، اس فن میں پردہ پوشی لازمی ہے۔ خالقِ کائنات جس نے ہمیں عقل دے کر ان علوم وفنون پر مہارت بخشی ہے، وہ بذاتِ خود ستار العیوب ہے اور عیبوں کی پردہ پوشی کو پسند فرماتا ہے۔ اپنے استاد کا یہ سبق مجھے اچھی طرح ازبر تھا اس لیے میں کسی کی بھی تحریر کا جب تجزیہ کرتا تو کمزوریوں اور خامیوں کو اتنی خوبصورتی سے چھپا جاتا کہ اسے پتا ہی نہیں چلتا تھا۔

سب بہن بھائیوں میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے ابھی میری شادی کی فائل اوپر نہیں آئی تھی لیکن جیسے ہی میرے والدین میرے بڑے بہن بھائیوں کی شادیوں سے سبکدوش ہوئے بس اسی دن سے میری والدہ نے چھوٹی بہو کی تلاش شروع کر دی لیکن میں فی الحال ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرا ارادہ اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانے کا تھا۔ اس کے لیے میں دل وجان سے کوشاں تھا۔ والدین کی جانب سے گھر اور جائداد میں میرا تھوڑا بہت حصہ بنتا تھا اسی کو فروخت کر کے میں اپنی دیرینہ خواہش پوری کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ میں ٹیوشنز پڑھا کر بھی کچھ نہ کچھ پس انداز کرلیتا تھا تاکہ اپنا مستقبل بہتر سے بہتر بنا سکوں۔ ان ہی دنوں مجھے ایک دوست کے توسط سے ایک ایسی ٹیوشن ملی جسے میں نے بے انتہا مصروفیت اور وقت کی کمی کے باوجود بغیر کسی پس وپیش کے قبول کرلی۔ کیونکہ فیس معقول تھی اور شرط صرف اتنی تھی کہ اسٹوڈنٹ کو گھر جا کر پڑھانا ہے۔ اپنے تفریح اور آرام کے اوقات میں سے کچھ گھنٹوں کی کٹوتی کر کے میں نے دوسرے ہی روز سے شاداب کے گھر جانا شروع کر دیا۔

میرا اسٹوڈنٹ شاداب دولت مند باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ انٹر میں پڑھ رہا تھا اور سائنس کے مضامین میں اسے ٹیوشن درکار تھی۔ شاداب پر مجھے زیادہ محنت بھی نہیں کرنی پڑی۔ وہ نہ صرف ذہین تھا بلکہ محنتی بھی بہت تھا۔ اپنی محنت اور ذہانت کی وجہ سے ہر ٹیسٹ میں نمایاں کامیابی حاصل کرتا تھا۔ شاداب کے والد آفتاب احمد ایک کامیاب بزنس مین تھے۔ گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ سیٹھ آفتاب بذاتِ خود نہایت شائستہ مزاج اور بااخلاق انسان تھے اور ان کے یہی اوصاف ان کے بیٹے شاداب میں بھی بدرجہ اتم موجود تھے۔ شاداب نے پہلی ملاقات میں مجھے بتایا کہ ان کا خاندان محض تین افراد پر مشتمل ہے۔ ایک وہ خود، دوسرے اس کے والد اور تیسری ہستی اس سے بڑی ایک بہن جو کہ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھی۔ شاداب کی والدہ کا انتقال ہوچکا تھا اور سیٹھ صاحب اپنے دونوں بچوں سے بے انتہا محبت کرتے تھے اس لیے انہوں نے بیوی کے مرنے کے بعد دوسری شادی نہیں کی تھی حالانکہ مردانہ وجاہت اس عمر میں بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شاداب اور اس کی بہن دونوں بہت کم کوٹھی سے نکلتے تھے اور اس کی وجہ خود مجھے سیٹھ صاحب نے یہ بتائی تھی کہ آج کل اغوا برائے تاوان کے کیسز کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ احتیاط لازمی ہے۔ اسی لیے ٹیوشن گھر پر پڑھانے کی شرط رکھی گئی تھی۔

شاداب کو پڑھاتے ہوئے مجھے تقریباً چھ سات ماہ کا عرصہ ہو رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً آفتاب صاحب سے ملاقات ہوجاتی تھی۔ شاداب کے سالانہ امتحان کے بعد بھی سیٹھ

صاحب نے ٹیوشن ختم نہیں کروائی بلکہ میں موسم گرما کی چھٹیوں میں بھی ان کے یہاں بحیثیت ٹیوٹر جاتا رہا۔

ایک دن میں شاداب کو پڑھا کر واپس ہو رہا تھا کہ راستے میں خیال آیا کہ میرے پاس کیمسٹری کے کچھ اہم نوٹس تھے جو میں نے پڑھائی کے دوران شاداب کی میز پر رکھ دیے تھے اور آتے ہوئے بھول آیا تھا۔ اس کی اسٹڈی میرے لیے بہت ضروری تھی اس لیے میں پلٹ پڑا۔ کوٹھی کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ لان عبور کر کے میں اس کمرے میں پہنچا جہاں شاداب کو پڑھاتا تھا تو دیکھا شاداب اپنی کرسی پر ہی براجمان تھا اور میرے نوٹس کی فائل وہیں میز پر پڑی تھی۔ میری کرسی پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ وہ شاداب سے چند سال بڑی ہوگی۔ اس کے نین ونقوش پُرکشش تھے۔

میری اچانک آمد سے وہ گھبرا گئی اور حواس باختہ سی یہ جا وہ جا۔ شاداب مجھے دیکھ کر ہنسنے لگا اور میری فائل اُٹھا کر مجھے دیتے ہوئے بولا ''میری اور آپی کی شرط لگی تھی۔ میں آپی سے کہہ رہا تھا کہ آپ اپنی فائل لینے واپس آئیں گے۔ آپی کہہ رہی تھیں کہ نہیں اب تمہارے سر کل ہی تشریف لائیں گے۔ مگر مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔

میرے تصور میں جو پیکر اپنے جیون ساتھی کے لیے تھا، وہ بالکل ویسی ہی تھی۔ میرا اس کو دیکھنا، اس کا گھبرا کر بھاگنا، میری زندگی کا انمٹ لمحہ تھا۔ میں گھر پر آ کر بھی اس ہی کے متعلق سوچتا رہا لیکن جب اپنی اور سیٹھ صاحب کی حیثیت کا موازنہ کیا تو دماغ نے مشورہ دیا کہ اس لڑکی کو بھول جاؤ۔ دل ودماغ میں کافی دیر جنگ جاری رہی۔ دل اس کے حصول کے لیے مچل رہا تھا اور دماغ کہہ رہا تھا کہ ابھی تمہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی ہے جس کے لیے جان توڑ محنت کرنی ہوگی اور جب تم ایک سنہری مستقبل کے مالک ہو جاؤ گے، اس وقت تک سیٹھ آفتاب انتظار نہیں کرسکیں گے۔

شاداب کو پڑھاتے ہوئے میں نے باتوں باتوں میں اس سے معلوم کرلیا تھا کہ اس کی بہن کا نام مدحت ہے اور وہ بی ایس سی فائنل میں ہے۔ شاعری سے گہرا شغف ہے، خود بھی شعر کہتی ہے۔ اکثر وبیشتر رسالوں میں بھی چھپتی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا ''بذاتِ خود وہ بھی کسی شاعر کی غزل ہے۔''

''ان کو پڑھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ اپنے اصلی نام سے لکھتی ہیں یا کوئی قلمی نام ہے یا تخلص استعمال کرتی ہیں۔''

شاداب نے فوراً کہا ''جی نہیں، آپی تو اپنا اصلی نام

حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں امیرِ شام حضرت ابوعبیدہؓ کی یہ حالت تھی کہ جب حضرت عمرؓ ملک شام پہنچے تو یہ دیکھنے کے لیے کہ امیر کہیں زہد وسادگی کو چھوڑ کر دنیاوی طمع میں تو نہیں آگئے۔ ابوعبیدہؓ سے فرمایا۔ ''امیرِ شام ہمیں اپنے گھر لے چلو۔'' حضرت ابوعبیدہؓ نے فرمایا کہ آپ وہاں جا کر کیا کریں گے۔ وہاں جا کر رونے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ مگر آپ کے اصرار پر گھر لے گئے۔ وہاں امیرِ شام کے گھر پر ایک نمدے، لکڑی کی رکابی اور مشکیزے کے سوا کچھ نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا ''تم امیرِ شام ہو تمہارے پاس مال و اسباب کچھ نہیں۔ اگر کھانے کے لیے کچھ ہو تو لاؤ۔'' حضرت ابوعبیدہؓ نے آپ کے سامنے سوکھی روٹی کے ٹکڑے لا کر رکھ دیے جنہیں دیکھ کر حضرت عمرؓ خلیفۃ المسلمین رو پڑے۔ امیرِ شام نے کہا! ''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ وہاں جا کر روئیں گے ہمیں زیادہ سامان کی کیا ضرورت ہے اتنا ہی کافی ہے جو اس قیام گاہ یعنی آخرت تک پہنچا دے۔''

یعنی مدحت آفتاب ہی لکھتی ہیں۔ پڑھائی کی وجہ سے بہت کم رسائل واخبارات میں اپنی کاوش بھیج پاتی ہیں۔ اگر آپ کو شاعری سے دلچسپی ہے تو آپی کا کوئی تازہ کلام لا کر دکھاتا ہوں۔ آج وہ اپنی کسی دوست کے گھر گئی ہیں اس لیے اچھا موقع ہے ورنہ وہ تو مجھے اپنی میز کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتیں۔''

میں خود بھی ادب کا دلدادہ تھا اس لیے میں نے فوراً اشتیاق آمیز لہجے میں کہا ''آپ کی آپی ناراض تو نہیں ہوں گی، جب انہیں پتا چلے گا کہ ان کی بیاض مجھ تک پہنچ چکی ہے؟''

شاداب نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا ''انہیں کون بتائے گا؟ دیکھنے کے بعد آپ خاموشی سے مجھے لا کر دے دیجیے گا، میں ان کے کمرے میں رکھ دوں گا۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا ''استاد ہو۔'' تھوڑی دیر بعد شاداب ایک ڈائری لے کر آیا اور ڈائری مجھے دیتے ہوئے بولا ''سر، مجھے تو شاعری اور افسانہ نگاری سے کوئی دلچسپی نہیں۔ آپی کی لکھنے کی میز پر یہ ڈائری رکھی تھی، یقیناً ان کی ہوگی۔ پلیز جلدی سے واپس کردیجیے گا تاکہ آپی کو پتا ہی نہ چلے۔''

میں نے اپنے دلی جذبات کو چھپاتے ہوئے کہا ''تم فکر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی نہ کر دنک ویلوٹ کے چچا، تمہاری آپی کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوگی۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنے بیگ میں وہ ڈائری رکھ لی اور وہاں سے نکل گیا۔

گھر پہنچ کر بے تابی دل سے میں نے ڈائری کھولی مگر پہلا ہی صفحہ دیکھ کر طبیعت مکدر ہوگئی۔ تحریر نہایت شکستہ اور ٹیڑھی میڑھی تھی بلکہ بدخط تھی۔ کلام بھی جو تھا اسے شاعری کہنا شاعری کی توہین ہی تھی۔ عجیب سی تک بندی تھی جو میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ میں نے جس جوش سے وہ ڈائری کھولی تھی، اتنی ہی بے دلی کے ساتھ اسے بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ پتا نہیں اس تحریر کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے میرے دل کے اندر کوئی چیز چھن سے ٹوٹ گئی ہو۔ کہاں مدحت کا سراپا اور کہاں وہ واہیات سی ڈائری۔ تحریر شناسی کا جو علم میں نے سیکھ رکھا تھا، وہ آزمایا تو پتا چلا کہ جس شخصیت کی بھی یہ تحریر ہے، وہ انتہائی بدذوق، چالاک اور کام چور ہے۔ میری طبیعت میں بدمزگی پیدا ہوگئی تھی اس لیے ڈائری کو ایک طرف رکھ کر میں سونے کی تیاری کرنے لگا مگر بستر پر لیٹ کر بھی میں کبھی مدحت کے بارے میں سوچتا اور کبھی اس کی ہینڈ رائٹنگ اور اس کے عامیانہ ذوق کے بارے میں۔ کافی رات تک میں کروٹیں بدلتا رہا۔ رات کے آخری پہر میں مجھے نیند آئی۔ نیند سے جب اٹھا تو فون کی رنگ ہو رہی تھی۔ فون میرے دوست فواد کا تھا جس کے توسط سے مجھے شاداب کی ٹیوشن ملی تھی۔ فواد نے مجھے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ سیٹھ آفتاب کو رات تین بجے دل کا جان لیوا دورہ پڑا اور فوری طبی امداد کے باوجود وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ خبر سن کر دل بیٹھ گیا۔ مدحت اور شاداب کے چہرے نظروں میں گھوم گئے، دونوں پر کیا بیت رہی ہوگی، مجھے اس کا بہ خوبی اندازہ تھا۔

میں فوراً تیار ہو کر فواد کے گھر پہنچا۔ فواد کی سیٹھ آفتاب سے رشتے داری بھی تھی اس لیے فواد کی والدہ اور بہنیں مدحت کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ فواد مجھ میرے انتظار میں رکا ہوا تھا۔ ہم دونوں جب وہاں پہنچے تو کوٹھی کالان آنے والے مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شاداب کو حوصلہ دینے کے لیے میرے پاس نہ الفاظ تھے اور نہ ہمت۔ تجہیز و تکفین کے بعد میں تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھ کر واپس آ گیا۔ دوسرے دن اپنی والدہ اور بھابی کو تعزیت کے لیے مدحت کے پاس بھجوایا۔ میری امی گئی تو تھیں، سوگوار ماحول میں لیکن انہیں وہاں جا کر ایسا محسوس ہوا کہ جس گوہر نایاب کی تلاش میں وہ اتنے دنوں سے سرگرداں تھیں۔ مدحت کی صورت میں وہ انہیں ہاتھ آ گیا ہے۔ بھابی بھی مسلسل مدحت کے قصیدے پڑھے جا رہی تھی۔ اگر میں نے مدحت کی تحریر نہ دیکھی ہوتی تو اس وقت میری خوشی کا عالم ہی اور ہوتا۔ امی اور بھابی کو میں نے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ ابھی سیٹھ صاحب کے گھر کا ماحول ان باتوں کے لیے موزوں نہیں ہے۔ وقتی طور پر تو امی مان گئیں لیکن اس کے بعد انہوں نے باقاعدہ اعلان کر دیا کہ وہ مدحت کو ہی اپنی بہو بنائیں گی۔ میں نے انہیں مدحت اور اپنے اسٹیٹس کا فرق سمجھایا لیکن وہ کسی طور ماننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

ایک دن تو امی میرے علم میں لائے بغیر بھابی کو ساتھ لے کر باقاعدہ رشتہ ڈالنے پہنچ گئیں۔ مدحت اور شاداب کے قریبی عزیز و اقارب جو ابھی تک کوٹھی میں موجود تھے۔ امی نے ان لوگوں سے یہی کہا کہ ''اگر سیٹھ آفتاب حیات ہوتے تو میں انہی سے سوال کرتی لیکن چونکہ اب وہ نہیں ہیں، اس لیے میں آپ لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کر رہی ہوں۔ امید ہے آپ مایوس نہیں کریں گے۔''

مجھے جب اس بات کا علم ہوا تو میں سر پکڑ کر رہ گیا۔ امی، بھابی اور بہنیں بہت خوش تھیں۔ ان سب کو یقین تھا کہ جواب مثبت ہی ملے گا لیکن مجھے سو فیصد یقین تھا کہ مدحت اور شاداب کے رشتے دار اس نسبت کو ضرور مسترد کر دیں گے لیکن میرا خیال یکسر غلط ثابت ہوا۔ میری سوچ کے برعکس جواب اثبات میں دیا گیا اور فواد نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس میں شاداب اور مدحت کی رضامندی بھی شامل ہے۔ خاندان کے بزرگوں نے شاداب اور مدحت سے بات کرنے کے بعد ہی فیصلہ کیا تھا۔ میرے لیے یہ لمحات بڑی کشمکش کے تھے۔

میری قوتِ فیصلہ جواب دے گئی تھی۔ ایک جانب مدحت جیسی حسین و جمیل، امیر کبیر لڑکی مجھے بڑی آسانی سے مل رہی تھی جبکہ دوسری جانب اس کی تحریر مجھے خبردار کر رہی تھی کہ زندگی ایک کامل، بدسلیقہ اور زبان دراز عورت کے ساتھ بسر کرنی ہوگی اور یہ کڑوی گولی نگلنے کے لیے میں کسی قیمت پر تیار نہیں تھا۔ میں نے بہت غور و فکر کے بعد گھر والوں کو اپنا فیصلہ سنا دیا کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے میں باہر جا رہا ہوں اور.... فی الحال میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔ امی اور گھر کے دوسرے افراد کی پروا کیے بغیر میں نے پاکستان چھوڑنے کا قصد کر لیا۔

میرا تعلیمی کیریئر شروع سے ہی بہت شاندار رہا تھا۔ اس بنا پر دیارِ غیر یعنی امریکا کی یونیورسٹی میں میرا ایڈمیشن ہوگیا اور

میں یکسوئی سے اپنی پڑھائی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ کبھی کبھی وطنِ عزیز بہت شدت سے یاد آتا اور اپنی والدہ اور بہن بھائیوں کے بعد اگر دیوار دل پر کوئی دستک دیتا تو وہ تھی مدحت لیکن پھر میں اس کی ڈائری کو دیکھ کر جو کہ میں اپنے ساتھ لایا تھا، سوچتا کہ میں نے جو کچھ کیا بہتر کیا۔ میں نے بڑی باریک بینی سے ایک نہیں کئی بار اس پر اپنی تحریر شناسی کا فن آزمایا تھا اور ہر بار مجھے یہی جواب ملا تھا کہ وہ ایک اچھی شریکِ زندگی بن ہی نہیں سکتی تھی۔

اس اجنبی ملک اور اجنبی لوگوں کے درمیان مجھے اچانک ایک شناسا چہرہ نظر آ گیا۔ اسلم جو کہ اسکول میں میرا کلاس فیلو تھا اور یہاں بھی وہ اسی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا جہاں میں نے ایڈمیشن لیا تھا۔ اسلم بھی فوراً مجھے پہچان گیا اور ہم دونوں بڑے تپاک سے ملے۔ اسلم اور میں کافی دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ اسلم نے بتایا کہ وہ چند سال پہلے ہی اپنے والدین اور بہن کے ساتھ امریکا سیٹل ہوا ہے اور فی الحال یہیں رہائش پذیر ہے۔ اسلم نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دے دی۔ پہلے تو میں ٹال مٹول کرتا رہا لیکن ایک دن اسلم سر پر ہی سوار ہوگیا کہ آج تو تمہیں میرے گھر چلنا ہی ہے اور بالآخر میں اس کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں جا کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں پاکستان میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوں۔ مسٹر اکرم اور مسز اکرم (اسلم کے والدین) نہایت شفقت اور محبت سے پیش آئے۔ اس روز کھانا بھی ان کے گھر میں نے ان کے ساتھ ہی کھایا۔ کافی عرصے بعد دیسی کھانا کھا کر مجھے بہت مزہ آیا اور میں نے مسز اکرم سے کہا ''آنٹی، آج تو مجھے اپنی امی یاد آ گئیں۔''

مسز اکرم نے خوشی سے سرشار لہجے میں جواب دیا ''ارے بیٹا، مجھ سے کہاں اب کام ہوتا ہے۔ یہ سب تو فوبیہ نے کیا ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ ان کی ایک عدد بیٹی ہے اور یہ سب اس کے ہاتھ کا کمال ہے۔ میں گاہے بہ گاہے اسلم کے گھر جاتا رہا لیکن اچانک میری طبیعت کچھ خراب رہنے لگی اور اسی وجہ سے میں اپنی پڑھائی پر بھی مکمل توجہ نہیں دے پا رہا تھا اور نہ ہی اسلم کے گھر جا پا رہا تھا۔ ایک دن اسلم بذاتِ خود اپنے والدین کے ساتھ میرے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ لوگ آئے تو تھے میری عیادت کے لیے مگر میری صحت اور خرابی طبیعت کو دیکھتے ہوئے اسلم کی والدہ نے فیصلہ صادر کیا کہ اس طرح تو تم اپنی صحت تباہ کر لو گے، چلو اسی وقت اپنا سامان سمیٹو اور ہمارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اب تم مستقل ہم لوگوں کے ساتھ رہو گے۔ میں انکار بالکل نہ سنوں گی۔ تمہاری بیماری کی اصل وجہ باہر کا کھانا ہے۔''

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں لیکن از راہِ تکلف پہلے تو میں نے انکار کیا مگر تھوڑی سی ردو کد کے بعد آخر میں اپنا سامان سمیٹ کر اسلم کے گھر شفٹ ہو گیا۔

اسلم کے گھر مجھے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ میں چاہتا تھا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ بحیثیت پے انگ گیسٹ رہوں لیکن وہ تینوں اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

رہائش کی تبدیلی سے مجھے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ یکسوئی کے ساتھ میں اپنی تعلیم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کبھی کبھی اسلم کی بہن ثوبیہ سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ بھی کسی کالج میں ماسٹرز کر رہی تھی۔ میں نے اس گھر میں رہتے ہوئے یہ بات بہت شدت سے نوٹ کی کہ اسلم کے والدین جب بیٹا، بیٹی کی تعریفوں کے پل باندھتے تو اس میں اسی فی صد جھوٹ ہوتا مثلاً جب وہ اسلم کی ذہانت اور اس کے تعلیمی کیریئر کے بارے میں دوسروں کو بتاتے تو ایسا لگتا جیسے وہ اس دور کا ارسطو ہو اور ثوبیہ کے سلسلے میں تو دونوں میاں بیوی جوزمین آسمان کے قلابے ملاتے تو ساری حدیں ہی پھلانگ جاتے۔ میں نے ثوبیہ کو کبھی کچن میں کوئی کام کرتے نہیں دیکھا لیکن ہر آنے والے مہمان کے سامنے یہ ظاہر کیا جاتا کہ گھر کی سجاوٹ سے لے کر کھانے کی میز پر چنی ہوئی ڈشز تک سب ثوبیہ کے ہاتھوں کی مرہونِ منت ہیں۔ اسلم کی فہم و فراست کا مجھے اچھی طرح علم تھا اور ثوبیہ کتنی سلیقہ مند اور سگھڑ تھی میں خوب اچھی طرح جانتا تھا لیکن زبان بند رکھنے میں ہی عافیت تھی۔ خواب و خور کے لیے جو ٹھکانا میسر آیا تھا، زبان ہلانے اور سچ بولنے سے اس کے چھن جانے کا خطرہ تھا۔ اس لیے گونگا، بہرا بن کر میں اس گھر میں رہ رہا تھا لیکن چند مہینے گزرنے کے بعد میں نے ان لوگوں میں یہ تبدیلی محسوس کی کہ کھانے کی میز پر اکرم صاحب، ان کی بیگم اور اسلم فوراً ہی کھانا ختم کر کے کسی نہ کسی بہانے میز سے اٹھ جاتے، ثوبیہ اور مجھے تنہا چھوڑ دیتے۔ کبھی کبھی ثوبیہ میرے کمرے میں ناشتا اور چائے لے کر آ دھمکتی۔ خطرے کا الارم میں اچھی طرح سن بھی رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا لیکن انجان بن کر میں اپنی اسٹڈی میں مشغول رہا اور اس طرح اسلم کے گھر رہ کر میں نے اپنا ایک سال پورا کیا۔ دوسرے سال میں نے چاہا کہ میں اپنی رہائش تبدیل کر لوں لیکن آنٹی تو باقاعدہ رونے لگیں اور گلہ بھی کیا کہ تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے؟ اکرم صاحب بھی کہنے لگے ''ہم تمہیں اسلم سے کم تھوڑا ہی سمجھتے ہیں۔''

ان کے اصرار اور بیگم اکرم کے آنسو دیکھ کر میرا دل موم ہو گیا اور میں نے اپنے آپ کو سرزنش کی کہ اتنے پیارے اور محبت کرنے والے لوگوں کا خلوص ٹھکرا کر میں کچھ اچھا نہیں کر رہا ہوں۔ میں پھر یونیورسٹی کی گہما گہمی اور اپنی تعلیمی مصروفیات میں مصروف ہو گیا۔ وقت پر لگا کر اُڑ رہا تھا۔ والد کے انتقال کی خبر ملی اور اس کے بعد والدہ کی مسلسل بیماری کی خبریں مل رہی تھیں۔ ڈاکٹریٹ کے لیے میں اپنی تھیسس مکمل کر چکا تھا۔ اسی اثنا میں ایک دن اکرم صاحب میرے کمرے میں تشریف لائے۔ میں احتراماً کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے اشارے سے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر بیوی کو بھی آواز دے کر وہیں بلا لیا۔ میں سمجھ تو اچھی طرح گیا کہ یہ تشریف آوری کس سلسلے میں ہوئی لیکن میں خاموش رہا۔ تھوڑی دیر دونوں میاں بیوی خاموش رہے پھر اکرم صاحب نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور گویا ہوئے ''بیٹا! تمہیں علم ہو گا کہ ہمارے کافی رشتہ دار ہندوستان اور پاکستان سے آ کر یہیں رہائش پذیر ہیں اور ہم لوگ چاہتے تھے کہ انہی عزیز و اقارب میں ثوبیہ کا رشتہ طے کر دیں لیکن جیسے ہی ہم نے بات چھیڑی ہمیں منہ کی کھانی پڑی۔''

میں نے بے اختیار سوال کیا ''وہ کیوں انکل؟''

اکرم صاحب کے بجائے بیگم اکرم نے کہا ''ارے بیٹا، ہم لوگوں نے جو اتنے سالوں سے تمہیں اپنے گھر میں جگہ دی ہے نا، اس پر سب کو اعتراض ہے۔ ہماری برادری والوں کا کہنا ہے کہ جوان بیٹی کی موجودگی میں تم نے ایک غیر نوجوان کو گھر میں رکھا ہوا ہے، یہ کوئی اچھی بات تھوڑی ہے۔ خاندان میں کوئی اس کا رشتہ لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اب بتاؤ اس صورت میں ہم کیا کریں؟ بس اب تو ہمیں تمہاری ہی مدد درکار ہے۔''

بلی تھیلے سے باہر آنے کے لیے بے چین تھی۔ اسلم کے ذریعے میرا گھیراؤ کیا گیا تھا اور اپنی نازوں سے پلی بیٹی کے لیے مجھ سے بہتر شوہر انہیں مل ہی نہیں سکتا تھا۔ دونوں میاں بیوی، ہر وہ حربہ آزما رہے تھے جس سے میں شیشے میں اُتر جاؤں۔ اسی دوران میں اسلم بھی باہر سے آ گیا اور اپنے والدین کے ساتھ اس محاذ میں شامل ہو گیا۔ میں اقلیت میں تھا اور مخالفین اکثریت میں۔ ثوبیہ بھی یقیناً قریب کے کمرے سے سن گن لے رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اکرم صاحب اور بیگم اکرم کی باتیں سن کر مجھے پسینا چھوٹ گیا اور حلق خشک ہوگیا۔ سب کچھ سمجھتے ہوئے انجان بن کر میں نے پوچھا ''اس سلسلے میں، میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

بیگم اکرم نے سارے جہاں کی شیرینی اپنے لہجے سے ٹپکاتے ہوئے کہا ''دراصل بیٹا، ہم دونوں تمہیں اپنا بیٹا بنانا چاہتے ہیں۔ ہماری ثوبیہ کو تم سے اچھا شریک حیات مل ہی نہیں سکتا۔''

دونوں میاں بیوی کا گھیراؤ اس قدر سخت تھا کہ جب تک میں نے شادی کی ہامی نہ بھری، وہ میرے پاس سے ٹلے بھی نہیں۔

بلآخر شادی ہوگئی اور ثوبیہ رخصت ہوکر اپنے کمرے سے میرے کمرے میں آگئی۔ اکرم صاحب کے خاندان نے مجھے پھنسانے کے لیے جو جال بچھایا تھا، اس میں میرا پورا وجود قید ہوچکا تھا۔ میری سادہ لوحی اور مجبوریوں کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔

میری اور ثوبیہ کی شادی کو چند ماہ ہی گزرے تھے کہ مجھے اپنی والدہ کی شدید علالت کی خبر ملی۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری جو کہ میرا خواب تھی، میرے ہاتھوں میں تھی۔ اس کے علاوہ وطنِ عزیز کی یادیں بھی مسلسل دل پر دستک دے رہی تھیں۔ میں نے فوری واپسی کا قصد کیا اور اپنا فیصلہ ثوبیہ کو سنایا۔ میری بات سنتے ہی ثوبیہ آگ بگولا ہوگئی۔ وہ کسی طور وطن واپسی کے لیے تیار نہیں تھی۔ صرف ثوبیہ ہی نہیں بلکہ اس کا سارا خاندان ہی میرے اس فیصلے سے بھڑک اٹھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے بارود کے ڈھیر کو آگ لگادی ہو۔ ثوبیہ کی زبان درازی، ہٹ دھرمی اور خودسری کا تو مجھے اچھی طرح علم تھا لیکن میری اتنی سی بات پر اس نے جو ہنگامہ برپا کیا تو میں اس سے مزید متنفر ہوگیا بلکہ مجھے اسلم، اکرم صاحب اور بیگم اکرم سے بھی نفرت ہوگئی تھی۔ ان لوگوں کا ارادہ تھا کہ میں پاکستان تن تنہا جاؤں اور پھر جلد ہی واپس آکر اپنا ذریعۂ معاش یہیں تلاش کروں۔ مجھے اور ثوبیہ کو مستقل ان کے ہی ساتھ رہنا ہوگا کیونکہ ثوبیہ ان کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی ہے۔ اپنے سسرال والوں کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ میں نے بہ آواز بلند اپنا حتمی فیصلہ انہیں سنادیا کہ میرا امریکا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں بلکہ میں مستقل پاکستان میں رہائش اختیار کروں گا۔ ثوبیہ اور اس کے خاندان پر جو قیامت ٹوٹی تھی۔ اس کا مجھے بہ خوبی اندازہ تھا کیونکہ گھر کے ہر فرد نے بلکہ ثوبیہ نے بھی مجھ سے بول چال بند کررکھی تھی۔ میں نے ان لوگوں کی ناراضی اور خفگی کا کوئی اثر ہی نہیں لیا اور اپنی تیاریوں میں مشغول ہوگیا۔

پلین کے ٹکٹ کنفرم ہونے کے بعد میں نے اپنا سامان پیک کرنا شروع کیا۔ سامان کی الٹ پھیر کے دوران اچانک میرے کاغذات میں سے مدحت کی وہی ڈائری نکل آئی جس کی وجہ سے میں نے مدحت جیسی دولت مند، تعلیم یافتہ اور حسین لڑکی کو ٹھکرادیا تھا۔ ڈائری کو دیکھ کر ثوبیہ اس پر یوں جھپٹی جیسے شکاری اپنے شکار پر۔ میں حیرت سے اسے تک رہا تھا۔ اس کا روٹھنا پھولنا ختم ہوچکا تھا اور وہ بے تابی سے ڈائری کی ورق گردانی کررہی تھی۔ اچھی طرح اس کا جائزہ لینے کے بعد اس نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ یہ ڈائری آپ کو کہاں سے ملی؟ کس نے دی؟ اور آپ نے اسے کیوں سنبھال کر رکھا ہوا ہے؟ میں نے اس کے پے در پے سوالات کے جوابات دینے کی بجائے الٹا اس سے سوال کردیا۔ اس ڈائری کا تم سے کیا تعلق ہے؟ ثوبیہ نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا ''دراصل یہ ڈائری میری ہے۔ کالج میں میری ایک دوست تھی مدحت، اسے بھی شعروشاعری سے کافی لگاؤ تھا اس لیے اپنی ڈائری اسے دی تھی کہ وہ میرے کلام میں کچھ اصلاح کردے لیکن اس کے بعد ہی ہم لوگ امریکا چلے آئے اور میری اس سے ملاقات ہی نہیں ہوسکی کہ میں مدحت سے اپنی شاعری کی یہ بیاض واپس لیتی، ویسے آپ کو یہ کہاں سے ملی؟''

مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ میں اس کے سوال کا جواب دیتا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ساری دنیا کی گردش یکدم رُک گئی ہو اور اس کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن بھی تھم گئی ہو۔ تھوڑی دیر کے لیے میں ہوش وحواس سے قطعاً بیگانہ ہوگیا۔ میرا پورا وجود اس وقت ایک اَن دیکھی آگ میں جل رہا تھا اور اس بھڑکتی ہوئی آگ میں مجھے اپنی ماں، بھابی اور بہنوں کے چہرے نظر آرہے تھے جو مدحت کو میرا جیون ساتھی بنانا چاہتے تھے اور ان سب چہروں کے درمیان مدحت کا معصوم چہرہ سب سے نمایاں تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سب میری تحریر شناسی کے فن پر خندہ زن تھے۔ میں جو دوسروں کی تحریروں کا جائزہ لیتے لیتے ایسا گم ہوا کہ کاتبِ تقدیر نے جو تحریر میرے لیے لکھی تھی۔ وہ ہی میں نہ پڑھ سکا۔ میری تحریر شناسی کا فن ہی مجھے لے ڈوبا۔

مکافاتِ عمل

جناب معراج رسول صاحب
السلام علیکم!
مجھے زیادہ اردو نہیں آتی لیکن آپ کا رسالہ شوق سے پڑھتا ہوں۔ اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ بھیج رہا ہوں۔ اچھا لگے تو اردو کو درست کراکر شائع کردیں۔

عظیم خان (حال مقیم دبئی)

میرے خیال میں سبھی لوگ اس بات سے آگاہ ہیں کہ عرب ملکوں کا قانون کیسا ہے؟ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عرب ممالک میں چور ڈاکو اور دیگر مجرم سزا سے نہیں بچ سکتے اور دھوکے باز اور جھوٹے لوگ تو بالکل نہیں بخشے جاتے ہیں۔ میں جو داستان لکھ رہا ہوں۔ یہ بالکل حقیقت ہے۔ اس کے ذریعے آپ لوگوں کو آگاہ کررہا ہوں کہ کہیں بھی، آپ کے ساتھ بھی ایسا ہوسکتا ہے۔ اس لیے اس تحریر کے ذریعے آپ ہوشیار ہوسکتے ہیں۔ ہوا کچھ یوں کہ بہت خرچہ کرنے اور بے انتہا پاپڑ بیلنے کے بعد جب میں نوکری کرنے کی غرض سے ابوظہبی پہنچا تو بہت خوش تھا۔

جب میں یہاں رہنے لگا اور کچھ دن ہوگئے تو میرے بہت سے دوست بن گئے جس میں اپنے ملک، شہر اور علاقے کے علاوہ غیر ملکی بھی شامل تھے۔ آہستہ آہستہ عربی، انگریزی اور دوسری زبانوں کو بھی سمجھنے لگا۔ میں چونکہ لیبر ویزے پر آیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے تقریباً سوا لاکھ برس پہلے اللہ تعالیٰ نے جنات کو پیدا کر کے زمین پر آباد کیا تھا۔ دنیا میں جنوں کی نسل کی بود و باش کے لیے جگہ نہ رہی تو حق تعالیٰ نے کچھ جنات کو ہوا میں رہنے کے لیے جگہ عطا فرمائی اور کچھ جنات پہلے آسمان پر رہنے لگے۔

وہب بن منبہ کی طویل روایت کا ایک حصہ یہ ہے۔

جنات کی افزائش نسل کا یہ عالم تھا کہ ایک حمل سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوتی تھی، جب ان لوگوں کی تعداد ستر ہزار ہوگئی اور بیاہ شادی کا سلسلہ جاری رہا تو پھر ان کی اولاد کی کوئی حد و حساب نہ رہا۔ ابلیس نے ہوالجان کی ایک لڑکی سے شادی کر لی، اس کے بھی بہت سی اولاد پیدا ہوئی۔ جب جن اور جان کی نسل کے لیے دنیا میں رہنے کے لیے جگہ نہ رہی تو اللہ تعالیٰ نے جان کو تو ہوا میں رہنے کے لیے مقام عطا فرمایا اور ابلیس اور اس کی اولاد کو پہلے آسمان میں رہائش کے لیے جگہ دی اور ان دونوں کو اپنی طاعت و عبادت کا حکم بھی دیا۔ اب چونکہ زمین خالی ہو چکی تھی۔ زمین پر خدا کا کوئی ذکر کرنے والا نہ رہا تھا تو آسمان اپنی بلندی اور رہنے والوں کی نسبت زمین پر فخر کرنے لگا۔

بحوالہ: الانس الجلیل از قاضی عبدالمجید حنبلی

مرسلہ: عشرت محمد خان، لاہور

تھا اس لیے لیبر کا کام کرتا رہا جو یہاں کی گرمی کے لحاظ سے بہت ہی سخت ہوتا ہے۔ ہمارے پاکستانیوں اور خاص کر پٹھانوں کے لیے جو کام آسان ہوتا ہے، وہ صرف اور صرف ڈرائیونگ ہے۔ اس لیے کچھ دوستوں کے مشورے پر ڈرائیونگ لائسنس کے لیے ٹرائی کیا اور تقریباً دو سالوں کی بہت محنت اور کوششوں سے ڈرائیونگ لائسنس حاصل کر لیا۔ یہ بھی میری خوش قسمتی تھی ورنہ کچھ لوگ تو دس سال بعد بھی نہیں لے سکے تھے۔ یہاں پاکستان کی طرح ایک گھنٹے میں لائسنس نہیں ملتا۔ میں بہت خوش تھا کیونکہ اب میرا گریڈ لیبر سے اوپر ہو گیا تھا اور ظاہر ہے، آمدنی بھی بڑھ گئی تھی۔ گھر والے بھی بہت خوش تھے۔ ماں، باپ، بہن بھائی سب میری درازی عمر، صحت اور ترقی کے لیے دعائیں کرتے تھے۔

میں جس کمپنی میں بھرتی ہوا، اس کمپنی میں اور بھی بہت سے ڈرائیور کام کر رہے تھے جس میں مجھ جیسے پٹھانوں کے علاوہ انڈین، فلپائنی نیپالی، فلسطینی، اردنی اور ایرانی وغیرہ شامل تھے۔

یہ کمپنی دواؤں کا کام کرتی تھی یعنی دوسرے یورپی ملکوں سے دوا میں خریدنا اور پورے گلف میں میڈیکل اسٹورز میں سپلائی کرنا..... اور ظاہر ہے ڈیلیوری ہم ڈرائیور حضرات لے کر جاتے تھے۔ اس کمپنی میں بہت سی مراعات ہم سب کو حاصل تھیں یعنی میڈیکل، رہائش کے علاوہ جب ہم تین گھنٹے کی مسافت پر جاتے تھے تو پچاس درہم کھانے کے علاوہ ملتے تھے۔ پاکستان آنے جانے کا سالانہ ائرٹکٹ فری تھا۔

لیکن میرا ذہن نہ جانے کیوں بے ایمانی کی جانب راغب ہو گیا یعنی اتنی مراعات کے باوجود بھی میں چوری کرنے لگا۔ مطلب یہ کہ چوری کچھ زیادہ کی بھی نہیں لیکن پھر بھی ''لکھ اور لکھ کا چور ایک جیسا'' والا معاملہ تھا یعنی جب میں پچاس درہم کا پیٹرول گاڑی میں ڈالتا تھا تو پیٹرول پمپ والا جو انڈین تھا اسے بتاتا کہ پیٹرول چالیس درہم کا ڈالو اور مل پچاس درہم کا دے دو جس میں سے دو درہم میں تمہیں دوں گا۔ وہ بھی بہ خوشی ایسا کر دیتا تھا کیونکہ انڈین ہم پاکستانیوں سے زیادہ غریب اور چور ہیں۔ ایسا کرتے کرتے مجھے تقریباً اس کمپنی میں پندرہ سال ہو گئے۔ کمپنی کا مالک جو لوکل عربی تھا، مجھے سالانہ ایک ماہ کی چھٹی کے ساتھ بونس کے علاوہ بھی پندرہ سو، دو ہزار درہم دیا کرتا تھا۔ کمپنی کا مالک ہم سے بہت اچھا تھا اور سب کی مالی امداد کرتا رہتا تھا، کبھی پاکستان میں کوئی ناخوشگوار واقعہ یعنی زلزلہ، طوفان، سیلاب وغیرہ کا اسے پتا چلتا تو اپنی طرف سے ہم کو بلا کے مالی امداد کرتا۔

آٹھ نو سال پہلے جب میری شادی کا اسے پتا چلا تھا کہ عظیم خان اس سال شادی کرنے پاکستان جا رہا ہے تو اس نے مجھے ایک مہینا چھٹی کی جگہ تین مہینے کی چھٹی اور سات ہزار درہم بیوی کو تحفہ دینے کے لیے دیے جس سے میری شادی کے تقریباً تمام زیورات میں نے خرید لیے لیکن مجھے اس پر صبر نہیں تھا۔ میں اور زیادہ بٹورنے کے چکر میں تھا۔

شیطان کی بیوی بچوں کے نام

شیطان نے اپنی بعض اولاد کو بعض مخصوص کاموں پر لگا رکھا ہے، حضرت مجاہد کے قول کے مطابق ان کے نام اور کام یہ ہیں۔

لاقیس، ولہان: یہ دونوں وضو اور نماز پر مامور ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں۔

ہفاف: یہ لڑکا صحرا پر مامور ہے، صحرا میں شیطنت پھیلاتا ہے۔

زلنبور: یہ بازاروں پر مامور ہے، جھوٹی تعریف اور جھوٹی قسموں پر لوگوں کو اکساتا ہے۔

ثبر: مصیبت زدہ لوگوں کو جہالت کے کام کی ترغیب دیتا ہے۔

ابیض: یہ انبیائے علیہم السلام کے دلوں میں وسوسہ ڈالنے پر مامور ہے۔

اعور: یہ شیطان زنا پر مامور ہے، اس وقت یہ ذہن پر سوار رہتا ہے۔

داسم: اس شیطان کی ڈیوٹی یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے گھر میں بغیر سلام کیے یا اللہ کا نام لیے داخل ہوتا ہے تو وہ گھر والوں میں فساد کرانے کا سبب بنتا ہے۔

مطوس: یہ شیطان غلط اور بے بنیاد افواہیں لوگوں میں پھیلاتا ہے۔

بحوالہ: حیوۃ الحیوان از علامہ دمیری

مرسلہ: عشرت محمد خان، لاہور

زیادہ عرصہ اس کمپنی میں گزارنے کی وجہ سے اس کمپنی کے گارڈ میری گاڑی یا مجھے چیک نہیں کرتے تھے۔ اس وجہ سے اکثر میں کمپنی سے کچھ قیمتی دوائیں چوری کر کے میڈیکل اسٹور والے کو آدھی قیمت پر بیچ دیتا تھا۔

آپ لوگ سوچیں گے کہ داستان کا عنوان تو غیر ملکی دوست ہے، جبکہ عنوان چور ہونا چاہیے تھا..... ٹھہریے، میں اسی طرف آتا ہوں۔

ان دنوں ایک انڈین ڈرائیور نیا نیا بھرتی ہوا۔ وہ میرا پکا دوست بن گیا تھا۔ اس سے زیادہ صحبت رہی تو پتا چلا کہ وہ لڑکیوں کے متعلق غلط قسم کے کاروبار میں ملوث تھا، وہ یہ کام چھوڑنا چاہتا تھا، میں نے اسے کافی سمجھایا۔ چونکہ وہ ہندو طرزِ معاشرت کا تھا اس لیے اسے کوئی برائی نہیں سمجھتا مگر میرے سمجھانے بجھانے پر اس کا مردہ ضمیر آہستہ آہستہ زندہ ہو رہا تھا۔

اس کے دل لگا کر کام کرنے کی وجہ سے اس کی نوکری پکی ہو گئی اور وہ اب بہت مطمئن تھا۔ اسی طرح تقریباً سات آٹھ مہینے گزر گئے۔ میں نے دنو دشا کو سب گر بتا دیے۔ یعنی کہاں سے گاڑی میں پیٹرول ڈلوانا ہے، کیسے ڈلوانا ہے۔ یہ دوائی چوری کر کے کس طرح کس میڈیکل اسٹور میں بیچنا ہے، کس ورکشاپ سے گاڑی کی سروس اور پارٹس چینج کرنے کے بہانے کتنا بل بنوانا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

میں اس پر اپنا رعب جمانے کے لیے اور اپنی دانست میں دوستی نبھانے کے لیے اسے سب کچھ بتاتا تھا۔

ان دنوں موبائل فونز کا نیا نیا رجحان چلا تھا۔ انڈین جو بہت چالاک قوم ہے، اسے ان سب چیزوں پر بہت عبور حاصل ہے۔ انگریزی تو انڈین لوگوں کا بچہ بچہ بڑی روانی سے بولتا ہے لیکن اگر ان کی کمپیوٹر نالج کو دیکھیں تو حیران رہ جائیں، وہ لوگ اس معاملے میں بہت آگے بڑھ رہے ہیں۔ بہرحال ہم کو کمپنی کی طرف سے موبائل فون دیے گئے تھے۔ جس پر اکثر کمپنی سے ہمیں ہدایت دی جاتیں کہ ادھر سے ادھر جاؤ یا اتنے لیٹ کیوں ہو یا واپس جلدی آ جاؤ یا اس فارمیسی سے ہو کے آؤ، وغیرہ وغیرہ۔

لیکن دنو دشا، میرے انڈین دوست نے اپنے لیے خود اپنے پیسوں سے ایک جدید ماڈل کا موبائل خریدا تھا جس میں ویڈیو کے علاوہ انٹرنیٹ کی سہولت بھی موجود تھی۔ پتا نہیں اور اس میں کیا کیا تھا لیکن مجھے صرف یہی معلوم تھا اور اس نے بھی یہی بتایا تھا اور میں تو تھا بھی معمولی پڑھا لکھا۔ میں نے تو کمپنی کا موبائل بھی اسی لیے لیا تھا کہ منیجر نے بتایا تھا کہ تمہیں موبائل دینے کا فائدہ ہمیں ہے۔ اس لیے میں نے لے لیا پھر آہستہ آہستہ میں سمجھ گیا کہ اس سیٹ سے فون کس طرح کیا جاتا ہے اور ریسیو کس طرح۔ باقی میسج وغیرہ کا مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ کس طرح لکھا جاتا ہے اور کس طرح بھیجا جاتا ہے۔ جبکہ دنو دشا کا موبائل نہ جانے کیا کیا کام کرتا تھا حتیٰ کہ گانے اور فلمیں بھی اس میں تھیں۔

جب میں کام پر جاتا تو وہ اکثر مجھے اپنے موبائل سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فون کرتا اور پوچھتا تھا کہ عظیم خان بھائی (وہ میرے نام کے ساتھ بھائی ضرور لگاتا تھا) پیٹرول کہاں سے اور کیسے ڈلوانا ہے؟ ورکشاپ کا کام کس سے کروانا ہے اور دیگر چیزیں بھی جو میں بتا بھی چکا تھا لیکن پھر بھی جب وہ مجھے فون کرتا میں اکثر اسے کہتا تھا کہ یار دنود، تم چھوڑو۔ وہ ورکشاپ، میڈیکل اسٹور یا پیٹرول پمپ والے کو موبائل دے دو۔ میں بات کر کے خود اسے سمجھا دیتا ہوں۔ وہ بھی جلدی سے موبائل ان لوگوں کو تھما دیتا اور اس طرح وہ لوگ جو بھی ہوتے، جو زبان بھی بولتے، میں انہیں اچھی طرح سمجھاتا کہ ایسا کام کر کے اتنا بل بناؤ اور اپنا کمیشن لے لو اور یہ بھی بتاتا کہ بھائی آپ نے مجھے پہچانا نہیں، میں عظیم خان ہوں، جو اکثر آپ لوگوں سے کام کرواتا ہوں اور کمیشن دیتا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔

وہ لوگ مجھے فون پر بھی پہچان جاتے اور کہتے ''ہاں ہاں بھائی عظیم خان! ہم نے آپ کو پہچان لیا۔ ہم آپ کے آدمی کا آپ کے کہنے کے مطابق کام کریں گے، آپ کوئی فکر نہ کریں۔''

میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ اس طرح دنود شا میری کالز کو ریکارڈ کر رہا ہے اور اس نے منیجر سے اتنے تعلقات بڑھا لیے ہیں کہ جا کے پوری ریکارڈنگ اسے سناتا ہے اور پھر موبائل سے ٹیپ ریکارڈر پر محفوظ کرتا جاتا ہے۔

جب میرے منیجر غضنفر زیدی کو اچھی طرح پوری معلومات حاصل ہو گئیں تو اس نے ایک دن مجھے آفس میں بلایا اور بہت آرام سے مجھ سے کہا کہ ''بیٹھ جاؤ۔''

میں بیٹھ گیا پھر آفس بوائے کو چائے لانے کا کہا اور مجھ سے مخاطب ہوا ''مسٹر عظیم خان! ہم سے ایسی کیا غلطی ہوئی تھی کہ تم ہمارے ساتھ اس طرح کرنے لگے، ہماری طرف سے تمہیں کیا کمی محسوس ہوئی؟ ہم نے ہر طرح سے آپ کا خیال رکھا پھر بھی آپ نے اس طرح سوچا ..... آخر کیوں.....؟''

میں نے حیرانی سے کہا ''سر! مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے، میں تو اپنی ڈیوٹی پوری ایمان داری سے پوری کرتا ہوں۔ پھر مجھ سے آخر آپ کو کیا شکایت ہے؟''

اس نے طنزیہ لہجے میں کہا ''ہاں، ایسی ایمان داری پر تو خدا بھی آپ کو دوزخ ہی دے گا۔''

پھر اس نے ریکارڈنگ سنانی شروع کر دی۔ میرے تو ہوش اُڑ گئے۔ جیل کی سلاخیں نظروں میں گھومنے لگیں۔ تبھی منیجر نے کہا ''عظیم خان، تم خیبر کا میں کراچی کا۔ ہم لوگ ہم وطن ہیں۔ یہاں کوئی بھی غلطی کریں گے تو ہمارا نہیں ہمارے ملک کا نام بدنام ہوگا۔ اور اگر یہ ریکارڈنگ شیخ تک پہنچ گئی تو جیل تمہارا مقدر ہوگا۔ اگر تم توبہ کر لو تو میں یہ سب ضائع کر دوں گا۔''

میرے لیے یہ بہت بڑی آفر تھی۔ میں نے اپنی فطرت کے خلاف دونوں ہاتھ جوڑ لیے۔ غضنفر زیدی نے میرے سامنے ٹیپ ریکارڈ کے کیسٹ کو توڑ دیا اور کہا کہ انڈین لوگوں سے ہوشیار رہنا۔ یہ شکر میں چھپا کر زہر دینے کے عادی ہیں۔

میں نے اس دن دل سے توبہ کی اور گزشتہ گناہوں کی معافی ہر نماز میں صدقِ دل سے مانگنے لگا۔

اب میں دنود سے ہوشیار ہو گیا تھا مگر زیدی صاحب کے کہنے پر یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ اس کے کرتوت مجھ پر آشکار ہو چکے ہیں۔ کہتے ہیں نا کہ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ میرے بعد اس نے ایک اور پاکستانی صفدر حیات بٹ کو نشانہ بنایا۔ اس کے گرد دوستی کا جال پھیلایا پھر اس کی شکایت سیدھے سیدھے شیخ تک پہنچا دی۔ اتنے دنوں میں اس نے عربی میں روانی پیدا کر کے شیخ تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ اس کی شکایت پر صفدر کو فوراً برطرف کر دیا گیا۔ یہ بات چھپی نہ رہ سکی۔ کمپنی کے ہر ورکر کے علم میں آ گئی۔ اب لوگ اس سے خائف رہنے لگے تھے۔ دل ہی دل میں لوگ اسے بددعا دیتے رہتے تھے۔

اب وہ ترقی کر کے سپروائزر بن چکا تھا۔ تنخواہ بھی بہت زیادہ ہو گئی تھی کہ ایک دن ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔ اس کی دوستی ایک ملیالم نرس سے تھی۔ دونوں انڈین تھے اس لیے ایک دوسرے سے خوب ملتے تھے۔ اس دن ہم سب رات کا کھانا کھا کر لیٹے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک آدمی نے جا کر دروازہ کھولا۔ سامنے ہی شرطے کھڑے تھے۔

''تم میں دنود کون ہے؟'' ایک شرطے نے پوچھا۔

''میں ہوں۔'' دنود نے آگے بڑھ کر کہا۔ شرطے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

اگلے دن پتا چلا کہ نرس کے ساتھ کام کرنے والی ایک فلسطینی نرس نے سازش تیار کی اور اس نرس کے کمرے میں ایک آدمی کو ورغلا کر بھیجا۔ وہ جیسے ہی اندر گیا، ساتھی نرس نے تھانے کو خبر کر دی کہ وہ نرس پیشہ کرتی ہے۔ دنود پر الزام لگا تھا کہ وہ گاہک تلاش کر کے لاتا ہے۔ وہی دنود جو دوسروں کے خلاف سازش کرتا تھا، خود بھی سازش کا شکار ہو گیا۔

شکستِ شبِ تار

محترم مدیر اعلیٰ
سلام تہنیت!
میں اپنے ایک عزیز کی دلچسپ سرگزشت آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں جو اس نے برسوں قبل سنائی تھی۔ وہ میرا ہم نام بھی ہے۔ اس کی کہانی میں دلچسپی کا عنصر بدرجہ اتم ہے، پھر بھی میں نے الفاظ کے اُلٹ پھیر سے کچھ گلیمرائز کر دیا ہے تاکہ قارئین کو پسند آجائے۔

شہریار، (لاہور)

کوارٹر گارڈ کے گھنٹے نے دس بجائے تو تمام کمروں کی کھڑکیاں کھٹا کھٹ بند ہونے لگیں۔

اشرف بھی فوراً اٹھا اور لائٹ بند کر دی۔

''ارے یار! تجھے بہت جلدی ہے۔'' میں نے جھنجلا کر کہا ''ذرا صبر کر۔''

''تو کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں نہیں ہے شہریار!'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا ''یہ پاکستان ملٹری اکیڈمی ہے۔ تو جانتا ہے کہ ہمیں دو دن پہلے وارننگ بھی مل چکی ہے۔''

''یار! ہم بھی انسان ہیں، روبوٹ نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔

''او بھائی!'' وہ بیزاری سے بولا ''اس وقت میں تیری بک بک سننے کے موڈ میں نہیں ہوں، تجھے اکیڈمی میں آئے ہوئے دو مہینے ہو گئے ہیں اور تو ابھی تک اس ماحول کا عادی نہیں ہوا۔'' وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

میں اتنی جلدی سونے کا عادی نہیں تھا اس لیے لحاف میں دبکا ہوا پیچ و تاب کھاتا رہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہاں پر قیدیوں والی زندگی گزارنا پڑے گی ورنہ میں بھول کر بھی اِدھر کا رخ نہ کرتا۔ دوسروں کی مرضی سے سونا اور جاگنا، کھانا پینا، یہ سب قید نہیں تو اور کیا تھا؟

میرا روم میٹ اشرف ریٹائرڈ صوبے دار میجر کا بیٹا تھا۔ فوجی ملازمت گویا اسے ورثے میں ملی تھی۔ اس کے والد، دادا اور پردادا بھی فوج میں ملازمت کرتے آئے تھے۔

وہ بڑے فخر سے بتایا کرتا تھا کہ میرے دادا جی کو دوسری جنگِ عظیم میں ملٹری کراس ملا تھا اور ابا جی کو اکہتر کی پاک بھارت جنگ میں ستارۂ جرأت ملا تھا۔

''اب تو نشانِ حیدر حاصل کرنا۔'' میں طنزیہ لہجے میں کہتا تھا۔

''یارِ شہریار!'' وہ حسرت سے کہتا ''اللہ تیری زبان مبارک کرے۔ نشانِ حیدر تو بہت نصیب والوں کو ملتا ہے۔''

میں کچھ دیر تو بستر پر کروٹیں بدلتا رہا، پھر لحاف کے اندر گھس کر اپنا سیل فون نکالا اور روبی کو کال کرنے لگا لیکن وہاں ایک مسئلہ یہ تھا کہ بند کمرے میں سگنل نہیں آتے تھے۔ کسی سے بات کرنے کے لیے باہر نکلنا پڑتا تھا۔

میرا تعلق بزنس مین گھرانے سے تھا۔ لاہور کے علاقے گلبرگ میں ہماری وسیع و عریض کوٹھی تھی۔ فیصل آباد، گجرات اور گوجرانوالہ میں ہماری کئی ملیں تھیں۔

سارا کاروبار اس وقت ابو کے کنٹرول میں تھا۔ میں بھی اپنے چاچو اور پاپا کی طرح دادا جان کو ابو ہی کہتا تھا۔ یہ کاروبار ابو نے بہت محنت سے جمایا تھا۔ پھر پاپا اور چاچو کی محنت سے وہ روز بہ روز پھیلتا ہی چلا گیا۔

میں اپنے والدین کا اکلوتا تھا اس لیے میرے ناز بھی زیادہ اُٹھائے جاتے تھے۔ عرفان چاچو کی بھی صرف ایک ہی بیٹی تھی روبینہ!

ابو ہم دونوں ہی کو حد سے زیادہ چاہتے تھے۔ ان کے لاڈ پیار کی وجہ سے میں کچھ زیادہ ہی بگڑ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر پاپا نے مجھے لارنس کالج گھوڑا گلی میں بھجوا دیا کہ وہاں رہ کر میں مزید بگڑنے سے بچ جاؤں گا۔

واقعی ہوا بھی یہی، وہاں رہ کر میری شخصیت میں مزید نکھار پیدا ہو گیا۔

وہ نہ جانے کون سی گھڑی تھی جب میں نے آرمی میں جانے کا فیصلہ کیا۔ میرے ساتھ ایک لڑکا صفدر بھی پڑھتا تھا۔ اس کے والد لیفٹیننٹ جنرل تھے۔ وہ جب بھی صفدر سے ملنے آتے تھے، میں ان کو دیکھ کر مرعوب ہو جاتا تھا۔ وہ آرمی افسران کی مخصوص سیاہ گاڑی میں آتے تھے، جس کی خصوصی نمبر پلیٹ کے اوپر ایک اور پلیٹ بھی جس پر چمک دار ستارے تھے۔ گاڑی کے ایک جانب بونٹ پر ان کے ڈویژن کا جھنڈا لہراتا تھا۔ ان کی گاڑی کے پیچھے آرمی کے مسلح جوانوں کی ہارڈ ٹاپ ٹویوٹا جیپ ہوتی تھی۔ ان کا ڈرائیور بھی مسلح ہوتا تھا۔

گاڑی رکتے ہی وہ پھرتی سے اُترتا اور جنرل صاحب کے لیے عقبی نشست کا دروازہ کھول کر مؤدب انداز میں کھڑا ہو جاتا۔ ان کے آنے سے اسکول میں بھی ایک ہلچل سی مچ جاتی۔ اسکول کے سخت گیر پرنسپل رضوان صاحب، جنرل صاحب کے سامنے گویا بچھ جاتے۔ ان دنوں ایک خبر یہ بھی تھی کہ صفدر کے والد ہی شاید آئندہ چیف آف اسٹاف ہوں گے۔

وہ تھے بھی بہت غصے والے۔ چہرے پر ہمیشہ ایک خشونت سی طاری رہتی تھی۔ وہ اسکول میں میرے سوا کسی سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے تھے، مجھ سے بھی اس لیے بات کر لیتے تھے کہ میں صفدر کا بہترین دوست تھا اور ہم دونوں ہاسٹل کے ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔

ان کے برعکس جب میرے پاپا یا چاچو اسکول آتے تھے تو ان کی وہ پذیرائی نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ وہ لوگ ارب پتی تھے اور بزنس کے حلقے میں ان کا نام تھا۔

میں نے جب ابو کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ حیران رہ گئے۔

''تو ملازمت کرے گا؟'' انہوں نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا ''جتنی تنخواہ تجھے ملے گی، اس سے دگنا تو ابھی خرچ کر دیتا ہے۔''

''لیکن ابو، یہ بھی تو دیکھئے کہ فوجی افسروں کی عزت کتنی ہوتی ہے؟''

''صرف عزت اور پھول پھاں سے زندگی نہیں گزرتی بیٹا جی!'' ابو نے کہا ''ہماری تو سات پشتوں میں کسی نے ملازمت نہیں کی۔''

''تو کیا ہوا ابو!'' میں نے ہنس کر کہا ''اب آپ کی آٹھویں پشت ملازمت کر لے گی۔''

اس وقت پاپا اور چاچو آ گئے۔ ابو نے پاپا سے کہا ''لو بھئی سلطان! تمہارا بیٹا تو ہاتھ سے گیا۔ یہ بے وقوف ملازمت کرنا چاہتا ہے۔'' انہوں نے یوں کہا جیسے میں ملازمت نہیں، چوری کرنا چاہتا ہوں۔

پاپا بھی چونک اُٹھے اور بولے ''کیوں بھئی، تمہیں ملازمت کی کیا ضرورت پڑ گئی؟''

''پاپا! میں فوجی افسر بننا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا، پہلے تم اپنی تعلیم تو مکمل کر لو۔'' پاپا نے کہا ''پھر اس بارے میں بات کریں گے۔''

''میں اس سال اے لیول کر لوں گا۔ آرمی میں جانے کے لیے اتنی ہی تعلیم کافی ہوتی ہے۔''

''تم کم سے کم گریجویشن تو کر لو۔'' چاچو نے کہا۔

''بی اے کی ڈگری تو ملٹری اکیڈمی سے مل جاتی ہے۔'' میں نے کہا۔

اس وقت تو بات آئی گئی ہو گئی۔

روبینہ اس وقت میٹرک میں تھی۔ ابو نے کئی برس پہلے ہم دونوں کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ اس پر پاپا نے کہا تھا کہ ابو! کل نہ جانے حالات کیسے ہوں، بچوں پر ہم اپنی مرضی نہیں تھوپ سکتے۔''

''اگر بچوں کی مرضی نہ ہو تو یہ رشتہ مت کرنا۔'' ابو نے کہا ''لیکن ابھی تم دونوں بتاؤ کہ تم اس رشتے پر راضی ہو؟'' انہوں نے پاپا اور چاچو سے پوچھا۔

''ابو! مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟'' پاپا نے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے عرفان؟'' انہوں نے چاچو سے پوچھا۔

''ابو! میں انکار کرنے والا کون ہوتا ہوں؟'' چاچو نے کہا۔

''بس، پھر یہ طے ہو گیا کہ شہریار اور روبی کی شادی ہو گی۔'' ابو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ''ہاں، اگر ان دونوں میں سے کسی کی مرضی نہ ہو گی تو میں اس رشتے پر زور بھی نہیں دوں گا۔'' ابو نے کہا۔

میں ان دنوں پانچویں کلاس میں پڑھتا تھا اور روبی نے دوسری کلاس میں جانا شروع کیا تھا۔ مجھے گول مٹول، سرخ و سفید اور پھولے پھولے گالوں والی روبی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ روتی ہوئی مجھے زیادہ اچھی لگتی تھی اس لیے میں کسی نہ کسی بہانے اسے تنگ کر کے رُلاتا رہتا تھا۔

اس وقت نہ مجھے اتنا شعور تھا، نہ روبی کو! جب میں مری کے اسکول میں پڑھنے کے لیے گیا تو کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا۔

میں ان دنوں آٹھویں کلاس میں تھا اور گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ ان دنوں روبی کی خالہ کا بیٹا احمر اور بیٹی سدرہ بھی آئی ہوئی تھی۔ وہ لوگ راولپنڈی میں رہتے

مجاز لکھنوی ایک بار پنجاب گئے۔ واپسی پر کسی نے پوچھا ''پنجاب کیسا لگا؟''

بولے ''بہت ہی اچھا..... مگر یار، وہاں پنجابی بہت ہیں۔''

تھے۔ احمر مجھ سے دو تین سال بڑا تھا اور ان دنوں میٹرک میں پڑھ رہا تھا۔ سدرہ تقریباً روبی کی ہم عمر تھی۔ ہم لوگ ساری دوپہر اودھم مچاتے تھے، درختوں پر چڑھ کر آم توڑتے، آنکھ مچولی کھیلتے اور سوئمنگ پول میں غوطے لگاتے۔

اس دوپہر بھی میں پکے پکے آموں کی تلاش میں درخت پر چڑھا ہوا تھا۔ میں نے بڑا سا ایک آم توڑ کر روبی کی طرف پھینکا، جسے اس نے فوراً ہی کیچ کر لیا۔

احمر نے وہ آم روبی سے چھیننے کی کوشش کی۔ روبی نے اسے آم دینے سے انکار کر دیا۔ احمر نے بُری طرح اس کا نرم و نازک ہاتھ مروڑا اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کر کے اس سے آم چھین لیا۔

میں درخت پر چڑھا ہوا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ احمر نے روبی پر ہاتھ اُٹھایا تو میرا خون کھول اُٹھا۔ میں نے وہیں سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس کی ایک آدھ ہڈی ٹوٹ جاتی لیکن میں ان درختوں سے کودنے کا عادی تھا اس لیے مجھے معمولی سی چوٹ آئی۔ میں اپنی چوٹ بھول کر احمر کی طرف لپکا اور اس کا گریبان پکڑ لیا۔ وہ مجھ سے عمر میں بڑا تھا اور قد میں بھی۔

وہ بپھر کر بولا ''میرا گریبان چھوڑ شہریار!''

''تم نے روبی کو کیوں مارا؟'' میں چیخ کر بولا۔

اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ مجھے بھی رسید کر دیا اور بولا ''تو بہت بڑا روبی کا ہمدرد ہے۔''

ہم سوئمنگ پول کے نزدیک کھڑے تھے۔ میں جانتا تھا کہ احمر کو تیرنا نہیں آتا ہے اور وہ پانی میں جاتے ہوئے ڈرتا ہے۔

میں نے اچانک اس کے سینے پر زوردار ٹکر ماری اور اسے پیچھے کی طرف دھکا دیا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن چھپاک سے سوئمنگ پول میں جا گرا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں نے بھی سوئمنگ پول میں چھلانگ لگا دی۔ احمر پانی میں بُری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ میں نے اس کے بال پکڑ کر اس کے چہرے پر ایک اور بھرپور ٹکر ماری۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی لیکن میں مچھلی کی طرح دوسری طرف نکل گیا۔ میں تو بچپن سے سوئمنگ کرتا آیا تھا۔ سوئمنگ پول کا پانی سرخ ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی احمر ہاتھ پاؤں مار کے ایک دفعہ پھر پانی کی سطح پر ابھرا۔

سدرہ چیختی ہوئی اندر بھاگی۔ مجھے بھی یہ خوف پیدا ہوا کہ احمر کہیں مر ہی نہ جائے۔

میں نے پلٹ کر اس کے بال پکڑے اور اسے پول کے اس حصے کی طرف کھینچا جہاں پانی کم تھا۔

احمر نے خوف زدہ ہو کر دوبارہ مجھے پکڑنا چاہا لیکن میں تیزی سے دوسری طرف ہو گیا۔ اس کے بال البتہ میرے ہاتھ میں تھے اور میں اسے کنارے کی طرف کھینچ رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ ڈوبتا ہوا آدمی اپنے ساتھ بچانے والے کو بھی لے ڈوبتا ہے۔ ہمارے سوئمنگ کے ٹیچر نے بھی بار بار یہ بات بتائی تھی کہ ڈوبتے ہوئے آدمی کو بچاتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا کہ وہ تم سے لپٹنے نہ پائے۔ اگر وہ تم سے لپٹ گیا تو پھر تمہیں بھی ساتھ ہی لے ڈوبے گا۔

یہ کوئی دریا نہیں تھا لیکن اچھا خاصا گہرا سوئمنگ پول تھا۔

میں کسی نہ کسی طرح احمر کو کھینچ کر پول کے اس حصے کی طرف لے گیا جہاں پانی برائے نام تھا۔

اس وقت اندر سے پاپا، امی، خالہ جان اور چاچی بھاگتے ہوئے پول کے پاس پہنچیں۔ خالہ جان اور سدرہ تو بُری طرح رو رہی تھیں۔

''احمر کو کچھ نہیں ہوا ہے باجی!'' امی نے کہا ''وہ بالکل ٹھیک ہے۔''

پاپا نے بھی اس حالت میں پول میں چھلانگ لگا دی اور احمر کو اُٹھا کر باہر لے گئے۔ وہ خوف اور ناک پر لگنے والی چوٹ سے نڈھال تھا لیکن ہوش میں تھا۔

میں جانتا تھا کہ اب پاپا مجھے اچھی طرح ڈانٹ پلائیں گے۔ میں نے غوطہ لگایا اور پھر میں غائب ہو گیا۔

''شہریار!'' پاپا نے درشت لہجے میں کہا ''باہر آؤ۔''

میں تیرتا ہوا کنارے کی طرف آیا اور آہستہ آہستہ پول کی سیڑھیوں کی طرف آ گیا۔

اس وقت روبی نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور وہ ابو کو بلا لائی۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' ابو کی گرج دار آواز سن کر میری جان میں جان آئی کہ اب پاپا مجھے کچھ نہیں کہہ سکیں گے۔

میں سر جھکائے ہوئے پول سے باہر نکل آیا۔

''تم نے احمر پر ہاتھ کیوں اٹھایا؟'' امی نے درشت لہجے میں پوچھا ''پھر اسے پانی میں دھکا دے دیا؟''

''اس نے پہلے روبی کو مارا تھا۔'' میں نے کہا ''اس نے روبی پر ہاتھ کیوں اُٹھایا؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''تو کیا روبی کا ٹھیکے دار ہے؟'' خالہ جان نے چیخ کر کہا۔

''ہاں، روبی اس کی ہونے والی بیوی ہے۔'' ابو نے ترش لہجے میں کہا ''یہ اتنا بڑا ہو گیا ہے، اسے یہ بھی تمیز نہیں کہ کسی لڑکی پر ہاتھ نہیں اُٹھانا چاہیے۔''

ابو اس کے بعد بھی بہت کچھ کہتے رہے لیکن میرے کانوں میں تو ان کا یہی جملہ گونج رہا تھا ''ہاں، روبی اس کی ہونے والی بیوی ہے۔''

احمر کی ناک سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ اس کی ناک سوج کر پکوڑا ہو گئی تھی۔

''احمر!'' خالہ جان نے درشت لہجے میں کہا ''اُٹھو ہم اسی وقت یہاں سے جائیں گے۔''

''ارے باجی! بچوں کی لڑائی میں آپ بھی جذباتی ہو گئیں؟''

''یہ بچہ ہے!'' خالہ جان نے میری طرف اشارہ کیا۔

''نہیں، احمر بچہ ہے۔'' چاچی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اس دن امی نے بہت مشکل سے خالہ جان کو منایا لیکن اس واقعے کے بعد مجھے بہت شدت سے یہ احساس ہوا کہ میں روبی کی تکلیف اور ہتک برداشت نہیں کر سکتا۔

روبی اچانک مجھے اچھی لگنے لگی۔

وہ اس وقت چھوٹی تھی، شاید چوتھی یا پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ اسے ان باتوں کی سمجھ نہیں تھی لیکن ابو کی بات سننے کے بعد وہ بھی مجھ سے شرمانے لگی تھی۔

جب میں اے لیول سے فارغ ہوا تو روبی میٹرک کر چکی تھی۔

میں چھٹیوں میں گھر آیا تو وہ اپنی خالہ کے گھر راولپنڈی گئی ہوئی تھی۔ مجھے اس کے بغیر گھر بالکل سونا سونا اور ویران لگ رہا تھا، اس پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ جب اسے معلوم تھا کہ میں چھٹیوں میں گھر آؤں گا تو وہ گئی کیوں؟

میں بھی لاہور میں نہیں ٹھہرا اور اپنے ایک دوست شہزاد خان سے ملنے چلا گیا۔

شہزاد خان علاقہ غیر کے ایک سردار کا بیٹا تھا اور اکثر مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دیتا رہتا تھا۔

میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ روبی کا فون آ گیا۔

''ہاں روبی! بولو۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''شیری! تم لاہور آئے اور چلے بھی گئے۔ تم سے ایک دو دن بھی انتظار نہ ہو سکا؟'' اس نے شکوہ کیا۔

''جب تمہیں میری آمد کا علم تھا تو تم گئیں ہی کیوں؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''اب اتنی مشکل اردو بولو گے تو میں کیا خاک سمجھوں گی؟''

میں جانتا تھا کہ وہ موضوع بدلنے کی کوشش کر رہی ہے ورنہ انگلش میڈیم اور کونونٹ میں پڑھنے کے باوجود ابو نے خاص طور پر ہمیں اردو اور تھوڑی بہت فارسی کی تعلیم بھی دلائی تھی۔

آپ کو یہ سن کر شاید حیرانی ہو گی کہ انہوں نے اس دور میں بھی ہم سے تختی لکھوائی تھی۔

''بیلو شیری!'' روبی نے کہا ''بس گھر پہنچ جاؤ۔ میں بھی کل تک پہنچ جاؤں گی۔''

''لیکن تم گئی ہی کیوں تھیں؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''بھئی، میں تو نہیں جا رہی تھی لیکن احمر بھائی اور سدرہ آ گئے۔ وہی مجھے ضد کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔''

''اور تم چلی گئیں؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا ''میں تو اپنے دوستوں کے ساتھ سوات، کاغان، ناران وغیرہ جا رہا ہوں۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا ''جب تک تمہارا دل چاہے، پنڈی میں رہو۔''

''شیری! میری بات.....''

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ احمر کا نام سن کر میرا موڈ ایک دم خراب ہو گیا تھا۔ مجھے اس سے اسی دن سے نفرت ہو گئی تھی جب اس نے روبی کو تھپڑ مارا تھا۔ اس دن کے بعد سے میں نے اس سے بات کرنی چھوڑ دی تھی۔

میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بجی، اسکرین پر روبی کا نام دیکھ کر میں نے لائن کاٹ دی۔ اس نے دوبارہ کال کی تو میں نے فون بھی آف کر دیا۔

''اوئے شہریار خان!'' شہزاد نے کہا ''تو کیوں اپنی منگیتر کو پریشان کرتا ہے؟'' کالج میں سبھی جانتے تھے کہ میری منگنی ہو چکی ہے۔ یہ بات میں نے صرف صفدر کو بتائی تھی اور اس نے پوری کلاس میں پھیلا دی تھی۔

''میں اسے پریشان کرتا ہوں؟'' میں نے منہ بنا کر کہا ''یا وہ مجھے غصہ دلاتی ہے۔ جب اسے معلوم تھا کہ میں گھر آنے والا ہوں تو وہ لاہور سے گئی ہی کیوں؟''

''اوئے تیرا دماغ تو بالکل ہم پٹھانوں والا ہے۔'' شہزاد خان ہنس کر بولا۔ ''میں بھی شاید یہ برداشت نہ کرتا لیکن وہ بے چاری بھی تو ابھی مجبور ہے، تجھ سے شادی تو نہیں ہوئی ہے نا۔''

''یار شہزاد! تو اس کی وکالت کرے گا تو میں یہاں سے بھی چلا جاؤں گا۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''اچھا چھوڑ!'' شہزاد نے کہا ''تو نے ابھی روبی سے جھوٹ بولا تھا نا کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ سوات اور کاغان وغیرہ جا رہا ہوں۔ یار، ویسے آئیڈیا اچھا ہے۔ ہم واقعی وہاں کی سیر کو چلتے ہیں۔ میں اپنا آدمی بھیج کر اکبر خان کو بھی بلا لیتا ہوں۔''

''نہیں یار!'' میں نے سنجیدگی سے کہا ''اکبر خان سارا وقت اپنے قبیلے کی بڑائی، اپنے خاندان کی بہادری اور اپنی نشانہ بازی کی ڈینگیں مارتا رہے گا۔ اسے مت بلاؤ، ہم دونوں ہی چلتے ہیں۔''

اکبر خان بھی شہزاد کی طرح علاقۂ غیر میں رہتا تھا لیکن اس کا گاؤں وہاں سے بھی خاصا دور تھا۔ وہاں تو سیل فون کے سگنلز تک نہیں جاتے تھے۔

''چل، تو کہتا ہے تو اسے نہیں بلاتا، اس کے ساتھ اچھی خاصی تفریح رہتی۔''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ چند لمحے بعد بولا ''ہم کل صبح یہاں سے نکل جائیں گے۔ میں ابھی جا کر بابا سے اجازت لے لوں۔''

> مولانا شوکت علی جن خوبیوں کی وجہ سے ملک بھر کے نوجوانوں کے محبوب تھے، اس میں ان کی بے پناہ ظرافت کو بہت دخل تھا۔ ان کی ہر بات اور ہر حرکت میں ہنسنے مسکرانے کا سامان موجود ہوتا تھا۔
>
> ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ آپ کے بڑے بھائی ذوالفقار علی کا تخلص گوہر ہے اور محمد علی کا جوہر ہے، آپ کا تخلص کیا ہے؟
>
> مولانا شوکت علی نے بے تکلف جواب دیا ''شوہر۔''
>
> مرسلہ: عنایت علی امجد، لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے اپنا سیل فون آف ہی کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ روبی لاہور پہنچ کر ابو سے فون کرائے گی۔ ان کی بات تو میں ٹال نہیں سکتا تھا اس لیے میں نے سیل فون ہی آف کر دیا تھا۔

وہ چھٹیاں ہم نے سوات، کاغان، ناران اور جھیل سیف الملوک کی سیر میں گزار دیں۔

کالج کھلنے سے دو دن پہلے میں لاہور پہنچا۔

مجھے دیکھتے ہی ابو نے کہا ''شہریار! تو نے اپنا سیل فون بند کیوں کر دیا تھا؟''

''نہیں ابو! میرا سیل فون تو کھلا ہے۔ اصل میں موسم کی خرابی کی وجہ سے پہاڑی علاقوں میں سگنل نہیں آتے۔''

ابو نے میری اس بات پر یقین کیا یا نہیں لیکن وہ کچھ بولے نہیں۔

میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور نہا دھو کر تازہ دم ہو کر باتھ روم سے باہر نکلا تو روبی میرے بیڈ پر نیم دراز تھی۔

میں نے اسے نظر انداز کر کے باہر نکلنا چاہا تو اس نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ اس عالم میں مزید حسین لگ رہی تھی۔

''شیری! تمہیں ذرا بھی میرا خیال نہیں ہے؟'' روبی نے کہا اور اس کی خوبصورت آنکھیں برسنے لگیں۔

''تم رو کیوں رہی ہو روبی!'' میں بوکھلا کر بولا تھا، اس کے آنسو میری سب سے بڑی کمزوری تھے۔

''تم تو بچپن سے مجھے رلاتے آئے ہو۔'' روبی نے کہا ''تم ہی تو کہتے تھے کہ تم روتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہو۔''

''یہ تو بچپن کی بات ہے روبی!'' میں نے کہا ''تم روتی ہوئی اب بھی مجھے اچھی لگتی ہو لیکن اب میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ بس تم نے احمر کا نام لے کر میرا موڈ خراب کر دیا ورنہ شاید میں دوسرے ہی دن لوٹ آتا۔''

''مجھے خود بھی بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔'' روبی نے کہا ''اوّل تو مجھے جانا ہی نہیں چاہیے تھا، چلی بھی گئی تھی تو مجھے احمر بھائی کا نام نہیں لینا چاہیے تھا۔ میں جانتی ہوں کہ تم ان کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے، پلیز شیری! معاف کر دو۔''

''ایک شرط پر!'' میں نے کہا ''تم پہلے تو اپنا حلیہ درست کرو۔ یہ روتی صورت ٹھیک کرو اور مجھے اپنے ہاتھوں سے بہترین قسم کی کافی بنا کر پلاؤ۔''

''بس اتنی سی بات!'' روبی مسکرائی اور کمرے سے بھاگ گئی۔

کمرے میں دیر تک اس کی سانسوں اور بدن کی خوشبو چکراتی رہی اور میں سوچتا رہا کہ اس ایک سال میں روبی نے کیا رنگ روپ نکالا ہے۔

☆☆☆

میں اے لیول کا امتحان دے کر واپس لاہور آ چکا تھا، جب میں نے یہ انکشاف کیا کہ میں نے آرمی میں کمیشن کے لیے درخواست دے دی ہے۔

پاپا یہ سن کر بپھر گئے ''شہریار! تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے۔ تم پر ابو کی بات کا بھی اثر نہیں ہوا؟''

''پاپا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگوں کو اعتراض کیوں ہے؟''

''اور تم نے بھی کبھی یہ بات سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ ہمیں اس پر اعتراض کیوں ہے؟ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں بیٹا! ہماری تو پشتوں میں کسی نے ملازمت نہیں کی ہے، وہ بھی فوجی ملازمت! تم وہاں کی سختیاں برداشت ہی نہیں کر پاؤ گے اور ٹریننگ ادھوری چھوڑ کر آ جاؤ گے۔ اس سے ہماری مزید بےعزتی ہو گی۔''

''میں بھی کوئی موم کا بنا ہوا نہیں ہوں پاپا!'' میں نے سنجیدگی سے کہا ''جو لوگ آرمی میں ملازمت کرتے ہیں، وہ بھی تو ہماری طرح کے انسان ہی ہوتے ہیں۔''

ان کے بعد ابو اور چاچو مجھے دیر تک سمجھاتے رہے لیکن میں اپنی ضد پر اڑا رہا۔

آخر ان لوگوں نے میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

اس دن شام کو میں روبی کو اپنے ساتھ لانگ ڈرائیو پر لے گیا۔ وہ بھی میرے جانے سے بہت اداس تھی۔

اس نے کہا ''شیری! خدا خدا کر کے تو تم مری سے واپس آئے تھے، اب پھر مجھ سے دور ہو جاؤ گے۔''

''وہی سال کی تو بات ہے روبی!'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ہاں، بس ایک خوشی ہے کہ تم فوجی وردی میں بہت اچھے لگو گے لیکن مجھ سے وعدہ کرو کہ تم وہاں سے روز مجھے فون کرو گے؟''

''ہاں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہاں سے تمہیں فون کرتا رہوں گا۔ تمہارے بغیر میرا دل بھی نہیں لگے گا، بس دو سال

گزر جائیں پھر تم روبینہ احسان کے بجائے روبینہ شہریار ہو جاؤ گی۔''

روبی نے شرما کر سر جھکا لیا۔

میں نے آرمی کے تمام ٹیسٹ اور انٹرویوز پاس کر لیے اور مجھے منتخب کر لیا گیا۔ مجھے دس دن بعد پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول جانا تھا۔

میں جانے کی تیاریوں میں اتنا مصروف ہوا کہ اپنی سالگرہ کا دن تک بھول گیا۔

ہمیشہ کی طرح ابو نے بہت دھوم دھام سے میری سالگرہ منائی اور فیصل آباد کی ایک ٹیکسٹائل مل مجھے تحفے میں دے دی۔

اس دن روبی بھی بہت خوش تھی۔ اس نے مجھے پلاٹینیم کی ایک انگوٹھی تحفے کے طور پر دی جس پر نمایاں انداز میں انگریزی کا حرف ''S'' بنا ہوا تھا۔

ہم لوگ دیر تک لان میں بیٹھے باتیں کرتے رہے، پھر کافی رات گئے میں نے روبی کو رخصت کیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

میرا کمرا کوٹھی کی بالائی منزل پر تھا۔ نیچے ہال میں سے ایک زینہ اوپر کی طرف جاتا تھا۔

میں سیڑھیوں کی طرف بڑھا تو میرے کانوں میں ابو کی آواز آئی۔ ان کا کمرا زینے کے بالکل نزدیک تھا اور اس وقت تو ان کے کمرے کی کھڑکی بھی کھلی ہوئی تھی۔

مجھے حیرت ہوئی کہ ابو ابھی تک جاگ رہے ہیں۔

میں نے سیڑھیوں پر قدم رکھا ہی تھا کہ ابو کی زبان سے اپنا نام سن کر چونک اُٹھا۔ ''کیوں تجھے شہریار کی اتنی فکر ہے؟''

میں اپنا نام سن کر چونک اُٹھا اور اندر کی آوازوں پر کان لگا دیے۔ یہ انتہائی غیر اخلاقی حرکت تھی لیکن مجھے تجسس تھا کہ ابو کس سے بات کر رہے ہیں؟

''وہ ابھی بچہ ہے ابو!'' چاچو کی آواز آئی ''آپ نے اتنی بڑی ٹیکسٹائل مل اس کے نام کر دی۔''

''تو پھر؟'' ابو نے پوچھا ''تمہیں کیا پریشانی ہے؟''

''مجھے پریشانی یہ ہے کہ آپ نے میرا حق مارا ہے۔'' چاچو نے کہا، ان کی بات سن کر مجھے دھچکا سا لگا۔

''عرفان!'' ابو نے درشت لہجے میں کہا ''تو ہوش میں تو ہے؟ وہ مل میری ہے، میں نے اپنی محنت سے بنائی ہے۔ میں اسے شہریار کو دوں یا روبی کو، تو مجھ سے پوچھنے والا کون ہے؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے علاوہ بھی تو فیصل آباد میں دو ملیں ہیں، گوجرانوالہ اور گجرات میں تین تین ملیں ہیں۔ یہ سب تم دونوں بھائیوں ہی کی تو ہیں۔ میں کیا انہیں قبر میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا؟''

میں چاچو کا بہت احترام کرتا تھا لیکن اس بات سے وہ میری نظروں سے گر گئے تھے۔

میں اسی وقت اپنے کمرے میں پہنچا۔ ابو کی دی ہوئی مل کی فائل اُٹھائی اور اسے لے کر ابو کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

مجھے دیکھ کر ابو حیران رہ گئے۔ چاچو بھی حیرت سے مجھے گھور رہے تھے۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''چاچو! آپ کو یہی پریشانی ہے کہ ابو نے وہ مل میرے نام کیوں کر دی ہے؟ یہ لیں، اس کے کاغذات آپ رکھیں۔ مل میرے نام ہو یا آپ کے نام! کاروبار کی دیکھ بھال تو آپ ہی کریں گے۔ میں تو ویسے بھی اب آرمی میں جا رہا ہوں، میرے پاس کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے وقت ہی کب ہو گا۔''

''نہیں..... بیٹا..... میرا..... مقصد..... نہیں تھا۔'' چاچو ہکلا کر بولے ''میں تو..... ابو سے صرف..... یہ کہہ رہا تھا..... کہ شہریار ابھی بچہ ہے، وہ.....''

''آپ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے چاچو! مجھے کاروبار کی سمجھ بوجھ ہے نہ میرے پاس وقت ہو گا۔ یہ فائل آپ ہی رکھیں۔ خون کے رشتے ان کاغذی بندھنوں کے محتاج نہیں ہوتے چاچو! مل آپ کے پاس رہے گی تو کیا فرق پڑے گا۔ رہے گی تو ہماری ہی نا!''

''نہیں بیٹا!'' چاچو نے جلدی سے کہا ''میں ابو سے کچھ اور کہہ رہا تھا، یہ فائل تو ہی رکھ۔''

''دیکھا عرفان!'' ابو نے کہا ''میرا پوتا کتنا سمجھ دار ہے۔ وہ اب اتنا بچہ بھی نہیں ہے جتنا تو اسے سمجھ رہا ہے۔'' پھر ابو مجھ سے بولے ''شہریار! تو اپنا تحفہ اپنے پاس رکھ۔ اس کی دیکھ بھال تو یہی لوگ کریں گے۔''

میں چند دن بعد ملٹری اکیڈمی چلا گیا۔ وہاں میرے ساتھ کیا بیتی یہ ایک الگ داستان ہے۔ بس دن رات کی مشقت نے مجھے بہت مضبوط کر دیا تھا۔

میرا ایک سال وہاں پورا ہوا تو میں اپنے بیچ کے تمام کیڈیٹس میں سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ سوئمنگ کا تو خیر مجھے بچپن ہی سے شوق تھا۔ اب میں نشانہ بازی میں بھی طاق ہو چکا تھا۔

ان ہی دنوں مجھے ابو کے انتقال کی اطلاع ملی۔

میں اکیڈمی کے کمانڈنٹ میجر جنرل شعیب کے پاس پہنچا اور انہیں بتایا کہ میرے دادا کا انتقال ہو گیا ہے اس لیے مجھے ایک ہفتے کی چھٹی چاہیے۔

''بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔'' جنرل صاحب نے کہا اور اُٹھ کر شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا تو میرے وہ آنسو بُری طرح بہنے لگے جنہیں میں اب تک ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ٹو ینگ مین!'' جنرل صاحب نے کہا ''تم کیسے فوجی ہو جو عورتوں کی طرح آنسو بہا رہے ہو۔ اپنے دادا جان کی مغفرت کی دعا کرو۔ اب تمہارے آنسوؤں سے زیادہ انہیں تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے۔''

جنرل نے مجھے ایک ہفتے کی چھٹی دے دی۔

میں گھر پہنچا تو وہاں ایک کہرام بپا تھا۔ پاپا اور چاچو غم سے نڈھال تھے۔ ابو کی موت پر جیسے پورا شہر ہی اُمڈ آیا تھا۔ وہ کاروباری حلقوں میں اتنے ہی مقبول تھے۔

سب سے زیادہ روبی کی حالت خراب تھی۔ ابو اسے بھی بہت چاہتے تھے۔ وہ تو ہر وقت ان ہی کے ساتھ رہتی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے نیند کا انجکشن دے دیا تھا اور اس وقت وہ گہری نیند بلکہ بے ہوشی میں تھی۔

پاپا نے بتایا کہ ابو اچھے خاصے بیٹھے ہم سے باتیں کر رہے تھے۔ اچانک ہی ان کی حالت بگڑ گئی اور وہ اپنا سینہ پکڑ کر صوفے پر ایک طرف لڑھک گئے۔ میں نے اسی وقت ڈاکٹر کو بلا لیا۔ اس نے ابو کو دیکھتے ہی کہا کہ انہیں دل کا دورہ پڑا ہے۔ آپ لوگ فوراً انہیں اسپتال لے جائیں۔

میں نے اور عرفان نے اسی وقت انہیں گاڑی میں ڈالا اور اسپتال پہنچ گئے لیکن وہاں..... پہنچ کر..... معلوم ہوا کہ..... ابو ہم سے روٹھ کے جا چکے ہیں۔'' یہ کہہ کر پاپا زار و قطار رونے لگے۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی دھاڑیں مار مار کر روؤں لیکن فوراً ہی مجھے اکیڈمی کے کمانڈنٹ جنرل صاحب کی بات یاد آ گئی اور میں نے بہت مشکل سے خود پر ضبط کر کے کہا۔

''پاپا پلیز! آپ لوگ ہی یوں روئیں گے تو ہم لوگوں کا کیا بنے گا؟''

پاپا نے میری بات سن کر فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ابو کے بغیر مجھے وہ گھر ویران اور سونا سونا لگتا تھا۔ کبھی کبھی ایک آدمی کے جانے سے بھرے پرے گھر یوں ہی ویران ہو جاتے ہیں۔ روبی کا حال تو مجھ سے بھی بُرا تھا۔ وہ

کبھی ابو کی چھڑی دیکھ کر رونے لگتی تھی، کبھی ان کا چشمہ، کبھی گھنٹوں ان کا ڈریسنگ گاؤن لیے بیٹھی رہتی تھی۔

اس کی حالت دیکھ کر پاپا نے یہ فیصلہ کیا کہ ابو کے استعمال کی تمام چیزیں ان کے کمرے میں بند کر کے تالا لگا دیا۔ بھلا کبھی یادوں پر بھی تالا لگا ہے۔ وہ اب دادا جان کے بند کمرے کو دیکھ دیکھ کر آنسو بہاتی رہتی تھی۔

میں نے اکیڈمی جانے سے پہلے اسے بہت سمجھایا کہ اگر تم اسی طرح روتی رہیں تو بیمار پڑ جاؤ گی۔ تمہاری وجہ سے گھر کے سبھی لوگ کتنے پریشان ہیں۔ بس مجھ سے وعدہ کرو کہ آج کے بعد تم آنسو نہیں بہاؤ گی۔''

''آنسوؤں پر کسے اختیار ہے شیری؟'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''مجھے دیکھو! تم کیا سمجھتی ہو کہ مجھے ابو کے جانے کا افسوس نہیں ہوا ہے؟ میں بھی انہیں اتنا ہی چاہتا تھا جتنا تم چاہتی تھیں لیکن اللہ کی مرضی کے آگے ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟ پھر تم نے یہ بات نہیں سنی کہ رونے سے مرنے والے کی روح کو شدید تکلیف ہوتی ہے۔ تم کیا چاہتی ہو، ابو مرنے کے بعد بھی اذیت میں مبتلا رہیں؟''

''ہاں شیری! تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں آئندہ بالکل آنسو نہیں بہاؤں گی۔'' اس نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔

''گڈ گرل!'' میں نے جبراً مسکرا کر کہا ''اب ذرا ہنستے ہوئے مجھے رخصت کرو۔''

اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی پھر بولی ''اب تم بھی چلے جاؤ گے شیری تو میرا تو یہاں دم گھٹ جائے گا۔''

''اب تو صرف چند مہینے رہ گئے ہیں۔ اب میں آؤں گا تو شہریار نہیں بلکہ سیکنڈ لیفٹیننٹ شہریار بن کر آؤں گا۔''

میں اسے تسلیاں دلاسے دے کر اور سمجھا بجھا کر رخصت ہو گیا۔

وہاں پہنچے ہوئے مجھے ایک ہی مہینا ہوا تھا کہ روبی نے مجھے فون پر بتایا کہ ڈیڈی نے مجھے راولپنڈی بھیج دیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ میں کچھ دن گھر سے دور رہوں گی تو صدمہ کم ہو جائے گا۔

''روبی! تم فوراً گھر واپس پہنچو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم پنڈی میں رہو۔''

''میں تو خود یہی چاہتی ہوں شیری!'' روبی نے کہا ''لیکن ڈیڈی ہر بار ٹال جاتے ہیں۔''

''اچھا، تم فکر مت کرو، پنڈی یہاں سے دور نہیں ہے۔ میں کسی ویک اینڈ پر وہاں آؤں گا۔''

''نہیں شیری، تم یہاں مت آنا۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''تم پہلے ہی اتنی چھٹیاں کر چکے ہو۔ تم اپنا کورس پورا کرو۔'' اس نے کہا۔

اس کے لہجے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔

ہمارا فائنل ٹرم چل رہا تھا۔ اکیڈمی سے پاس آؤٹ ہونے میں صرف دو مہینے باقی تھے۔ ہر کیڈٹ اس ٹرم کی تیاری میں مصروف تھا۔

میں اس وقت پلے گراؤنڈ سے واپس آ رہا تھا۔

اچانک میرا سیل فون تھرتھرانے لگا۔ میں نے اسے سائلنٹ پر لگا رکھا تھا۔ کلاس روم میں یا پلے گراؤنڈ میں سیل فون ساتھ رکھنے پر پابندی تھی۔ اس کے باوجود میں سیل فون اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر ایک ستون کی اوٹ میں جا کر سیل فون نکال لیا۔ اسکرین پر امی کا نام دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ امی تو مجھے کبھی کبھار ہی فون کرتی تھیں ورنہ موقع دیکھ کر میں ہی انہیں فون کر لیتا تھا۔ میں نے پاپا اور روبی سے بھی کہہ رکھا تھا کہ میں آپ لوگوں کو خود ہی فون کروں گا۔

میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا اور بولا ''السلام علیکم امی! خیریت تو ہے؟''

امی نے سلام کا جواب دیتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''خیریت نہیں ہے بیٹا! تمہارے پاپا کو دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ اسپتال میں ہیں۔ ان کی..... حالت..... خطرے میں ہے بیٹا!'' امی رونے لگیں۔

''آپ فکر مت کریں امی!'' میں نے کہا ''میں ابھی لاہور پہنچتا ہوں۔''

میں نے سیل فون جیب میں رکھا اور اسی ستون کا سہارا لے لیا۔ مجھے اچانک بہت زور کا چکر آیا تھا اور زمین آسمان اوپر تلے ہو گئے تھے۔

میں وہاں سے اپنے کمرے میں پہنچا اور اپنا سامان پیک کرنے لگا۔

''لیکن شہریار! ڈیڑھ مہینے بعد ہی تو ہماری پاسنگ آؤٹ پریڈ ہونے والی ہے۔ ایسے موقع پر.....''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''پاسنگ آؤٹ پریڈ سے زیادہ اہم میرے لیے میرا باپ ہے۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''اچھا، تم جنرل صاحب سے چھٹی تو لے لو، تم جاؤ، میں پیکنگ کر دیتا ہوں۔''

جنرل صاحب اس وقت اپنے آفس میں نہیں تھے، وہ بنگلے پر تھے۔ ان کا بنگلا بھی اکیڈمی کی عمارت کے اندر ہی تھا لیکن وہاں سے قدرے فاصلے پر تھا۔ انسٹرکٹر البتہ آفس میں موجود تھے۔ میں ان ہی کے پاس چلا گیا۔ وہ خاصے اکھڑ مزاج اور سخت گیر قسم کے تھے۔

میں اس وقت اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ ان کے کمرے میں دستک دیے بغیر ہی داخل ہو گیا۔

میں نے فوجی انداز میں انہیں سلام کیا۔ وہ درشت لہجے میں بولے ''تم اکیڈمی کے سب سے سینئر بیچ کے کیڈٹ ہو۔ تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں کہ کسی کے کمرے میں دستک دے کر داخل ہوتے ہیں۔''

''معافی چاہتا ہوں سر!'' میں نے کہا ''لیکن مسئلہ ایسا ہے کہ میں گھبراہٹ میں یوں ہی اندر چلا آیا۔''

''بولو!'' انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔

''سر، میرے پاپا کو دل کا دورہ پڑا ہے اور ان کی حالت بہت نازک ہے۔''

''تو پھر.....؟'' انہوں نے مجھے گھورا۔

''میں گھر جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟'' وہ دہاڑے ''اس وقت گھر جانے کا مطلب سمجھتے ہو؟ تمہاری دو سال کی محنت پر پانی پھر جائے گا۔ پھر نہ تمہیں بی اے کی ڈگری ملے گی، نہ کمیشن!''

''سوری سر!'' میں نے جلدی سے کہا ''اس وقت میرا ذہن ماؤف ہو رہا ہے، آپ مجھے جو سزا بھی دیں گے میں بھگتنے کے لیے تیار ہوں لیکن مجھے ایک دفعہ پاپا سے مل لینے دیں۔''

وہ چند لمحے مجھے گھورتے رہے۔

''او کے بوائے!'' وہ طویل سانس لے کر بولے ''میں نہیں چاہتا کہ تمہارا کیریئر تباہ ہو۔ تم اکیڈمی کے بہترین کیڈٹ ہو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم بارہ تاریخ کی شام تک یہاں پہنچ جاؤ۔ میں صرف انسانیت کے ناتے ایسا کر رہا ہوں ورنہ یہ بہت بڑا جرم ہے۔ صرف اس لیے کہ تمہاری طرح میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے انگریز انسٹرکٹر نے مجھے چھٹی نہیں دی تھی اور اپنے والد کا میں دیدار بھی نہیں کر سکا تھا۔''

اس دن آٹھ تاریخ تھی، گویا میرے پاس تقریباً چار دن تھے۔ میں نے جلدی سے کہا ''ٹھیک ہے سر! میں بارہ تاریخ کی شام سے پہلے یہاں پہنچ جاؤں گا۔'' پھر میں نے کہا ''سر، مجھے ایک کاغذ دے دیں تاکہ میں درخواست لکھ سکوں۔''

انہوں نے فوراً ہی گارڈ سے ایک کلپ بورڈ اور کاغذ منگوالیا۔ میں نے جلدی جلدی درخواست لکھی اور ان کو دے دی۔

''یہ اپلی کیشن میرے ہی پاس رہے گی۔ اکیڈمی کے ریکارڈ میں تم یہیں موجود ہو۔ ہاں، اگر تم بارہ تاریخ کی شام تک یہاں نہ پہنچے تو پھر میں بھی تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔''

''تم ایسا کرو، یہیں سے باہر نکل جاؤ۔'' انہوں نے کہا۔

وہاں سے باہر جانے کا ایک دوسرا راستہ بھی تھا جو صرف افسران یا ان کے اردلیوں کے لیے تھا۔

''واپس بھی اسی راستے سے آنا اور گیٹ پر موجود گارڈز کو میرا حوالہ دینا۔ بس اب تم نکل جاؤ۔''

میں اسی وقت اس دوسرے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ میرا بیگ کمرے ہی میں رہ گیا تھا لیکن سیل فون، پرس اور اکیڈمی کے آئی ڈی کارڈ جیب میں تھا۔

تھوڑی دیر چلنے کے بعد مجھے ایک موٹر سائیکل سوار نے ایبٹ آباد تک لفٹ دے دی۔

ایبٹ آباد کے لاری اڈے پر پہنچنے کے بعد میں نے ایک ٹیکسی والے سے بات کی۔ وہ لاہور کا نام سن کر بدک گیا اور بولا ''میں اتنی دور نہیں جا سکتا، جناب!''

''کیوں، کیا تمہارے پاس لائسنس نہیں ہے یا پھر گاڑی چوری کی ہے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے سر!'' اس نے کہا ''اصل میں میری طبیعت خراب ہے، آپ ٹھہریں، میں لطیف سے بات کرتا ہوں، وہ لاہور کیا کراچی جانے پر بھی راضی ہو جائے گا۔'' وہ ایک طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد تقریباً نئی ٹویوٹا کرولا میرے نزدیک آ کر رکی۔ بوڑھے ٹیکسی ڈرائیور کو اس میں دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ لطیف کو لے آیا ہے۔

لطیف شکل ہی سے مجھے چالاک لگ رہا تھا۔ اس نے

مجھ سے لاہور کا دگنا معاوضہ طلب کیا۔ اس سے پہلے بھی میں کئی دفعہ لاہور جا چکا تھا، اس لیے مجھے کرائے کا علم تھا۔

میں نے اس سے کوئی حجت نہیں کی اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

''دیکھو لطیف! اگر تم نے مجھے جلدی لاہور پہنچا دیا تو میں ایک ہزار مزید دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں سر!'' لطیف نے کہا ''لوگ کہتے ہیں کہ لطیف گاڑی چلاتا نہیں بلکہ اُڑاتا ہے۔''

''چلو، پھر آج ہم بھی تمہاری پرواز دیکھ لیں گے۔'' میں نے کہا۔

لطیف واقعی گاڑی کو جیٹ فائٹر کی طرح اُڑا رہا تھا۔ کئی جگہ سے تو اس نے اتنے خوف ناک انداز میں گاڑی نکالی کہ میں بھی گھبرا گیا۔ میں خود بھی اس سے زیادہ تیز ڈرائیونگ کرتا تھا لیکن جب اسٹیئرنگ کسی اور آدمی کے ہاتھ میں ہو تو بات دوسری ہوتی ہے۔

میں لاہور پہنچا تو صبح کے چار بجنے والے تھے۔ میں جانتا تھا کہ پاپا کس اسپتال میں ہیں۔

میں سیدھا وہاں پہنچ گیا۔ اس اسپتال کے تقریباً سبھی ڈاکٹر مجھے جانتے تھے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ لاہور کا وہ مہنگا ترین اسپتال ایک طرح سے ہمارا فیملی اسپتال تھا۔ ہمارے گھر میں کسی کو معمولی نزلہ... زکام بھی ہوتا تھا تو یا تو اس اسپتال کے کسی ڈاکٹر کو گھر پر بلا لیا جاتا تھا یا پھر اسے وہاں داخل کر دیا جاتا تھا۔

وہاں اس وقت بالکل سناٹا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کوریڈور میں امی، چاچو اور گھر کے دوسرے ملازم ہوں گے لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

میں نے استقبالیہ کا رُخ کیا۔ وہاں استقبالیہ کلرک بیٹھی ہوئی اونگھ رہی تھی۔

میں نے کاؤنٹر پر آہستہ سے ہاتھ مارا تو وہ چونک کر سیدھی ہو گئی اور بولی ''جی سر، فرمائیے؟'' وہ شاید نئی تھی اس لیے مجھے پہچانتی نہیں تھی۔

''سلطان احمد صاحب کس روم میں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''سلطان احمد صاحب.....!'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور بولی ''ایک منٹ سر!'' وہ کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گئی اور فوراً ہی بولی ''سلطان صاحب..... صاحب تو.....''

''شہریار بیٹا! عقب سے مجھے پاپا کے ملازم خاص کرم دین کی آواز سنائی دی۔

میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تو میرا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کرم دین کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''پاپا کہاں ہیں چاچا؟'' میں نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا ''کیا ان کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟''

''بڑے صاحب تو گھر چلے گئے بیٹا!'' کرم دین نے روتے ہوئے کہا۔

''گھر چلے گئے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا ''کیا ان کی طبیعت ٹھیک ہو گئی؟''

''وہ..... بیٹا..... بڑے صاحب!'' کرم دین کی آواز گویا گلے میں اٹک گئی اور وہ بُری طرح سسکنے لگا۔

''مجھے بتاؤ چاچا!'' میں چیخ کر بولا ''پاپا کہاں ہیں؟'' مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''وہ..... ہم سے..... ہمیشہ کے لیے..... بچھڑ گئے بیٹا!'' کرم دین نے اپنی سسکیوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''کیا کہہ رہے ہو کرم دین!'' میں نے چیخ کر کہا۔

میری آواز سن کر ڈیوٹی ڈاکٹر اور دو نرسیں اپنے کمروں سے نکل آئے۔

''ڈاکٹر صاحب!'' میں نے ہیجانی لہجے میں کہا ''یہ کرم دین کیا بکواس کر رہا ہے؟''

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے شہریار صاحب!'' ڈاکٹر نے گویا میری رہی سہی امید کا بھی گلا گھونٹ دیا۔ ''ہم نے تو سلطان صاحب کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن..... مجھے افسوس ہے شہریار صاحب!..... میں.....''

میرا ذہن اس وقت گویا مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر کچھ اور بھی کہہ رہا تھا لیکن اب مجھے اس کے صرف ہونٹ ہلتے دکھائی دے رہے تھے۔

پھر مجھے ایسا لگا جیسے کوریڈور کی چھت میری طرف آ رہی ہو۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ بے خبری کا یہ وقفہ زیادہ طویل نہیں تھا۔ مجھے ہوش آیا تو میں ڈاکٹر کے ڈیوٹی روم میں تھا۔ میں عالم اضطراب میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر روبی کا نام تھا۔ میں نے سیل فون کان سے لگا لیا اور بہ مشکل تمام کہا ''ہیلو..... روبی.....!'' میرے حلق میں گولہ سا اٹک گیا۔

''تم اس وقت کہاں ہو شیری؟'' روبی کی آواز بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی ''کیا ابھی تک کا کول میں ہو؟''

''میں..... لاہور..... پہنچ چکا ہوں اور..... اس وقت..... اسپتال میں ہوں۔'' میں نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''وہاں اب کیا ہے شیری!'' روبی بُری طرح سسکنے لگی ''تایا جان تو..... اب گھر پر ہیں۔''

''میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کرم دین چاچا!'' میں نے کہا ''کوئی ٹیکسی لے آؤ۔''

''میں گاڑی لایا ہوں بیٹا! بڑی بیگم صاحبہ کو اندازہ تھا کہ تم گھر کی بجائے اسپتال پہنچو گے۔ انہوں نے ہی مجھے یہاں بھیجا ہے۔''

میں گاڑی میں بیٹھ گیا تو کرم دین بھی پسنجر سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''یہ کب ہوا کرم دین چاچا؟'' میں نے پوچھا۔

''شام کو پانچ بجے کے قریب۔'' اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''شام کو پانچ بجے تو امی نے مجھے فون کیا تھا۔ تو کیا اس وقت تک پاپا کا انتقال ہو چکا تھا؟ امی نے جان بوجھ کر مجھے نہیں بتایا تھا کہ نہ جانے اچانک یہ خبر سن کر مجھ پر کیا گزرے؟''

میں گھر پہنچا تو گھر کے سامنے اور دور دور تک گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کوٹھی کے وسیع و عریض لان میں شامیانہ لگا ہوا تھا اور وہاں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

چاچوان لوگوں میں گھرے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکے۔ میں بھی دوڑ کر ان کے سینے سے لپٹ گیا اور بلک بلک کر رونے لگا۔

چاچو نے روتے ہوئے کہا ''تو کیوں رو رہا ہے پگلے! یتیم تو میں ہوا ہوں۔ ابو کے بعد بھائی ہی تو تھے جنہوں نے کبھی مجھے ان کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ تیرے سر پر تو ابھی میں موجود ہوں بیٹا!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے ''بس اب آنسو پونچھ لے۔ تو کیسا فوجی ہے جو عورتوں کی طرح آنسو بہا رہا ہے؟'' یہ کہتے کہتے وہ خود رونے لگے۔

امی کی حالت غیر تھی، وہ رو رو کر نڈھال ہو گئی تھیں۔ پھر وہ میرے سینے سے لگ کر اس بُری طرح روئیں کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ان کی حالت اتنی بگڑی کہ ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔

روبی سکتے کی حالت میں بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ ملازمین تک آنسو بہا رہے تھے۔

سب سے زیادہ خراب حالت چاچا کرم دین کی تھی۔ وہ برسوں سے پاپا کے ساتھ تھا۔

اسی افسردگی اور آہ و بکا کے ماحول میں پاپا سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔

پاپا کے سوئم کے موقع پر شہر کے بڑے بڑے بزنس مین، اعلیٰ افسران اور ہماری گروپ آف کمپنیز کے ملازمین سبھی موجود تھے۔

میری آنکھیں زاہد صاحب کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ ہمارے گروپ آف کمپنیز کے مینجنگ ڈائریکٹر تھے۔ یوں سمجھ لیں کہ ہماری کمپنی میں پاپا اور چاچو کے بعد وہی سب سے زیادہ با اختیار اور با اعتبار شخص تھے۔ انہیں میں نے تدفین کے موقعے پر تو دیکھا تھا، اس کے بعد وہ مجھے نظر نہیں آئے۔

پاپا سے ان کی دوستی بھی تھی۔ پاپا ان پر اندھا..... اعتماد کرتے تھے اور مجھ سے ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ زاہد جیسا ایماندار شخص اس دور میں ملنا بہت مشکل ہے۔ وہ ان کی بہت عزت کرتے تھے اور ان کی محنت کے معترف تھے۔

میں نے سوچا کہ ممکن ہے صدمے سے ان کی طبیعت خراب ہو گئی ہو۔

لوگ اب کھانا کھا رہے تھے اور آپس میں یوں باتیں کر رہے تھے جیسے وہ سوئم میں نہیں بلکہ کسی دعوت میں آئے ہوں۔ چاچو نے لاہور کی بہترین کیٹرنگ..... سے کھانے کا انتظام کرایا تھا۔

عجیب رسم ہے! میں نے دل ہی دل میں کڑھ کر سوچا۔ لوگ قرآن خوانی کے وقت تو اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے لیکن کھانے کے وقت سبھی موجود تھے اور مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔

جب سارے مہمان چہروں پر افسردگی کی نقاب لگا کے مجھ سے اور چاچو سے تعزیت کر کے رخصت ہو گئے تو مجھے زاہد انکل کا خیال آیا۔

میں نے چاچو سے پوچھا ''چاچو! زاہد انکل نظر نہیں آ رہے ہیں، ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''میں نے زاہد کو فارغ کر دیا ہے۔'' چاچو نے سرد لہجے میں کہا۔

''فارغ کر دیا ہے، لیکن کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ آج کل کچھ زیادہ ہی غلطیاں کر رہے تھے۔ بھائی جان کا بھی یہی خیال تھا کہ اب انہیں ریٹائر ہو جانا چاہیے۔''

میں ان کی بات سن کر خاموش ہو گیا اور امی کے پاس چلا گیا۔ وہ اب کسی حد تک سنبھل گئی تھیں لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کی عمر میں اچانک کئی سالی کا اضافہ ہو گیا ہو۔ میں دیر تک ان کے پاس بیٹھا اپنی اکیڈمی کی باتیں کرتا رہا۔ وہاں چاچی اور روبی بھی موجود تھیں۔ وہ کچھ دیر بعد اٹھ کر چلی گئیں۔

اچانک امی نے کہا ''شیری! تم نے آج تک مجھے اپنی اکیڈمی کا فون نمبر نہیں دیا؟''

''میں نہیں چاہتا کہ کوئی وہاں فون کر کے وقت بے وقت مجھے ڈسٹرب کرے۔'' میں نے کہا۔

''اتنے نا سمجھ ہم بھی نہیں ہیں۔'' امی نے کہا ''تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ وہاں تم سیل فون آف رکھتے ہو۔ میں نے یونہی کوشش کی تھی کہ شاید تمہارا سیل فون آن ہو۔''

میں کہنے والا تھا کہ اکیڈمی کا نمبر روبی کے پاس ہے لیکن میں نے کہا نہیں۔ یہ بات امی زیادہ محسوس کرتیں۔

''امی، پاپا کے پاس تو اکیڈمی کا نمبر تھا۔'' میں نے کہا۔

''وہ اس وقت کچھ بتانے کے قابل ہی کب رہے تھے۔'' امی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور اپنی آنکھوں میں آئے آنسو پونچھنے لگیں۔ پھر مجھ سے بولیں ''جا بیٹا، اب تو بھی آرام کر، تو کل رات سے جاگ رہا ہے۔''

مجھے واقعی چکر سے آ رہے تھے۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

میں سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سیل فون اٹھا کر دیکھا، اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ بات ہی نہ کروں پھر یہ سوچ کر سیل فون کان سے لگا لیا کہ ممکن ہے پاپا کا کوئی دوست ہو۔

''ہیلو!'' میں نے تھکی تھکی سی آواز میں کہا۔

''شہریار بیٹا!'' دوسری طرف سے آنے والی آواز مجھے کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔

''جی بول رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''بیٹا! میں زاہد بول رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''زاہد انکل! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے، آپ آج ابو کے سوئم میں بھی نہیں آئے۔''

''بیٹا، مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنا ہیں۔ میں تم سے ابھی ملنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔

''ابھی؟'' میں نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی، ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

''ہاں بیٹا! ابھی۔'' انہوں نے کہا ''تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔''

''میری زندگی خطرے میں ہے؟'' میں نے کہا ''آپ کیا کہہ رہے ہیں انکل!''

''وقت ضائع مت کرو بیٹا! فوراً آفس کے پارکنگ لاٹ پر پہنچو، میں وہیں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

میں نے سونے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور بہت عجلت میں کپڑے بدل کر باہر نکل آیا۔

میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھا تو پیچھے سے چاچو کی آواز آئی ''شہریار، تم اس وقت کہاں جا رہے ہو؟''

''میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں چاچو!'' میں نے جان بوجھ کر زاہد انکل کا نام نہیں لیا۔ وہ سوچتے کہ میں نے ایک شخص کو ملازمت سے فارغ کر دیا ہے اور یہ اس سے ملنے جا رہا ہے۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ پوچھتے، میں جلدی سے گاڑی میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ہمارا آفس وہاں سے تقریباً پچیس منٹ کے فاصلے پر تھا۔

میں نے وہ فاصلہ سترہ اٹھارہ منٹ میں طے کر لیا۔

گیٹ پر چوکیدار موجود تھا۔ میں نے اس سے زاہد انکل کے بارے میں پوچھا۔

''آپ یہاں ٹھہریں سر! میں انہیں بلا کر لاتا ہوں۔ انہوں نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ شہریار صاحب آئیں تو مجھے اطلاع کر دینا۔''

وہ تیزی سے پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گیا۔

اس کی واپسی مشکل سے دو منٹ میں ہو گئی۔ انکل زاہد اس کے ساتھ تھے۔

وہ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے اور بولے ''اس وقت کسی فائیو اسٹار کا ریسٹورنٹ کھلا ہو گا، تم وہیں چلو۔''

ان کی گھبراہٹ دیکھ کر میں نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

ابھی میں نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ پیچھے سے ایک گاڑی نے میری گاڑی کو اوورٹیک کرنے کی کوشش کی لیکن میری گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔

وہ پُرانے ماڈل کی مزدا تھی۔ اس میں جو لوگ بیٹھے تھے،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان کے چہرے نظر نہیں آ رہے تھے۔

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ان دنوں ڈکیتی اور لوٹ مار کی وارداتیں عام تھیں۔ میں نے اپنی گاڑی کی رفتار ایک دم کم کر دی تاکہ وہ گاڑی آگے نکل جائے۔

ہوا بھی یہی، وہ گاڑی تیز رفتاری سے آگے نکل گئی لیکن کچھ ہی فاصلے پر جا کر رک گئی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ ان لوگوں کے ارادے نیک نہیں ہیں۔

وہ سڑک خاصی چوڑی تھی۔ میں نے بریک لگائے اور گاڑی کو ایک دم یوٹرن دے دیا۔ ہنڈا سٹی میں خاص بات یہ ہے کہ وہ بہت کم جگہ میں یوٹرن لے لیتی ہے۔ یوٹرن لیتے ہی میں نے گاڑی خاصی رفتار سے دوڑانا شروع کر دی۔ میں نے عقب سے آئینے میں دیکھا، وہ گاڑی بھی یوٹرن لے چکی تھی اور ہمارے تعاقب میں آ رہی تھی لیکن اب وہ میری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔

''شہریار بیٹا! لگتا ہے، تمہارے چچا کو معلوم ہو گیا ہے کہ تم مجھ سے ملنے آئے ہو۔''

''انہیں اگر معلوم ہو بھی گیا ہے تو کیا ہوا انکل؟'' میں نے کہا۔

''اس نے دو دفعہ میری جان لینے کی کوشش کی ہے بیٹا!'' زاہد انکل نے کہا ''دونوں دفعہ میری زندگی ہی تھی کہ میں بال بال بچ گیا۔''

''چاچو نے آپ کی جان لینے کی کوشش کی ہے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں بیٹا، سلطان صاحب کی موت کا ذمے دار بھی وہی ہے اور بڑے صاحب کو بھی اسی نے قتل کرایا ہے۔''

میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں ''یہ..... یہ آپ ..... کیا کہہ رہے ہیں انکل!'' میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

''اگر میں اپنے کانوں سے نہ سن لیتا تو شاید میں بھی یقین نہ کرتا۔ اس دن ایک ضروری فائل لے کر سلطان صاحب کے پاس گیا تھا۔ تمہارے بنگلے سے کچھ فاصلے پر میری گاڑی کا پیٹرول ختم ہو گیا۔ گاڑی میں پیٹرول کا بھرا ہوا ایک کین موجود تھا لیکن فاصلہ زیادہ نہیں تھا اس لیے میں نے سوچا کہ پہلے فائل پر سلطان صاحب کے سائن لے لوں، پھر گاڑی میں پیٹرول ڈالوں گا یا ان کے ڈرائیور کو بھیج کر گاڑی بنگلے پر منگوا لوں گا۔ بنگلے کے دونوں گارڈز بھی مجھے اچھی طرح جانتے تھے اس لیے انہوں نے مجھے روکنے کی جرأت نہیں کی۔

میں نے پورچ میں تین گاڑیاں کھڑی دیکھیں۔ ایک تو سلطان صاحب کی تھی اور دوسری عرفان کی، تیسری گاڑی میں شاید کوئی مہمان آیا تھا۔

میں برآمدے میں پہنچا اور ڈرائنگ روم میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ مجھے عرفان کی آواز سنائی دی ''تمہیں یقین ہے ڈاکٹر کہ اس انجکشن کے بعد بھائی جان بچ نہ سکیں گے؟''

''مجھے دو سو فی صد یقین ہے عرفان صاحب!'' دوسری آواز آئی ''سلطان صاحب کے پاس اب مشکل سے بارہ گھنٹے ہیں۔ یہ ظاہر ساری علامات دل کے دورے کی ہوں گی لیکن کوئی ڈاکٹر انہیں بچا نہ پائے گا۔ بس آپ میرا انعام تیار رکھیں۔''

''تم انعام کی فکر مت کرو۔'' عرفان نے کہا ''کام ہو جائے گا تو تمہیں اتنا انعام دوں گا کہ تم نے تصور بھی نہ کیا ہو گا۔''

''اس سے پہلے بھی تو آپ میرا کام دیکھ چکے ہیں۔'' اس نے کہا ''میں نے بڑے صاحب کو بھی یہی انجکشن دیا تھا۔''

مجھے اچانک خطرے کا احساس ہوا۔ میں تیزی سے واپس پلٹا تھا کہ برآمدے میں رکھا ہوا ایک گملا میرے پیر سے ٹکرا کر گر گیا مگر میں رکا نہیں اور بھاگتا ہوا گیٹ سے باہر نکل گیا۔ تبھی پیچھے سے عرفان کی دہاڑتی ہوئی آواز آئی ''کون ہے، چوکیدار.....! باہر کون بھاگا ہے؟''

''سر، زاہد صاحب تھے، وہ بہت جلدی میں جا رہے تھے۔''

میں نے سوچا کہ اپنی گاڑی کی طرف بھاگوں لیکن میں فوری طور پر گاڑی میں نہیں بھاگ سکتا تھا۔ جب تک میں گاڑی میں پیٹرول ڈالتا، عرفان مجھے پکڑ لیتا۔ میں گھبرا کر برابر والے مکان میں گھس گیا۔

سلطان صاحب ہی نے بتایا تھا کہ برابر والا بنگلا عرصے سے خالی ہے۔ وہ اس کے مالک سے رابطہ کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ بنگلا بھی خرید لیں۔ بنگلے کا مالک ملک سے باہر ہے۔

وہاں ایک چوکیدار ہے جو گیٹ کے بجائے بنگلے کے اندر ہی رہتا ہے۔ میں نے اس بنگلے کی باؤنڈری وال پھلانگی اور ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

میرے بنگلے میں گھستے ہی ایک گاڑی تیز رفتاری سے گزر گئی۔ عرفان سمجھا کہ میں اسی گاڑی میں فرار ہوا ہوں۔ اس نے چیخ کر کہا ''وہ جا رہا ہے زاہد! پکڑو اسے۔'' فوراً ہی ایک گاڑی اس گاڑی کے پیچھے روانہ ہو گئی۔

میں جانتا تھا کہ ان لوگوں کو کچھ ہی دیر میں اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا اور وہ لوٹ آئیں گے۔ میں جلدی سے باہر نکلا اور اپنی گاڑی تک پہنچ گیا۔ تمہارے بنگلے کے سامنے اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میں نے بہت عجلت میں گاڑی میں پیٹرول ڈالا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میں گھر جانے کے بجائے اپنے ایک دوست کے گھر چلا گیا۔ میرا وہ دوست افضل بادامی باغ کے علاقے میں رہتا ہے۔ عرفان تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں اس طرف جا سکتا ہوں۔ میں نے سیل فون پر اپنی بیوی سے کہا کہ تم فوری طور پر نوشین کو لے کر وہاں سے نکل جاؤ۔ تم لوگ خطرے میں ہو۔ تم اپنے بھائی کے گھر چلی جاؤ۔ فوراً نکل جاؤ ورنہ مشکل میں پڑ جاؤ گی۔

دوسرے دن میں دفتر بھی نہیں گیا۔ پھر مجھے اطلاع ملی کہ سلطان صاحب کا انتقال ہو گیا۔ میں نے ان کے ساتھ تیس برس گزارے تھے، پھر میں آخری بار ان کے دیدار سے محروم کیوں رہتا؟ میں جان ہتھیلی پر رکھ کر تدفین میں شریک ہوا۔ وہاں سے واپسی پر عرفان کے کرائے کے بدمعاشوں نے مجھے گھیرنے کی کوشش کی اور میری گاڑی پر فائرنگ کی۔ عین وقت پر میں ایک پولیس اسٹیشن میں گھس گیا تو وہ لوگ خوف زدہ ہو کر فرار ہو گئے۔''

اس دوران میں ہم ہوٹل کی تلاش میں بادامی باغ پہنچ چکے تھے۔ زاہد صاحب نے کہا کہ چلو میرے دوست کے گھر چلتے ہیں۔ وہ معقول شخص ہے۔

ان کا وہ دوست خاصا معقول اور پڑھا لکھا شخص تھا۔

اس نے زاہد انکل کو مشورہ دیا کہ آپ عرفان کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرا دیں۔

''پولیس کیا کرے گی؟'' زاہد انکل نے مایوسی سے کہا ''عرفان نے کچھ بڑے پولیس افسران کو بھی خرید لیا ہے۔''

''انکل!'' میں نے اچانک پوچھا ''آپ اس ڈاکٹر کو شناخت کر سکتے ہیں جس نے چاچو کے کہنے پر یا پاپا کو وہ انجکشن دیا تھا؟''

''بیٹا! میں نے اس ڈاکٹر کی شکل تو نہیں دیکھی تھی، صرف آواز سنی تھی۔ اگر وہ میرے سامنے آ کر بولے یا میں اس کی آواز دوبارہ سن لوں تو اسے پہچان لوں گا لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ وہ ڈاکٹر اس اسپتال کا نہیں ہو گا جہاں سلطان صاحب کو لے جایا گیا تھا۔''

اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ ہم لوگ بُری طرح اچھل پڑے کہ رات کے اس پہر کون آ گیا؟

''کون ہے؟'' زاہد صاحب کے دوست نے سنبھل کر پوچھا۔

دستک کی آواز سے ان کی بیگم اور بچے بھی اُٹھ گئے تھے۔

''پولیس!'' باہر سے کرخت آواز سنائی دی۔

انہوں نے ہم دونوں کو اسٹور میں جانے کا اشارہ کیا اور دروازہ کھول دیا۔

میں اسٹور کے دروازے سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ اچانک تین آدمی اندر آ گئے۔ وہ مسلح تھے اور چہروں سے بدمعاش لگ رہے تھے۔

ان میں سے ایک کے کان کے نیچے گہرے زخم کا نشان تھا۔

''زاہد کہاں ہے؟'' اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''کون زاہد؟'' ان کے میزبان افضل نے پوچھا۔

مسلح بدمعاش نے ریوالور کی نال ان کے منہ پر ماردی۔ ان کے منہ سے خون بہنے لگا۔ وہ درشت لہجے میں بولا ''سیدھی طرح بتا دے بڈھے ورنہ تو تو اپنی جان سے جائے گا ہی، ہم تیری بیٹیوں کو بھی اُٹھا کر لے جائیں گے۔ باہر شہریار کی گاڑی موجود ہے اور تو پوچھ رہا ہے کون زاہد؟''

انکل زاہد اچانک اسٹور روم سے باہر نکل آئے۔ اب میرا بھی چھپے رہنا فضول تھا۔ میں بھی اسٹور روم سے باہر آ گیا۔

''اچھا تو تم ہم سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے؟'' زخم کے نشان والا تضحیک آمیز لہجے میں بولا۔

''تم لوگ ہو کون اور کیا چاہتے ہو؟'' میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''اوہو، تو بھی بولتا ہے؟'' وہ تمسخر اُڑانے والے انداز میں بولا۔

''یہ فوجی افسر ہے استاد!'' دوسرے بدمعاش نے کہا ''اس سے ذرا ہوشیار رہنا۔''

''اس کھلونے کے آگے بڑے بڑے سورما بھیڑ کے بچے کی طرح ہو جاتے ہیں۔'' اس نے ریوالور لہرا کر کہا۔ پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درشت لہجے میں بولا ''چلو ہمارے ساتھ۔ تم دونوں نے بہت دوڑایا ہے۔'' وہ افضل سے مخاطب ہوا ''اگر تم اپنی اور اپنے خاندان کی خیریت چاہتے ہو تو اپنی زبان بند ہی رکھنا ورنہ ہم دوبارہ بھی یہاں آسکتے ہیں۔''

وہ لوگ ہمیں گن پوائنٹ پر لے کر وہاں سے باہر آگئے۔ پھر انہوں نے مجھے اور انکل زاہد کو میری ہی گاڑی میں دھکیلا اور وہ تینوں بھی اسی میں بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ دوسرا بدمعاش پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے ریوالور کا رُخ انکل کی طرف کر دیا۔ تیسرا بدمعاش میرے ساتھ بیٹھا تھا اور اس کے ریوالور کی نال میری پسلیوں میں اڑی ہوئی تھی۔

بھرے پرے علاقے سے گزر کر جب وہ مرکزی شاہراہ پر آئے تو وہاں دور دور تک سنّاٹا تھا۔

پسنجر سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے گاڑی روکنے کو کہا۔ پھر وہ انکل زاہد سے بولا ''زاہد صاحب! ہمیں آپ کی ضرورت نہیں ہے' آپ جاسکتے ہیں۔ دو گھنٹے میں کسی ایسی جگہ تو پہنچ ہی جائیں گے جہاں سے آپ کو سواری مل سکے۔ ممکن ہے یہاں بھی کوئی ٹیکسی آپ کو مل جائے۔ اب جائیں، دیر مت کریں۔''

انکل زاہد نے حیرت سے اسے دیکھا، پھر وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر گئے۔

وہ چند قدم چلنے کے بعد تیزی سے سڑک کے کنارے اُگی ہوئی خودرو جھاڑیوں کی طرف بھاگے لیکن پسنجر سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے اچانک ان پر دو فائر کیے۔ وہ لڑکھڑا کر گرے اور بُری طرح تڑپنے لگے۔ اس کے فائر سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے ریوالور پر سائلنسر بھی فٹ کر لیا تھا۔

ڈرائیو کرنے والے نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔

''یہ تم نے کیا، کیا؟'' میں چیخ کر بولا۔

''خاموش بیٹھا رہ فوجی کی اولاد!'' پسنجر سیٹ والا مضحکہ اُڑانے والے انداز میں بولا ''ورنہ تیرا بھی یہی حشر کروں گا۔''

وہ لوگ انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے مجھے بنگلے پر لے آئے۔

چاچو نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا، پھر بولے ''اسے کمرے میں لے چلو۔''

وہ لوگ مجھے کمرے میں لے آئے۔

وہ تینوں مجھ پر یوں ریوالور تانے کھڑے تھے جیسے میں نے ذرا سی بھی جنبش کی تو وہ مجھے گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔

تھوڑی دیر بعد چاچو بھی وہاں آگئے۔ اب تو انہیں چاچو کہتے ہوئے مجھے کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔

ان کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک بہت خوبصورت بریف کیس تھا۔ وہ میرے سامنے ہی کرسی پر بیٹھ گئے اور اس میں سے کچھ فائلیں نکال کر بولے ''شہریار! ان فائلوں پر دستخط کر دو۔''

''یہ کیا ہے عرفان صاحب!'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''تم پڑھے لکھے ہو، پڑھ کر دیکھ لو، ان میں کیا ہے؟''

میں نے ایک فائل اُٹھا کر کھولی۔ یہ اسی ٹیکسٹائل مل کی فائل تھی جو ابو نے میرے نام کی تھی۔ اس میں ایک اسٹیمپ پیپر بھی موجود تھا۔ اس پر لکھا تھا کہ میں اپنی ملازمت کی مصروفیات کی وجہ سے اپنی یہ ٹیکسٹائل مل اپنے چچا عرفان احمد کے نام کر رہا ہوں۔

دوسری فائلوں میں بھی کچھ اسی طرح کے مضمون والے اسٹیمپ پیپرز لگے ہوئے تھے۔

گویا وہ ابو کی پوری جائداد، بینک بیلنس، کاروبار اور گلبرگ کی اس کوٹھی سمیت کراچی اور اسلام آباد کی کوٹھیوں اور مری کے ایک کاٹیج کے بلاشرکت غیرے مالک بننا چاہتے تھے۔

''میں اگر ان کاغذات پر سائن نہ کروں تو؟'' میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

''تو پھر تجھے بھی مار کر کہیں دفن کرا دوں گا۔ تیری موت کے بعد تو یہ جائدادئیں بھی میری ہی ہوں گی۔''

''میں سلطان احمد کا بیٹا ہوں عرفان صاحب!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''اور میرا باپ آپ کی طرح جاہل نہیں تھا بلکہ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔''

''ہاں، تیرا باپ بہت عالم فاضل تھا لیکن اب تو وہ اپنے علم سمیت دفن ہو گیا ہے۔ بہت قابل اور ذہین بنتا تھا وہ، فائدہ کیا ہوا؟ وہ کتّے کی موت مارا گیا اور......''

''عرفان!'' میں چیخا ''اگر میرے باپ کے بارے میں اب ایک لفظ......'' میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ عرفان نے بھر کر میرے منہ پر چٹاخ سے تھپڑ رسید کر دیا تھا۔

''اپنی زبان کو لگام دے اور ان کاغذات پر دستخط کر دے ورنہ تو بھی اسی طرح مارا جائے گا۔''

''تُو نے میری پوری بات نہیں سنی۔'' میں نے کہا ''میرا باپ بہت ذہین تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ تیری نظریں .... پوری جائداد پر ہیں۔ اس نے ابو کے انتقال کے بعد ہی اپنا وصیت نامہ لکھوایا تھا کہ میری موت کی صورت میں میرے حصے کی پوری جائداد کا وارث میرا بیٹا شہریار ہوگا۔ اگر خدانا خواستہ شہریار بھی نہ رہا تو میرے حصے کی پوری جائداد سے ایک ٹرسٹ قائم کر دیا جائے۔''

عرفان پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری بات سن رہا تھا۔

''اب تو مجھے شوق سے مار دے۔ تیرے حصے میں کچھ بھی نہیں آئے گا۔''

''وصیت نامہ کس وکیل کے پاس ہے؟'' عرفان کی آواز میں شکست خوردگی تھی۔ ''بھائی جان کے قانونی مشیر کے پاس تو ایسا کوئی وصیت نامہ نہیں ہے؟''

''پاپا اتنے احمق نہیں تھے کہ فرم کے قانونی مشیر سے اپنا وصیت نامہ لکھواتے۔ وہ وصیت نامہ جس وکیل کے پاس ہے اس کا علم صرف مجھے ہے۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''مجھے یقین تھا کہ عرفان اب اس وقت تک مجھے قتل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا، جب تک مجھ سے اس وکیل کا پتا حاصل نہ کر لے۔ اس وکیل کا کوئی وجود تھا نہ وصیت نامے کا۔ یہ بات تو مجھے عین وقت پر سوجھی تھی۔

''سلیمان!'' عرفان نے اسی زخم کے نشان والے کو مخاطب کیا ''اس حرام زادے کو تہ خانے میں لے جاؤ اور اس سے اُگلواؤ کہ وہ وکیل کہاں رہتا ہے؟''

سلیمان اپنے دونوں بدمعاش ساتھیوں کے ساتھ مجھے کھینچتا ہوا وہاں سے لے گیا۔ اس کم بخت نے میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیے تھے۔ میں بالکل بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

سلیمان مجھے کوٹھی کے عقبی حصے میں واقع ایک اسٹور روم میں لے گیا۔ پھر اس نے ایک الماری کھول کر اس کے اندر نہ جانے کیا، کیا کہ اسٹور روم کی ایک دیوار کا کچھ حصہ سلائڈنگ ڈور کی طرح ایک طرف سرک گیا۔ میں حیران رہ گیا۔ میرا بچپن اور لڑکپن حویلی کے ان ہی کمروں میں کھیلتے گزرا تھا لیکن مجھے کبھی یہ علم نہ ہو سکا کہ وہاں کوئی خفیہ تہ خانہ بھی ہے۔

سلیمان نے اچانک مجھے دیوار میں نمودار ہونے والے خلا کی طرف دھکیل دیا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اندر سیڑھیاں ہوں گی۔ میں لڑکھتا ہوا نیچے جا پڑا۔ میری کمر اور گھٹنوں میں شدید چوٹ آئی تھی۔ گھٹنوں اور کہنیوں کی تو کھال بھی اُدھڑ گئی تھی۔

مجھے اس وقت تکلیف کا احساس بھی نہیں ہو رہا تھا۔ مجھ پر تو اس وقت ایک جنون طاری تھا کہ جس شخص نے میرے دادا کی جان لی، میرے باپ کو موت سے ہمکنار کیا، میں اس وقت اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔

نیچے تہ خانے میں بھی دو تین کمرے تھے۔ ممکن ہے مزید کمرے بھی ہوں۔ سلیمان نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور میری گردن پشت سے پکڑ کر مجھے کمرے میں دھکا دینا چاہا لیکن میں اچانک گھوما اور سلیمان کی ناف کے نیچے گھٹنے سے زوردار ضرب لگائی۔ وہ تکلیف کی شدت سے دُہرا ہو گیا۔ میں نے دوسری لات بھی اس کی ناف کے نیچے مار دی۔ وہ کراہتا ہوا فرش پر گر گیا۔

اس سے پہلے کہ دوسرے دونوں بدمعاش سنبھلتے، میں نے ان میں سے ایک کو بھی اپنی زبردست لات کا نشانہ بنایا۔ لات اس کے سر پر پڑی تھی اس لیے وہ فوری طور پر بے ہوش ہو گیا۔

میں نے تیسرے آدمی پر بھی لات چلائی لیکن وہ محتاط ہو گیا تھا اس لیے لات اچٹتی ہوئی اس کے سینے پڑی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں نے اس کی ٹانگوں پر لات مار کے اسے گرا لیا اور اس کی گردن پر گھٹنا رکھ کر بولا ''اگر مزید زندہ رہنا چاہتا ہے تو میرے ہاتھ کھول دے۔''

''میں...... اوغ...... غوں......'' اس کے حلق سے بے معنی آوازیں نکلیں۔

''میں اب مزید انتظار نہیں کروں گا اور اس گھٹنے سے تیرا گلا دبا دوں گا۔ یہاں سے باہر تو میں اس حالت میں بھی نکل جاؤں گا۔'' میں نے اپنے گھٹنے کا دباؤ اس کی گردن پر بڑھا دیا۔

میں اس انداز میں اس پر بیٹھا تھا کہ میرا پورا وزن اس کے جسم پر تھا۔ میرا ایک گھٹنا اس کی گردن پر تھا اور دوسرا گھٹنا اس کے پیٹ میں اُترا ہوا تھا۔

کھک... کھک.. کھول تا ہوں......'' وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

میں نے اپنے گھٹنے کا دباؤ کچھ کم کر دیا۔

اچانک میرے سر پر گویا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میں سلیمان کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ وہ بہت سخت جان آدمی تھا۔ وہ اُٹھ کر اچانک میرے سر پر پہنچ گیا تھا۔ پھر اس نے لاتوں، گھونسوں اور تھپڑوں سے مجھے اتنا مارا کہ میں نڈھال ہو گیا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید مر ہی جاتا۔ میں نے ملٹری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اکیڈمی میں شدید مشقت کی تھی، جسمانی فٹنس کے ساتھ ساتھ میں باکسنگ بھی کرتا تھا اور مار کھانے کا عادی ہو چکا تھا۔

''بتا الو کے پٹھے! وہ وکیل کہاں رہتا ہے؟''

''تجھ جیسے تو دس حرام زادے بھی مجھ سے اس وکیل کا پتا نہیں پوچھ سکتے۔'' میں نے اذیت برداشت کرتے ہوئے کہا۔

''اسے اُلٹا لٹکا دو۔'' اس نے اس آدمی سے کہا جو اَب تک میرے گھٹنے کے نیچے دبا ہوا تھا۔

اس نے تہ خانے کے ایک کمرے سے رسی کا گچھا نکالا اور اسے اسٹول پر چڑھ کر لکڑے کے کنڈے میں سے گزار دیا پھر رسی کے دوسرے سرے سے اس نے میرے ہاتھ پاؤں اتنی مضبوطی سے باندھے کہ رسی میری پنڈلیوں میں پیوست ہو گئی۔

پھر اس مردود نے رسی کا دوسرا سرا کھینچا اور مجھے اُلٹا لٹکا کر دوسرا سرا اکھڑ کی کی گرل میں باندھ دیا۔

اُلٹا لٹکنے سے میرے جسم کا تمام خون میرے سر کی طرف آ گیا۔

میں اکیڈمی میں ایکسر سائز کے طور پر آدھے آدھے گھنٹے تک سر کے بل کھڑا رہتا تھا اس لیے مجھے تکلیف صرف اس رسی کی تھی جو میری پنڈلیوں کے گوشت میں دھنسی جا رہی تھی۔

سلیمان نے آگے بڑھ کر میرے منہ پر زوردار تھپڑ مارا تو میں پینڈولم کی طرح کمرے میں آگے پیچھے جھولنے لگا۔ میرے رخسار میں گویا مرچیں سی لگی ہوئی تھیں اور کانوں میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔

''بتا، وہ الو کا پٹھا وکیل کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟'' سلیمان نے پوچھا۔

میں تکلیف کی شدت کے باوجود ہنسنے لگا اور بولا ''کوشش کرتا رہ۔''

وہ سگریٹ پی رہا تھا، اس نے جلتا ہوا سگریٹ اچانک میری گردن پر رکھ دیا۔

ضبط کے باوجود میرے منہ سے کراہ نکل گئی۔

''بتا!'' اس نے دوسرا سگریٹ سلگایا۔ ''ورنہ تیرا پورا جسم داغ دار کر دوں گا۔'' اس نے جھٹکے سے پہلے میری قمیص، پھر بنیان بھی پھاڑ دی۔

''بتا، کون ہے وہ وکیل ہے؟''

میں نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس مرتبہ اس نے سگریٹ میرے پیٹ پر بجھائی۔ پھر تو نہ جانے کتنی مرتبہ اس نے سگریٹ سے میرا جسم داغا۔

میری خاموشی سے اس کی جھنجلاہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''شاکر!'' اس نے اپنے ساتھی کو حکم دیا ''نمک لے کر آؤ، یہ تو ابھی ایسے بولے گا کہ اسے روکنا مشکل ہو جائے گا۔''

شاکر فوراً ہی نمک لے کر آ گیا۔

سلیمان نے نمک کی ایک چٹکی میری گردن پر اس جگہ ڈال کر مسل دی جہاں اس نے سگریٹ سے جلایا تھا۔ اس مرتبہ تکلیف کی شدت سے میری چیخ نکل گئی۔ اس نے میرے جسم کے ہر اس حصے پر نمک چھڑکا جہاں جہاں اس نے سگریٹ سے داغا تھا۔

پھر شاید میں تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو گیا تھا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو کمرے کا منظر دیکھا۔ میں اسی طرح سر کے بل لٹکا ہوا تھا اور میرے جسم میں شدید سوزش ہو رہی تھی۔ جسم کا پورا خون گویا میرے سر میں جمع ہو گیا تھا اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ خون ابھی میری ناک، کانوں اور آنکھوں سے بہہ نکلے گا۔ میرے پیرسن ہو گئے تھے۔

نہ جانے اس حالت میں مجھے کتنا وقت گزر گیا تھا۔

سلیمان نے نمک لے کر پھر وہی عمل دُہرایا اور میں ایک مرتبہ پھر بے ہوش ہو گیا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں فرش پر پڑا تھا اور میرا چہرہ پانی میں بھیگا ہوا تھا لیکن میرے ہاتھ اور پیر اسی طرح بندھے ہوئے تھے۔

اچانک تہ خانے میں عرفان داخل ہوا اور بولا ''اس نے کچھ بتایا؟'' اس نے سلیمان کو مخاطب کیا تھا۔

سلیمان نے نظریں جھکا کر نفی میں ہلا دیا اور بولا ''اس کے جسم میں کوئی بدروح ہے سیٹھ صاحب.....!''

عرفان نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا ''الو کے پٹھے! تو نے ساری رات گزار دی اور اس سے کچھ بھی معلوم نہ کر سکا۔''

''یہ الو کا پٹھا ساری عمر بھی گزار دے گا تو کچھ معلوم نہیں کر پائے گا عرفان!'' میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا ''تم بھی الو کی دم ہو۔''

''سلیمان! میں تجھے چوبیس گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں۔ اگر تو نے اس کے بعد بھی اس کی زبان نہ کھلوائی تو استاد کو کاتیری زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دے گا۔''

''سیٹھ صاحب! آپ ابھی اسے کچھ مت کہیے گا۔ مجھے ایک موقع اور دیں۔ یہ تو انسان ہے، میں نے تو پتھروں کو بولنے پر مجبور کر دیا ہے۔''

''زیادہ فلمی ڈائیلاگ مت بول الو کے پٹھے!'' عرفان نے بپھر کر کہا ''اگر چوبیس گھنٹے بعد بھی اس نے زبان نہ کھولی تو پھر میں خود اسے اپنے ہاتھ سے گولی ماروں گا۔ وہ جائداد اگر مجھے نہیں ملے گی تو پھر اسے بھی نہیں ملے گی۔'' یہ کہہ کر عرفان نے میرے پہلو میں ایک لات ماری اور تہ خانے سے باہر نکل گیا۔

گویا اس وحشی سلیمان کی اذیت سہتے ہوئے مجھے پوری رات گزر گئی تھی۔

''شاکر!'' سلیمان نے کہا ''اس حرام زادے کو سونے مت دینا۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ کب تک زبان نہیں کھولتا۔ ہاں، اسے کھانے پینے کو کچھ دو ورنہ یہ کچھ بتائے بغیر ہی مر جائے گا۔''

تھوڑی دیر بعد شاکر ایک کپ میں چائے اور ڈبل روٹی کے کچھ سلائس لے کر آ گیا۔ میں نے کچھ بھی کھانے سے انکار کر دیا۔ اس نے مجھے دیوار کے سہارے بٹھا دیا تھا۔ اس نے چائے کا کپ میرے ہونٹوں سے لگانے کی کوشش کی تھی کہ میں نے اس کے چہرے پر کفر رسید کر دی۔ گرم گرم کچھ چائے مجھ پر گری لیکن زیادہ چائے شاکر پر گری۔ اس کے منہ سے گویا گالیوں کا طوفان اُمڈ پڑا۔ اس نے کہا ''نہیں کھاتا ہے، مت کھا۔ مرتا رہ بھوکا۔'' اس نے طیش میں آ کر میرے منہ پر ایک تھپڑ بھی رسید کر دیا۔

وقت گزرتا رہا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد سلیمان پھر آیا۔ اس نے شاکر کو حکم دیا کہ مجھے ایک بار پھر اُلٹا لٹکا دے۔

شاکر نے رسی کا سرا کھینچا اور مجھے ایک مرتبہ پھر اُلٹا لٹکا دیا گیا۔

سلیمان نے بپھر کر میرے منہ پر تھپڑ مارا اور بولا ''آج یا تو، تُو زبان کھول دے گا یا پھر تیری زبان ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گی۔''

اسی وقت عرفان تہ خانے میں داخل ہوا اور سلیمان سے بولا ''اسے کچھ کھانے کو دیا؟''

''اب تو میں تیری ہڈیاں چبا ؤں گا الو کی دم!'' میں نے عرفان سے کہا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں اعصابی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہوں۔

عرفان نے بپھر کر میرے چہرے پر تھپڑ مارا تو میں پھر پینڈولم کی طرح جھولنے لگا۔

اس نے دوسرا تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ اچانک ایک گرج دار آواز سنائی دی ''خبردار! تم میں سے کوئی حرکت نہ کرے ورنہ اپنی موت کا خود ذمے دار ہو گا۔''

میں نے بہ مشکل تمام گردن گھما کر دیکھا تو مجھے پولیس کا ایک انسپکٹر اور کچھ سپاہی نظر آئے۔ ان کے پیچھے آرمی کے ایک میجر صاحب تھے اور ان کے ساتھ ہماری اکیڈمی کے انسٹرکٹر اعجاز تھے۔ انہیں دیکھ کر مارے خوشی کے میرا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔

پولیس نے فوراً ہی عرفان، شاکر اور سلیمان کو ہتھکڑیاں پہنا دیں۔

ایک پولیس والے نے مجھے نیچے اُتارا اور میرے ہاتھ پیروں کی ہتھکڑیاں کھول دیں، اس کے باوجود مجھ سے فوری طور پر اُٹھا نہ گیا۔

میں حیران تھا کہ یہ سب ہوا کیسے؟

اعجاز صاحب نے اس کی تفصیل یوں بتائی۔

''کل رات اکیڈمی کے فون پر کسی لڑکی کی کال موصول ہوئی۔ اس وقت میں ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے کہا ''مجھے کیمپ کمانڈنٹ صاحب سے بات کرنی ہے۔''

میں نے پوچھا ''بی بی! آپ کون ہیں اور اتنی رات گئے جنرل صاحب سے کیا بات کرنا چاہتی ہیں؟''

اس نے کہا ''میں کیڈٹ آفیسر شہریار کی کزن ہوں اور مجھے جنرل صاحب سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

''جنرل صاحب تو اس وقت سو رہے ہوں گے۔ اگر کوئی ضروری بات ہے تو آپ مجھے بتا سکتی ہیں۔''

مجھے روبی پر اس وقت بے تحاشا پیار بھی آیا اور اس کی ذہانت پر رشک بھی۔ میں نے صرف اسی کو بتایا تھا کہ مجھے چھٹی نہیں ملی ہے اور اکیڈمی کے انسٹرکٹر صاحب نے مجھے ذاتی رسک پر یہاں بھیجا ہے۔

''اس نے صاف انکار کر دیا کہ میں صرف کمانڈنٹ صاحب ہی سے بات کروں گی۔ معاملہ بہت سنگین ہے اور کسی کی زندگی کا سوال ہے۔''

''پلیز آفیسر! اگر شہریار کو کچھ ہو گیا تو.....'' وہ بُری طرح رونے لگی اور جذبات میں آ کر یہ بھی بتا بیٹھی کہ تمہاری جان خطرے میں ہے۔

میں نے کہا ''آپ فکر نہ کریں، میں ابھی کچھ کرتا ہوں۔'' تمہارا نام سن کر میں بھی پریشان ہو گیا تھا کہ تمہاری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جان کو کیا خطرہ ہے؟''

روبی کی بات سننے کے بعد میں نے کہا'' کیا تمہیں یقین ہے کہ..... اچھا..... تم نے خود دیکھا ہے..... اب تم بے فکر ہو جاؤ، شہریار کو کچھ نہیں ہوگا۔''

پھر میں آندھی طوفان کی طرح ڈرائیونگ کرتا ہوا لاہور پہنچا لیکن اس وقت تک صبح ہو چکی تھی۔ میں نے ڈویژنل ہیڈ کوارٹر فون کیا تو اپنے ایک شاگرد میجر بابر سے بات ہوگئی۔ میں نے انہیں فوری طور پر گلبرگ کے پولیس اسٹیشن پہنچنے کو کہا۔ وہ اس وقت اپنے ساتھ دو سپاہیوں کو لے کر وہاں پہنچ گئے۔ میں ان سے دو منٹ پہلے پولیس اسٹیشن پہنچ چکا تھا۔ میں نے انہیں بھی مختصراً تمہارے بارے میں بتایا۔ انہوں نے پولیس کے ایک انسپکٹر کو ساتھ لیا اور تمہارے بنگلے کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہوں نے پولیس کو یہی بتایا تھا کہ عرفان نے ہمارے ایک آدمی کو اغوا کر لیا ہے اور اس کی جان خطرے میں ہے۔ اس کے بعد تو جو کچھ ہوا، وہ تم جانتے ہی ہو۔'' پھر وہ چونک کر بولے'' تم ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ کاکول چلو تاکہ میری حیثیت مجروح نہ ہو۔ یہاں کے معاملات سے میجر بابر نمٹ لیں گے۔''

'' آپ بے فکر ہو جائیں۔'' میجر بابر نے کہا'' میں سب کچھ دیکھ لوں گا۔''

میں روبی سے ملا تو وہ روتی ہوئی میرے سینے سے لگ گئی۔

'' روبی! تم نے اپنے ڈیڈی کے خلاف بھی رپورٹ کر دی؟'' میں نے کہا۔

'' ڈیڈی.....!'' وہ زہریلے لہجے میں بولی'' وہ اسی قابل ہیں۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ ابو اور تایا جان کو انہوں نے ہی قتل کرایا ہے۔ مجھے نفرت ہوگئی ہے ان سے۔'' پھر وہ سسکتے ہوئے بولی'' شہریار! مجھے تو تائی اماں کی فکر تھی۔ اگر ڈیڈی ان کی جان لینے کی دھمکی دے کر تمہیں بلیک میل کرتے تو شاید تم بھی ان کی بات مان جاتے اور تائی جی کی تو شاید حرکت قلب ہی بند ہو جاتی۔''

'' یہ بھی اللہ کا احسان ہے روبی کہ تمہارے ڈیڈی کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا۔ اچھا، اب تم امی کا بہت خیال رکھنا، میں چلتا ہوں۔''

میں اسی دن اعجاز صاحب کے ساتھ اکیڈمی پہنچ گیا۔ مجھے فوراً سی ایم ایچ میں داخل کر دیا گیا۔

میں نے وہاں ڈاکٹروں کو یہ بتایا کہ میں آؤٹ پاس لے کر ایبٹ آباد گیا تھا۔ وہاں کچھ لوگوں نے مجھے اغوا کر لیا۔ وہ میرے ذریعے میرے گھر والوں سے تاوان وصول کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی بہت اذیت پہنچائی ہے لیکن میں کسی نہ کسی طرح ان کی قید سے نکل بھاگا۔

☆☆☆

پاسنگ آؤٹ پریڈ کے موقعے پر امی، روبی اور چاچی بھی موجود تھیں۔ مہمانوں میں انکل زاہد کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اپنے زخمی ہونے کی وجہ سے اعزازی تلوار تو مجھے نہ مل سکی لیکن بہترین کیڈٹ کی ٹرافی ضرور مل گئی۔

جب میرے شانوں پر ستارے سجائے گئے تو میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔

میں وہاں سے فارغ ہو کر سیدھا امی کے پاس پہنچا۔ انہوں نے میرا ماتھا چوم لیا، پھر انکل زاہد نے مجھے سینے سے لگا لیا اور بولے'' تمہیں بھی پریشانی ہے نا کہ میں زندہ کیسے ہوں؟ اس آدمی کی چلائی ہوئی دونوں گولیاں میرے بازو میں لگی تھیں۔ وہ لوگ عقل سے اتنے پیدل تھے کہ میرا سیل فون بھی میرے پاس ہی چھوڑ دیا۔ میں نے اسی وقت ایک دوست کو فون کیا اور اس نے مجھے اسپتال پہنچا دیا۔''

'' اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے انکل!'' میں نے کہا'' ویسے بھی مجھے آپ کی شدید ضرورت تھی۔ شاید اللہ تعالیٰ کو اسی لیے مجھ پر رحم آ گیا۔ اب پہلے کی طرح سارا بزنس تو آپ ہی سنبھالیں گے۔''

پھر میں نے روبی کو اکیڈمی کے کمانڈنٹ صاحب سے ملوایا۔ وہ بھی روبی سے مل کر بہت خوش ہوئے اور بولے'' بیٹی! تمہاری وجہ سے ایک بہترین افسر بچ گیا۔''

عرفان کا کیس ابھی عدالت میں چل رہا ہے۔ اس نے ابو اور پاپا کے قتل کا اعتراف بھی کر لیا تھا اور پولیس نے اس ڈاکٹر کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔

☆☆☆

مقدمہ دو سال تک چلتا رہا۔ عدالت نے عرفان اور ڈاکٹر کو بیس بیس سال قید اور دس دس لاکھ روپے جرمانے کی سزا سنا دی۔ سلیمان، شاکر، استاد کو کا اور اس کے تیسرے ساتھی کو بھی سات سات سال کی قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔

میں تو اللہ تعالیٰ کے بعد روبی کا احسان مند ہوں کہ اس کی ذہانت اور محبت کی وجہ سے..... نہ صرف میری جان بچی بلکہ ابو اور پاپا کے قاتلوں کو سزا بھی مل گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk